هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران)

مُنْتَخَباتِ

بیانُ القرآن

ترجمہ ومختصر تفسیر

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مُرتّب :

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

نام کتاب	:	منتخباتِ بیانُ القرآن
اشاعت اوّل	:	اپریل 2019ء
اشاعت دوم	:	دسمبر 2019ء
اشاعت سوم	:	جولائی 2020ء
اشاعت چہارم	:	ستمبر 2020ء
قیمت	:	800 روپے

ISBN: 978-969-606-057-4

© Copyrights Protected

زیرِ اہتمام:
شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی لاہور
publications@tanzeem.org

شائع کردہ:
مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501
maktaba@tanzeem.org

مطبع: مکتبہ جدید پریس لاہور

عرضِ مُرتّب

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب داعی رجوع الی القرآن اور بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمة الله عليه کی مختصر تفسیر ''بیان القرآن'' سے اہم اقتباسات منتخب کر کے ترتیب دی گئی ہے۔ بیان القرآن کے قارئین جانتے ہیں کہ یہ تفسیر محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران چونکہ محدود وقت (اوقاتِ تراویح) میں مخصوص نصاب کا مطالعہ مکمل کرنے کا التزام کیا جاتا ہے' اس لیے بیان القرآن کا عمومی مزاج تو اختصار سے ہی عبارت ہے' لیکن اس پابندی یا مجبوری کے باوجود محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے بعض آیات کی تشریح قدرے تفصیل سے بھی کی ہے۔ متعلقہ آیات کی ایسی تمام تشریحات اپنے سیاق وسباق کی مناسبت سے انتہائی جامع' علمی اعتبار سے نہایت بصیرت افروز اور قرآن حکیم کے فلسفۂ ہدایت کی تعلیم وتفہیم کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں' اور واقعتاً اس لائق ہیں کہ انہیں بار بار پڑھا جائے۔ ان عبارات کی اسی اہمیت کے پیش نظر انہیں یکجا کر کے نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ قرآنی مضامین کے کہائے رنگا رنگ پر مشتمل اس خوبصورت گلدستے میں قارئین کو جابجا تنوع کی جھلک بھی دکھائی دے گی' بار بار انہیں انقلابی دعوت کا رنگ بھی نظر آئے گا اور اقامتِ دین سے متعلق محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر وفلسفہ کی مہک بھی ایک تسلسل کے ساتھ ان کے مشامِ جان کو معطر کرتی رہے گی۔

کتاب کا آغاز ''تعارفِ قرآن'' سے ہوتا ہے۔ یہ تحریر دراصل محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے ان آٹھ خطبات کا خلاصہ ہے جو قبل ازیں اسی عنوان سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر انتظام مختلف مواقع پر متعدد بار شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد منتخب آیات اور اقتباسات کا سلسلہ چلتا ہے جو قرآن حکیم کی ترتیب کے مطابق سورۃ الفاتحہ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ان تمام آیات اور اقتباسات کو موضوعات کی مناسبت سے الگ الگ عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو اپنے حضور قبول فرمائے' اس دور کی ظلمت میں قرآن حکیم کے نورِ ہدایت کو عام کرنے کے لیے اسے خصوصی تاثیر سے نوازے اور اس کے مرتبین کو بہترین اجر وثواب عطا فرمائے۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

۶ شعبان المعظم ۱۴۴۰ھ / ۱۲ / اپریل ۲۰۱۹ء
بروز جمعۃ المبارک

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
(۱)	تعارفِ قرآن	11
(۲)	سورۃ الفاتحہ	39
(۳)	ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ	41
(۴)	عبادتِ ربّ کی دعوت	45
(۵)	قصۂ آدمؑ و ابلیس اور خلافتِ ارضی کا بیان	46
(۶)	سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو دعوتِ ایمان	58
(۷)	ناسخ و منسوخ کا معاملہ	68
(۸)	تحویلِ قبلہ کا واقعہ	69
(۹)	نیکی کی حقیقت	73
(۱۰)	روزوں کی اہمیت اور فرضیت	77
(۱۱)	ہم تو مائل بہ کرم ہیں!	81
(۱۲)	یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے!	82
(۱۳)	زوجین کے حقوق و فرائض کا معاملہ	84
(۱۴)	ایک عظیم آیت —— ایک عظیم دعا	89
(۱۵)	آیاتِ محکمات و متشابہات کی تقسیم	93
(۱۶)	رسول اللہ ﷺ کے اتباع اور اطاعت کا خصوصی حکم	95
(۱۷)	اُمتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل	96
(۱۸)	اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ تاسیس	100
(۱۹)	غزوۂ اُحد کے تناظر میں جماعتی زندگی سے متعلق اہم ہدایات	101
(۲۰)	امیرِ کارواں کے لیے اہم ہدایات	104
(۲۱)	کبائر سے بچنے والوں کے لیے بشارت	105
(۲۲)	اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	107
(۲۳)	عدالتِ خداوندی میں انبیاء ورسلؑ کی شہادت کا معاملہ	109
(۲۴)	اسلامی ریاست کے دستور اور سیاسی وقانونی نظام کا خاکہ	110

(۲۵) سلام کا جواب دینے کے آداب 113
(۲۶) اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ عدل وانصاف کے لیے! 114
(۲۷) اہلِ ایمان کو ایمان لانے کا حکم 118
(۲۸) انبیاء ورسلؑ کی بعثت کا مقصد 119
(۲۹) ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ 121
(۳۰) گر یہ نہیں تو جان لو کہ تم کچھ بھی نہیں! 123
(۳۱) دعوتی تحریک کے حوالے سے اُمّ القریٰ کی اہمیت 125
(۳۲) جانتے بوجھتے حق سے روگردانی کی سزا 126
(۳۳) خبردار! اس راہ پہ دشمن قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھا ہے! 127
(۳۴) لباس —— نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت 128
(۳۵) کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو! 129
(۳۶) عالَمِ خلق اور عالَمِ امر کا معاملہ 131
(۳۷) انبیاءؑ کی دعوت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا ذکر 133
(۳۸) نبی اُمی ﷺ کی امتیازی شان اور آپؐ کے متبعین کا خصوصی اعزاز 134
(۳۹) واقعۂ سبت کے تناظر میں نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت 139
(۴۰) عہدِ الست کا بیان 143
(۴۱) ایک اسرائیلی عالم کا عبرت انگیز واقعہ 145
(۴۲) سورۃ الانفال کے مضامین کا اجمالی تعارف 147
(۴۳) مؤمنین صادقین کی پہچان 152
(۴۴) سورۃ التوبہ کے مضامین کا اجمالی تعارف 154
(۴۵) یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند! 157
(۴۶) نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے! 159
(۴۷) ارتکازِ دولت —— ایک سخت وعید 160
(۴۸) منافقین کے خلاف جہاد کے حکم کا اصل مفہوم 162
(۴۹) اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کی سزا —— مسلمانانِ پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ! 163
(۵۰) السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ 165
(۵۱) توبہ کرنے کا قابلِ رشک انداز 167

(۵۲) اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے اُن کے جان و مال خرید لیے ہیں! 170
(۵۳) غلبۂ دین کے لیے مسلسل جہاد کرنے کا حکم 173
(۵۴) ایک سبق آموز مثال 173
(۵۵) اعمال کی قبولیت کے لیے ''ایمان'' لازمی شرط ہے 175
(۵۶) قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت 177
(۵۷) دُنیوی معاملات کا ادھوراپن ایک دوسری دنیا کا متقاضی ہے 178
(۵۸) اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنْ فَیَکُوْن اور تخلیقِ کائنات کا واقعہ 180
(۵۹) اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان کرنے کی ممانعت 183
(۶۰) ایک آیت —— چھ احکام 184
(۶۱) ایک عبرت آموز تمثیل 185
(۶۲) دعوت اِلی الحق کے تین مدارج 186
(۶۳) تاریخ بنی اسرائیل کے آئینے میں اُمّتِ مُسلمہ کے حالات کی تصویر 188
(۶۴) ہر انسان کی قسمت کا لکھا اُس کی گردن میں لٹکا دیا گیا ہے 197
(۶۵) اے انسان! تجھے دنیا کا خریدار بننا ہے یا آخرت کا طلب گار! 198
(۶۶) انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے بارے میں جواب دہ ہے 199
(۶۷) انسان اپنے شاکلہ کے مطابق ہی عمل کرنے کا مکلف ہے 203
(۶۸) تاریخ نسلِ انسانی کے سب سے بڑے فتنے کا ذکر 203
(۶۹) اصحابِ کہف کون تھے؟ 205
(۷۰) ''ان شاء اللہ'' کہنے کا حکم 207
(۷۱) داعیانِ حق کے لیے ایک قیمتی نصیحت 209
(۷۲) خبردار! یہ بھی شرک ہے! 210
(۷۳) ذوالقرنین کون تھا؟ 212
(۷۴) سب سے بڑا گھاٹا کھانے والے بدقسمت انسان! 215
(۷۵) صِدِّیق نبیؐ اور رسول نبیؐ 218
(۷۶) حق کے مقابلے میں بالآخر ہزیمت اٹھانا باطل کا مقدر ہے 222
(۷۷) یاجوج اور ماجوج کی یلغار کا ذکر 223
(۷۸) وقوعِ قیامت کے حالات کی ایک جھلک 225

(۷۹)	محمد رسول اللہ ﷺ: تمام جہانوں کے لیے رحمت	228
(۸۰)	انبیاء ورسلؑ کی شخصیات کے ذاتی یا نجی پہلو کا معاملہ	229
(۸۱)	دعوتِ توحید اور فلسفۂ دین کے حوالے سے قرآن حکیم کا ایک اہم مقام	231
(۸۲)	لفظ ''فلاح'' کے مفہوم کی وضاحت	237
(۸۳)	رحمِ مادر میں بچے کی تخلیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ	240
(۸۴)	خبردار! تم نے لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا ہے	242
(۸۵)	انسانی معاشرتی زندگی سے متعلق چند اہم احکام	244
(۸۶)	نورِ ایمان کی مثال	247
(۸۷)	اہلِ ایمان کے لیے خلافت اور غلبۂ دین کی بشارت	250
(۸۸)	جماعتی نظم وضبط کے ضمن میں اہم ہدایات	254
(۸۹)	اخلاص وایمان کے بغیر کیے گئے اعمال کا انجام	257
(۹۰)	حقوقِ قرآن کے حوالے سے لرزا دینے والی آیت	258
(۹۱)	نفس پرستی —— شرک کی ایک انتہائی مہلک قسم	259
(۹۲)	واٹر سائیکل —— اللہ تعالیٰ کی ایک بصیرت افروز نشانی	260
(۹۳)	عذابِ قبر کے بارے میں ایک واضح قرآنی اشارہ	261
(۹۴)	عباد الرحمٰن کی ایک اہم دُعا	262
(۹۵)	''قارون'' —— ایک رویے، ایک کردار کا نام	263
(۹۶)	رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک خاص بشارت	267
(۹۷)	علمبردارانِ حق کی خصوصی توجہ کے لیے!	269
(۹۸)	قبولِ حق کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ	278
(۹۹)	خبردار! اصل زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے!	281
(۱۰۰)	سود لینے سے مال بڑھتا نہیں اور زکوٰۃ دینے سے کم نہیں ہوتا	282
(۱۰۱)	انسان نے بحر وبَر میں فساد برپا کر دیا ہے	284
(۱۰۲)	لہو ولعب کی محفلیں سجانے والوں کا انجام	285
(۱۰۳)	حضرت لقمان کے نصائح	286
(۱۰۴)	پانچ چیزوں کے خصوصی حوالے سے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کا بیان	295
(۱۰۵)	دعوتِ دین کے حوالے سے ائمۂ بنی اسرائیل کے طرزِ عمل کی تعریف	297

(۱۰۶)	اُسوۂ حسنہ سے متعلق آیت کے سیاق وسباق کی اہمیت	298
(۱۰۷)	مقامِ رسالت اور رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی	300
(۱۰۸)	مسلمان خواتین کے لیے پردے کا حکم	302
(۱۰۹)	امانتِ خداوندی کا خاص امین بندۂ خاکی نہاد	304
(۱۱۰)	اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے	305
(۱۱۱)	خبردار! اللہ تعالیٰ کو جزوی یا مشترکہ اطاعت قبول نہیں!	306
(۱۱۲)	وقوعِ قیامت اور عدالتِ الٰہی کے منظر کی ایک جھلک	308
(۱۱۳)	انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا بیان	310
(۱۱۴)	ایمان پر استقامت کی اہمیت وفضیلت	311
(۱۱۵)	قرآن حکیم کی حقانیت پر سائنس کی شہادت	314
(۱۱۶)	اقامتِ دین کی جدّوجُہد —— ایک اہم دینی فریضہ	317
(۱۱۷)	علمبردارانِ حق کے اوصاف	324
(۱۱۸)	والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم	331
(۱۱۹)	فلسفۂ جہاد بالسیف کا ایک اہم اصول	333
(۱۲۰)	اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا	336
(۱۲۱)	فلسفۂ بیعت اور تنظیم سازی میں بیعت کی اہمیت	338
(۱۲۲)	محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت	341
(۱۲۳)	اصحابِ رسولؐ کے اوصاف	342
(۱۲۴)	اسلامی ریاست کے آئین کی بنیاد	347
(۱۲۵)	انسانی مساوات کا قرآنی فلسفہ	348
(۱۲۶)	ایمان اور اسلام کا فرق	349
(۱۲۷)	نفسِ انسانی کی وسوسہ اندازی	355
(۱۲۸)	یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید!	356
(۱۲۹)	انسان کا مقصدِ تخلیق	357
(۱۳۰)	وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ	358
(۱۳۱)	عظمتِ قرآن کے بیان کا خصوصی انداز	359
(۱۳۲)	قرآن مجید کے حقوق میں کوتاہی کے حوالے سے ایک سخت وعید	362

(۱۳۳)	وحی ورسالت کا بنیادی مقصد: نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام	367
(۱۳۴)	اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کی سزا	371
(۱۳۵)	انقلابِ نبوی ﷺ کا تکمیلی منہاج	374
(۱۳۶)	انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی منہاج	375
(۱۳۷)	ایمانِ حقیقی کے ثمرات	380
(۱۳۸)	تم اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کو سونپ کر تو دیکھو!	388
(۱۳۹)	جہنم کی آگ سے خود کو بھی بچاؤ اور اپنے اہل وعیال کو بھی	391
(۱۴۰)	ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!	392
(۱۴۱)	انسان اور حیوان میں بنیادی فرق	394
(۱۴۲)	انبیاء ورسلؑ کے علمِ غیب کا معاملہ	395
(۱۴۳)	قیام اللیل کی اہمیت وفضیلت	396
(۱۴۴)	’’تکبیرِ رب‘‘ کے حکم کا اصل مفہوم ومدعا	400
(۱۴۵)	وقوعِ قیامت کا ایک اہم گواہ —— انسان کا نفسِ لوّامہ	402
(۱۴۶)	’’انسان‘‘ کا اصل الیہ	403
(۱۴۷)	اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے بارے میں ایک اہم بشارت	407
(۱۴۸)	اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے چار مظاہر	409
(۱۴۹)	تزکیۂ باطن کی اہمیت وضرورت	411
(۱۵۰)	رزق کی بست وکشاد —— انسان کی آزمائش کی دو صورتیں	412
(۱۵۱)	نفسِ انسانی کی خصوصیت اور اہمیت	413
(۱۵۲)	سورۃ الیل	416
(۱۵۳)	سورۃ الم نشرح	423
(۱۵۴)	سورۃ العصر	427
(۱۵۵)	سورۃ قُریش	428
(۱۵۶)	سورۃ الفلق	430
(۱۵۷)	سورۃ النّاس	432
(۱۵۸)	دعائے ختمِ قرآن	434

تعارفِ قرآن

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ درج ذیل تین جملوں پر مشتمل ہے:

۱۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

۲۔ یہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔

۳۔ یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے‘ کُل کا کُل‘ مِن وعَن موجود ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

لفظ ’’قرآن‘‘ کا لغوی مفہوم

لفظ ’’قرآن‘‘ بعض اہل لغت کے نزدیک اسمِ عَلَم اور اسمِ جامد ہے‘ جبکہ بعض کے نزدیک یہ مشتق (کسی مادے سے ماخوذ) ہے۔ جو علماءِ لغت اسے مشتق مانتے ہیں ان میں سے کچھ کی رائے میں اس کا مادہ ’’قرن‘‘ ہے جبکہ کچھ اسے ’’قرأ‘‘ سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ بہرحال علماءِ لغت کی آراء کی روشنی میں لفظ ’’قرآن‘‘ کے درج ذیل دو معروف معانی سامنے آتے ہیں:

۱۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا کلام ’’جمع‘‘ کر دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی تمام آیات کو جب جمع کر لیا گیا تو یہ ’’قرآن‘‘ بن گیا۔

۲۔ پڑھی جانے والی شے‘ پڑھی گئی شے۔

قرآن حکیم کا اسلوب

قرآن حکیم کے اسلوب کے حوالے سے مندرجہ ذیل نکات پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

۱۔ قرآن حکیم کو شعر اور شاعری سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس حوالے سے سورۂ یٰسٓ کی آیت ۶۹ میں دوٹوک انداز میں واضح فرما دیا گیا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهٗ ؕ﴾ ’’ہم نے اس (رسول) کو شعر سکھایا ہی نہیں اور نہ یہ ان کے شایانِ شان ہے۔‘‘

۲۔ ہمارے ہاں معروف مفہوم کے مطابق ایک کتاب کے بارے میں جو تصور پایا جاتا ہے اس مفہوم میں قرآن حکیم ایک ’’کتاب‘‘ بھی نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ہمارے ہاں ایک کتاب اپنے مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت ہوتی ہے‘ کتاب کے مضمون کو مختلف عنوانات کے تحت ابواب میں تقسیم کر کے ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھایا جاتا ہے‘ ہر باب میں بنیادی مضمون کا ایک نیا پہلو زیرِ بحث آتا ہے اور یوں یہ

مضمون تدریجی مراحل سے گزرتے ہوئے منطقی انداز میں اختتام پذیر ہوتا ہے‘ اس مفہوم میں قرآن حکیم ایک ’’کتاب‘‘ بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ اس اعتبار سے ’’کتاب‘‘ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ’’الکتٰب‘‘ (بمعنی لکھی ہوئی) قرار دیا ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ خود قرآن حکیم میں قرآن حکیم کے مختلف احکام کو اور اس کے مختلف حصوں کو ’’کتاب‘‘ قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ قرآن حکیم مجموعہ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں کا مقالہ عام طور پر اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل وحدت ہوتا ہے‘ جبکہ قرآن حکیم کی اکثر و بیشتر سورتیں اس پابندی سے ماوراء ہیں۔

۴۔ قرآن حکیم کا اسلوب دراصل خطیبانہ ہے اور اس کی ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔ جس طرح ہم انسانوں کے ہاں ایک خطیب اپنے خطبے کے دوران کبھی ایک موضوع پر بات کرتا ہے اور کبھی دوسرے پر‘ کبھی رلانے کا انداز اختیار کرتا ہے اور کبھی ہنسانے کا‘ کبھی حاضرین سے صیغۂ غائب میں گفتگو کرنے لگتا ہے تو کبھی اچانک غائبین کو صیغۂ حاضر میں مخاطب کرنا شروع کر دیتا ہے‘ اسی طرح قرآن حکیم میں بھی موضوعِ گفتگو‘ روئے سخن اور صیغہ خطاب بغیر کسی تمہید کے بار بار تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس خطیبانہ اسلوب کی بنا پر قرآن حکیم کو مجموعہ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Divine Orations) کہا جا سکتا ہے۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیات

قرآن حکیم کے نزول کے حوالے سے خود قرآن حکیم میں لفظ ’’انزال‘‘ (یکبارگی اُتار دینا) بھی آیا ہے اور ’’تنزیل‘‘ (تھوڑا تھوڑا کر کے تدریجاً اتارنا) بھی۔ اس ضمن میں مفسرین کی متفق علیہ رائے یہ ہے کہ لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ (الدخان: ۳) میں لوحِ محفوظ سے پورا قرآن سمائے دنیا پر نازل کر دیا گیا۔ البتہ اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ پر یہ کلام بصورتِ تنزیل یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا۔

حکمتِ تنزیل

حضور اکرم ﷺ پر قرآن حکیم تھوڑا تھوڑا نازل کرنے میں کیا حکمت تھی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ بنی اسرائیل میں اس کی وضاحت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾﴾ ’’اور قرآن کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے (کر کے نازل) کیا ہے‘ تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں‘ اور ہم نے اس کو اُتارا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے!‘‘ یعنی قرآن کو تدریجاً اس لیے نازل کیا گیا تاکہ اہلِ ایمان اسے اچھی طرح سے سمجھیں‘ اس پر غور کریں اور یہ آہستہ آہستہ ان کے باطن میں سرایت کرتا چلا جائے۔

سورۃ الفرقان میں اس حوالے سے کفار کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور ان کافروں نے یہ بھی کہا کہ اِس شخص (نبی ﷺ) پر یہ قرآن

پورے کا پورا ایک ہی دفعہ کیوں نہ اُتار دیا گیا؟ اس طرح (تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے نازل کیا گیا ہے) تاکہ اس کے ذریعے سے ہم آپؐ کا دل مضبوط کریں' اور (اسی لیے) ہم نے اسے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا اتارا ہے۔ اور یہ لوگ آپؐ کے پاس کوئی بھی اعتراض نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہم (اس کے جواب میں) آپؐ کے پاس حق اور اس کی بہترین وضاحت لے آئیں گے۔''

کفار کا کہنا تھا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو یکبارگی نازل کیوں نہیں کر دیا گیا؟ اس کے تھوڑا تھوڑا سامنے آنے سے تو یوں لگتا ہے جیسے محمد (ﷺ) خود اسے موزوں کر کے وقفے وقفے سے پیش کر رہے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن حکیم کے تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی درج ذیل حکمتیں بیان فرمائی گئیں:

۱۔ ﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ کہ اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے نازل کیا جا رہا ہے کہ اس طرح اے نبی (ﷺ) ہم آپؐ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ کے یہ الفاظ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اگر ہم اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے''۔ گویا حضور نبی اکرم ﷺ پر قرآن حکیم تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے نازل کیا جاتا تھا تاکہ آپ ﷺ کے دل کے لیے اس کے نزول کا تحمل آسان رہے۔

۲۔ ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾﴾ ''اور یہ لوگ آپؐ کے پاس کوئی بھی اعتراض نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہم (اس کے جواب میں) آپؐ کے پاس حق اور اس کی بہترین وضاحت لے آئیں گے''۔ اس ارشاد کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! یہ لوگ ہم پر جو بھی اعتراض کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کی یہ تحریک حق و باطل کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کی صورت میں تدریجاً آگے بڑھ رہی ہے۔ اس تحریک کے ہر موڑ پر آپؐ کو نت نئے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے مخالفین کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات بھی سننے ہیں۔ تو اگر سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو زمینی حقائق کے ساتھ اس کی مطابقت کیونکر ہوتی؟ اور کفار کو ان کے اعتراضات کے بروقت' برمحل جوابات کیسے ملتے؟ چنانچہ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ مطابقت و موافقت کے لیے بھی کلام اللہ کا تدریجاً نازل ہونا ضروری تھا۔

قرآن حکیم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول

قرآن حکیم ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک تقریباً ۲۲ سال میں بتدریج نازل ہوا۔ قمری کیلنڈر کے مطابق ۴۰ عام الفیل سے شمار کریں تو ۱۲ سال ہجرت سے پہلے اور ۱۱ سال ہجرت کے بعد تک یہ مدت ۲۳ سال بنتی ہے۔ جہاں تک نزولِ قرآن کے مقام یا علاقے کا سوال ہے تو اس بارے میں بنیادی طور پر یہ حقیقت مدِنظر رہنی چاہیے کہ حضور ﷺ نے آغازِ وحی سے لے کر وصال تک حجاز سے باہر کوئی سفر نہیں کیا۔ اس دوران آپ ﷺ کا طویل ترین

سفرِ غزوۂ تبوک کے حوالے سے تھا' لیکن تبوک کا علاقہ بھی حجاز ہی میں شامل ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات کے علاوہ باقی پورا قرآن علاقہ حجاز ہی میں نازل ہوا۔ البتہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات حضورﷺ کو معراج کے موقع پر ساتویں آسمان پر عطا کی گئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی صحیح مسلم میں مذکور روایت کے مطابق شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو جو تین تحفے عطا کیے ان میں نمازِ پنج گانہ کی فرضیت اور سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات شامل تھیں۔

قرآنِ حکیم کی محفوظیت

قرآنِ حکیم کو لفظاً' معناً اور متناً ہر لحاظ سے محفوظ ماننا ہمارے ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ یعنی ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ حکیم مِن وعَن' کُل کا کُل محفوظ ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی' کوئی تحریف یا کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے:

۱۔ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞﴾ (القیامۃ) ''آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

۲۔ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۞﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

۳۔ ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۞ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۞ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۞ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۞﴾ (الحاقۃ) ''اور اگر یہ (نبیﷺ) خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا' تو ہم پکڑ لیتے اس کو داہنے ہاتھ سے۔ پھر اس کی گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

قرآنِ حکیم کی ترکیب و تقسیم

جس طرح ہمارے ہاں کتابوں کو عام طور پر ابواب اور فصول وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے اس طرح قرآن حکیم بھی مختلف اکائیوں اور حصوں میں منقسم ہے' لیکن اس تقسیم کے حوالے سے جو نام اور اصطلاحات مستعمل ہیں وہ قرآنِ حکیم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس اعتبار سے دنیا کی کسی بھی کتاب کے ساتھ قرآن حکیم کی کوئی مشابہت و مماثلت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ مخصوص قرآنی اصطلاحات کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی اس سے ان اصطلاحات کا درست مفہوم واضح ہو سکتا ہے۔

۱۔ آیات کی تقسیم: کلام اللہ کی بنیادی اکائی کا نام ''آیت'' ہے۔ لفظ ''آیت'' کے لغوی معنی ''نشانی'' کے ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق قرآنی آیات گویا اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کی نشانیاں ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی آیات کا تعین نہ تو گرامر بیان یا نحو کے قواعد کے مطابق ہوا ہے اور نہ ہی اس معاملے میں کسی کے اجتہاد کا کوئی

دخل ہے' بلکہ یہ سراسر ایک توقیفی (رسول اکرم ﷺ کے بتانے پر موقوف) امر ہے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ سے جو روایات منقول ہوئی ہیں ان میں چونکہ کہیں کہیں اختلاف ہے اس لیے آیات کی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک آیات کی کُل تعداد ۶۲۱۶ 'بعض کے نزدیک ۶۲۳۶ ' جبکہ بعض کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے۔ لیکن یہ تمام اعداد و شمار حضور ﷺ سے نقل ہونے والی روایات کی بنیاد پر جمع کیے گئے ہیں۔ تعداد میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ''بسم اللہ'' کو بعض لوگوں نے صرف ایک آیت شمار کیا ہے اور بعض نے ۱۱۳ سورتوں کے آغاز میں اسے ہر بار شمار کیا ہے (واضح رہے کہ سورۃ التوبہ کے شروع میں ''بسم اللہ'' نہیں لکھی جاتی)۔ بعض آیات دو حروف پر بھی مشتمل ہیں (جیسے حٰـمٓ) اور بعض بہت طویل بھی ہیں' جیسے آیت مداینت (البقرۃ:۲۸۲) اور آیت الکرسی۔ انگریزی زبان میں قرآن مجید کی آیت کے لیے' عام طور پر لفظ verse استعمال کیا جاتا ہے جو درست نہیں۔ اس لیے کہ verse کے معنی شعر کے ہیں جبکہ قرآنی آیات نہ تو اشعار ہیں' نہ مصرعے اور نہ ہی جملے۔ اس لیے معاملہ خواہ کسی بھی زبان کا ہو' قرآنی آیت کے لیے بعینہٖ لفظ ''آیت'' ہی استعمال کرنا چاہیے۔

۲۔ سورتوں کی تقسیم: آیات سے مل کر قرآن مجید کی سورتیں بنی ہیں۔ لفظ ''سورۃ'' عربی مادہ ''سور'' سے ماخوذ ہے' جس کے معنی ''فصیل'' کے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ سورۃ الحدید کی آیت ۱۳ میں آیا ہے۔ لفظ فصل اور فصیل میں علیحدگی اور حد بندی وغیرہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ گویا ہر سورت ایک وحدت کے طور پر اپنا الگ تشخص رکھتی ہے۔ سورتوں کا تعین بھی خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔ یعنی یہ معاملہ بھی سراسر توقیفی ہے۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی کُل تعداد ۱۱۴ ہے۔ ان میں مختصر ترین سورۃ ''الکوثر'' ہے' جس کی صرف تین آیات ہیں اور طویل ترین سورۃ ''البقرہ'' ہے جو ۲۸۶ آیات پر مشتمل ہے۔ جس طرح آیت کے لیے انگریزی لفظ verse کا استعمال مناسب نہیں' اسی طرح سورت کے لیے بھی باب یا chapter جیسے الفاظ استعمال کرنا درست نہیں۔

۳۔ سات منازل کی تقسیم: صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے اکثر حضرات کا معمول تھا کہ وہ ایک ہفتے میں پورے قرآن کی تلاوت مکمل کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس معمول کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۱۱۴ سورتوں کو سات حصوں یا مجموعوں میں تقسیم کر دیا گیا' تاکہ جو شخص سات دنوں میں قرآن مجید ختم کرنا چاہے وہ روزانہ ان میں سے ایک حصے کی تلاوت کر لیا کرے۔ ان میں سے ہر حصے کو ہمارے ہاں ''منزل'' کا نام دیا گیا ہے' جبکہ احادیث میں ان کے لیے ''حِزب'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ سات منازل یا اَحزاب حجم کے اعتبار سے آپس میں بالکل برابر نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تقسیم کے لیے سورتوں کو توڑا نہیں گیا۔ چنانچہ کوئی حزب بڑا ہے اور کوئی چھوٹا۔ یہ تقسیم اگرچہ دورِ صحابہ میں موجود تھی لیکن کیا اس کا تعلق بھی توقیفی امور سے ہے؟ اس بارے میں ہمارے پاس کوئی سند نہیں ہے۔ البتہ ان احزاب میں سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تقسیم بھی اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت کا مظہر ہے۔ سورتوں کی تعداد کے لحاظ سے اس تقسیم کی خوبصورتی کی ایک جھلک ملاحظہ ہو: پہلی منزل البقرہ' آل عمران اور النساء تین سورتوں پر مشتمل ہے (سورۃ الفاتحہ کی حیثیت چونکہ

قرآن حکیم کے دیباچہ یا مقدمہ کی ہے اس لیے وہ اس تقسیم میں شامل نہیں)۔ دوسری منزل میں پانچ سورتیں‘ تیسری منزل میں سات سورتیں‘ چوتھی منزل میں نو سورتیں‘ پانچویں منزل میں گیارہ سورتیں‘ چھٹی منزل میں تیرہ اور ساتویں منزل (ساتویں منزل کو حزبِ مفصّل کہا جاتا ہے) میں پینسٹھ (۶۵) سورتیں شامل ہیں۔ واضح رہے کہ ۶۵ اور ۱۳ کے ہندسوں کے مابین بھی ایک نسبت اور تعلق ہے‘ کہ ۶۵ کا ہندسہ ۱۳ کے ہندسے کا multiple ہے۔

۴۔ **رکوعوں اور پاروں کی تقسیم**: یہ دونوں تقسیمیں دورِ نبوی ﷺ اور دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھیں۔ طویل سورتوں کی رکوعوں میں تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں کی گئی۔ ایک رکوع میں عام طور پر تلاوت کی اتنی مقدار رکھی گئی ہے جتنی ایک رکعت میں آسانی سے مکمل ہو سکتی ہے۔ لفظ رکعت دراصل ’’رکوع‘‘ سے ہی مشتق ہے۔ تیسویں پارے کی آخری ۳۵ سورتیں ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں۔ یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ ایک رکعت میں ایک سورت آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ معنوی اعتبار سے اس تقسیم پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ رکوعوں کی نشان دہی مضمون و معانی پر گہرے تدبر کے بعد بڑی محنت سے عمل میں لائی گئی ہے۔

پاروں کی تقسیم اس کے بعد کسی زمانے میں ہوئی ہے۔ اس تقسیم کا سبب غالباً یہ تھا کہ جب مسلمانوں کا جوشِ ایمان ماند پڑ گیا اور منازل کے حساب سے قرآن حکیم کی تلاوت ان پر گراں گزرنے لگی تو اس صورت حال میں نسبتاً آسان تقسیم کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس ضرورت کے تحت پورے قرآن کو برابر تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ ان میں سے ایک حصے کی روزانہ تلاوت کر کے ایک ماہ میں قرآن مجید ختم کیا جا سکے۔ اس تقسیم کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ذمہ داری سے ’’عہدہ برآ‘‘ ہونے کے لیے متعلقہ شخص نے اپنے مصحف کے صفحات کی گنتی کی‘ صفحات کی تعداد کو تیس پر تقسیم کیا اور جہاں جہاں مطلوبہ صفحات کی گنتی پوری ہوتی گئی وہاں وہاں پاروں کے نشانات لگا دیے۔ یعنی یہ کہ ’’کام‘‘ انتہائی عجلت میں بغیر کسی غور و فکر کے سرانجام دیا گیا ہے۔ اس میں نہ تو مضمون کے تسلسل کو دیکھا گیا ہے اور نہ ہی سورتوں کی وحدت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال تیرہویں پارے کے اختتام پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ یعنی سورۃ الحجر کی ابتدائی اکیلی آیت تیرہویں پارے میں‘ جبکہ باقی پوری سورت چودہویں پارے میں ہے۔ بہرحال یہ تقسیم چونکہ دورِ تبع تابعین کے بعد عمل میں آئی ہے اس لیے یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے۔ اس لیے بعض ممالک میں شائع ہونے والے قرآن مجید کے نسخوں میں پاروں کی نشاندہی نہیں کی جاتی۔ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمران بن حصین ؓ سے مروی نبی اکرم ﷺ کی ایک متفق علیہ حدیث کے الفاظ ((خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِىْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ)) کے مطابق بہترین ادوار تین ہی ہیں۔ یعنی دورِ صحابہؓ‘ دورِ تابعینؒ اور دورِ تبع تابعینؒ۔ ان تین ادوار کو ہم ’’قُرُوْنٌ مَشْهُوْدٌ لَهَا بِالْخَيْر‘‘ کہتے ہیں۔ اس کے بعد کے کسی زمانے کا کوئی معاملہ دین میں حجت نہیں ہو سکتا۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف

قرآن حکیم کی ترتیب کے حوالے سے یہ رائے متفق علیہ ہے کہ مصحف میں آیات اور سورتوں کی ترتیب اس

کی ترتیبِ نزولی سے بالکل مختلف ہے۔ ترتیب مصحف تو آج ہر کسی کے سامنے ہے‘ لیکن ترتیب نزولی کے بارے میں جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس حوالے سے غور کرنے کے نتیجے میں قرآن حکیم کے معانی ومفاہیم کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں‘ اور اس لیے بھی کہ بعض سورتوں اور آیات کا تعلق بعض مخصوص حالات وواقعات کے ساتھ ہے۔ یہ ربط وتعلق اس قدر واضح اور گہرا ہے کہ اگر قرآن حکیم کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مدوّن کیا جائے تو یہ ایک طرح سے سیرت النبی ﷺ کی کتاب بن جائے گی۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے قرآن حکیم کو ترتیب نزولی کے مطابق بھی مرتب کر رکھا تھا۔ بہر حال ترتیب نزولی کے مطابق قرآن کو ترتیب دینے کی کوشش کرنے میں علمی اعتبار سے اگرچہ کوئی حرج نہیں لیکن انسانی سطح پر پورے قرآن کو اس انداز میں مرتب کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں بہت پرزور انداز میں اس موقف کی تائید کی ہے کہ اگر تمام انسان اور تمام جنات مل کر بھی اپنی سی کوشش کر لیں تو بھی قرآن حکیم کو ترتیب نزولی کے مطابق مرتب نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس بارے میں آج مکمل معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونے والی آیات پہلے اور پہلے نازل ہونے والی آیات بعد میں درج ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک ایک آیت کے زمانہ نزول کے بارے میں تعین کرنا اور پھر اس پر اجماع ہونا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ چنانچہ اس بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ ''اصل قرآن'' وہ مصحف ہے جو آج دنیا میں (کتابی شکل میں) موجود ہے۔ اس کی ترتیب خود حضور اکرم ﷺ کی عطا کردہ ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں موجود قرآن کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:۔

۱۔ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾﴾ (الواقعہ) ''یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔ ایک چھپی ہوئی کتاب میں۔''

۲۔ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج) ''بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزت والا۔ لوحِ محفوظ میں (نقش ہے)۔''

ترتیبِ مصحف کے حوالے سے دورِ حاضر میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تحقیق کے نتیجے میں قرآن حکیم کی سورتوں اور آیات کے نظم کی بہت سی نئی جہتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق تمام سورتیں مجموعوں (groups) اور جوڑوں (pairs) کی شکل میں باہم منظم ہیں۔ ہر سورت اپنا عمود یعنی ایک مرکزی مضمون رکھتی ہے‘ جبکہ ہر آیت کا اپنی سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ گہرا ربط اور تعلق ہے۔ اسی طرح ایک سورت کی تمام آیات کے مابین بھی ایک منطقی ربط موجود ہے۔ ''مقدمہ نظام القرآن'' میں مولانا فراہیؒ نے اپنی اس تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے نظم قرآن کے موضوع پر اس تحقیق کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

تدوینِ قرآن

قرآن حکیم کی تدوین مندرجہ ذیل تین مراحل میں مکمل ہوئی:

۱۔ تدوین قرآن کا پہلا مرحلہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ نے تمام آیات اور تمام سورتوں کی ترتیب معین فرما دی تھی' البتہ آپ ﷺ کی زندگی میں پورا قرآن کتابی شکل میں موجود نہیں تھا' لیکن مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن حکیم کے مختلف حصے پتھر کی تختیوں' اونٹ کی چوڑی ہڈیوں اور کپڑوں وغیرہ پر لکھے ہوئے موجود تھے۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی اصل حیثیت ''قول'' کی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحاقہ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝﴾ کہ یہ ایک معزز رسول (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کا قول ہے۔ تو اوّلاً یہ قول جبرائیلؑ ہے اور ثانیاً یہ قولِ محمد ﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ نہ تو قرآن حکیم حضور ﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا اور نہ حضور ﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا' بلکہ آپ ﷺ کو قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھایا گیا۔ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کی اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝﴾ ''ہم آپ کو پڑھائیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ چنانچہ قرآن حکیم اصل میں پڑھی جانے والی شے ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو پڑھایا اور آپ ﷺ نے صحابہؓ کو پڑھایا۔ لیکن جیسے جیسے قرآن حکیم نازل ہوتا گیا ویسے ویسے حضور اکرم ﷺ نے اسے لکھوانے کا اہتمام بھی فرمایا۔ آپ ﷺ نے مختلف صحابہؓ کو کتابت وحی کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔ جیسے ہی کوئی نئی وحی نازل ہوتی تو متعلقہ لوگ اسے لکھ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کی زندگی میں پورا قرآن موجودہ ترتیب کے ساتھ حُفّاظ کے سینوں میں بھی محفوظ تھا۔ صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر رمضان میں حضور ﷺ حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے۔ یعنی اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا' اسے آپؐ حضرت جبرائیلؑ کے سامنے دہراتے تھے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں آپ ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ سے قرآن حکیم کا دو مرتبہ مکمل دور کیا۔ چنانچہ جہاں تک لوگوں کے حافظے میں قرآن حکیم کی تدوین کا تعلق ہے یہ تدوین حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہو چکی تھی۔

۲۔ قرآن حکیم کی تدوین کے دوسرے مرحلے کی تکمیل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ آپؓ کے دور میں لڑی جانے والی جنگِ یمامہ میں جب بہت سے حُفّاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ قرآن حکیم کو جلد از جلد کتابی صورت میں محفوظ کر لینا چاہیے' مبادا کہ بعد میں اس حوالے سے مشکل پیش آئے۔ آپؓ نے یہ تجویز حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی تو وہ متردّد ہوئے کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے بار بار اصرار کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کو اس معاملے میں انشراحِ صدر ہو گیا۔ جس کے بعد آپؓ نے اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (جو کاتبانِ وحی میں سے تھے) کی سربراہی میں چند صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے دی۔ اس کمیٹی نے غیر معمولی محنت اور ذمہ داری سے تحریری کتبوں' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادتوں اور حُفّاظ کی مدد سے قرآن حکیم کو دورِ خلافتِ صدیقیؓ ہی میں کتابی

شکل میں جمع کر لیا۔ واضح رہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا دورانیہ صرف سوا دو برس تھا۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دو سال کے اندر اندر ہی قرآن حکیم کی کتابی شکل میں تدوین مکمل ہو گئی اور حضرت ابو بکرؓ نے صحابہؓ کی مشاورت سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تجویز پر اس کا نام ''مُصْحَف'' رکھا۔

۳۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ قرآن حکیم سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ ظاہر ہے عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن مختلف قبائل کی بولیاں مختلف تھیں۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں الفاظ کے لہجے بھی مختلف تھے۔ ابتداء میں مختلف علاقوں کے لوگوں کو اپنے اپنے لہجے کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کرنے کی اجازت تھی۔ اس طرح اپنے اپنے لہجے میں پڑھنے سے قراءت میں کہیں کہیں لفظی فرق بھی آ جاتا تھا' لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک مختلف لہجوں میں لفظی فرق کے ساتھ بھی قرآن مجید پڑھا جاتا رہا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جب اسلامی سلطنت دور دراز علاقوں تک پھیل گئی تو قراءت میں لہجے اور الفاظ کے فرق کی وجہ سے لوگوں میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے' بلکہ چند مواقع پر تو اس اختلاف کی بنا پر فریقین کے مابین تلواریں بھی نکل آئیں۔ اس صورت حال سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بجا طور پر تشویش ہوئی کہ اگر ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے لہجے کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کرتے رہے تو امت افتراق و انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ آپؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے قریش کے لہجے کے مطابق قرآن حکیم کا ایک متفق علیہ متن (text) تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام آپؓ نے صحابہ کرامؓ کی ایک کمیٹی کے سپرد کیا۔ اس کمیٹی نے تمام معروف قراءتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے قریش کے لہجے کے مطابق ایک خاص انداز کے خط (خط کے لیے عربی میں لفظ ''رسم'' استعمال ہوتا ہے' اسی سے اردو کی ترکیب ''رسم الخط'' وضع ہوئی ہے) میں قرآن حکیم کا متفق علیہ متن تیار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس متن کی چار نقول (بعض روایات میں پانچ اور بعض میں سات نقول کا ذکر بھی آتا ہے) تیار کروائیں۔ ایک نقل سرکاری ریکارڈ (official version) کے طور پر مدینہ میں رہی اور باقی مختلف علاقوں کے گورنرز کو بھجوا دی گئیں۔ اس طرح حضرت عثمانؓ نے قرآن حکیم کو ایک رسم الخط اور ایک متن (text) پر جمع کیا۔ قرآن حکیم کے اس خاص خط کو ''رسم عثمانی'' اور آپؓ کے تیار کردہ مصاحف کو ''مصاحف عثمانیؓ'' کہا جاتا ہے۔ یہ تدوینِ قرآن کا تیسرا مرحلہ تھا اور یہ تدوین بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ۲۴ برس بعد تک مکمل ہو گئی تھی۔

قرآن حکیم کا موضوع

قرآن حکیم میں اگرچہ مادی دنیا (physical world) سے متعلق بھی بہت سی معلومات موجود ہیں' لیکن اس کا اصل اور بنیادی موضوع انسان کی ہدایت ہے۔ اس حوالے سے یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانِ اوّل اور پیغمبر اوّل حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے وقت دو قسم کے علوم عطا فرمائے تھے: علم اسماء (مادی دنیا کے حقائق کا علم) اور علم وحی۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۳۱ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام نام سکھا دیے۔ اس سے مراد مادی دنیا کی اشیاء کا ہمہ جہت علم ہے

جس کا تعلق انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل سے ہے۔ گویا انسانی زندگی کے اس شعبے (مادی دنیا کے حقائق) سے متعلق کُل کا کُل علم حضرت آدمؑ کے وجود میں بالقوّہ (potentially) ودیعت کر دیا گیا تھا۔ آپؑ کے دنیا میں آنے سے لے کر آج تک یہ علم مسلسل ارتقاء پذیر رہا ہے اور آئندہ بھی ترقی کرتا رہے گا۔ یہ علم دراصل انسان کے لیے حکومت ارضی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جو قوم اس علم میں ترقی کرے گی وہی دنیا میں غلبہ واقتدار کی حق دار ٹھہرے گی۔ آج ہم فزیکل سائنسز اور سوشل سائنسز کے مختلف شعبوں میں جن علوم سے واقف ہیں ان سب کا تعلق علم الاسماء سے ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو جو دوسرا علم عطا ہوا وہ علم وحی تھا۔ (واضح رہے کہ علم الاسماء اور علم وحی دو الگ الگ علوم ہیں‘ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔) انسانی ہدایت کا منبع و سرچشمہ دراصل یہی علم ہے۔ حضرت آدمؑ کے حوالے سے اس علم کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت ۳۸ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞﴾ ”ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ۔ تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت‘ تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے“۔ گویا علم ہدایت انسان کو بذریعہ وحی ابتدائے آفرینش میں ہی فراہم کر دیا گیا تھا۔ پھر جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منازل طے کرتی گئی ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ہدایت (ھُــدًی) کی جامعیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ یہ نورِ ہدایت درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے بالآخر قرآن حکیم کے اندر الھُـدیٰ (Final Guidance) کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

قرآن مجید انسان کو جو ہدایت فراہم کرتا ہے‘ بنیادی طور پر اس کے دو حصے ہیں: ایک فکر ونظر کی ہدایت اور دوسرے کردار وعمل کی ہدایت۔ فکری ونظری ہدایت کا دوسرا نام ”ایمان“ ہے۔ اس عنوان کے تحت قرآن حکیم سے انسان کو عالمِ غیب کے حقائق‘ کائنات کی تخلیق‘ زندگی کے آغاز وانجام اور خیر وشر کی حقیقت جیسے امور سے متعلق راہنمائی ملتی ہے۔ جبکہ قرآنی ہدایت کا دوسرا حصہ جو اوامر ونواہی اور حلال وحرام کے احکام پر مشتمل ہے‘ وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے درست راہِ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ بالا دونوں علوم (علم الاسماء اور علم الوحی) کے حوالے سے درج ذیل نکات کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے:

۱۔ قرآن حکیم کے نزول کا اصل مقصد انسان کے لیے راہِ ہدایت کی نشاندہی کرنا ہے۔ یہ بنی نوعِ انسان کو سائنس یا ٹیکنالوجی سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے نازل نہیں ہوا۔ البتہ قرآن حکیم میں جابجا طبیعی مظاہر (physical phenomena) کے بارے میں حوالے موجود ہیں۔ ان حوالوں کی مدد سے متعلقہ شعبہ ہائے علوم سے متعلق بہت سی اہم اور مفید معلومات مہیا ہوسکتی ہیں۔

۲۔ قرآن حکیم اس اللہ کا کلام ہے جو کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کا خالق ہے' اس لیے قرآن حکیم میں مادی دنیا کے حقائق یعنی سائنسی مظاہر سے متعلق جو معلومات درج ہیں وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم' یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور قرآن حکیم اس کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول و فعل میں تضاد ممکن نہیں۔

۳۔ اگر ہمیں قرآن حکیم کی کسی آیت میں سائنسی مظاہر سے متعلق بیان کردہ حقائق اور انسانی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کے درمیان تضاد محسوس ہو تو ایسی صورت میں ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ انسانی معلومات غلط یا ادھوری ہو سکتی ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی حقانیت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ اور یہ کہ جیسے جیسے علم انسانی کا قافلہ آگے بڑھے گا اور مادی دنیا سے متعلق مزید حقائق انسان پر منکشف ہوں گے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ قرآن کی فراہم کردہ معلومات ہی برحق ہیں۔ جیسے سورۂ یٰسٓ کی آیت ۴۰ کے جملہ: ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝﴾ کا مفہوم جس قدر آج واضح ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے' زمانہ ماضی میں اس قدر کبھی بھی واضح نہیں رہا۔ ماضی میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب انسان سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ پھر وہ دور آیا جب سورج کے ساکن اور زمین کے متحرک ہونے کا دعویٰ کیا گیا۔ جبکہ آج ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ سب کے سب اَجرامِ سماوی اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعلان سورۂ یٰسٓ کی مذکورہ آیت میں آج سے پندرہ سو سال پہلے کیا گیا تھا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۵۳ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ ''عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی' یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔''

۴۔ دنیا میں علمی و تحقیقی سطح پر آج تک سائنس کے مصدقہ حقائق (proved facts) کے ساتھ قرآن حکیم کے کسی ایک لفظ کا تضاد بھی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ اس حقیقت کی شہادت فرانسیسی سکالر ڈاکٹر موریس بوکائی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "The Bible, The Quran and Science" میں بھی دی ہے۔ اسی طرح کینیڈا کے نامور ماہر علم جنین (Embryologist) ڈاکٹر کیتھ ایل مور نے قرآن حکیم کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ آج سے صدیوں پہلے جبکہ نہ تو مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی دنیا dissection کے عمل سے واقف تھی' قرآن نے علمِ جنین (Embryology) سے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سورۃ المؤمنون کی درج ذیل آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رحم مادر میں بچے کی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے بارے میں جو تفصیل ان آیات میں بیان ہوئی ہے اس سے بہتر تعبیر آج بھی ممکن نہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝۱۲ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۱۳ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ

مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۖ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ﴾ ''ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے' پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل دے دی' پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا' پھر ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔''

۵۔ اگر ہمارے اَسلاف نے اپنے زمانے میں دستیاب سائنسی معلومات کی بنیاد پر قرآن حکیم کی کسی آیت کا کوئی خاص مفہوم معین کیا ہے تو آج ہم ایسے کسی مفہوم کو من وعن تسلیم کرنے کے پابند نہیں ہیں' بلکہ اس کے برعکس ہمیں سائنسی مظاہر سے متعلق قرآنی آیات کو اپنے زمانے کے سائنسی انکشافات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن حکیم انسانی ہدایت (هُدًى) کا تکمیلی ایڈیشن ہے۔ اس اعتبار سے اس کا نام الھُدٰی (ہدایت تامہ) ہے۔ قرآن حکیم میں اگرچہ جگہ جگہ سائنسی مظاہر سے متعلق حوالے بھی آئے ہیں' جو یقیناً حقائق پر مبنی ہیں اور ان حوالوں سے انسان کو مختلف شعبہ ہائے علوم سے متعلق بہت سی مفید معلومات بھی ملتی ہیں' لیکن ایسی آیات پر غور وفکر کرتے ہوئے ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن حکیم انسان کو مادی دنیا (physical world) کے علوم سکھانے کے لیے نہیں بلکہ اس کی فکری اور عملی راہنمائی کے لیے آیا ہے۔ فکری و نظری اعتبار سے قرآن حکیم انسان کو علم حقیقت یعنی ایمان اور مابعد الطبیعیات حقائق سے متعلق راہنمائی فراہم کرتا ہے' جبکہ عملی میدان میں یہ اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس طرح کسی سڑک پر نصب سائن بورڈز ڈرائیور کے سفر کو آسان اور محفوظ بنانے میں مددگار بنتے ہیں' اسی طرح شاہراہِ حیات کے مسافر (انسان) کے لیے قرآن حکیم کے اوامر ونواہی (Dos & Don'ts) کے ''سائن بورڈز'' محفوظ اور کامیاب سفر کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

فہم قرآن کے اصول

قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے درج ذیل نکات سے آگاہی ضروری ہے:

ا۔ قرآن حکیم کا اسلوبِ استدلال: قرآن حکیم کے طالب علم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کلام کا طرزِ استدلال منطقی نہیں بلکہ فطری ہے۔ ایمانی حقائق (ذاتِ باری تعالیٰ' فرشتوں' آخرت' جنت' دوزخ وغیرہ) کو منطق کی کسوٹی پر پرکھنا چونکہ ممکن ہی نہیں اس لیے قرآن حکیم عمومی طور پر انسان کی عقل کو مخاطب کرنے کے بجائے اس کی روح سے ہم کلام ہوتا ہے' تاکہ انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت اپنے باطن میں جھانکے' اپنی فطرت میں پہلے سے موجود ایمانی حقائق (اللہ تعالیٰ کی معرفت) کا شعور حاصل کرے اور اپنے خالق کو پہچانے۔ ملاحظہ ہو سورۂ ابراہیم کی اس آیت میں اس طرزِ استدلال کی ایک جھلک: ﴿اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ (آیت ۱۰) ''کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟'' اس جملے میں اللہ

خدا کے وجود کے بارے میں کوئی منطقی دلیل نہیں دی گئی بلکہ مخاطب کو دروں بینی کی ترغیب دی گئی ہے کہ تم اپنے اندر جھانکو' اپنی روح سے پوچھو' تمہاری روح خود اللہ کی ہستی کے بارے میں شہادت دے گی۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں فرمایا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی﴾ ''کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟'' یعنی تم اپنی زبان سے تو ایسی باتیں کہتے ہو' لیکن کبھی تم اپنے باطن میں جھانک کر اپنی فطرت سے بھی پوچھو! اپنے دل کو بھی ٹٹولو! کیا تمہاری فطرت تمہارے اس دعوے کو تسلیم کرتی ہے؟ کیا تمہارا دل اللہ کے علاوہ کسی اور معبود کے وجود کی شہادت دیتا ہے؟ تو قرآن حکیم اس فطری اسلوب کے ذریعے انسان کی فطرت کے اندر مضمر ایمانی حقائق کو اُجاگر کرتا ہے۔

۲۔ **آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات:** آیاتِ قرآنی کی اس تقسیم کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ط فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ ''وہی ہے جس نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی' اس میں محکم آیات ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں' اور کچھ دوسری آیتیں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ پیچھے لگتے ہیں ان آیات کے جو ان میں سے متشابہ ہیں' فتنے کی تلاش میں' اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کے لیے' حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر' یہ کُل کا کُل ہمارے رب کی طرف سے ہے' اور یہ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں۔''

قرآن حکیم کی وہ تمام آیات جن میں قطعی احکام اور اوامر و نواہی کا ذکر ہے ''محکمات'' کے درجے میں آتی ہیں۔ ان کے قطعی ہونے کے حوالے سے کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک آیاتِ متشابہات کا تعلق ہے تو ان میں سے کچھ تو دائمی متشابہات ہیں اور کچھ عارضی متشابہات۔ دائمی متشابہات کے درجے میں وہ آیات آتی ہیں جن میں عالمِ غیب مثلاً عالمِ برزخ' عالمِ آخرت' عالمِ ارواح' عالمِ ملائکہ وغیرہ سے متعلق حقائق کا ذکر ہے۔ ان تمام حقائق پر ایمان لانے کے لیے انسان کو ان سے آگاہ کرنا ضروری تھا' لیکن دُنیوی زندگی میں ان حقائق تک انسانی حواس اور عقل کی رسائی چونکہ ممکن نہیں اس لیے ایسی تمام آیات دائمی طور پر متشابہات ہی کے درجے میں رہیں گی۔ ہاں جب عالمِ آخرت میں انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ان تمام حقائق کو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ عارضی متشابہات کے درجے میں وہ آیات آتی ہیں جن میں مظاہرِ طبیعی (Physical Phenomena) کا ذکر آیا ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے ان متشابہات کی فہرست بہت طویل تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ بتدریج سکڑتا چلا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے ہزار سال پہلے سورۂ یٰسٓ کی آیت ۴۰ کے جملے ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) میں

بیان کی گئی حقیقت کو انسانی ذہن سمجھنے سے قاصر تھا لیکن آج کا انسان اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتا ہے کہ سورج، چاند، ستارے، سیارے اور زمین ہی نہیں کائنات کے ایک ایک ذرّے (atom) کے اندر الیکٹران اور پروٹان تک حرکت میں ہیں۔ گویا کچھ عرصہ پہلے تک یہ آیت متشابہات میں سے تھی مگر آج یہ محکمات کے دائرے میں آ چکی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر سات آسمانوں کا ذکر آیا ہے، مگر ان کی حقیقت کے بارے میں ابھی تک ہم کچھ نہیں جانتے۔ عین ممکن ہے مستقبل میں انسان ان کی حقیقت سے بھی آگاہی حاصل کر لے اور یوں وہ تمام آیات جن میں سات آسمانوں کا ذکر ہے وہ بھی محکمات کے دائرے میں شامل ہو جائیں۔

۳۔ **تفسیر اور تاویل کا فرق**: تفسیر اور تاویل دونوں قرآنی الفاظ ہیں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔ اسی طرح لفظ ''تفسیر'' سورۃ الفرقان کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝۳۳﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بات کو بہترین طریقے سے کھول دیتے ہیں''۔ واضح رہے کہ لفظ ''تفسیر'' قرآنِ حکیم میں صرف ایک مرتبہ اسی آیت میں آیا ہے، جبکہ لفظ ''تاویل'' سترہ (۱۷) مقامات پر آیا ہے۔ لفظ تفسیر کے معنی ہیں: کھولنا، واضح کرنا، روشن کرنا۔ لیکن اس لفظ کے اس مفہوم کا اطلاق زیادہ تر مفردات یعنی الفاظ کی وضاحت پر ہوتا ہے۔ جبکہ لفظ ''تاویل'' کے معنی کسی کلام یا کسی عبارت کا اصل مطلب و مقصود کے ہیں۔ بہرحال قرآنِ حکیم کے مطالب و مفاہیم کے لیے ہمارے اردو دان طبقہ کے ہاں عام طور پر لفظ ''تفسیر'' استعمال ہوتا ہے، البتہ اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے قرآنِ حکیم کی اپنی اصطلاح ''تاویل'' ہے۔

۴۔ **تاویل عام اور تاویل خاص**: جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن حکیم سرزمین حجاز میں ۶۱۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک کے عرصے کے دوران نازل ہوا۔ اس اعتبار سے اس کلام کے اسلوب اور اس کے مضامین کو سمجھنے کے لیے اُس زمانے کے حالات و واقعات، ان لوگوں کے عقائد و نظریات اور اس معاشرے کی رسومات و روایات جیسے عوامل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب کسی آیت یا چند آیات میں مذکور کسی مضمون کی وضاحت واقعاتی پس منظر کے سیاق و سباق (context) کے لحاظ سے کی جائے گی تو اس کی وضاحت یا تاویل کو متعلقہ آیت یا آیات کی تاویل خاص کہا جائے گا۔ جبکہ الفاظ کے عموم پر غور و فکر کے نتیجے میں تشکیل پانے والی رائے یا تشریح تاویل عام کہلائے گی۔ گویا تاویل عام کی بنیاد الفاظ کے معانی، آیات کے باہمی ربط، متعلقہ سورت کے مرکزی مضمون جیسے عوامل (یعنی متن) پر استوار ہوگی۔ جبکہ تاویل خاص کے حوالے سے واقعاتی سیاق و سباق (شانِ نزول) کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ قرآنِ حکیم کا پیغام چونکہ نوعِ انسانی کے تمام افراد اور تا قیامِ قیامت تمام زمانوں کے لیے ہے اس لیے اس کی تاویل و تفسیر کے ضمن میں بنیادی طور پر یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے: **الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب** یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا، نہ کہ خاص

شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شانِ نزول کے حوالوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں مناسب طرزِ عمل یہ ہوگا کہ پہلے زیرِ مطالعہ آیت یا آیات کی تاویلِ خاص کا جائزہ لیا جائے اور اس کے بعد اس کلام کے ابدی سرچشمہ ہدایت ہونے کے ناطے سے تاویلِ عام پر غور کیا جائے۔

۵۔ تذکر و تدبر: تفہیمِ قرآن کے حوالے سے تذکّر اور تدبّر کی اصطلاحات قرآن حکیم میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہیں۔ البتہ سورۂ صٓ کی اس آیت میں یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾ ''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں''۔ لفظ تذکر کا مادہ ''ذکر'' ہے اور ذکر کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ گویا وہ مابعد الطبیعیاتی حقائق (خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت) جو فطرتِ انسانی کے اندر پہلے سے موجود ہیں' لیکن دنیا کے مسائل و مشاغل کی وجہ سے وہ ذہول اور نسیان کے پردوں میں دب کر عام طور پر انسان کی یادداشت سے محو ہو جاتے ہیں' قرآن حکیم ان حقائق کو اجاگر کر کے انسان کے ذہن اور شعور میں پھر سے تازہ کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ جیسے آپ کا ایک بہت قریبی اور بے تکلف دوست تھا' لیکن ایک طویل عرصہ تک اس سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے آپ اسے بالکل ہی بھول گئے۔ پھر ایک دن اچانک جب اس کا دیا ہوا ایک تحفہ آپ کے سامنے آیا تو اپنے دوست کی اس ''نشانی'' کو دیکھتے ہی اس کی یاد یکدم آپ کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ اس مفہوم میں قرآن حکیم کی ہر آیت ایک ''نشانی'' (لفظ ''آیت'' کے لغوی معنی نشانی کے ہیں) ہے۔ چنانچہ تذکّر (یاددہانی) کی سطح کی ہدایت کے لیے قرآن حکیم دنیا کی آسان ترین کتاب ہے۔ جیسا کہ سورۃ القمر میں چار مرتبہ یہ اعلان کیا گیا: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''ہم نے قرآن کو تذکّر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے' تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا!''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ''تذکر'' کی حد تک قرآن حکیم کی ہدایت کے گوہرِ مقصود تک انسان کی رسائی بہت آسان ہے' بشرطیکہ طلبِ ہدایت کے حوالے سے انسان کی نیت میں خلوص ہو اور وہ قرآن حکیم سے براہِ راست ہم کلام ہونے کی استعداد رکھتا ہو۔ یعنی وہ عربی زبان کا اتنا فہم رکھتا ہو کہ آیات کا مفہوم سمجھتے ہوئے تسلسل کے ساتھ تلاوت کر سکے۔ واضح رہے کہ ترجمے کی مدد سے قرآن حکیم کے مطالب کو سمجھنے سے تذکّر کی دولت کما حقہ ہاتھ نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمے کی مدد سے آپ متعلقہ عبارت میں موجود معلومات تک تو رسائی حاصل کر سکتے ہیں' لیکن اس کلام کی اصل تاثیر کی کوئی رمق آپ کے دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ظاہر ہے آپ انگریزی ترجمے کے ذریعے کسی انگریز کو غالب یا میر کی شاعری کی اثر آفرینی سے متاثر نہیں کر سکتے اور نہ ہی آپ شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کا اردو ترجمہ پڑھ کر اس کی جادو بیانی کے معترف ہو سکتے ہیں۔ دراصل ''تذکّر'' قرآنِ حکیم سے اخذِ ہدایت کا وہ مرحلہ ہے جس میں قرآن حکیم انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت

سے متعلق پہلے سے موجود علم وادراک کو نسیان اور غفلت کے پردوں سے نکال کر اس کے شعور میں تازہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے حوالے سے قرآن کا اصل ہدف تذکر ہی ہے۔ اس کی مثال سطحِ سمندر پر پھیلے ہوئے اس تیل کی سی ہے جو کسی ٹینکر کے پھٹ جانے کی وجہ سے سمندر میں بہہ گیا ہو۔ مطلب یہ کہ بالکل اسی طرح قرآن حکیم کی اصل ہدایت (تذکر) اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے کسی کا عالم ومحقق ہونا یا عربی زبان وادب کا ماہر ہونا ضروری نہیں۔ بس جو انسان خلوصِ نیت اور طلبِ ہدایت کے جذبے سے قرآن حکیم کا مطالعہ کرے اور وہ صرف اس قدر عربی جانتا ہو کہ قرآن حکیم سے براہِ راست ہم کلام ہو سکتا ہو تو وہ تذکر کی حد تک آسانی سے رسائی حاصل کر لے گا۔

اس کے برعکس ''تدبر'' یہ ہے کہ تحقیق وتدقیق کی غرض سے گہرائی میں اُتر کر غوطہ زنی کی جائے۔ اور اس اعتبار سے قرآن حکیم بلاشبہ دنیا کی مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا مظہر ہے۔ اس لحاظ سے یہ علم وحکمت کا ایک لامتناہی خزانہ اور معرفتِ الٰہی کا لامحدود سمندر ہے۔ اس لیے اس پر عبور حاصل کرنا یا اس کی گہرائی میں اتر کر اس کی تہہ تک پہنچنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں تدبر کے لیے ایک ایک لفظ کی لغت اور تاریخ، علمِ حدیث، علمِ بیان، منطق وغیرہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

تدبرِ قرآن کے حوالے سے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جیسے سورۃ الرحمٰن کی آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ کی ایک شان ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر زمانے کے افق پر ایک خورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا متن اور اس کے الفاظ تو ظاہر ہے کسی قسم کے تغیر وتبدل سے مبرا ہیں، لیکن مطالب ومعانی کے لحاظ سے آج کا قرآن سو سال پہلے کے قرآن سے یقیناً بہت مختلف ہے۔ لہٰذا آج میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے بارے میں جو جو معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں، اور وہ نظریات جنہیں آج دنیا میں مسلمہ اصولوں کے طور پر مانا جا رہا ہے، تدبرِ قرآن کے ایک طالب علم کے لیے ان سب سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیے آج اگر کوئی داعیٔ قرآن عصرِ حاضر کے ان علوم سے بے بہرہ ہے تو وہ گویا آج سے سو سال پرانا قرآن لوگوں کو پڑھا رہا ہے۔

موجودہ دور میں دراصل علومِ انسانی کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اب کسی اکیلے انسان کا تدبرِ قرآن کی راہ پر چلنا ممکن ہی نہیں رہا۔ اب تو اس کے لیے مختلف شعبہ ہائے علوم کے ماہرین کی ایک جماعت درکار ہے، بلکہ اس حوالے سے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو عالمی سطح پر ایسی یونیورسٹیز قائم کرنے کی ضرورت ہے جن کا مرکزی شعبہ ''تدبرِ قرآن'' ہو۔ اس شعبہ میں بنیادی طور پر عربی زبان اور قرآن پڑھایا جائے، لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی (منطق، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، نفسیات، الٰہیات وغیرہ)، علومِ عمرانی (معاشیات، سیاسیات، قانون وغیرہ)، اور علومِ طبیعی (ریاضی، کیمیا، طبیعیات، ارضیات، فلکیات وغیرہ)

کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو۔ ایسی یونیورسٹیز کا ہر طالب علم ''تدبّرِ قرآن'' کو بطورِ ایک لازمی مضمون کے پڑھے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ باقی علوم میں سے اپنے ذوق اور اپنی اہلیت کے مطابق ایک یا ایک سے زائد علوم کی تحصیل بھی کرے۔ قرآن حکیم پر اس انداز کا تدبر اور اس سطح کی تحقیق آج وقت کا اہم تقاضا ہے۔ جب تک یہ تقاضا پورا نہیں ہوگا آج کا انسان زندگی کے مختلف شعبوں کے پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم کے علم اور اس کی ہدایت سے کماحقہ فیض یاب نہیں ہوسکتا۔ اس نکتے کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم علم و ہدایت کا بحرِ بیکراں ہے، لیکن جہاں تک اس سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے اس کا انحصار طالبِ ہدایت کے اپنے ظرف پر ہے اور ظاہر ہے انسانی ذہن کے ''ظرف'' کا تعلق ''علم'' کے ساتھ ہے۔ کسی کے ذہن کا علمی افق جس قدر کشادہ ہوگا، اسی نسبت سے اس کا ظرف بھی بڑا ہوگا۔ پھر جس طرح ہر شخص کا انفرادی ظرف ہوتا ہے، اسی طرح کسی ایک زمانے کے لوگوں کے اجتماعی ظرف کا معاملہ ہے۔ ماضی کے مقابلے میں آج چونکہ انسانی علوم کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوچکا ہے اس لیے آج کے انسان کو قرآن حکیم سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے اپنا ذہنی ظرف اسی نسبت سے کشادہ کرنا ہوگا۔ اگر آج کوئی شخص ہزار سال پرانے ذہنی ظرف کے ساتھ قرآن حکیم سے ہدایت کا طلب گار ہوگا تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اس پر منکشف نہیں ہوں گے۔

۶۔ **عملی ہدایات اور مظاہرِ طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل اپنانے کی ضرورت:** قرآن حکیم پر تدبر کرتے ہوئے سائنسی حوالہ جات کی حامل آیات کی توضیح و توجیہہ کے لیے ہمیں اپنے دور کے سائنسی علوم کی جدید ترین معلومات و ایجادات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ البتہ ایسی آیات پر غور و فکر کرتے ہوئے سائنسی نظریات (theories) اور سائنسی حقائق (facts) کے فرق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ کسی ایسے نظریے (thoery) یا مفروضے (hypothesis) پر کسی قرآنی آیت کو منطبق کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جس کی ابھی تک تجرباتی توثیق نہ ہوئی ہو۔ بہرحال قرآن حکیم میں مذکور سائنسی حوالہ جات پر تحقیق کرتے ہوئے ہمیں آگے سے آگے دیکھنے کی ضرورت ہے، لیکن دین سے متعلق عملی ہدایات (ان ہدایات کے مجموعے کو عرفِ عام میں ''شریعت'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً اوامر و نواہی، حلال و حرام، حدود و تعزیرات وغیرہ) کی تشریح اور تعبیر کی تلاش میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا چاہیے۔ یعنی اس معاملے میں ہمیں متاخرین کی آراء جاننے کے بعد متقدمین کے قول و عمل کو دیکھنا ہوگا۔ پھر تبع تابعینؒ، تابعینؒ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقوشِ اقدام کی پیروی میں خود کو حضور نبی کریم ﷺ کے قدموں میں ڈال دینا ہوگا۔ اس لیے کہ دین اصل میں آپ ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔ بقول اقبال:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست! اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

۷۔ **فہمِ قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت:** فہمِ قرآن کے حوالے سے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ قرآن حکیم دراصل ''کتابِ انقلاب'' (Manual of Revolution) ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی راہنمائی میں دعوت کا آغاز کیا، حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) تشکیل دی، انقلابی جِدّوجُہد کے مختلف مراحل طے کیے

اور اس جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ قرآن حکیم کے بتدریج نازل ہونے میں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی کارفرما تھی کہ حضور اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے اس کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ہدایات نازل ہوتی گئیں۔ چنانچہ آج اگر ہم قرآن حکیم کے فہم حقیقی کے خواہش مند ہیں تو ہمیں خود کو ان مراحل جیسی صورتِ حال کے عملی تجربے سے گزرنا ہوگا' جن مراحل سے حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ انقلابی جدوجہد کے دوران گزر رہے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص صرف مطالعہ کے ذریعے قرآن مجید کو سمجھنا چاہے' یعنی نہ تو اس کے دل میں انقلاب کا جذبہ ہو اور نہ ہی وہ ایک داعی کی حیثیت سے انقلابی جدوجہد میں شریک ہو تو ایسے شخص پر قرآن حکیم کے مطالب و مفاہیم سے متعلق بہت سے حقائق منکشف نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے فہم قرآن کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد سے متعلق ایک مکمل خاکہ علمی اعتبار سے قرآن حکیم کے طالب علم کے سامنے ضرور رہے۔ اگر قرآن حکیم کے مطالعہ کے دوران سیرت النبی ﷺ کے اس پہلو کا ایک واضح اور جامع خاکہ علمی اعتبار سے بھی اس کے ذہن میں مستحضر نہیں ہوگا تو قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا حصہ اس کی پہنچ سے دور رہے گا۔

۸۔ قرآن حکیم کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت: قرآن حکیم کی تفہیم کے حوالے سے یہ بحث بھی بہت اہم ہے کہ اس کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ اس ضمن میں سب سے بڑا خارجی ثبوت تو خود رسول کریم ﷺ کی یہ شہادت ہے کہ یہ کلام مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا۔ اور آپ ﷺ کی یہ شہادت دو حیثیتوں سے ہے: ایک آپ ﷺ کی زبان مبارک کی شہادت اور دوسری آپ ﷺ کے مشن کی شہادت۔ جہاں تک اس بارے میں آپ ﷺ کی زبانی شہادت کا تعلق ہے یہ اس وقت بہت زیادہ نمایاں تھی جب قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور آپ ﷺ اس معاشرے میں ان لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر بنفسِ نفیس یہ شہادت دیتے تھے جن کے سامنے آپ ﷺ کی سیرت (یعنی آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت' آپ ﷺ کے اخلاق اور ایفائے عہد) کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ ان لوگوں کے سامنے حضور نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ انور موجود تھا' جسے دیکھ کر ایک سلیم الفطرت انسان یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا تھا: سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا بِوَجْہِ کَذَّابٍ (سبحان اللہ! یہ چہرہ کسی جھوٹے شخص کا نہیں ہوسکتا)۔ جہاں تک اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کے مشن کی شہادت کا تعلق ہے یہ تاریخ انسانی کا وہ عظیم انقلاب ہے جو آپ ﷺ نے قرآن حکیم کی راہنمائی میں برپا کیا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ کارنامہ قرآن حکیم کے منزل من اللہ ہونے کی دائمی اور ابدی شہادت ہے۔ اس انقلاب کے حوالے سے آپ ﷺ کی عظمت اور پوری نوعِ انسانی میں آپ ﷺ کی امتیازی حیثیت کو ایچ جی ویلز' ایم این رائے اور ڈاکٹر مائیکل ہارٹ جیسے غیر مسلم اسکالرز بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اس ضمن میں حضور ﷺ کی عظمت کا اعتراف اپنی کتاب ''The Hundred'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels".

حضور نبی اکرم ﷺ کے اس انقلاب کا منبع و سرچشمہ چونکہ قرآن حکیم تھا اس لیے یہ انقلاب گویا قرآن حکیم کی حقانیت اور اس کے منزل من اللہ ہونے کی ایک اَن مٹ تاریخی شہادت ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور قرآن حکیم کی راہنمائی کے بل پر وقوع پذیر ہونے والا تاریخ انسانی کا عظیم ترین کارنامہ یعنی انقلابِ محمدیؐ — یہ ہیں قرآن حکیم کی حقانیت اور اس کے منزل من اللہ ہونے کے خارجی ثبوت کے طور پر دو عظیم شہادتیں۔

دوسری طرف قرآن حکیم کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ اسے پڑھ کر انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کسی انسان کا نہیں بلکہ اُس اللہ کا کلام ہے جو انسان سمیت اس کائنات کی ایک ایک چیز کا خالق اور مالک ہے۔ قرآن حکیم کو انسان کی روح کے ساتھ چونکہ ایک خاص تعلق ہے اس لیے اس کلام کو سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود اور میری ہستی کا منبع و سرچشمہ ہے۔ قرآن حکیم اور انسانی روح کے مابین پائی جانے والی یہ ہم آہنگی جب باطنی تجربے کی شکل میں ڈھلتی ہے تو انسان کا دل پکار اٹھتا ہے کہ قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے۔

اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآن کا باہمی تعلق: قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ کی ذات دراصل باہم ایک دوسرے کی حقانیت پر گواہ ہیں۔ قرآن حکیم کے منزل من اللہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی شہادت نبی اکرم ﷺ کی ذات (آپ ﷺ کی شخصیت' آپ ﷺ کا چہرۂ انور اور آپ ﷺ کا کردار) ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ کے نبی اور رسول ہونے پر سب سے بڑا گواہ اور سب سے بڑا ثبوت قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے اس باہمی تعلق کا ذکر سورۃ البیّنہ میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ③﴾ ''نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ ہونے والے (یا باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البیّنہ نہ آ جاتی' یک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتے ہیں پاکیزہ اوراق کی' ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔'' واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور اللہ تعالیٰ کا کلام جو آپ ﷺ پر نازل ہوا' دونوں مل کر بیّنہ (روشن دلیل) بنتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الطلاق کی آیت ۱۰ میں اہل ایمان کو یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری طرف ''ذکر'' نازل فرمایا گیا ہے اور پھر ''ذکر'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ یعنی ذکر سے مراد اللہ کا رسول ہے جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی ہیں۔ گویا سورۃ الطلاق کی اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور اللہ کی آیات (قرآن حکیم) کو ''ذکر'' قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البیّنہ اور سورۃ الطلاق کی ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذات ایک حیاتیاتی وجود (organic whole) کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے گواہ بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ —— قرآن حکیم: واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول کو ایک خاص معجزہ عطا کیا جاتا رہا ہے اور وہ خاص معجزہ متعلقہ رسول کی طرف سے اپنی قوم کے سامنے اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر چیلنج کے انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آپؑ کی رسالت کی سند کے طور پر ''عصا'' اور ''یدِ بیضا'' دو معجزات عطا کیے گئے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ۹ بڑے بڑے معجزے دیے گئے تھے —— مگر آپؑ نے فرعون اور آلِ فرعون کے سامنے اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر صرف یہی دو معجزات پیش کیے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آپؐ سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا (مولانا شبلیؒ کی مرتب کردہ ''سیرت النبی ﷺ'' کی ایک ضخیم جلد صرف آپ ﷺ کے معجزات کے ذکر پر مشتمل ہے) لیکن ان میں سے کوئی معجزہ بھی آپ ﷺ نے اپنے مخالفین کے سامنے بطور چیلنج پیش نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے مخالفین کے سامنے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے جس معجزے کا ذکر بطور چیلنج کیا اور بار بار کیا وہ قرآن حکیم ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل اور سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے۔

قرآن حکیم کا دعویٰ اور چیلنج: قرآن حکیم نے اپنے مخاطبین اوّل یعنی عرب کے اہلِ زبان شُعراء، اُدباء اور خُطباء کو اور تا قیامِ قیامت نسلِ انسانی کے تمام افراد کو واشگاف الفاظ میں چیلنج کیا کہ اگر کوئی قرآن کو انسانی کلام سمجھتا ہے تو وہ اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر اس جیسا کلام بنا کر دکھائے۔ یہ چیلنج مختلف انداز میں قرآن حکیم کے درج ذیل پانچ مقامات پر دہرایا گیا ہے:

۱۔ ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (الطّور)
''کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (محمد ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ ماننے والے نہیں ہیں' تو وہ لے آئیں اس جیسی کوئی ایک بات اگر وہ سچے ہیں!''

۲۔ ﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾﴾ (بنی اسراءیل) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس بات پر کہ وہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو وہ نہیں لا سکیں گے اس کی مانند' اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔''

ان دو مقامات پر تو پورے قرآن کی نظیر پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا ہے' لیکن اس کے بعد ایسی دس سورتیں بنانے اور پھر اس جیسی صرف ایک سورت ہی بنا کر دکھانے کا چیلنج بھی دیا گیا:

۳۔ ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ (ھود) ''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اُس نے خود گھڑ لیا ہے؟ (اے نبیﷺ! ان سے) کہیے کہ اچھا تم لوگ بھی لے آؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی' اور (اس کے لیے) بلا لو تم جس کو بھی بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔''

۴۔ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾﴾ (یونس) ''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبر نے خود گھڑ لیا ہے؟ (اے نبیﷺ! ان سے) کہیے کہ لے آؤ تم بھی ایک سورت اس جیسی اور (اس کے لیے) بلا لو جس کو بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔''

۵۔ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (البقرۃ) ''اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں)' تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی' اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

نزولِ قرآن کے وقت یہ چیلنج ان لوگوں کو دیا گیا تھا جنہیں اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا۔ ان میں بڑے بڑے شعراء اور ادباء بھی موجود تھے' لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شاعر' کوئی ایک ادیب اور کوئی ایک خطیب بھی اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے کھڑا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قرآن حکیم کے اسلوبِ بیان کی معجزاتی کیفیت کو خوب پہچانتے تھے اور ان کے دل گواہی بھی دیتے تھے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ محض اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر اسے جھٹلا رہے تھے۔ اس چیلنج میں دراصل ان کے دلوں کے اسی چور کو مخاطب کیا گیا ہے کہ تمہارے دل تو گواہی دیتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اب اگر تم اپنی زبانوں سے اس بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو تو تمہارے ان شکوک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کے دعوے کا ذکر قرآن حکیم میں دو طرح سے آیا ہے۔ ایک تو مثبت انداز میں قرآن حکیم کو نبی اکرمﷺ کی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں' جبکہ دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر دکھاؤ۔

<u>قرآن حکیم کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟</u> ''وجوہِ اعجاز القرآن'' بہت وسیع اور متنوع الاطراف موضوع ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ یہاں اس موضوع سے متعلق تمام تفصیلات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں' البتہ درج ذیل سطور میں خلاصے کے طور پر اس ضمن میں صرف چیدہ چیدہ نکات پیش کیے جا رہے ہیں:

۱۔ قرآن حکیم کا سب سے بڑا اور بنیادی معجزہ اس کے اسلوب کی وہ تاثیر ہے جو پڑھنے یا سننے والے کے دل پر براہِ راست اثر کرتی ہے' بشرطیکہ متعلقہ شخص کا دل تعصب سے پاک ہو اور وہ اسے براہِ راست سمجھنے کی اہلیت

بھی رکھتا ہو۔ دراصل قرآن حکیم کا صوتی آہنگ انسانی روح کے تاروں میں جنبش پیدا کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی اس معجزانہ تاثیر کا اعتراف ہر دور اور ہر زبان و نسل کے صاحب ذوق افراد نے کیا ہے۔ یہ تاثیر آج بھی اسی شان سے جلوہ افروز ہے جیسے نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ زمانہ کی وجہ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

۲۔ نزولِ وحی کے زمانے میں قرآن حکیم کے جس اعجاز نے اہلِ زبان کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا ادبی جمال و جلال تھا۔ واضح رہے کہ ہر رسول کو اس کی رسالت کی سند کے طور پر جو خصوصی معجزہ دیا گیا اس کا تعلق اس انسانی علم و فن سے ہوتا تھا جس کی سمجھ بوجھ اور مہارت کا متعلقہ معاشرے میں اس وقت خوب چرچا ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں چونکہ جادو کا چرچا تھا اس لیے آپؑ کو ایسے معجزات دیے گئے جن سے آپؑ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ ایسا ہی معاملہ حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزۂ خاص قرآن حکیم کا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے جن لوگوں میں اپنی دعوت کا آغاز کیا انہیں اپنی زبان دانی پر فخر تھا۔ وہ لوگ اپنے مقابلے میں باقی تمام دنیا کو گونگا سمجھتے تھے۔ ان کی سخن شناسی اور شعر و شاعری کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ بہترین شاعر کے انتخاب کے لیے ہر سال بڑے اہتمام سے مشاعروں کی صورت میں عرب بھر کے نامور شعراء کے مابین مقابلوں کا انعقاد کرتے تھے۔ ان مقابلوں میں جس شاعر کا قصیدہ بہترین قرار پاتا اسے اس سال کا ملک الشعراء (Poet of the Year) تسلیم کر لیا جاتا۔ تمام شعراء اس شاعر کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اسے سجدہ کرتے اور اس کا قصیدہ خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا۔ ایسے سات منتخب قصائد عربی شاعری کی تاریخ میں **سَبْعَة مُعَلَّقَه** کے نام سے مشہور تھے۔ اس سلسلے کے آخری منتخب شاعر اور **سَبْعَة مُعَلَّقَه** میں سے ساتویں قصیدے کے خالق مشہور صحابیٔ رسول ﷺ حضرت لبید رضی اللہ عنہ تھے۔

اس ماحول میں جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو اس کے اسلوب کی فصاحت و بلاغت کے سامنے بڑی بڑی قادر الکلام زبانیں گنگ ہو گئیں' اور مسلّمہ عظمت و اعزاز کے حامل شعراء مبہوت ہو کر رہ گئے۔ جبکہ آخری ''ملک الشعراء'' نے تو قرآن سننے کے بعد شاعری ہی ترک کر دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت لبید رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ''اَ بَعْدَ الْقُرْآن ؟'' کہ کیا قرآن کے نازل ہونے کے بعد اب بھی کسی کے لیے کوئی گنجائش رہ گئی ہے کہ وہ اپنی فصاحت و بلاغت کا رنگ جمانے کی کوشش کرے؟ قرآن حکیم کا یہ معجزہ آج بھی مسلّمہ ہے' لیکن اس کا احساس صرف عربی اہل زبان حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

۳۔ عہد حاضر میں قرآن حکیم کے اعجاز کا جو پہلو بہت نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آیا ہے اس کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والے اکتشافات و انکشافات سے ہے۔ یہ دراصل قرآن حکیم کا وہ معجزہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمایاں تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی اس آیت میں پیشین گوئی کی گئی ہے: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (آیت ۵۳) ''عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی' یہاں تک کہ ان

پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے''۔ اس حوالے سے فرانسیسی سرجن ڈاکٹر موریس بکائی اور کینیڈین ایمبر یالوجسٹ ڈاکٹر کیتھ ایل مور کی تحقیقات بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب The Bible, The Quran and Science میں اعتراف کیا ہے کہ سائنسی معلومات سے متعلق قرآن کی کوئی ایک بات (statement) بھی ایسی نہیں جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو (اگرچہ سائنسی حوالوں کی حامل بعض آیات کی تشریح مختلف ادوار کے مفسرین نے مختلف انداز میں کی ہے' لیکن اس ضمن میں اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کی ہے) اور یہ کہ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام کے بارے میں قرآن کے بیان کردہ حقائق اور اب تک کے سائنسی انکشافات کے مابین کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف ڈاکٹر کیتھ ایل مور نے اپنی تحقیق کے بعد تسلیم کیا ہے کہ اس دور کے سائنس دان جدید ترین آلات کی مدد سے علمِ جنین (Embryology) کے شعبے میں اب تک جو معلومات حاصل کر پائے ہیں وہ بعینہٖ وہی حقائق ہیں جن کا انکشاف صدیوں پہلے قرآن حکیم کر چکا ہے —— چنانچہ ہمارا ایمان ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آنے والے حقائق بتدریج قرآن حکیم کی حقانیت کے گواہ بنتے چلے جائیں گے' جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی مذکورہ آیت (آیت ۵۳) میں فرمایا گیا ہے' فزیکل سائنسز کے مختلف شعبوں میں انسانی علم جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا قرآن حکیم کی حقانیت مزید مبرہن اور واضح تر ہوتی چلی جائے گی اور بالآخر ایک وقت وہ بھی آئے گا جب دنیا کے تمام اہل علم و دانش یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے اور یہ کہ محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے رسول ہیں۔

۴۔ عہدِ حاضر میں قرآن حکیم کے اعجاز کا ایک اور اہم پہلو جو نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آ رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی یقیناً مزید نمایاں ہوتا چلا جائے گا وہ اس کی ہدایت عملی ہے۔ قرآن حکیم نے انسان کو اس کے اخلاق و کردار اور رویہ کے بارے میں انفرادی و اجتماعی سطح پر مکمل اور جامع راہنمائی فراہم کی ہے۔ جہاں تک انفرادی سطح پر انسانی اخلاق و اقدار کا معاملہ ہے اس بارے میں راہنمائی تو خود انسان کی فطرت میں بھی ودیعت کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشمس کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ یعنی نفس انسانی کو الہامی طور پر معلوم ہے کہ ''فجور'' کیا ہے اور ''تقویٰ'' کیا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہدایات سابق انبیاء کرام ﷺ کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں' لیکن اس ضمن میں قرآن حکیم کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو عدل و قسط پر مبنی ایک انتہائی جامع اور متوازن اجتماعی نظام عطا کیا ہے۔ انسان دراصل اپنی اجتماعی زندگی کے حوالے سے تین عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) کی وجہ سے ہر دور میں پریشان رہا ہے۔ یعنی انسانی اجتماعیت کے اندر مرد و عورت' سرمایہ و محنت اور فرد و اجتماعیت کے درمیان باہمی حقوق و فرائض کا معاملہ ہمیشہ عدم توازن اور عدمِ اعتدال کا شکار رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی قوانین کے تحت چلنے والا کوئی معاشرہ بھی فساد اور بگاڑ سے پاک نہ رہ سکا۔ زمانہ گواہ ہے کہ ان تینوں معاملات کے فریقوں

میں سے طاقتور فریق نے کمزور فریق کا ہر دور میں بدترین استحصال کیا ہے۔ گویا انسان نے اپنے ان مسائل کے حل کی کوششوں میں مسلسل ٹھوکریں کھائی ہیں اور آج تک کھا رہا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے انسانی اجتماعیت کے تمام شعبوں مثلاً اقتصادیات‘ سماجیات‘ سیاسیات وغیرہ سے متعلق عدلِ اجتماعی کا ایک مکمل اور جامع نظام دیا ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں اگر کہیں عدل اجتماعی کی کوئی جھلک نظر آتی ہے تو وہ قرآنی قوانین وضوابط کی کسی نہ کسی انداز میں کی گئی خوشہ چینی ہی کے سبب ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کا اظہار اس خوبصورت انداز میں کیا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آں کہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

یعنی دنیا میں جو بھی سوشل انقلاب برپا ہوا ہے‘ اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط وتفریط کے دھکے کھا کر گرتا پڑتا‘ چار و ناچار نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے اس نظام ہی کی طرف جا رہا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے قرآن حکیم کا عطا کردہ ہے۔ چنانچہ آج بحیثیت مسلمان ہماری اجتماعی ذمہ داری ہے کہ ہم اعجازِ قرآن کے اس پہلو کی تفصیلات و جزئیات کو نظریاتی سطح پر بھی عام کریں اور قرآن حکیم کے عادلانہ نظام کے تحت ایک معاشرہ قائم کر کے جدید دنیا کو قرآن حکیم کے اس معجزے کا عملی نمونہ بھی دکھائیں۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال: قرآن حکیم کے اعجاز کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی قلوب واذہان کو مسخر کرنے کی بے پناہ تاثیر ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم کی تاثیر اور قوتِ تسخیر کی سب سے بڑی اور واضح مثال صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شخصیات ہیں۔ قرآن حکیم کے اولین مخاطبین عرب کے دیہاتی‘ بدو اور اَن پڑھ لوگ تھے۔ اس کلام نے ان لوگوں کی شخصیات میں نہ صرف ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا بلکہ انہیں خارجی دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی شخصیات بنا دیا۔ اسی طرح قرآن حکیم نے اپنی معجزانہ تاثیر سے ہر دور میں بہت سے اہل علم ودانش کے قلوب واذہان کو مسخر کیا۔ ایسی بے شمار نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک شخصیت علامہ اقبال کی بھی ہے۔ میرے نزدیک علامہ اقبال کی شخصیت عہدِ حاضر میں اعجاز قرآن کا بہت بڑا مظہر ہے۔ علامہ اقبال بنیادی طور پر فلسفے کے طالب علم تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا‘ پھر انگلستان جا کر قانون پڑھا۔ جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی‘ لیکن وہ متاثر ہوئے تو صرف قرآن حکیم سے‘ اور یہ کہ پھر قرآن حکیم نے انہیں اس انداز میں مسخر (possess) کر لیا کہ وہ ساری عمر قرآن ہی کی زبان بولتے رہے۔ میں نے اپنی علمی استعداد کے مطابق امکانی حد تک پوری باریک بینی سے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس پر غور وفکر بھی کیا ہے۔ دوسری طرف میں نے علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کو بھی بغور پڑھا ہے۔ اپنے اس مطالعے کی بنیاد پر میری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ موجودہ

دور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن سے متعلق حقائق جس شدت کے ساتھ علامہ اقبال پر منکشف ہوئے ہیں اور یہ کہ قرآن حکیم کے علوم و معارف کی تعبیر جس انداز میں علامہ اقبال نے کی ہے‘ اس دور کی کوئی اور شخصیت اس حوالے سے ان کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکی۔ چنانچہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن‘ سب سے بڑا داعی الی القرآن اور اعجاز القرآن کا سب سے بڑا مظہر اقبال ہے۔ میں اپنی اس رائے کی تائید میں یہاں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی شہادت بھی نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا صاحب نے ایک موقع پر علامہ اقبال کی قرآن فہمی کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ قرآن حکیم کی بعض آیات کے بارے میں مجھے کچھ زعم سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی دوسرا اس طرح سے نہ کر سکے۔ لیکن جب مجھے ایک عرصے کے بعد علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کو دوبارہ بغور پڑھنے کا موقع ملا تو یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ علامہ ان آیات کی تعبیر بہت پہلے مجھ سے بہت بہتر انداز میں کر چکے ہیں —— مولانا صاحب کی اس گواہی کے بعد علامہ اقبال کے بارے میں اپنے مذکورہ موقف کی صداقت پر میرا یقین اور بھی پختہ ہو چکا ہے۔ بہرحال میرے نزدیک علامہ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو قرآن حکیم کے اعجاز کی ایک روشن مثال ہے کہ قرآن حکیم نے مغرب سے فلسفے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کرنے والے ایک نوجوان کے قلب و ذہن کو مسخر کیا اور پھر اپنے علم و حکمت کے عرفان سے فیض یاب کر کے اسے یگانہ روزگار بنا دیا۔

قرآن حکیم سے ہمارا تعلق

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪﴾ ’’اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو مل جل کر اور تفرقے میں نہ پڑو‘‘۔ اس آیت میں جس ’’حبل اللہ‘‘ کا ذکر ہوا ہے وہ دراصل قرآن حکیم ہی ہے۔ اس کی صراحت ہمیں درج ذیل احادیث سے ملتی ہے:

(i) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا وَاِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمۡ ثَقَلَیۡنِ: اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبۡلُ اللّٰہِ ......)) ’’آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں‘ ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے‘ وہی ’’حبل اللہ‘‘ ہے......‘‘ (صحیح مسلم)

(ii) سنن ترمذی اور سنن دارمی میں منقول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((ھُوَ حَبۡلُ اللّٰہِ الۡمَتِیۡنُ)) ’’یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے۔‘‘

(iii) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی قرآن حکیم کے بارے میں یہی الفاظ آئے ہیں: ((ھُوَ حَبۡلُ اللّٰہِ الۡمَتِیۡنُ))۔

(iv) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ حَبۡلُ اللّٰہِ وَالنُّوۡرُ الۡمُبِیۡنُ)) ’’یقیناً یہ قرآن حبل اللہ اور نور مبین ہے‘‘۔ (سنن دارمی)

سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت کے حوالے سے ’’حبل اللہ‘‘ کی تعیین کے بارے میں مفسرین کے ہاں

بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ بعض مفسرین ''حبلُ اللہ'' سے قرآن حکیم مراد لیتے ہیں' بعض کے نزدیک کلمہ طیبہ حبل اللہ ہے' جبکہ کچھ اہلِ علم اسلام کو بھی حبل اللہ قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام آراء اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن مذکور بالا احادیث کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن حکیم ہی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے بھی اپنے شعر میں قرآن کو ''حبلُ اللہ'' قرار دیا ہے: ؎

ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اُوست اعتصامش کُن کہ حبلُ اللہ اوست!

قرآن حکیم دراصل دو حیثیتوں سے اللہ کی رسی (حبل اللہ) ہے۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ یہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے (تقرب الی اللہ) کا ذریعہ ہے' جبکہ اس کی دوسری حیثیت اہلِ ایمان کو باہم متحد کرنے والی رسی (binding force) کی ہے۔ بندے کے لیے تقرّب اِلی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہونے کے حوالے سے قرآن حکیم کا ذکر درج ذیل دو احادیث میں ملتا ہے:

(i) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یعنی جو کوئی اس رسّی کو مضبوطی سے تھام لے گا اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑ جائے گا۔

(ii) معجم کبیر طبرانی کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((...... فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ)) ''......پس تم خوشیاں مناؤ اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سِرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور اس کا دوسرا سِرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ یعنی قرآن حکیم کے دامن کو تھام کر انسان براہِ راست اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

اس نکتے کو اس زاویے سے بھی سمجھنا چاہیے کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب یا تعلق قائم کرنے کی پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے اور ایمان کا منبع وسرچشمہ قرآن حکیم ہے ایمانیات کے تمام شعبے قرآنِ حکیم کے ساتھ اس طرح سے مربوط ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی تمام رسیاں ایک جگہ پر بندھی ہوتی ہیں۔ گویا تقرب الی اللہ کے تمام راستے قرآنِ حکیم سے ہو کر گزرتے ہیں۔

قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کو آپس میں جوڑنے والی رسی اور انہیں بنیانِ مرصوص بنانے کا ذریعہ ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۳ میں جہاں ''حبل اللہ'' کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ اہل ایمان کو تفرقہ بازی سے بھی منع کیا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو''۔ دراصل قرآنِ حکیم اہلِ ایمان کو فکر ونظر کی وہ ہم آہنگی عطا کرتا ہے جو کسی بھی انسانی اتحاد کے استحکام کے لیے لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ ظاہر ہے انسان ایک صاحب عقل وشعور مخلوق ہے۔ ہر انسان اپنا اندازِ فکر' اپنا نظریہ اور اپنا نصب العین رکھتا ہے۔ چنانچہ جب تک کسی معاشرے کے تمام افراد کے مابین فکری ونظری اعتبار سے مکمل یک جہتی وہم آہنگی

نہیں پائی جائے گی تب تک کسی بھی سطح پر کوئی انسانی جمعیت وجود میں نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی ہم آہنگی کو نظر انداز کر کے عارضی مفادات اور وقتی مصلحتوں کی بنیاد پر جو اتحاد بنائے جاتے ہیں وہ کبھی بھی پائیدار اور دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ چنانچہ مؤمنین صادقین سب مل کر جب ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ کے حکم کی تعمیل میں قرآن حکیم سے اپنا تعلق استوار کریں گے تو وہ سب کے سب دو مضبوط رشتوں میں بندھ جائیں گے۔ یعنی ایک رشتہ ان سب کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جائے گا اور دوسرا رشتہ سب مؤمنین کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ استوار ہوگا۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

ہر مسلمان پر حسبِ استعداد قرآن مجید کے درج ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننا جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان و تعظیم)

۲۔ اسے پڑھنا جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت و ترتیل)

۳۔ اسے سمجھنا جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکر و تدبر)

۴۔ اس پر عمل کرنا جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم و اقامت) —— انفرادی زندگی میں اس حق کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان کی ہر رائے اور اس کا ہر فیصلہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو اور اجتماعی زندگی میں اس کی صورت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو معاشرے میں عملی طور پر قائم کیا جائے۔

۵۔ قرآن حکیم کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا' اس پیغام کو پھیلانا اور عام کرنا جیسا کہ اس کا حق ہے۔ (تبلیغ و تبیین)

ان پانچ عنوانات کی جامع تشریح کے ساتھ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے عنوان سے میرا ایک کتابچہ بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اور مسلسل شائع ہو رہا ہے' بلکہ اب تو انگریزی' عربی' فارسی' پشتو' سندھی' تامل اور ملائشین زبانوں میں اس کے تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے لیے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ قرآن حکیم کے حقوق سے روگردانی کرنا دراصل قرآن حکیم کو ترک کر دینے کے مترادف ہے' اور یہ کہ قرآن کو ترک کرنے والوں کے خلاف نبی اکرم ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الفرقان کی اس آیت کا لرزا دینے والا انداز:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾ ''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حاشیہ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) میں لکھتے ہیں: ''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے' تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر

چیزوں کی طرف متوجہ ہونا‘ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں‘‘۔ علامہ اقبال نے اپنے درج ذیل شعر میں دراصل اسی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

’’(اے مسلمان) تیری ذلت و رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے۔ لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!‘‘

قرآن حکیم کو ترک کرنے یا اسے جھٹلانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے۔ اس اعتبار سے ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں قرآن حکیم پر ایمان کی سعادت اور دولت نصیب کی ہے‘ لیکن اسے جھٹلانے کی دوسری صورت وہ ہے جسے عملی تکذیب کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی عملی تکذیب یہ ہے کہ اس کے مذکورہ حقوق کی ادائیگی کے لیے استعداد بھر کوشش نہ کی جائے۔ اس حوالے سے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم سے پہلے والی اُمتِ مُسلمہ یعنی قومِ یہود اپنی کتاب کی عملی تکذیب کے سبب اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو چکی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ان کے اس جرم کا ذکر سورۃ الجمعہ کی اس آیت میں کس قدر سخت انداز میں آیا ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ’’مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے‘ پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے‘ اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ۔ بہت بُری مثال ہے اس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا‘ اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں ہمیں اپنے طرزِ عمل کا مسلسل جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور ہر لحظہ ڈرتے رہنا چاہیے کہ ہم حاملِ قرآن ہو کر اگر قرآن حکیم کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے اور اس کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو نبھانے کی مخلصانہ کوشش نہیں کریں گے تو کہیں ہمارا شمار بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی آیات کو جھٹلانے والوں میں نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآنِ حکیم کے بارے میں سستی‘ ناقدری‘ بے اعتنائی اور عملی تعطّل جیسا طرزِ عمل اپنانے سے محفوظ رکھے اور ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق قرآن حکیم کے حقوق ادا کرنے کے لیے بھرپور انداز میں کوشاں رہنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴿۴﴾ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪﴿۷﴾ (آمین)

سورۃ الفاتحہ قرآن حکیم کی مختصر اور عظیم سورتوں میں سے ہے۔ اسے اُمّ القرآن اور اساس القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ گویا یہ سورت پورے قرآن کے لیے جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ روایات میں اس کا ایک نام الکافیہ (کفایت کرنے والی) اور ایک نام الشافیہ (شفاء دینے والی) بھی مذکور ہے —— فَتَحَ یَفۡتَحُ کے معنی ہیں: کسی چیز کو کھولنا۔ چونکہ قرآن حکیم کا آغاز اس سورت سے ہوتا ہے اس لیے اسے الفاتحہ (The Opening Surah of the Quran) کا نام دیا گیا۔ سات آیات پر مشتمل اس سورت کی ایک امتیازی شان یہ بھی ہے کہ یہ رسول اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی مکمل سورت ہے۔ اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے کہ جب تم لوگ میرے حضور حاضر ہوا کرو تو مجھ سے یوں مخاطب ہوا کرو۔ اسی بنا پر یہ سورت نماز کا جزوِ لازم قرار پائی ہے' بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی ایک حدیث قدسی میں تو سورۃ الفاتحہ ہی کو ''الصَّلَاۃ'' کہا گیا ہے' جبکہ سورۃ الحجر کی اس آیت میں سورۃ الفاتحہ کے لیے ''قرآن عظیم'' کے الفاظ آئے ہیں: ﴿وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾﴾ ''اور ہم نے آپ کو دی ہیں سات بار بار پڑھی جانے والی آیات اور عظمت والا قرآن''۔ اس آیت کی وضاحت صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ملتی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: ((اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہِیَ السَّبۡعُ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡآنُ الۡعَظِیۡمُ الَّذِیۡ اُوۡتِیۡتُہٗ)) ''سورۃ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہی 'سبع مثانی' اور 'قرآنِ عظیم' ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔''

سورۃ الفاتحہ کے تین حصے

مضمون کے اعتبار سے سورۃ الفاتحہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا حصہ: یہ حصہ ان تین آیات پر مشتمل ہے' جو مل کر ایک جملہ بنتی ہیں۔

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾

''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان ہے' جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔''

ان تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان ہوئی ہے۔ یہ دراصل ان حقائق کا اظہار ہے جن تک ایک انسان اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کی مدد سے بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے' چاہے وہ ابھی وحی کے فیض سے

مستفیض نہ بھی ہوا ہو۔

دوسرا حصہ: دوسرا حصہ اس ایک آیت پر مشتمل ہے: ﴿اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ○﴾ ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور ہم صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔''

یہ آیت ہر اعتبار سے اس سورت کی مرکزی آیت ہے۔ یہ ایک بندے کا اپنے پروردگار کے ساتھ عہد و پیمان ہے (اس مفہوم کے اعتبار سے میں اسے اللہ تعالیٰ اور بندے کا hand shake کہتا ہوں)۔ اس حیثیت سے یہ آیت انتہائی اہم ہے۔ ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے ایک بندہ اپنے پروردگار سے جو عہد کرتا ہے وہ یقیناً بہت بڑا عہد ہے' کہ اے اللہ! میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تیرا بندہ بن کر زندگی گزاروں گا' لیکن اس عہد کے حوالے سے میرا سارا دار و مدار اور توکّل تجھ ہی پر ہے۔ میں تیری مدد کا محتاج ہوں اور تیری مدد اور نصرت میرے شامل حال ہوگی تو تبھی میں اتنا بڑا یہ عہد پورا کرسکوں گا۔

تیسرا حصہ: سورت کا تیسرا حصہ ان تین آیات پر مشتمل ہے:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ ۵ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ○﴾ (آمین!)

''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

یہ تین آیات بھی مل کر ایک جملہ بنتی ہیں اور یہ جملہ گویا گزشتہ آیت کے آخری الفاظ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ہی کی تشریح ہے' کہ اے اللہ! تو ہماری مدد فرما اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ واضح رہے کہ مُنۡعَمٌ عَلَیۡهِمۡ (یعنی جن پر انعام ہوا) وہ چار گروہ ہیں جن کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾﴾ ''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاء کرامؑ' صدیقین' شہداء اور صالحین' اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے''۔ جبکہ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ سے قومِ یہود اور الضَّآلِّیۡنَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ گویا ان آیات میں دعا ہے کہ اے اللہ! ایسے تمام لوگوں کے راستے سے بچا کر ہمیں اس سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما جو صدیقین کا' انبیاء کا' شُہداء کا اور صالحین کا راستہ ہے۔

اس سورت مبارکہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔ ''آمین'' کے معنی ہیں ''ایسا ہی ہو''۔ اس سورت کا اسلوب چونکہ دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر ''آمین'' کہہ کر بندہ گویا ایک دفعہ پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں نے جو عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبولیت عطا فرما!

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرۃ)

یہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات ہیں۔ سورۃ البقرۃ مدنی ہے اور اس کا اکثر و بیشتر حصہ غزوۂ بدر سے قبل نازل ہوا۔ یہ قرآن حکیم کی طویل ترین سورت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْبَقَرَۃُ سَنَامُ الْقُرْآنِ وَذُرْوَتُہٗ)) (مسند احمد) یعنی سورۃ البقرۃ قرآن حکیم کی چوٹی (climax) ہے۔ اس سورت کے نصفِ اوّل میں بنیادی طور پر روئے سخن سابقہ اُمتِ مُسلمہ یعنی یہود کی طرف ہے، جبکہ نصفِ ثانی مجموعی طور پر اُمتِ محمد ﷺ سے خطاب پر مشتمل ہے۔ اس نسبت سے میں نے اسے ''سُورۃُ الاُمَّتَین'' (دو اُمتوں کی سورت) کا نام دیا ہے۔ زمانہ نزول کے مطابق یہ پہلی مدنی سورت ہے۔ اس اعتبار سے اس میں شریعتِ اسلامی کے بہت سے ابتدائی احکام بیان ہوئے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شریعت اسلامی کا ابتدائی خاکہ سورۃ البقرۃ میں دیا گیا ہے۔

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ۝۱﴾ ''ا۔ل۔م۔''

یہ حروفِ مقطعات ہیں جن کے حقیقی، حتمی اور یقینی مفہوم کو کوئی نہیں جانتا، سوائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے۔ گویا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین ایک راز ہے۔ حروفِ مقطعات کے معانی و مفاہیم کے بارے میں اگرچہ بہت سی آراء ظاہر کی گئی ہیں، لیکن اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ البتہ تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہے کہ ایسے حروف کا استعمال قدیم عرب شاعروں کے ہاں معروف تھا، اس لیے قرآن حکیم کے حروفِ مقطعات کے بارے میں کسی کو کوئی تجسس نہ ہوا۔ قرآن مجید کی ۱۱۴ میں سے ۲۹ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔

آیت ۲ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ ''یہ الکتاب ہے، اس میں کچھ شک نہیں''۔ یا ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔''

پہلے ترجمے کی رو سے اس جملے سے یہ مراد ہے کہ یہ ہے وہ کتابِ موعود جس کی قبل ازیں خبر دی گئی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ آئیں گے اور اُن کو ہم ایک کتاب دیں گے۔ یہ گویا اشارہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ان پیشین گوئیوں کی طرف جو تورات میں موجود تھیں۔ مثلاً ''کتاب مقدس'' کی کتابِ استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی اٹھارہویں آیت میں یہ الفاظ آج بھی موجود ہیں کہ: ''میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا

اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا''۔ چنانچہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے الفاظ میں گویا تورات کی ان پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہی وہ کتابِ موعود ہے جو اب نازل کر دی گئی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ: اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی اس کی ہر خبر یقینی اور حتمی ہے' اور یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو یہ دعویٰ لے کر آئی ہے۔ اس سے پہلے نازل ہونے والی کسی الہامی کتاب کے اندر ایسا کوئی دعویٰ موجود نہیں ہے اور ظاہر ہے انسانی سطح پر تو ایسے کسی دعوے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ بہر حال قرآن حکیم کا اپنے بارے میں لَا رَيْبَ فِيْهِ کا دعویٰ اپنی جگہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ واضح رہے کہ پہلے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' ایک مکمل جملہ ہے اور ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' دوسرا جملہ ہے۔ جبکہ دوسرے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' ایک مکمل جملہ ہے۔ یعنی ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ ''ہدایت ہے پرہیز گار لوگوں کے لیے۔''

یعنی یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو بچنا چاہیں۔ ''وَقٰى' يَقِى'' کا مفہوم ہے: ''کسی کو بچانا'' جبکہ ''تقویٰ'' کا معنی ہے خود بچنا۔ یعنی کج روی سے بچنا' غلط کاری سے بچنا اور افراط و تفریط کے دھکوں سے بچنا۔ گویا قرآن مجید کے اصل مخاطبین فطرت سلیمہ کے حامل وہ لوگ ہیں جن کی اخلاقی حس زندہ ہو اور وہ فطری طور پر نیکی کو اپنانا اور برائی سے بچنا چاہتے ہوں۔ تو ایسے ہر انسان کے لیے قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔ اور یہ ''کتابِ ہدایت'' دراصل انسانی فطرت کی اس پکار کے جواب میں عطا کی گئی ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے ان خوبصورت الفاظ میں ڈھال دیا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''(اے پروردگار!) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش''۔ گویا آیت زیر مطالعہ سورۃ الفاتحہ میں مذکور اس دعا کا جواب ہے کہ اگر تم ہدایت کے طلب گار ہو تو یہ لو! تمہاری ہدایت کے لیے یہ کتاب موجود ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ ان تمام انسانوں کے لیے ہدایت کے اعتبار سے کفایت کرتی ہے جن میں غلط روی سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متقین کی پہچان کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اگلی آیات میں آ رہا ہے۔ واضح رہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی تیرہ برس کی محنت کے نتیجہ میں مہاجرین و انصار کی ایک جماعت وجود میں آ چکی تھی' جس میں حضراتِ ابوبکر' عمر' عثمان' علی' طلحہ' زبیر' سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم جیسے نفوسِ قدسیہ شامل تھے۔ یہاں گویا مہاجرین و انصار کی اس جماعت کی طرف اشارہ کر کے دکھایا جا رہا ہے کہ دیکھو یہ ہیں اس کتاب ہدایت سے فیض یاب ہونے والے لوگ۔ واضح رہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر کے حوالے سے یہ ان آیات کی ''تاویل خاص'' ہوگی۔

آیت ۳ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ''جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر''

یہ متقین کے اوصاف میں سے پہلا وصف ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں جو کچھ ہمیں آنکھوں سے نظر آ رہا ہے' اور جو کچھ ہمارے حواسِ خمسہ کی زد میں ہے بس وہی کچھ اصل اور کُل حقیقت ہے' بلکہ انہیں یقین ہے کہ

اصل حقائق ان کے حواس کی سرحدوں سے بہت پرے ہیں۔ یہ ہدایت قرآنی کا گویا نقطۂ آغاز ہے۔ یعنی انسان یہ سمجھ لے کہ اصل حقائق اس کی نگاہوں سے مستور یعنی پردۂ غیب میں ہیں۔ انگلستان کے نامور فلسفی بریڈلے (Bradley) نے اپنی کتاب: ''Appearance and Reality'' میں لکھا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہمیں بظاہر نظر آتا ہے یہ کُل حقیقت نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت اس کے پیچھے ہے۔ کنفیوشس (۵۵۱تا۴۷۹ ق م) چین کا بہت بڑا حکیم اور فلسفی تھا' اس کی تعلیمات میں اخلاقی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اُس کا یہ جملہ اس حوالے سے بہت اہم ہے:

There is nothing more real than what can not be seen; and there is nothing more certain than what can not be heard .

یعنی وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اور کانوں سے سنے نہیں جاسکتے اُن سے زیادہ یقینی اور واقعی حقائق کوئی اور نہیں ہیں۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ ''اور وہ نماز قائم کرتے ہیں''

متقی لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا ذہنی وقلبی اور روحانی رشتہ استوار کرنے کے لیے نماز قائم کرتے ہیں۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

وہ لوگ نیکی و بھلائی کے کاموں میں' لوگوں کی تکالیف دور کرنے اور دین کی سربلندی کے لیے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ ''اور جو ایمان رکھتے ہیں اُس پر بھی جو (اے نبی ﷺ) آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ ''اور اُس پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا۔''

یعنی ایمان کی تکمیل کے لیے صرف قرآن ہی کو ماننا کافی نہیں بلکہ ان تمام الہامی کُتب وصحائف پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جو قرآن سے پہلے نازل ہوئیں۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں یہی بات بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔''

لہٰذا تورات' انجیل' زبور اور صُحفِ ابراہیمؑ پر اجمالی ایمان رکھنا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ البتہ چونکہ ہم سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کتابوں میں تحریف ہوگئی ہے اس لیے اِن کتابوں میں درج کسی حکم کو ہم قرآن پر حجت نہیں مانتے۔ اسی بنا پر ہم ان کتابوں میں درج ہر اس خبر یا حکم کو رد کر دیتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہو۔ لیکن جہاں قرآن مجید کی کسی بات کی نفی نہ ہو رہی ہو وہاں ان کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے

کہ تاریخ کے بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کے بارے میں معلومات ہمیں ان کتابوں ہی سے ملتی ہیں۔ مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان زمانی ترتیب (chronological order) ہمیں تورات سے ملتی ہے' ایسی معلومات قرآن حکیم میں نہیں ہیں۔ قرآن حکیم میں کبھی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بعد میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے آ جاتا ہے' لیکن تورات میں ہمیں حضراتِ ابراہیم' اسحاق' یعقوب' انبیاءِ بنی اسرائیل موسیٰ اور عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کے بارے میں زمانی ترتیب کے مطابق مفصل معلومات ملتی ہیں۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ ''اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ زیر مطالعہ آیت میں باقی سب عقائد کے لیے تو لفظ ''ایمان'' آیا ہے' جبکہ آخرت کے بارے میں یقین رکھنے کا ذکر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر عقیدہ ''ایمان بالآخرۃ'' ہے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ آخرت کی زندگی میں مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے تو زندگی میں اس کا طرزِ عمل درست رہے گا۔ لیکن اگر اس یقین میں کمی واقع ہو گئی تو توحید کی حیثیت بھی محض ایک عقیدہ (Dogma) کی رہ جائے گی اور ایمان بالرسالت میں بھی بدعات در آئیں گی۔ ایسی صورت حال میں ایمان بالرسالت کے مظاہر محض عید میلاد منانے اور نعتیہ اشعار سننے سنانے تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جب تک انسان کے دل میں آخرت سے متعلق پختہ یقین نہ ہوگا اس کا عمل درست نہیں ہو سکتا۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ کے الفاظ یہاں یہ مفہوم بھی دے رہے ہیں کہ ''آخرت پر صرف انہی لوگوں کا یقین ہے''۔ اس مفہوم کے اعتبار سے یہ گویا حصر کا انداز ہے۔ اس اسلوب سے دراصل اہلِ ایمان کے مقابلے میں قومِ یہود کے فکر و عمل کے تضاد کو نمایاں کرنا مقصود ہے۔ ظاہر ہے یہودی بھی ایمان بالآخرت کے دعوے دار تھے' لیکن ان کا طرزِ عمل ان کے اس عقیدے کا عکاس نہیں تھا۔ چنانچہ اس پس منظر میں تاویلِ خاص کے اعتبار سے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ آخرت پر یقین رکھنے والے تو دراصل یہ لوگ ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں''

یہ وہی لوگ ہیں جنہیں فطری ہدایت بھی عطا ہوئی تھی اور اس تکمیلی ہدایت یعنی قرآن حکیم پر بھی ان کا پورا یقین ہے' اور وہ محمد ﷺ کا اتباع بھی کر رہے ہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ''اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

فلاح پانے والے' کامیاب ہونے والے' اور منزلِ مراد کو پہنچنے والے اصل میں یہی لوگ ہیں۔ تاویلِ خاص کے مطابق اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں' جبکہ تاویل عام کے اعتبار سے یہاں ہر شخص مخاطب ہے کہ اگر

قرآن کی ہدایت سے مستفید ہونا چاہتے ہو تو یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرو۔

عبادتِ رب کی دعوت

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾

(البقرۃ)

''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

یہ قرآن کی دعوت کا خلاصہ ہے اور یہی تمام انبیاء و رُسل ﷺ کی دعوت تھی۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک رسول کا نام لے کر اس دعوت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی اور الٰہ اُس کے سوا نہیں ہے''۔ سورۃ الشّعراء میں رسولوں کی دعوت کے ضمن میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر یوں ہوا ہے: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۳﴾ ''کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!'' سورۃ الذّاریات کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی غایتِ تخلیق بھی یہی ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی صرف اس لیے کیا ہے کہ میری بندگی کریں۔''

تمام انبیاء و رسل ﷺ نے اپنے اپنے وقت میں لوگوں کو ''عبادتِ ربّ'' کی دعوت دی اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی دعوت بھی یہی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ باقی تمام رسولوں کا خطاب اپنی اپنی قوم سے تھا جبکہ یہاں تمام بنی نوعِ انسانی سے خطاب ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے تمام رسول ﷺ صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے، جبکہ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری اور کامل رسول ہیں جن کی دعوت آفاقی ہے۔

عام طور پر لوگ جو غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں وہ اُس پر اِس دلیل سے جمے رہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اَجداد کا راستہ یہی تھا۔ چنانچہ ﴿الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ کے الفاظ میں اس دلیل کا ردّ بھی موجود ہے کہ جیسے تم مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے آباء و اَجداد بھی مخلوق تھے، جیسے تم خطا کر سکتے ہو اسی طرح وہ بھی تو خطا کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ نہ دیکھو کہ آباء و اَجداد کا راستہ کیا تھا، بلکہ یہ دیکھو کہ حق کیا ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾ ''تاکہ تم بچ سکو۔''

یعنی دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکو۔ ان دونوں سے اگر بچنا ہے تو اللہ کی بندگی کی روش اختیار کرو۔

قصۂ آدمؑ و ابلیس اور خلافتِ ارضی کا بیان

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۫
وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
حَیْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ
عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ
هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرۃ)

آیت ۳۰ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ ”اور یاد کرو جب کہ کہا تھا تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔“

خلیفہ کے معنی نائب کے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ خلیفہ کسی کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کے اندر انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے ”نائب“ کی ہے۔ انسان کی اس حیثیت کو ۱۹۴۷ء سے پہلے کے برصغیر میں انگریز وائسرائے کی مثال سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہم انگریز کے غلام تھے۔ ہمارا اصل حاکم (بادشاہ یا ملکہ) انگلستان میں تھا، جس کی طرف سے دہلی میں وائسرائے مقرر کیا جاتا تھا۔ وائسرائے کا کام یہ تھا کہ His Majesty یا Her Majesty کی حکومت کا جو بھی حکم اسے موصول ہو اُسے بغیر کسی تغیر و تبدل کے یہاں نافذ کرے۔ البتہ وائسرائے کو اختیار حاصل تھا کہ اگر کسی معاملے میں انگلستان سے حکم نہ آئے تو وہ یہاں کے حالات کی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے اور سلطنت برطانیہ کے مفادات کو مدّنظر رکھتے ہوئے غور و فکر کے بعد اس بارے میں مناسب فیصلہ کرے۔ بعینہٖ یہی رشتہ کائنات کے اصل حاکم اور زمین پر اُس کے خلیفہ کے مابین ہے۔ کائنات کا اصل حاکم اور مالک اللہ تعالیٰ

ہے‘ لیکن اُس نے اپنے آپ کو غیب کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ زمین پر انسان اس کا نائب ہے۔ اس حیثیت میں انسان کا کام یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات موصول ہوں‘ ان پر بے چون وچرا عمل کرے اور جس معاملے میں کوئی واضح ہدایت نہ ہو اس معاملے میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے وہ فیصلہ کرے جو روحِ دین سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ یہ ہے خلافت کے اس تعلق کی اصل حقیقت اور نوعیت جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسان کے مابین قائم فرمایا ہے۔

چنانچہ بالقُوّۃ (potentially) ہر وہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے جو اُس کا فرمانبردار ہے اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ البتہ جو انسان اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر کے حاکمیت کا مدعی بن جائے‘ وہ خلافت کے اس حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر دنیا میں کسی بادشاہ کا ولی عہد یا کوئی گورنر اس سے بغاوت کر دے اور زبردستی اس کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے نہ صرف اس کے منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے بلکہ بادشاہ کے نزدیک وہ واجب القتل بھی ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے باغیوں اور اپنے مقابلے میں حاکمیت کے دعویداروں کو خلافت کے منصب سے معزول کر دیتا ہے۔ البتہ وہ انہیں فوری طور پر ہلاک اس لیے نہیں کرتا کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور یہاں اس نے ہر انسان کو ایک وقتِ معین تک مہلت دے رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا ذکر سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴) ”اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی ایک وقتِ معین تک تمہارے ربّ کی طرف سے تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا“۔ گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خلافت صرف ”خلافت المسلمین“ ہو گی۔ یعنی صرف وہ شخص خلافت کے منصب کا اہل ہو گا جو اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم مطلق مانے اور اس کا فرمانبردار بن کر رہے۔

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ ”انہوں نے کہا: کیا آپ زمین میں اسے مقرر کرنے والے ہیں جو اس میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟“

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ ”اور ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔“

﴿قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰﴾ ”فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔“

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ گمان کیونکر ہوا کہ وہ زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟ اس ضمن میں مفسرین کے ہاں دو آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے اس زمین پر اللہ تعالیٰ نے جنّات کو کچھ اختیارات تفویض کیے تھے اور ان اختیارات کے بل پر انہوں نے یہاں فساد برپا کر رکھا تھا۔ ان ہی پر قیاس کرتے ہوئے فرشتوں نے سمجھا ہو گا کہ انسان بھی زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا۔ ایک دوسری رائے اس ضمن میں یہ ہے کہ جب خلافت کا لفظ

استعمال ہوا تو فرشتے سمجھ گئے کہ انسان کو زمین میں لازماً کچھ اختیارات بھی ملیں گے (واضح رہے کہ دنیا میں خلافت کا منصب صرف انسان کو عطا ہوا ہے' جنات کا اس میں کوئی حصہ نہیں)۔ ظاہر ہے خلیفہ بالکل بے اختیار تو نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے جہاں واضح حکم موجود ہو وہاں خلیفہ کا کام اس حکم کی تنفیذ کو یقینی بنانا ہے اور جہاں واضح حکم موجود نہ ہو وہاں اسے اپنی سمجھ بوجھ اور دین کی روح کے مطابق بہتر سے بہتر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تو جہاں اختیار ہوگا وہاں اس کے صحیح استعمال کا بھی امکان ہوگا اور غلط کا بھی۔ پولیٹیکل سائنس کا تو یہ مسلّمہ اصول (axiom) ہے :

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

کہ اختیارات لازماً کرپشن کو جنم دیتے ہیں اور مطلق اختیارات کا مطلب ہے: ''مطلق کرپشن''۔ چنانچہ جہاں اختیارات ہوں گے وہاں ''مَن مانی'' کرنے کا امکان بھی ہوگا۔ تو فرشتوں نے اسی بنا پر قیاس کیا ہوگا کہ انسان کو زمین میں اختیار ملے گا تو وہ یہاں لازماً فساد برپا کرے گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اعتراض یہ فرما کر نظر انداز کر دیا کہ میں اپنی حکمتوں کو بہتر طور پر سمجھتا ہوں۔ انسان کو زمین میں خلیفہ بنانے میں کیا حکمت کارفرما ہے' اسے صرف میں ہی جانتا ہوں۔

آیت ۳۱ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام نام''

اس جملے کے بارے میں مفسّرین کا تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد ان تمام اشیاء کے نام ہیں جو قیامت تک اس دنیا میں ظاہر ہونے والی تھیں اور یہ کہ اشیاء کے ناموں سے مراد اُن کی حقیقت کا علم ہے۔ اگر انسانی علم (Human Knowledge) کا بحیثیت مجموعی تجزیہ کیا جائے تو وہ یہی ہے کہ انسان ایک چیز کو پہچانتا ہے' اس کا ایک نام رکھتا ہے یا اس کے لیے کوئی اصطلاح (term) قائم کرتا ہے اور پھر وہ اس نام یا اُس اصطلاح کے حوالے سے اُس چیز کے بارے میں کچھ حقائق کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو ''تمام نام'' سکھا دینے کا مطلب یہ تھا کہ کل مادّی کائنات کے اندر قیامت تک جو کچھ وجود میں آنے والا تھا' اس سب کچھ کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالقُوّۃ (potentially) آگاہ کر دیا۔ یہی آگاہی انسان کے اس اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کی اصل بنیاد ہے جو اسے اپنے حواس سے حاصل ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ انسانی علم کے دو حصے ہیں۔ ایک الہامی علم (Revealed Knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے انسانوں کو عطا کرتا ہے' جبکہ ایک علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) ہے جو انسان خود حاصل کرتا ہے۔ اس طرح کہ انسان اپنے حواس کے ذریعے سے مختلف معلومات حاصل کرتا ہے' پھر اس کے دماغ کا کمپیوٹر ان معلومات کو پراسیس کر کے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے اور ان نتائج کو اپنے حافظے (memory) میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنے حواس کے ذریعے علم حاصل کرتا جاتا ہے اور اس کا دماغ نئی معلومات کو اس کے پرانے ذخیرۂ علم میں جمع کرتا جاتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی

اس آیت میں انسان کے اسی علم اور تحصیل علم کے اسی پراسیس کی طرف اشارہ ہے: ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں بازپرس کی جائے گی''۔ آیت زیر مطالعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کُل کا کُل بالقوۃ (potentially) ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کر دیا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ کے زمین پر آنے کے بعد اس علم کی exfoliation شروع ہوئی اور اُس وقت سے آج تک یہ مسلسل پھیل رہا ہے۔ یوں بڑھتے بڑھتے یہ کہاں تک پہنچے گا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ نصف صدی کے دوران انسانی علم کے حوالے سے جو دھماکہ خیز ترقی ہوئی ہے' چند سال پہلے تک اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج علومِ انسانی کی فتوحات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال کے اس شعر کی تعبیر قریب سے قریب تر آ رہی ہے ۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے!

انسانی علم کی ترقی کا یہ عمل اب بڑی تیزی سے اس صورت حال کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے جس کی پیشین گوئیاں احادیث میں دجال کے حوالے سے کی گئی ہیں۔ چنانچہ اب شاید وہ وقت زیادہ دور نہیں جب کوئی انسان اکتسابی علم کی طاقت کے ذریعے دجال کی شکل اختیار کر لے گا۔ دجال وہ شخص ہوگا جو اس دنیا کے تمام قواعدِ طبیعیہ (Physical Laws) پر قابو پالے گا ۔ پھر وہ جب چاہے گا' جہاں چاہے گا بارش برسائے گا۔ وہ انسانی ضروریاتِ زندگی سے متعلقہ تمام اشیاء کے تمام خزانے اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور اعلان کر دے گا کہ جو انسان اس پر ایمان لائے گا' بنیادی ضروریات کی اشیاء صرف اسی کو ملیں گی۔ اُس کی آواز پوری دنیا میں سنائی دے گی۔ وہ چند دنوں کے اندر پوری دنیا کا چکر لگا سکے گا۔ دجال کے بارے میں یہ ساری باتیں احادیث میں مذکور ہیں۔ یعنی وہ انسان کے اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کی اس حد کو پہنچ جائے گا کہ فطرت کے تمام اسرار (mysteries) اس پر منکشف ہو جائیں گے اور اسے قواعدِ طبیعیہ پر مکمل تصرف حاصل ہو جائے گا۔ بہرحال انسان کے اکتسابی علم کا خلافتِ ارضی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا فرشتوں کو بتایا گیا کہ آدم کو صرف اختیار ہی نہیں' علم بھی دیا جا رہا ہے۔

﴿ثُمَّ عَرَضَہُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ ۙ﴾ ''پھر اُن (تمام اشیاء) کو پیش کیا فرشتوں کے سامنے''

﴿فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ ہٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور فرمایا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو۔''

آیت ۳۲ ﴿قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ﴾ ''انہوں نے کہا (پروردگار!) ہر نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے''

آپ کی ذات ہر نقص سے' ہر عیب سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے مبرّا اور منزّہ ہے۔

﴿لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ﴾ ’’ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اُس کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔‘‘

فرشتوں کے اس جواب سے اہلِ علم کی اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کائناتی حکومت میں ملائکہ کی حیثیت درحقیقت اس کے کارندوں (civil servants) کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف اس کے اپنے شعبے کے متعلق ہی علم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کا علم جامع نہیں ہے‘ اور نہ ہی ان میں تمام چیزوں کا مجموعی علم حاصل کرنے کی استعداد ہے۔ مثلاً کسی فرشتے کو بارش کے امور کی ذمہ داری سونپی گئی ہے تو کوئی پہاڑوں پر مامور ہے۔ جیسے سیرت کی کتابوں میں مَلَکُ الْجِبَال کا ذکر آیا ہے کہ طائف میں جب حضور اکرم ﷺ پر پتھراؤ کیا گیا تو وہ حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پہاڑوں پر مامور کر رکھا ہے‘ اگر آپ فرمائیں تو میں اِن دو پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے درمیان طائف کی یہ وادی واقع ہے اور اس طرح اہلِ طائف پِس کر سرمہ بن جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایسا نہیں چاہتا‘ عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔ چنانچہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات کے اندر مختلف خدمات پر مامور ہیں اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ صرف متعلقہ شعبوں کے اندر ان کے فرائضِ منصبی کے ساتھ مخصوص ہے‘ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بالقُوّۃ (potentially) جامع علم عطا کیا گیا تھا جو بڑھتے بڑھتے اب ایک بہت بڑا تناور درخت بن چکا ہے۔

﴿اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾﴾ ’’یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے‘ کامل حکمت والے ہیں۔‘‘

اے اللہ! صرف آپ ہی کی ذات ہے جو کُل کے کُل علم اور کامل حکمت کی مالک ہے۔ باقی تمام مخلوق کا علم ناقص ہے۔

آیت ۳۳ ﴿قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ﴾ ’’(اللہ نے) فرمایا: اے آدم‘ ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام!‘‘

﴿فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ﴾ ’’تو جب اُس نے بتا دیے ان کو اُن سب کے نام‘‘

﴿قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ﴾ ’’تو (اللہ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزوں کو‘‘

جو چیزیں تمہاری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہیں‘ میں انہیں بھی جانتا ہوں۔

﴿وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔‘‘

ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ فرشتے خود خلافت کے خواہش مند تھے۔ ہوسکتا ہے انہیں خیال آیا ہو کہ ہم خدامِ ادب ہیں‘ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید وتقدیس میں مصروف رہتے ہیں‘ جو حکم ملتا ہے بلا چون و چرا بجا

لاتے ہیں' اس لیے اللہ تعالیٰ کی خلافت پر سب سے بڑھ کر ہمارا حق ہے۔

ملائکہ اور حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے بعد اب آئندہ آیات میں تیسری مخلوق کا ذکر آرہا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تین مخلوقات ایسی ہیں جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور ہیں اور ان میں ''اَنَا'' (میں) کا شعور بھی ہے۔ یعنی ایک ملائکہ جن کی تخلیق نور سے ہوئی ہے' دوسرے انسان جن کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور تیسرے جِنات جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ حیوانات میں اگرچہ شعور (consciousness) تو ہے لیکن خودشعوری (self consciousness) نہیں ہے۔ شعور اور خودشعوری کے فرق کو یوں سمجھیں کہ انسان جب دیکھتا ہے تو اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں' جبکہ کُتّا یا بلّا دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ حیوانات میں ''میں'' کا شعور بھی نہیں ہے۔ یہ اَنَا' Self یا Ego صرف فرشتوں میں' انسانوں میں اور جِنات میں پائی جاتی ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔''

یہاں پر یہ سوال خاص طور پر بہت اہم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ملائکہ کے سجدے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا یہ سجدہ صرف تعظیماً تھا؟ اور اگر تعظیماً تھا تو کیا اس سے ''آدمِ خاکی'' کی تعظیم مقصود تھی یا اس روح کی جو اس کے اندر خصوصی طور پر پھونکی گئی تھی؟ مکی سورتوں میں یہ نکتہ دو مقامات پر بایں الفاظ واضح کیا گیا ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۝﴾ (الحجر: ۲۹ و ص: ۷۲) ''پھر جب میں اس (آدم) کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تب تم گر پڑنا اُس کے سامنے سجدے میں''۔ بہرحال ان الفاظ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر تعظیم مقصود تھی تو وہ آدمِ خاکی کے لیے نہیں بلکہ اس کے اندر موجود ''روحِ ربانی'' کے حوالے سے تھی۔ یہ ایک Divine Element یا Divine Spark ہے' جسے خود خالق نے ''مِنْ رُّوْحِيْ'' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسرا سوال اس آیت کے حوالے سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سجدے کی حکمت کیا تھی؟ اس کی عِلّت اور غرض و غایت کیا تھی؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جب تک کائناتی حکومت کی سول سروس کے تمام اہلِ کار (فرشتے) انسان کے تابع نہ ہو جاتے وہ خلافت کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے انسان جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور کوئی فعل سرانجام دینا چاہتا ہے تو اس فعل کے پورا ہونے اور اُس کے نتائج ظاہر ہونے میں نہ معلوم کون کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور نہ معلوم فطرت کی کون کون سی قوتیں انسان کے ساتھ موافقت کرتی ہیں تو تب وہ کوئی کام سرانجام دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے فطرت کی تمام قوتوں کا انتظام فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی اقلیم (domain) ہے۔ تو جب تک تمام فرشتوں کو انسان کے تابع نہ کر دیا جاتا اسے ملنے والے تمام اختیارات بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ چنانچہ کائناتی

حکومت میں کارفرما تمام قوتوں کی انسان کے ساتھ موافقت کی علامت کے طور پر تمام فرشتوں کو انسان کے آگے جھکا دیا گیا۔

اس آیت میں ''اِلَّآ اِبْلِیْسَ'' (سوائے ابلیس کے) کے الفاظ سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید ابلیس بھی فرشتہ ہی تھا' اس لیے کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس مغالطے کا سدِّباب سورۃ الکھف کی آیت ۵۰ میں بایں الفاظ کر دیا گیا: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ ''وہ جنوں میں سے تھا' پس اس نے سرکشی کی اپنے ربّ کے حکم سے''۔ ظاہر ہے اگر وہ فرشتوں میں سے ہوتا تو نافرمانی کر ہی نہ سکتا' اس لیے کہ فرشتوں کی شان تو یہ ہے: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶﴾ (التحریم) ''وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اُسے بجالاتے ہیں''۔ واضح رہے کہ جِنّات بھی انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہیں۔ انہیں بھی کفر و ایمان اور اطاعت و معصیت دونوں راستے اپنانے کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اس لیے ان میں انسانوں کی طرح نیک' بد' اعلیٰ' ادنیٰ' ہر طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ابلیس اپنے علم و زہد کے اعتبار سے بہت بلند مرتبے پر فائز تھا اور اس حیثیت میں وہ فرشتوں کا ہم نشین تھا۔ وہ فرشتوں کے ساتھ ایسے ہی شامل تھا جیسے علم' زہد اور تقویٰ کی بنا پر بہت سے انسانوں کا عالمِ ارواح' عالمِ ملائکہ اور ملأ اعلیٰ کے ساتھ ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ بہرحال ابلیس ایک جن ہونے کے باوجود اپنی نیکی' عبادت' پارسائی اور اپنے علم کی بنا پر ''مُعَلِّمُ الْمَلَكُوْت'' کا منصب حاصل کر چکا تھا اور اسے اپنی اس حیثیت کا بڑا زعم تھا۔ اس کا اصل نام ''عزازیل'' تھا' جبکہ ابلیس اس کا صفاتی نام ہے۔ اَبْلَسَ' یُبْلِسُ کے معنی ہیں مایوس ہو جانا۔ وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بالکل مایوس ہو چکا ہے اس لیے اسے ''ابلیس'' کہا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق بھی سیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا ''ابلیسی'' طرزِ عمل ہے۔ عزازیل یا ابلیس اس معنی میں ''شیطان'' بھی قرار پایا کہ تکبر اور سرکشی کی بنا پر اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی' اور پھر نادم ہونے اور توبہ کرنے کے بجائے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے ﴿اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ کی مہلت حاصل کر لی' کہ ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!'' اپنی اسی ضد میں اس وقت سے وہ نسلِ آدمؑ کی عداوت پر کمربستہ ہے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے کہ آدمؑ اس مقام و مرتبہ کا اہل نہیں تھا جو اسے دیا گیا۔

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں قصہ آدمؑ و ابلیس سات مقامات پر مذکور ہے۔ چھ مرتبہ مکی سورتوں (الاعراف' الحجر' بنی اسرائیل' الکھف' طٰہٰ اور صٓ) میں اور آخری مرتبہ یہاں اس مدنی سورت میں۔

﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ ''اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔''

اس واقعہ کے حوالے سے قرآن حکیم میں ابلیس کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الاعراف: ۱۲ و صٓ: ۷۶) ''میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے گارے سے بنایا''۔ درحقیقت یہی وہ تکبر تھا جس نے اسے راندۂ درگاہِ حق کر دیا۔

تکبّر عزازیل را خوار کرد کہ در طوقِ لعنت گرفتار کرد

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ ''اور ہو گیا وہ کافروں میں سے''۔ یا ''اور تھا وہ کافروں میں سے۔''

کَانَ کا استعمال عربی زبان میں دو طرح سے ہوتا ہے: ''تامہ'' اور ''ناقصہ''۔ کَانَ ناقصہ کے اعتبار سے اس جملے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے استکبار اور انکار کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ جبکہ کَانَ تامہ کے اعتبار سے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ یعنی اس کے اندر سرکشی چھپی ہوئی تھی جو اس موقع پر ظاہر ہو گئی۔ ایسا اکثر ہمارے انسانی معاشروں میں بھی ہوتا ہے کہ ایک مدت تک کسی شخص کی بدنیتی پر نیکی اور زُہد کے پردے پڑے رہتے ہیں لیکن کسی خاص صورت حال میں اچانک اس کی باطنی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

آیت ۳۵ ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ''اور ہم نے کہا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں''

اکثر اہلِ علم حضرات کے نزدیک یہ جنت آسمانوں ہی میں تھی اور آسمانوں ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تھی۔ البتہ اس نکتے پر سب مفسّرین کا اجماع ہے کہ یہ وہ جنت الفردوس نہیں تھی جس میں قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد کامیاب لوگوں کو داخل ہونا ہے اور جس میں داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک رائے یہ بھی ہے' اور میرا رُجحان اسی رائے کی طرف ہے' کہ تخلیق آدمؑ اسی زمین پر ہوئی تھی۔ اس تخلیق کے مختلف مراحل کی تفصیلات بیان کرنا اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ تاہم یہاں مختصراً یہ جان لیجیے کہ بائیولوجی اور قرآن حکیم دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق قشرِ ارض (Crust of the Earth) یعنی مٹی سے ہوئی۔ اس کے بعد حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو کسی اونچے اور سرسبز و شاداب علاقے میں رکھا گیا' جہاں ہر قسم کے پھل اور ضروریات کی تمام اشیاء بافراغت میسر تھیں۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝۱۱۸ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝۱۱۹﴾ ''یہاں تمہارے لیے یہ آسائشیں موجود ہیں کہ نہ تمہیں اس میں بھوک لگے گی نہ عریانی لاحق ہو گی۔ اور یہ کہ نہ تمہیں اس میں پیاس تنگ کرے گی اور نہ دھوپ ستائے گی''۔ حضرت آدمؑ اور آپؑ کی زوجہ کو وہاں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں' البتہ یہ جنت نمونے یا آزمائش (demonstration) کے لیے تھی تاکہ وہ عملی طور پر مشاہدہ کر لیں کہ شیطان ان کا اور اُن کی اولاد کا ازلی دشمن ہے اور یہ کہ اسے جہاں بھی' جب بھی موقع ملے گا وہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس جنت میں حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو قیام پذیر کرنے کے معاملے کی مثال ایسے ہے جیسے CSP Cader میں منتخب ہونے والے آفیسرز کو باقاعدہ تعیناتی (posting) سے پہلے سول سروسز اکیڈمی میں کچھ عرصے کے لیے زیر تربیت رکھا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اگلی آیت میں جو لفظ هُبُوْط (اترنا) آیا ہے یہ صرف بلندی سے نیچے اترنے کے معنی میں ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ

اس لفظ کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ بہر حال اس واقعہ کی تفصیلات قرآن مجید میں اس انداز سے بیان ہوئی ہیں کہ اس کے بہت سے پہلو بلاشبہ متشابہات کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس لیے ایسے معاملات میں غور و فکر کر کے کوئی ایک یا دوسری رائے اختیار کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

﴿وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ ''اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو۔''

یہاں ہر طرح کے پھل موجود ہیں' ان میں سے تم لوگ جو چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ۔

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ ''مگر اس درخت کے قریب مت جانا۔''

یہاں پر اس درخت کا نام نہیں لیا گیا' صرف اشارہ کر دیا گیا کہ اس ایک مخصوص درخت کے قریب جانے سے منع کر دیا گیا تھا۔

﴿فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ۝٣٥﴾ ''ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

اگر تم منع کرنے کے باوجود اس درخت کے قریب گئے تو تمہارا شمار حد سے گزرنے والے لوگوں میں ہوگا۔

اس آزمائشی مظاہرے (demonstration) کے ذریعے ہمیں (اولادِ آدمؑ کو) اس حکمت سے آگاہ کرنا بھی مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ممنوع یا حرام چیزیں بہت کم رکھی ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثلاً ایک مسلمان مرد کے نکاح کے لیے چند محرمات کو چھوڑ کر کروڑوں مواقع (options) ہیں۔ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی عورت سے نکاح کر سکتا ہے' بلکہ دو دو' تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے' لیکن اگر کوئی مسلمان اس کے باوجود بھی حرام میں منہ مارے تو اس کی اس حرکت یا جسارت کو حیوانیت اور خباثت نفس کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال حضرت آدم اور حضرت حواؑ پر واضح کر دیا گیا کہ یہ پورا باغ تمہارے لیے مباح ہے' بس یہ ایک شجر ممنوعہ ہے' اس کے قریب نہ جانا۔

آیت ٣٦ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ ''پھر پھسلا دیا اُن دونوں کو شیطان نے اُس درخت کے بارے میں''

اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ (آیت ١٢٠) میں آئی ہے کہ شیطان نے انہیں کیسے ورغلایا اور کس طریقے سے انہیں اس درخت کا پھل چکھنے پر آمادہ کیا۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾ ''تو نکلوا دیا ان دونوں کو اُس کیفیت میں سے جس میں وہ تھے۔''

وہ دراصل ایک مثالی کیفیت تھی جس میں بغیر کسی محنت اور مشقت کے بیٹھے بٹھائے بہترین انداز میں ان کی تمام ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ بہر حال اس کیفیت سے نکال کر انہیں کہا گیا کہ اب یہاں سے جاؤ اور زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرو۔ لیکن جاتے ہوئے انہیں ایک مرتبہ پھر یاد دلایا گیا کہ شیطان تمہارا اور تمہاری نسل کا دشمن ہے' اس نے جیسے یہاں تمہیں پھسلایا ہے ایسے ہی دنیا میں بھی پھسلانے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا تم اس کی شرارتوں سے ہوشیار رہنا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:٦) ''یقیناً شیطان

تمہارا دشمن ہے‘ اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔‘‘

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ ’’اور ہم نے کہا تم سب اُترو‘ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔‘‘

نوٹ کیجیے یہاں جمع کے صیغے میں بتایا گیا کہ تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن ہوں گے۔ گویا یہ خطاب حضرت آدمؑ‘ حضرت حواؑ اور ابلیس تینوں سے ہے۔ چنانچہ اس خطاب میں شیطان کی آدمؑ و ذریت آدم کے ساتھ دشمنی‘ اور پھر انسانوں میں مرد اور عورت کے مابین دشمنی کی طرف اشارہ ہے‘ مثلاً اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت مرد کو بہلا پھسلا کر غلط راستے پر ڈالتی ہے اور اسی طرح مرد بھی عورتوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو خبردار کیا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (التغابن: ١٤) ’’اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں‘ ان سے ہوشیار رہو‘‘۔ کہیں ان کی محبت تمہیں راہِ حق سے منحرف نہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ شوہر دین کے راستے پر چلنا چاہے لیکن بیوی اس کے ارادے میں رکاوٹ بن جائے‘ یا یہ کہ بیوی کوئی اچھا کام کرنا چاہے اور شوہر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ اگر کہیں واقعی ایسا ہوتا ہے تو یہ مصلحت اور محبت نہیں‘ عداوت ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝٣٦﴾ ’’اور تمہارے لیے اب زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔‘‘

اب یہ زمین تمہاری جائے قیام ہے۔ یہاں تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں ہم نے فراہم کر دی ہیں‘ لیکن یہ سب کچھ ایک وقتِ معین تک کے لیے ہے اور ایک وقت آئے گا کہ ہم یہ بساط لپیٹ دیں گے: ﴿یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ﴾ (الانبیاء: ١٠٤) ’’جس دن کہ ہم تمام آسمانوں کو اس طرح لپیٹ لیں گے جیسے اوراق کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے۔‘‘

آیت ٣٧ ﴿فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ﴾ ’’پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات‘ تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔‘‘

اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں آئی ہے۔ حضرت آدم اور حضرت حواؑ نے جب اللہ تعالیٰ کا عتاب آمیز حکم سنا تو وہ انتہائی پشیمانی اور ندامت کی کیفیت میں گریہ وزاری کرنے لگے۔ اس وقت ان کے دل میں ندامت کے شدید احساسات تو تھے لیکن وہ اظہارِ ندامت کے آداب سے ناواقف تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے توبہ کے الفاظ انہیں خود تلقین فرما دیے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو ان کی ندامت پر پیار آ گیا۔ دراصل توبہ کی بنیادی اور لازمی شرط ہی یہی ہے کہ ارتکابِ گناہ کے فوراً بعد اس بارے میں انسان نادم اور پشیمان ہو جائے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو انسان کی ایسی ندامت و پشیمانی بے حد پسند ہے۔ توبہ کا یہ فلسفہ علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب کے زمانے کے ایک شعر

میں بایں الفاظ بیان کیا ہے۔ ان کے اس شعر کو سن کر اُس وقت کے بڑے بڑے شعراء بھی پھڑک اُٹھے تھے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

(یعنی شرمندگی کے باعث میری پیشانی پر پسینے کے جو قطرے نمودار ہوئے میرے پروردگار کو وہ اتنے پیارے لگے کہ اس کی شانِ کریمی نے انہیں موتیوں کی طرح چُن لیا۔) حضرات آدم وحوا علیہما السلام کو توبہ کے لیے جو کلمات سکھائے گئے تھے وہ سورۃ الاعراف میں یوں بیان ہوئے ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تو نے ہمیں بخش نہ دیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔''

آیات زیر مطالعہ میں ''شیطنت'' اور ''آدمیت'' کا جو موازنہ اور تقابل دکھایا گیا ہے وہ ہمارے لیے لائقِ توجہ ہے۔ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی صورت میں غلطی کی تو وہ اس پر ندامت محسوس کرنے کے بجائے مزید اکڑ گیا اور ''اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اس نے سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا۔ دوسری طرف غلطی حضرت آدمؑ سے بھی ہوئی' وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے' لیکن وہ اس پر پشیمان ہوئے اور فوراً توبہ کی فکر میں لگ گئے۔ گویا غلطی کر کے اس پر اکڑ جانا اور مزید سرکشی کی روش اختیار کرنا شیطانی طرزِ عمل ہے' جبکہ غلطی پر پشیمان ہونا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہونا انسانی کردار کا خاصہ ہے' اور اللہ تعالیٰ کو یہی طرزِ عمل پسند ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسل علیہم السلام کے علاوہ گناہ اور معصیت سے کوئی انسان بھی مبرّا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((کُلُّ بَنِیۡ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیۡرُ الۡخَطَّائِیۡنَ التَّوَّابُوۡنَ)) (سنن ابن ماجه وسنن الترمذی)

''آدمؑ کی تمام اولاد خطا کار ہے' اور ان خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو توبہ کر لیں۔''

اس حوالے سے حضرت آدم علیہ السلام کا طرزِ عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ آپؑ سے غلطی ہوئی تو آپؑ کو اس پر ندامت ہوئی اور آپؑ نے فوراً توبہ کر لی۔ آپؑ نے جونہی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی توبہ قبول فرمالی۔

﴿اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾﴾ ''یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا۔''

توبہ کے معنی ہیں پلٹ آنا۔ اس معنی میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بندے کے لیے بھی۔ یعنی تَوَّاب اللہ تعالیٰ بھی ہے اور بندہ بھی۔ آیت زیر نظر میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آیا ہے جبکہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اَلتَّوَّابِیۡنَ سے مراد اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے والے بندے مراد ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ محبت کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتا ہے بہت پاکبازی اختیار کرنے والوں سے''۔ بندہ جب گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے اور اس کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت کی نظر اس سے پھیر لیتا ہے۔ پھر جب بندہ اپنی

غلطی پر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے تو وہ گویا معصیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ اس صورتِ حال کے حوالے سے حدیث میں بڑے پیارے الفاظ آتے ہیں:

((...... وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا، وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا، وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهُ هَرْوَلَةً)) (متفق علیه)

''......اور اگر وہ (میرا بندہ) بالشت بھر میری طرف آتا ہے تو میں ہاتھ بھر اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ ہاتھ بھر میری طرف آتا ہے تو میں دو ہاتھ اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔''

علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اللہ تعالیٰ کے اسی لطف و کرم کا ذکر کیا ہے: ؂

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ رَوِ منزل ہی نہیں!

بہر حال لفظ ''توبہ'' اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بندے کے لیے بھی۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''تَابَ'' جب بندے کے لیے آئے گا تو ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آئے گا۔ جیسے ﴿اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ﴾ اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے آئے گا تو ''عَلٰی'' کے صلہ کے ساتھ (تَابَ عَلٰی) آئے گا' جیسے آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے: ﴿فَتَابَ عَلَیْهِ﴾۔ اس فرق کی کیفیت کو سادہ لفظوں میں یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان چونکہ بہت بلند ہے اس لیے جب انسان توبہ کرتا ہے تو ''اُس کی طرف'' توبہ کرتا ہے' جبکہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ''بندے پر'' توبہ (نظر کرم) کرتا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ۔''

یہ لفظ ''اِهْبِطُوْا'' اس سے پہلے آیت ۳۶ میں بھی آیا ہے۔ اس کے لفظی معنی بلندی سے پستی کی طرف اترنے کے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کی رائے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رکھا گیا تھا وہ آسمانوں میں تھی' ان کے نزدیک ''اِهْبِطُوْا'' کے حکم میں آسمان سے زمین پر اُترنے کا مفہوم پایا جاتا ہے' لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو زمین پر ہی کسی بلند مقام پر رکھا گیا تھا ان کا خیال یہ ہے کہ ''اِهْبِطُوْا'' کا لفظ یہاں بلند جگہ سے نیچے اُترنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال اسی سورۃ کے ساتویں رکوع کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (آیت ۶۱)۔ یعنی یہ کہ تم جاؤ جا کر کسی شہر میں آباد ہو جاؤ' وہاں تمہیں تمہاری یہ تمام مطلوبہ چیزیں مل جائیں گی۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

اس آیت میں علم انسانی کے دوسرے شعبے یعنی علم وحی (Revealed Knowledge) کا ذکر ہے۔ یاد رہے کہ اس رکوع کے شروع (آیت ۳۱) میں علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کا ذکر آیا ہے جو بالقُوّۃ (potentially) حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوا اور جسے انسان نے بعد میں اپنی محنت اور عقل کے ذریعے سے آگے بڑھایا۔ یہ علم ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک مسلسل ترقی پذیر ہے۔ ایک وقت تھا جب مسلمان اس علم میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے تھے' مگر آج مغربی اقوام اس علم کی ترقی میں تمام دنیا کو پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ ظاہر ہے دنیا میں جو قوم اس علم میں سب سے آگے ہوگی' دنیا میں وہی مادی ترقی کے میدان کی فاتح قرار پائے گی۔ البتہ آخرت کی کامیابیوں کا تعلق اس علم سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی انسان کو عطا ہوا ہے۔ یہاں اس آیت میں اسی نکتے کی وضاحت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے پاس جو ہدایات اور احکام آئے ہیں' اس کے منصبِ خلافت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان کی پیروی کرے۔ جو لوگ اس معیار پر پورا اتریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ آخرت میں کسی قسم کے رنج اور خوف سے دوچار نہیں ہوں گے۔

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور جو کفر کریں گے''

یعنی جو لوگ ہماری اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے' اور ہمارے عطا کردہ علم (علم بالوحی) کی ناقدری و ناشکری کریں گے۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ ''اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے''

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾ ''وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے' اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

گزشتہ آیت کے آخری جملے اور اس آیت کے الفاظ پر مشتمل یہ عبارت فلاحِ انسانیت کا وہ ابدی منشور (charter) ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ خلافت کے تقرر نامے کے ساتھ منسلک کر کے گویا انسان کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔

سابقہ اُمتِ مُسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو دعوتِ ایمان

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ (البقرۃ)

بنی اسرائیل کو دعوتِ ایمان کے سلسلے میں یہ خطاب سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل دس رکوعات پر محیط ہے۔ ان میں سے پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے جب کسی فرد یا کسی گروہ کو دعوت دی جاتی ہے تو تشویق و ترغیب اور دلجوئی و نرمی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس انداز کے بغیر کوئی دعوت مؤثر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یوں سمجھ لیجیے کہ اس خطاب کی ابتدائی سات آیات (پانچواں رکوع) ان دس رکوعوں کے لیے بمنزلہ فاتحہ ہیں۔ واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی حیثیت سابقہ اُمتِ مُسلمہ کی تھی۔ جب تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت ان تک نہیں پہنچی تھی اس وقت تک وہ مسلمان تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے' شریعتِ موسویؑ کے پیروکار تھے' بڑے بڑے علماء ان میں موجود تھے۔ اس سب کچھ کے باوجود وہ لوگ حضور اکرم ﷺ کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ یہاں جس انداز سے انہیں دعوت دی جارہی ہے اس سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آج مسلمانوں میں اگر اللہ کا کوئی نیک اور مخلص بندہ بطور داعی کھڑا ہو تو اسے اپنی دعوت کا آغاز اپنی ہی امت یعنی اپنے مسلمان بھائیوں سے کرنا ہوگا جو اپنی اصلیت کو بھول کر دوسری قوموں جیسی ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا تو اسلام کو اِسی اُمت کے حوالے سے پہچانتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس امت کو اپنا علاج کرنا ہوگا۔ یہ خود ٹھیک ہوگی اور اسلام کا حقیقی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی تو تبھی یہ دوسروں کو دعوت دے سکے گی کہ آؤ دیکھو یہ ہے اسلام! اس لیے ہم میں سے اگر کسی خوش نصیب کو دعوت الی اللہ کی ذمہ داری نبھانے کی توفیق ملے تو اس کی دعوت کا اسلوب اور انداز وہی ہونا چاہیے جو یہاں ان سات آیات میں ہمارے سامنے ہے۔

آیت ۴۰ ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ﴾ ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا''

لفظ ''اسرائیل'' عبرانی کے دو الفاظ ''اسرا'' اور ''ئیل'' سے مرکب اضافی ہے۔ ''اسرا'' کا معنی ہے بندہ یا غلام' جبکہ لفظ ''ئیل'' عبرانی میں اللہ کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کا ترجمہ ہوگا ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا غلام' اللہ کی اطاعت کے قلادے میں بندھا ہوا بندہ۔ ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ آپؑ کے بارہ بیٹے تھے اور ان سے آپؑ کی جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لوگ ایک بہت بڑی امت بن گئے۔ اس امت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سمیت بہت سے انبیاء مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت تک بنی اسرائیل پر عروج و زوال کے چار ادوار گزر چکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی گھٹائیں کھل کر برسی تھیں جس کے نتیجے میں دُنیوی اعتبار سے بھی انہیں بڑا عروج نصیب ہوا' جبکہ دو مرتبہ حُبِّ دنیا' شہوات پرستی اور اللہ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دینے کی پاداش میں ان پر عذاب کے عبرت ناک کوڑے بھی برسے تھے۔ ان

کے عروج وزوال کے ان چار ادوار کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات کے نزول کے وقت یہ لوگ اپنے زوال کے دوسرے دور سے گزر رہے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہیکل یعنی ان کا ''معبدِ اوّل'' (First Temple) حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سو سال قبل بخت نصر (Nebukadnezar) کے ہاتھوں مسمار ہو چکا تھا۔ بعد میں انہوں نے اسے ''معبدِ ثانی'' کے نام سے دوبارہ تعمیر کیا۔ لیکن ۷۰ عیسوی میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے رومیوں کے حملے میں اسے بھی مسمار کر دیا گیا اور یہ اس وقت سے اب تک گرا پڑا ہے۔ صرف ایک دیوارِ گریہ (Wailing Wall) باقی ہے جس کے پاس جا کر یہ لوگ ماتم اور گریہ وزاری کر لیتے ہیں اور اب یہ لوگ اسے سہ بارہ تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے ''معبدِ ثالث'' (Third Temple) کے نقشے بھی بن چکے ہیں اور تعمیری منصوبے کا خاکہ بھی تیار ہو چکا ہے۔

بہرحال نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ لوگ بحیثیتِ مجموعی بہت ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے' چنانچہ اس حالت میں انہیں یاد دلایا گیا: ''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا تھا''۔ اللہ کا وہ انعام کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب دی' ان میں پے در پے انبیاء بھیجے' شریعت عطا فرمائی' ان میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے بادشاہ پیدا کیے' جو بادشاہ بھی تھے اور نبی بھی تھے۔

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ﴾ ''اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لے رکھا تھا۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفرِ استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸۔۱۹ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ الفاظ فرمائے تھے:

> ''میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا' نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔''

ان الفاظ میں گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ آئیں گے' ان پر اللہ کا کلام نازل ہوگا' اور یہ کہ تمہیں انؐ کی نبوت کو تسلیم کرنا ہے (یہ مضمون سورۃ الاعراف کے انیسویں رکوع میں قدرے تفصیل سے آیا ہے)۔ چنانچہ اب اللہ تعالیٰ اپنا وہ پرانا عہد انہیں یاد دلا رہا ہے کہ اب جبکہ نبی آخر الزماں (ﷺ) تشریف لا چکے ہیں تو اب تم لوگ اُن (ﷺ) پر ایمان لاؤ' انؐ کی صدا پر لبیک کہو تو میری رحمتوں کے دروازے تمہارے لیے پھر سے کھل جائیں گے۔

﴿وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰﴾ ''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

آیت ۴۱ ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے''

اس جملے کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان لاؤ اس قرآن پر جو تصدیق کرتا ہے تورات کی اور انجیل کی اور دوسرے یہ کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ اُن پیشین گوئیوں کے مصداق بن کر آئے ہیں جو تورات میں تھیں' ورنہ وہ پیشین گوئیاں جھوٹی ثابت ہوتیں۔

﴿وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ ''اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

یعنی تم لوگ قرآن کی دیدہ ودانستہ تکذیب کرنے والا ہراول دستہ مت بنو اس لیے کہ تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ تم لوگ تو آخری نبی (ﷺ) کے انتظار میں تھے اور اُنؐ کے حوالے سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزماں (ﷺ) کے واسطے سے ہماری مدد فرما اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرما (بحوالہ سورۃ البقرۃ آیت ۸۹)' لیکن اب تم ہی ہماری اس آخری کتاب کے اوّلین منکر بن گئے ہو اور تم ہی سب سے بڑھ کر ہمارے آخری رسولؐ کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئے ہو۔

﴿وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا﴾ ''اور میری آیات کے عوض حقیر سی قیمت قبول نہ کرو۔''

یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں اور تم ان کو صرف اس لیے ردّ کر رہے ہو کہ کہیں تمہاری مسندوں اور تمہاری چودھراہٹوں پر کوئی آنچ نہ آجائے۔ یاد رکھو! اللہ کی آیات کے مقابلے میں یہ بہت حقیر سی چیزیں ہیں۔

﴿وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ ۝۴۱﴾ ''اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو۔''

تمہیں صرف میری نافرمانی سے بچنے کی فکر ہونی چاہیے۔

آیت ۴۲ ﴿وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۴۲﴾ ''اور نہ گڈمڈ کرو حق کے ساتھ باطل کو اور نہ چھپاؤ حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر مدّنظر رکھنا چاہیے کہ کسی مغالطے کی وجہ سے غلط راہ پر پڑنا تو صرف ضلالت اور گمراہی کے زمرے میں آتا ہے' لیکن حق کو پہچان کر اُسے ردّ کر دینا اور جانتے بوجھتے باطل کی روش اختیار کرنا سرکشی ہے۔ اس سورت کی آیت ۴۶ میں علماءِ یہود کے بارے میں قرآن کی یہ گواہی بھی موجود ہے: ﴿يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ﴾ (کہ یہ لوگ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ تم لوگ جانتے بوجھتے حق کو جھٹلا کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت مت دو۔

آیت ۴۳ ﴿وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ۝۴۳﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جھکو (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ۔''

یعنی باجماعت نماز ادا کیا کرو ــــــ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنی نماز سے رکوع کا رکن خارج کر دیا تھا' مزید برآں وہ باجماعت نماز کو بھی ترک کر چکے تھے۔ چنانچہ اس حکم کے ذریعے ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ پر صرف ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی نہیں' بلکہ آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد آپ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل اور آپ ﷺ کی ہر سنت کی پیروی بھی ضروری ہے۔

آیت ۴۴ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

ان آیات کے اصل مخاطب علماءِ یہود ہیں' جو لوگوں کو تو تقویٰ اور پارسائی کی تعلیم دیتے تھے' لیکن ان کا اپنا کردار ان کی تعلیمات کے برعکس تھا۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور واعظین کا اکثر و بیشتر یہی حال ہے کہ ان کے وعظ بہت پُر تاثیر ہوتے ہیں اور ان کی بات بات سے پرہیزگاری و پارسائی ٹپکتی ہے' لیکن ان کے ذاتی کردار کو ان باتوں سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی جن کی دعوت وہ دوسرے لوگوں کو دیتے ہیں' الا ماشاء اللہ! آیت زیر مطالعہ میں جس سخت انداز میں علماءِ یہود کو تنبیہ کی گئی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر ناپسندیدہ ہے۔

﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ﴾ ''حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔''

تم لوگ صاحبِ تورات ہو۔ تم اللہ کی اس کتاب کو پڑھتے بھی ہو اور اس کے احکام کو سمجھتے بھی ہو۔ اس کے باوجود تمہارا یہ حال ہے کہ تم لوگوں نے دوہرے کردار اپنا رکھے ہیں۔ آج ہمارے ہاں علماءِ سُوء کا بھی یہی حال ہے۔ یہ لوگ کتاب اللہ کے ساتھ جو ''سلوک'' کر رہے ہیں اس کی تصویر علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں یوں پیش کی ہے: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

ان ''فقیہانِ حرم'' نے تراجم و تفاسیر کے حوالے سے تو قرآن کے مفہوم میں جی بھر کے تحریفات کی ہیں' البتہ اس کے متن کے بارے میں اُن کا بس نہیں چلتا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴﴾ ''کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟''

آیت ۴۵ ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ﴾ ''اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔''

اس حکم کے مخاطب بھی بنیادی طور پر علماءِ یہود ہی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں لفظ ''صبر'' یہاں خصوصی مفہوم کا حامل ہے۔ اس مفہوم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہوگا کہ آخر علماءِ سُوء کیوں وجود میں آتے ہیں؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ جب دین سے وابستہ لوگ صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں تو وہ شیطان کے جال میں پھنس کر حبِّ مال و جاہ کی روش پر چل پڑتے ہیں۔ گویا وہ ایک اعلیٰ

اور مقدس منصب کو چھوڑ کر دنیا کے کُتّے بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ اپنی اصلیت کو دین داری کے لبادے میں چھپائے رکھتے ہیں اور بظاہر وہ دینی مراسم کی پابندی بھی کرتے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کردار و عمل دین کو بدنام کرنے کا باعث بنتا ہے۔ علماء یہود کے اس کردار پر سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۳ میں بایں الفاظ تنقید کی گئی ہے: ﴿لَوۡلَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ﴾ ''کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے علماء اور صوفیاء جھوٹ بولنے سے اور حرام کھانے سے؟'' ظاہر ہے ایسے علماء وصوفیاء جن کی نظریں ہر وقت اپنے ارادت مندوں کے نذرانوں اور تحفوں پر لگی رہتی ہوں' وہ بھلا انہیں حرام خوری سے کیونکر منع کریں گے۔ چنانچہ ایسے لوگ جب صبر وقناعت کی روش کو خیر باد کہہ کر نفسانی خواہشات کے اسیر ہو جاتے ہیں تو حق گوئی کے حوالے سے قدم قدم پر سمجھوتہ (compromise) کرنا ان کا معمول بن جاتا ہے۔

صبر کے ساتھ علماء یہود کو دوسری نصیحت یہاں اقامتِ صلوٰۃ کے بارے میں کی گئی ہے۔ وہ لوگ وضوحِ حق کے باوجود بھی نبی آخر الزماں ﷺ کی نبوت ورسالت کا جو انکار کیے جا رہے تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حُبِ دنیا اور حُبِ جاہ جیسی بیماریاں ان کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں ان کی ان دونوں بیماریوں کا علاج بتا دیا گیا کہ صبر وقناعت کا طرزِ عمل اپنانے سے حُبِ دنیا کے جذبے پر زد پڑتی ہے' جبکہ نماز کی مداومت سے انسان کے دل میں عبودیت وتذلل کے احساسات پروان چڑھتے ہیں جو بالآخر حُبِ جاہ جیسی مہلک بیماری کے خاتمے کا باعث بنتے ہیں۔

﴿وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بھاری شے ہے''

اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس جملے میں اِنَّھَا کی ضمیر صرف صلوٰۃ کے لیے آئی ہے کہ نماز بہت بھاری اور مشکل کام ہے۔ لیکن اس بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ اس پورے طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک اہلِ ایمان بندے سے مطلوب ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دنیا اور دنیا کے متعلقات کے بارے میں کم سے کم پر قانع ہو جائے' اپنی زیادہ تر توانائیاں حق کا بول بالا کرنے کے لیے صرف کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نماز کو اپنے معمولاتِ حیات کا محور بنائے رکھے' جو کہ عماد الدین ہے' اور یوں وہ اپنے راستے میں آنے والی تکلیفوں اور آزمائشوں کا سامنا صبر اور نماز سے کرے۔ اس طرح وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کا پوری زندگی میں صبر وقناعت کے حوالے سے استقامت دکھانا اور نماز کی مسلسل پابندی کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔

﴿اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿ۙ۴۵﴾﴾ ''مگر اُن عاجزوں پر (بھاری نہیں ہے)۔''

ان لوگوں کے لیے یہ روش اختیار کرنا قطعاً مشکل نہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور ان کے دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔

آیت ۴۶ ﴿الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ﴾ ''جنہیں یہ یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں''

﴿وَاَنَّهُمۡ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (جنہیں یہ یقین ہے کہ) بالآخر انہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودہویں رکوع تک (پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات بھی اس میں شامل ہیں) مسلسل بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ البتہ ان میں سے پہلا (یعنی سورت کا پانچواں) رکوع اس خطاب کی تمہید پر مشتمل ہے، جس میں انہیں نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دی گئی ہے، جبکہ بقیہ نو رکوع اُس فردِ جرم (charge sheet) پر مشتمل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر عائد کی جا رہی ہے کہ میں نے تم پر طرح طرح کے احسانات کیے۔ تمہیں بہت غیر معمولی انداز میں اپنی نعمتوں سے نوازا، دنیا بھر کی اقوام پر تمہیں فضیلت عطا کی، لیکن اس اعزاز و اکرام کے باوجود تم نے میری ناشکری اور نافرمانی کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ تم لوگوں نے میرے تفویض کردہ مشن کو چھوڑ کر مستقل طور پر دنیا پرستی کی روش اختیار کر لی —— چنانچہ اگلے نو رکوعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ نکتہ خصوصی طور پر مدنظر رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے اجتماعی کردار کے اہم خدوخال (features) کا نقشہ محض ہماری معلومات میں اضافے کی خاطر نہیں دکھایا گیا بلکہ اس میں ہمارے لیے پیشگی تنبیہ ہے۔ گویا بنی اسرائیل کے کردار کے پردے میں ہمیں گن گن کر بتا دیا گیا ہے کہ کون کون سی خرابیاں کسی مسلمان امت کے بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔ یہ مضمون احادیث میں بڑی وضاحت سے آیا ہے: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَاءِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) (سنن الترمذی)

''میری اُمت پر بھی وہ سب حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: ((فَمَنْ؟)) (متفق علیہ)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے، بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

ترمذی کی مذکورہ بالا حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ)) یعنی اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا ہو گا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا تھا تو تم میں سے بھی کوئی شقی انسان ایسا ضرور اٹھے گا جو یہ حرکت کرے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل سے خطاب

پر مشتمل ان آیات کو پڑھتے ہوئے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ تو محض ''اگلوں کی داستان'' ہے' بلکہ ہمیں ان تفصیلات کو یہ سمجھ کر پڑھنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کے اجتماعی کردار کا یہ نقشہ دکھا کر گویا ہمیں خبردار کیا جا رہا ہے:۔

''خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں''

بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل سورت کے اس حصے (پانچویں رکوع سے لے کر پندرھویں رکوع کی ابتدائی دو آیات تک) سے متعلق دوسرا اہم نکتہ یہ سمجھنے کا ہے کہ اس حصے کے ابتدائی (سورت کے پانچویں) رکوع میں نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان کی دعوت کا جو مضمون آیا ہے اس کی حیثیت ان تمام مضامین کی بنیاد کی سی ہے جو اگلے نو رکوعوں (چھٹے سے لے کر چودھویں رکوع تک) میں آئے ہیں۔ اس نکتے کی نشاندہی اس مخصوص صورتِ حال سے بھی ہوتی ہے کہ مذکورہ نو رکوع چار آیات کی دو بریکٹس کے اندر ملفوف ہیں۔ یعنی چھٹے رکوع کا آغاز جن دو آیات (آیت ۴۷ اور ۴۸) سے ہوتا ہے' چودھویں رکوع کے اختتام پر وہی دو آیات دوبارہ آئی ہیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۴۷) تو بطور آیت ۱۲۲ بعینہٖ دہرائی گئی ہے' جبکہ آیت ۴۸ اور آیت ۱۲۳ کے مابین الفاظ کی ترتیب میں معمولی سا فرق ہے لیکن مضمون ہو بہو وہی ہے۔ چنانچہ یہ چار آیات ان رکوعوں کے آغاز اور اختتام پر گویا دو بریکٹس کی مانند ہیں' جبکہ پانچویں رکوع کی آیات ان بریکٹس سے باہر ہیں۔ پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کو نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی گئی ہے اس دعوت کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ''بریکٹس'' کے اندر ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے اور ان کی نافرمانیوں کی ایک مختصر مگر جامع فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کوئی عبارت لکھتے ہوئے کسی نکتے یا جملے کی وضاحت عام طور پر دو بریکٹس کے اندر درج کر دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والا خود بخود سمجھ جاتا ہے کہ بریکٹس کے اندر عبارت کا تعلق پہلی بریکٹ کے باہر درج عبارت سے ہے۔ ریاضی کی زبان میں مذکورہ صورت حال کی وضاحت یوں ہوگی کہ پانچویں رکوع کے مضامین بریکٹس کے اندر موجود نو رکوعوں کے تمام مضامین سے گویا ضرب کھا رہے ہیں۔ یہ ریاضی کا عام فہم سا قاعدہ ہے کہ بریکٹ کے باہر کی رقم بریکٹ کے اندر کی تمام اقدار (values) سے ضرب کھاتی ہے۔ چنانچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کو حضور ﷺ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی گئی ہے وہ دعوت چودھویں رکوع کے اختتام تک مسلسل تمام مضامین کے اندر موجود ہے۔

یہ وضاحت یہاں اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس حصے کی بعض آیات (خصوصی طور پر آیت ۶۲) سے کچھ لوگوں کو مغالطہ پیدا ہوا ہے اور کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر اس بارے میں فتنہ پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے خیالات پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر یا کسی بھی رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے' اور یہ کہ آخرت میں نجات کے لیے صرف اللہ کو مان لینا' آخرت کو مان لینا اور نیک اعمال کرنا کافی ہے۔ یہ فتنہ پہلی بار برصغیر میں مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ''دینِ الٰہی'' کے نام سے پھیلایا گیا۔ اُس وقت

اس فتنے سے صوفیاء کے بعض حلقے بھی کسی حد تک متاثر ہوئے اور ان کی طرف سے بھی ''مسجد مندر ہکو نور'' کے فلسفے کی تشہیر کی گئی۔ یعنی مسجد اور مندر میں ایک ہی نور ہے' اور یہ کہ سب مذاہب کی اصل ایک ہے' ان میں صرف شریعتوں اور عبادات کی ظاہری شکل کا فرق ہے اور وہ فرق رسولوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ رسولوں کو اگر بیچ میں سے نکال دیا جائے تو باقی ''دینِ الٰہی'' (اللہ کا دین) رہ جائے گا۔ اُس زمانے میں اس فتنے کو دراصل اکبر کی سرپرستی حاصل تھی۔ اُس وقت برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ اکبر خود کو ''اکبرِ اعظم'' اور ''مغلِ اعظم'' کہلاتا تھا۔ اس کے پیش کردہ ''دین'' کا فلسفہ یہ تھا کہ دینِ محمدی ﷺ کا دَور ختم ہو چکا ہے (نعوذ باللہ) وہ دین ایک ہزار سال کے لیے تھا' اب دوسرے ہزار سال (الف ثانی) کا دور ہے اور اس دور کے لیے نئے دین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس فلسفے کے تحت سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ سے استدلال کرتے ہوئے ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جسے ''دینِ اکبری'' اور ''دینِ الٰہی'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان میں اس فتنے نے دوبارہ اُس وقت سر اٹھایا جب گاندھی جی نے ''متحدہ وطنی قومیت'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس مرتبہ مسلمانوں کے نابغہ عصر ابوالکلام آزاد بھی اس فتنے کا شکار ہو گئے۔ گاندھی جی کا معمول تھا کہ وہ اپنی پرارتھنا میں قرآن مجید کی تلاوت بھی کرواتے اور گیتا بھی پڑھواتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنشدوں' بائبل اور گرنتھ سے بھی استفادہ کرتے۔ ''متحدہ وطنی قومیت'' کا تصور یہ تھا کہ ایک وطن کے رہنے والے لوگ ایک قوم ہیں' لہٰذا ان سب کو ایک بن کر رہنا چاہیے۔ مذہب محض انفرادی معاملہ ہے' اپنی عبادت کے لیے کوئی مسجد میں چلا جائے' کوئی مندر میں چلا جائے' کوئی گوردوارے میں چلا جائے' کوئی کلیسا سنیگاگ یا چرچ میں چلا جائے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بہرحال بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ مذکورہ چار آیات (کی بریکٹس) کے درمیان آنے والے تمام مضامین اس موضوع کے ابتدائی (پانچویں) رکوع کے مضمون کے تابع ہیں۔ یعنی پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کو نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی گئی ہے وہ دعوت چھٹے رکوع سے لے کر چودھویں رکوع تک کے تمام مضامین میں ہر مرحلے پر مقدر (understood) سمجھی جائے گی۔

بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل زیر مطالعہ سلسلۂ آیات کے حوالے سے چند اہم نکات یہاں ایک مرتبہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ یہ سلسلہ دس رکوعوں (پانچویں رکوع سے لے کر پندرھویں رکوع کے آغاز کی دو آیات تک) پر مشتمل ہے اور اس پورے سلسلۂ کلام میں پانچواں رکوع خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس رکوع میں بنی اسرائیل کو حضور ﷺ پر اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ رکوع اس پورے سلسلہ خطاب میں گویا بمنزلہ ''فاتحہ'' ہے۔ بقیہ نو رکوع چار آیات کی دو بریکٹس (آغاز میں آیات ۴۷' ۴۸ اور اختتام پر آیات ۱۲۲' ۱۲۳) کے اندر ملفوف ہیں۔ ریاضی کی زبان میں اس صورت حال کی وضاحت یوں ہوگی کہ

آغاز کی بریکٹ (آیت ۴۷ اور ۴۸) کے باہر پانچویں رکوع کے مضامین مذکورہ دو بریکٹس کے اندر کی آیات (چھٹے رکوع سے لے کر چودھویں رکوع کے اختتام تک) کے تمام مضامین سے ضرب کھا رہے ہیں۔ گویا چھٹے رکوع سے لے کر چودھویں رکوع تک کے تمام مضامین' پانچویں رکوع کے مضامین کے تابع ہیں۔ یہ نو رکوع دراصل بنی اسرائیل کی فردِ جرم (charge sheet) کے اہم نکات پر مشتمل ہیں۔ اسی فردِ جرم کے باعث اس امت کو بالآخر اس منصب جلیلہ سے معزول کر دیا گیا جس پر وہ پچھلے دو ہزار برس سے فائز تھی اور اس کی جگہ اس منصب پر ایک نئی اُمتِ مُسلمہ یعنی اُمتِ محمد ﷺ کا تقرر عمل میں آیا۔ اس فردِ جرم کی تفصیل بیان کرنے کے فوراً بعد (دوسرے پارے کے آغاز میں) تحویلِ قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ گویا بنی اسرائیل کی امت مسلمہ کے منصب سے معزولی اور اُمتِ محمد یہ ﷺ کی بحیثیت امتِ مسلمہ مسند نشینی کی تقریب (installation ceremony) کی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طویل سلسلۂ آیات کے مطالعہ کے دوران حقائق وواقعات کا یہ ربط وتسلسل اور سیاق وسباق مدّنظر رکھنا ضروری ہے۔

بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلۂ کلام میں تاریخی واقعات کے حوالے سے بعض ایسے عظیم ابدی حقائق (universal truths) بیان ہوئے ہیں جن کا تعلق کسی زمانے یا کسی قوم سے نہیں بلکہ ''سنت اللہ'' سے ہے اور یہ حقائق یہاں ہماری (موجودہ امتِ مسلمہ کی) راہنمائی کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سلسلۂ خطاب کے دوران آیت ۶۱ میں بنی اسرائیل کے لیے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡکَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ اب اس جملے میں ہمارے لیے یہ پیغام بہت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور انعام کی مستحق مسلمان امت اگر اس کی نافرمانی اور سرکشی کی روش اپنائے گی تو عین ممکن ہے اس جرم کی پاداش میں اس پر ذلت ومسکنت تھوپ دی جائے۔ چنانچہ اس پہلو سے یہ الفاظ آج ہمارے لیے لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بعد کیا آج ہم بھی کہیں اس مقام پر تو نہیں پہنچ چکے ہیں؟ اسی طرح آیت ۷۴ میں ایک عظیم ابدی حقیقت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ فَهِیَ کَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ؕ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہوگئے اس سب کچھ کے بعد' پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی شدید تر ہیں''۔ یہ الفاظ بھی ہمیں دعوتِ فکر دے رہے ہیں کہ ایک ایسی اُمت اس کیفیت میں آخر کیوں مبتلا ہوگئی جسے اللہ تعالیٰ خود: ﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ کی سندِ امتیاز عطا فرما چکا تھا۔ ع ''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!'' واضح رہے کہ ایسی قساوتِ قلبی میں کوئی پوری کی پوری اُمت مبتلا نہیں ہوا کرتی' بلکہ اس کیفیت میں متعلقہ اُمت کے قائدین یعنی علماءِ امت مبتلا ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر اللہ کی کتاب میں تحریف کر رہے ہوں اور حق کو پہچان لینے کے بعد اس کا انکار کر رہے ہوں۔

ناسخ و منسوخ کا معاملہ

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ (البقرۃ)

﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا﴾ ’’جو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا اسے بھلا دیتے ہیں‘‘

اس جملے میں دو اہم نکات کا ذکر آیا ہے۔ ایک نسخ یعنی کسی آیت کو باقاعدہ منسوخ کر دینا' اور دوسرے یہ کہ کسی آیت کو متعلقہ تمام لوگوں کے حافظے سے محو کر دینا۔

﴿نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ﴾ ’’تو ہم (اُس کی جگہ پر) لے آتے ہیں اُس سے بہتر یا (کم از کم) ویسی ہی۔‘‘

﴿اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۶﴾﴾ ’’کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے؟‘‘

اس آیت کے مفہوم اور پس منظر کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اللہ کا دین تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی ہے' البتہ مختلف انبیاء کی شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب یہ تھا کہ نوعِ انسانی مختلف اعتبارات سے ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھی۔ انسان کے ذہن اور تمدن کے ارتقاء (intllectual and social evolution) کا سفر مسلسل جاری تھا۔ لہٰذا اِس ارتقاء کے جس مرحلے میں جو رسول آئے اس زمانے کی مناسبت سے ان کو تعلیمات دے دی گئیں۔ ان تعلیمات کے کچھ حصے ابدی (eternal) نوعیت کے تھے جو ہمیشہ برقرار رہے' جبکہ کچھ حصے زمانے کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق تبدیل ہوتے رہے۔ چنانچہ جب کوئی اگلا رسول آتا تو اس کی قوم کے لیے پچھلے رسول کی تعلیمات میں مناسب طور پر تغیر و تبدل کر دیا جاتا' کچھ نئی ہدایات آ جاتیں' جبکہ پرانی تعلیمات میں سے کچھ احکام کو ساقط کر دیا جاتا۔ اس معاملے کو ’’نسخ‘‘ کہا جاتا ہے' جس کے تحت یا تو اللہ تعالیٰ تعین کے ساتھ کسی مخصوص حکم کو منسوخ فرما دیتے ہیں اور اس کی جگہ نیا حکم بھیج دیتے ہیں' یا کسی حکم کو سرے سے لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیتے ہیں۔ یہودیوں کا قرآن مجید پر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ دین وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے تو پھر شریعت بھی پوری کی پوری وہی ہونی چاہیے۔ اس آیت میں دراصل ان کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ناسخ و منسوخ کا معاملہ خود قرآن کے اندر بھی ہے۔ یعنی یہ مسئلہ صرف سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین ہی نہیں ہے' بلکہ خود شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بھی زمانی اعتبار سے ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے شراب کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اس میں گناہ کا پہلو زیادہ ہے' اگرچہ کچھ فائدے بھی

ہیں۔ اس کے بعد حکم آیا کہ جب تم لوگ شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ پھر سورۃ المائدۃ میں آخری حکم آ گیا اور اسے گندا شیطانی کام قرار دے کر فرمایا گیا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ ''تو کیا اب بھی تم باز آتے ہو یا نہیں؟'' اس طرح حالات کی مناسبت سے تدریجاً احکام آتے رہے اور آخری حکم میں شراب حرام کر دی گئی۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے' اُس کا اختیار کامل ہے' وہ مالک الملک ہے' دین اُس کا ہے' اس میں وہ جس طرح چاہے تبدیلی کرے۔

تحویلِ قبلہ کا واقعہ

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (البقرۃ)

دوسرے پارے کے ابتدائی دو رکوع تحویل قبلہ کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ یہاں ممکن ہے کسی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس چھوٹے سے واقعہ کو قرآن مجید میں آخر اس قدر شدّ و مدّ اور تکرار کے ساتھ کیوں زیر بحث لایا گیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب کے طور پر اس معاملے سے متعلق درج ذیل نکات پیش نظر رہنے چاہئیں:

۱۔ عوام الناس چونکہ عموماً دین کی اصل روح سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان کی اصل توجہ ظواہر (مثلاً مراسم عبودیت کے طور طریقوں) پر ہوتی ہے اس لیے دین کے ظواہر کے بارے میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی انہیں بے حد ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ جیسے آج اگر ہمارے ہاں احناف کی کسی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے کوئی شخص ''رفع یدین'' کر لے یا اونچی آواز میں ''آمین'' کہہ دے تو گویا قیامت آ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی ذہنیت کے پس منظر میں قبلہ کا تبدیل ہو جانا عوام الناس کے لیے کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

۲۔ عربوں کی قبائلی اور قومی روایات کے حوالے سے دیکھا جائے تو مکّہ سے آئے ہوئے اہلِ ایمان کے لیے اس معاملے میں بہت بڑی آزمائش تھی۔ ظاہر ہے اہلِ مکّہ کو کعبہ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ ہجرت کے باعث خانہ کعبہ کی جدائی حضور ﷺ سمیت تمام اہلِ ایمان پر بہت شاق گزری تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کے لیے مکہ سے نکلے تو آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کو مخاطب کر کے روتے ہوئے فرمایا تھا کہ اے کعبہ! مجھے تجھ سے بے حد محبت ہے' لیکن تیرے یہاں کے رہنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قیام کے دوران حضور ﷺ کعبہ کی جنوبی دیوار کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا

کرتے تھے۔ اس طرح آپؐ کا رُخ شمال کی طرف ہوتا۔ کعبہ آپؐ کے سامنے ہوتا‘ کعبہ کی سیدھ میں بیت المقدس بھی آ جاتا اور یوں ’’اِستقبالُ القِبلتین‘‘ کا اہتمام ہو جاتا۔ لیکن مدینہ میں آ کر آپؐ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ یہاں ’’اِستقبالُ القِبلتین‘‘ ممکن نہ تھا‘ اس لیے کہ یروشلم مدینہ منورہ کے شمال میں واقع ہے‘ جبکہ مکہ مکرمہ جنوب میں ہے۔ اس طرح بیت المقدس کی طرف رخ کرنے سے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں خصوصاً مہاجرین کے لیے بہت بڑا امتحان تھا کہ آیا وہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں یا اپنی پرانی عقیدتوں اور روایات کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس امتحان کا ایک خصوصی پہلو یہ بھی تھا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے متعلق کوئی حکم قرآن مجید میں منقول نہیں (ممکن ہے حضور اکرم ﷺ کو یہ حکم وحی خفی کے ذریعے دیا گیا ہو)۔ گویا یہ امتحان خالصتاً اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے تھا۔ بہرحال مکہ سے آنے والے تمام مہاجرین اس امتحان میں سرخرو ہوئے‘ اور ان میں سے کسی کو بھی اس معاملے میں کوئی تردّد نہ ہوا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کی تربیت کے فیضان سے وہ لوگ دین کے اصل تقاضوں کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دین اصل میں حضور ﷺ کے نقوشِ پا کی پیروی کا نام ہے۔ علامہ اقبال نے یہ اہم نکتہ ہمیں ان الفاظ میں سمجھایا ہے: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

۳۔ دوسری طرف یہ معاملہ انصارِ مدینہ کے لیے بھی باعث آزمائش تھا۔ اوس اور خزرج قبائل کے یہ لوگ مدینہ میں ایک مدت سے یہودی علماء کے زیر اثر تھے‘ بلکہ مشہور انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تو خود علماء یہود میں سے تھے۔ اس اعتبار سے وہ لوگ اپنے دلوں میں بیت المقدس سے خصوصی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ بنائے جانے کے حکم کی تعمیل میں ان کا بھی امتحان تھا‘ جس میں وہ سب بھی سرخرو ہوئے۔

۴۔ بہت سے لوگوں کو یہ خیال بھی پریشان کیے دے رہا تھا کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا تو ہم نے اتنے عرصے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے جو نمازیں پڑھی ہیں‘ ان کا کیا بنے گا؟ کیا ہماری وہ سب نمازیں ضائع ہو گئیں؟ ایسے تمام لوگوں کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔

۵۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ سیاسی اعتبار سے بھی بہت اہم تھا۔ مثلاً تحویلِ قبلہ کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیوں میں یک دم شدت آ گئی۔ اب تک مسلمان چونکہ یہودیوں کے قبلہ ہی کو اپنا قبلہ مانتے تھے‘ اس لیے وہ مسلمانوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ یہ بھی گویا ہمارے ہی دین کے پیروکار ہیں‘ لیکن تحویلِ قبلہ کی وجہ سے ان کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ تو محمد (ﷺ) کے زیرسایہ ایک نئی امت کی تشکیل ہونے جا رہی ہے۔

آیت ۱۴۲ ﴿سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ ’’عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے احمق اور بیوقوف لوگ‘‘

﴿مَا وَلّٰىهُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِهِمُ الَّتِىۡ كَانُوۡا عَلَيۡهَا ؕ﴾ ''کس چیز نے پھیر دیا انہیں اس قبلے سے جس پر یہ تھے؟''

یعنی سولہ سترہ مہینے تک تو مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے' اب یکا یک انہیں بیت اللہ کی طرف کس چیز نے پھیر دیا؟

﴿قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب!''

یاد رہے یہی الفاظ سورۃ البقرۃ کے چودھویں رکوع (آیت ۱۱۵) میں تحویلِ قبلہ کے مضمون کی تمہید میں بھی آئے ہیں' مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک سمت میں محدود نہیں ہے' بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب اُسی کے ہیں۔

﴿يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴿۱۴۲﴾﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔''

آیت ۱۴۳ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے''

نوٹ کیجیے! نئی اُمتِ مُسلمہ کے تقرر سے متعلق اس حکم کا ذکر یہاں تحویل قبلہ کے حوالے سے آیا ہے کہ اے مسلمانو! تم اس تحویل قبلہ کو معمولی واقعہ نہ سمجھو' بلکہ قبلہ کی یہ تبدیلی تو علامت ہے اس منصب کی تبدیلی کی جو اب تمہیں عطا کر دیا گیا ہے۔ یاد رکھو! اب تمہیں ''اُمتِ وسط'' کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے:

﴿لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ﴾ ''تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔''

تمہارے اس منصب کے حوالے سے اب تم لوگوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) نے جس دین کی گواہی تم پر دی ہے اب تم لوگ اپنے قول و عمل سے پوری نوعِ انسانی پر اس دین کی گواہی دینے کی فکر کرو۔ اس حیثیت سے تم لوگ اب محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) اور نوعِ انسانی کے درمیان تا قیامِ قیامت ایک واسطہ (link) بن گئے ہو۔ اب تک تو دنیا میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک نبی کی تعلیم ختم ہو جاتی تھی یا اس میں تحریف ہو جاتی تھی تو دوسرا نبی آ جاتا تھا۔ اس طرح پے در پے انبیاء و رسل علیہم السلام چلے آ رہے تھے اور ہر دور میں ہدایت کا یہ معاملہ تسلسل کے ساتھ چل رہا تھا' لیکن اب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا اب تا قیامِ قیامت لوگوں تک دین پہنچانے اور ان پر حجت قائم کرنے (شہادت علی الناس) کا فریضہ تمہیں ادا کرنا ہے۔

﴿وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِىۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَآ﴾ ''اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر (اے نبی ﷺ!) آپ پہلے تھے''

﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ﴾ ''مگر یہ جاننے کے لیے (یہ ظاہر کرنے کے لیے) کہ کون رسولؐ کا اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے اُلٹے پاؤں!''

نوٹ کیجیے! یہاں اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کے فیصلے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بعد وحی خفی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کا اپنا اجتہاد ہو اور اسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ یہاں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو جو قبلہ بنایا تھا تو اس سے مقصود مسلمانوں کا امتحان تھا کہ ان میں سے کون اتباعِ رسول ﷺ کی روش پر قائم رہتا ہے اور کون اس سے پھر جاتا ہے۔ بہرحال اس امتحان میں سب کے سب اہلِ ایمان سرخرو ہوئے۔

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی بات تھی مگر ان کے لیے (دشوار نہ تھی) جن کو اللہ نے ہدایت دی۔''

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ عام لوگ دین کے ظواہر کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں اور ایسے معاملات میں کوئی چھوٹی سی تبدیلی بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تحویلِ قبلہ واقعی بہت حساس اور پیچیدہ معاملہ تھا۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔''

ایمان سے یہاں مراد نماز ہے جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس تشویش کے جواب میں فرمائی گئی جو بعض مسلمانوں کو لاحق ہوگئی تھی کہ ہماری اُن نمازوں کا کیا بنے گا جو ہم نے سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہیں؟ چنانچہ یہاں واضح کر دیا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اتباع میں کیا گیا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں ضائع نہیں ہوتا۔ جس وقت اللہ کے رسولؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں اس وقت اللہ کے ہاں تمہارا وہ عمل مقبول ٹھہرا، اور اب جبکہ آپ ﷺ نے بیت اللہ کی طرف رخ کر لیا تو سمجھ لو کہ اب اللہ کی رضا بھی اسی میں ہے۔ تو اے مسلمانو! تمہیں رسول اللہ ﷺ کے حکم کا پابند رہنا چاہیے اور آپ ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کو اپنا شعار بنائے رکھنا چاہیے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۳﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انسانوں کے حق میں بہت ہی شفیق اور بہت ہی رحیم ہے۔''

نیکی کی حقیقت

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۝ (البقرۃ)

''نیکی'' دراصل ہر انسان کی ''ضرورت'' ہے' لیکن ہر انسان نیکی کی تعریف (definition) اپنی پسند اور اپنی سہولت کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں ایک طبقے کا نیکی کے بارے میں تصور یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے' لین دین میں دیانتداری برتنا چاہیے' کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے' کسی کا حق نہیں مارنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ باقی یہ کہ کوئی نماز روزہ کی پابندی کرے یا نہ کرے' اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح چور' لٹیرے' گرہ کٹ اور ڈاکو بھی اپنے ہاں نیکی کا تصور رکھتے ہیں اور اپنے اس تصور کے مطابق وہ اپنی ''کمائی'' سے بیواؤں' یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کر کے آخرت کے لیے ''ثواب'' جمع کرنے کی فکر میں بھی رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جسم فروش عورتیں بھی ''نیکیاں'' کمانے کے لیے خیرات بانٹتی ہیں اور مسجدیں تعمیر کراتی ہیں۔ دوسری طرف ہمارے مذہبی طبقات کے لوگوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ دین کی روح سے بالکل نا آشنا ہیں اور عبادات کے صرف ظواہر کو لیے بیٹھے ہیں۔ عملی زندگی میں یہ لوگ ''مچھر چھانتے ہیں اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہیں''۔ آپس میں ان کے مابین رفع یدین' آمین بالجہر اور رکعاتِ تراویح کی تعداد جیسے مسائل پر تو شدید اختلافات ہیں' لیکن سودی کاروبار کے بارے میں سب متفق ہیں۔ سود لینے دینے سے نہ تو کسی کی ''حنفیت'' متاثر ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کی ''اہلِ حدیثیت'' پر کوئی آنچ آتی ہے۔

بہرحال ہمارے ہاں عام طور پر لوگ نیکی کے مسخ شدہ (perverted) تصورات کے پیروکار ہیں۔ اس صورتِ حال پر اندھوں کے ہاتھی دیکھنے کی مثال صادق آتی ہے کہ ان میں سے جس نے ہاتھی کے جس عضو کو ٹٹولا' اس نے سمجھا کہ بس یہی ہاتھی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مختلف افراد اور مختلف طبقات نے نیکی کے تصور کو اپنی اپنی سہولت اور پسند کے مطابق تقسیم کر رکھا ہے۔ بقول اقبال: ؎

اُڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

چنانچہ یہ آیت اس اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے کہ اس میں نیکی کی اصل حقیقت کو بہت جامع انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ نیکی کی جڑ اور بنیاد کیا ہے؟ اس کی روح کیا

ہے؟اس کے مظاہر کیا ہیں؟ان میں سے کون سے مظاہر زیادہ اہم ہیں اور کون سے ثانوی حیثیت کے حامل ہیں؟ اس لحاظ سے یہ آیت اس قدر جامع ہے کہ اس کی روشنی میں قرآن حکیم کے علم الاخلاق پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جا سکتی ہے۔ گویا اخلاقیاتِ قرآنی (Quranic Ethics) کے لیے یہ آیت جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔اس حوالے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت یہاں تحویل قبلہ کے سیاق وسباق میں آئی ہے۔سورۃ البقرۃ میں تحویل قبلہ سے متعلق چار رکوع (۱۵ تا ۱۸) تو مسلسل ہیں۔اس سے پہلے چودھویں رکوع میں اس موضوع کی تمہید کے طور پر آیت ۱۱۵ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ﴾ اور اس کے بعد یہاں اٹھارہویں رکوع میں اس ضمن میں یہ آیت آئی ہے۔اپنے مضمون کی مناسبت سے اس آیت کا نام ''آیت البر'' ہے۔اس ضروری وضاحت کے بعد اب ہم اس آیت کا مطالعہ کرتے ہیں:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو''

ظاہر ہے مشرق اور مغرب سمیت تمام آفاق اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں'وہ کسی بھی سمت کو تمہارے لیے بطور قبلہ مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو! نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم لوگ اپنا رخ کسی خاص سمت کی طرف پھیر لو —— واضح رہے کہ یہاں اس عمل کے نیکی ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کسی ایک سمت سے رخ پھیر کر کسی دوسری طرف کر لینا بھی یقیناً نیکی ہے' لیکن اس ضمن میں اصل اہمیت کسی عمل کے باطن یعنی اس کی روح کی ہے۔اگر کسی عمل کا باطن صحیح ہوگا تو تبھی وہ عمل نیکی شمار ہوگا' ورنہ نہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ ''بلکہ نیکی تو اُس کی ہے''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ ''جو ایمان لائے اللہ پر' یومِ آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔''

نوٹ کیجیے! اس جملے میں گویا نیکی کی جڑ اور بنیاد کا ذکر ہوا ہے۔نیکی کی جڑ اور بنیاد ایمان ہے اور ایمانیات میں بھی یہاں سب سے پہلے اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔یعنی انسان جو نیکی کر رہا ہے وہ صرف اللہ کے لیے کرے اور اس کا اجر بھی وہ اسی سے چاہے۔ پھر اس کے لیے اس کا آخرت پر بھی ایمان ہونا ضروری ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نیکی کا اجراُسے دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مطلوب ہو۔اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا متعلقہ عمل نیکی کے بجائے سوداگری شمار ہوگا۔گویا اس نے دین کو بھی خرید وفروخت کی چیز بنا لیا ہے۔ یومِ آخرت کے بعد یہاں فرشتوں' کتابوں اور انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔واضح رہے کہ یہ تینوں مل کر ایک یونٹ بنتے ہیں جس کا نام ''ایمان بالرسالت'' ہے۔یعنی الہامی کتب وحی کی صورت میں فرشتے کے ذریعے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہوئیں۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کے ساتھ یہ ہے کہ نیکی کا ایک مجسمہ' ایک ماڈل یا ایک آئیڈیل ''اُسوۂ

رسول ﷺ‘‘ کی صورت میں ہمہ وقت ہمارے سامنے رہنا چاہیے‘ اس میں کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس ضمن میں اسوۂ رسول ﷺ کے ’’معتدل‘‘ معیار کی پیروی کا اہتمام نہ کیا جائے تو انسان ’’لازماً‘‘ افراط و تفریط کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم کسی عمل کے ظاہری خدوخال میں نیکی کا رنگ بھرنے کے لیے اسوۂ رسول ﷺ کو معیار سمجھیں اور ٹھیک ٹھیک اسی معیار اور اسی طریقے کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ اس طریقے میں نہ تو کوئی کوتاہی یا کمی ہونے دیں اور نہ ہی اس پر کوئی اضافہ کرنے کی جسارت کریں۔

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ ’’اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود‘‘

یعنی مال کی محبت کے علی الرغم مال خرچ کرے۔ یہاں ’’عَلٰی حُبِّہٖ‘‘ میں ضمیر متصل اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ مال کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ مال اگرچہ انسان کو محبوب ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرے۔

﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ ’’قرابت داروں‘ یتیموں‘ محتاجوں‘ مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔‘‘

گویا نیکی کے مظاہر میں اوّلین مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ اگر کسی بندۂ مسلمان کے ہاں عبادات کے تو انبار لگے ہوں مگر دل میں شقاوت ہو‘ انسان کو حاجت میں دیکھ کر اس کا دل نہ پسیجے اور تجوری کی طرف ہاتھ نہ بڑھے‘ جبکہ تجوری میں مال موجود بھی ہو‘ تو یہ طرزِ عمل دین کی روح کے بالکل منافی ہے۔ اس حوالے سے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۲ کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ﴾ ’’تم نیکی کے مقام کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں محبوب ہے‘‘۔ یعنی جس شے سے طبیعت اکتا گئی ہو‘ جو کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہوں وہ کسی کو دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کی کوشش نہ کی جائے‘ بلکہ جو شے خود کو پسند ہو‘ دل سے عزیز ہو‘ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کی جائے۔

﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾ ’’اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔‘‘

یہاں حکمتِ دین کا یہ اہم نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ نیکی کے مظاہر گنواتے ہوئے اس آیت میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایمان اور انسانی ہمدردی کے ذکر کے بعد آیا ہے۔ اس لیے کہ روحِ دین ’’ایمان‘‘ ہے اور نیکی کے مظاہر میں سے مظہر اوّل انسانی ہمدردی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں ’’زکوٰۃ‘‘ کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے‘ جبکہ اس سے قبل ایتائے مال کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت سنن الترمذی میں موجود رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں ملتی ہے:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) ’’یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔‘‘

روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ گویا صاحبِ نصاب لوگوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی ہے تو اب انفاقِ مال کے ضمن میں ہمارے ذمہ مزید اور کوئی تقاضا نہیں ہے‘ بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی

مستحقین کا حق ہے۔

ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایمان کو تر و تازہ رکھنے والی شے نماز ہے۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ جبکہ انسانی ہمدردی میں مال خرچ کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے زکوٰۃ ہے۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ ''اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کرلیں۔''

کسی بھی انسانی معاشرے میں اجتماعی زندگی کے تمام معاملات مختلف نوعیت کے معاہدوں کی بدولت ہی انجام پاتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ شریعت اسلامی کا ''ایفائے عہد'' سے متعلق حکم صرف روزمرہ کاروبارِ زندگی کے دوران افراد کے باہمی وعدوں' معاہدوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق ہر سطح کے ہر قسم کے عہد و پیمان اور معاہدوں پر ہوتا ہے۔ جیسے انسان کا عالمِ اَرواح میں اللہ تعالیٰ سے کیا جانے والا 'عہد الست' شوہر اور بیوی کے مابین نکاح کا سماجی معاہدہ (social contract)' آجر اور مستاجر کے درمیان تنخواہ وغیرہ کے بارے میں طے پانے والا معاہدہ' کسی ملک کے سیاسی و انتظامی نظام کو چلانے کے لیے مختلف سطحوں پر کیے جانے والے چھوٹے بڑے لاتعداد معاہدے' بین الاقوامی سطح پر ملکوں اور حکومتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے۔ چنانچہ معاشرے کا ہر انسان اگر واقعتاً اپنے ہر عہد و پیمان کی پاسداری شروع کر دے تو معاشرتی زندگی کے تمام معاملات سدھر جائیں گے۔ بہرحال ایک بندۂ مؤمن اپنے ہر عہد اور ہر معاہدے کو پورا کرنے کا مکلف ہے۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ﴾ ''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔''

گویا اللہ تعالیٰ کو جو نیکی پسند ہے وہ بدھ مت کے بھکشوؤں اور خانقاہوں کے مجاوروں کی نیکی کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ نیکی کے اس راستے پر چلتے ہوئے باطل کو چیلنج کر کے اس کا سر کچلنے کے لیے میدان میں بھی آنا پڑتا ہے اور پھر اس میدان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نہ صرف طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں' بلکہ ضرورت پڑنے پر گردنیں بھی کٹوانا پڑتی ہیں۔ جیسے کہ صحابہ کرام ؓ نے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے قدم قدم پر سختیاں جھیلیں اور جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ واضح رہے کہ دنیا کے ہر نظامِ اخلاق میں ''خیر اعلیٰ'' (summum bonum) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ سب سے اعلیٰ اور اونچی نیکی کون سی ہے! چنانچہ قرآن حکیم کی رو سے سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص حق کے غلبے کے لیے اپنی گردن کٹوا دے اور ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہو جائے جن کا ذکر اس سورت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں (جامِ

شہادت نوش کرلیں) انہیں مردہ مت کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں ہے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

راست بازی اور نیکوکاری کا دعویٰ تو سب ہی کرتے ہیں' لیکن حقیقت میں خوش قسمت یہ لوگ ہیں جنہیں راست بازی اور نیکوکاری کی سند خود اللہ تعالیٰ عطا فرمارہا ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ''اور یہی لوگ حقیقت میں متقی ہیں۔''

معلوم ہوا کہ ''متقین'' کی پہچان کوئی مخصوص لباس یا کوئی خاص وضع قطع نہیں ہے' بلکہ نیکی اور تقویٰ کی حامل انسانی شخصیت کا اصل تعارف وہ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت کا خاکہ ہے جس کا باطن نورِ ایمان سے منور ہے اور اس کا کردار نیکی کے مندرجہ بالا مظاہر کے رنگا رنگ پھولوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ ان میں سے ہر پھول موقع محل کی ضرورت اور مناسبت سے اپنی خوشبو بکھیرتا ہے اور یوں ''متقین'' کے وجود سے معاشرے کی فضا ہر لحظہ معطر رہتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (آمین یا ربّ العالمین)۔

روزوں کی اہمیت اور فرضیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (البقرۃ)

نزولِ قرآن سے قبل صوم' صیام' صائم وغیرہ الفاظ عربوں کے ہاں عام طور پر گھوڑوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ وہ لوگ اپنے گھوڑوں کو لوٹ مار کی مہمات اور قبائلی جنگوں کے دوران بھوک پیاس اور موسمی سختیوں کا عادی بنانے کے لیے ان کے مونہوں پر توبڑے چڑھا کر انہیں بھوکا پیاسا رہنے کی مشق کراتے اور پھر بھوک اور پیاس کی حالت میں انہیں صحرا کی لو کے رخ دوڑاتے۔ گھوڑے کی اس تربیت کے عمل کو وہ لوگ ''صوم'' کہتے اور جو گھوڑا تربیت کے ان مراحل سے گزر رہا ہوتا وہ ''صائم'' کہلاتا۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے ہاں روزہ رکھنے کا رواج تھا۔ وہ لوگ عاشورہ کا روزہ خصوصی اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے' اس لیے کہ اس روز مصر میں بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات ملی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ابتداءً ہر مہینے ''ایامِ بیض'' کے تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ میرے نزدیک سورۃ

البقرہ کے رکوع ۲۳ کی ابتدائی دو آیات (آیت ۱۸۳ اور ۱۸۴) میں آپ ﷺ کے اسی حکم کی توثیق ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ روزے بھی مسلمانوں پر تدریجاً فرض کیے گئے۔ ظاہر ہے اگر یکایک پورے مہینے کے روزے فرض کر دیے جاتے تو وہ یقیناً لوگوں پر شاق گزرتے۔ چنانچہ لوگوں کو روزوں کا بتدریج عادی بنانے کے لیے ابتداءً ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور یہ روزے مختلف موسموں میں آتے رہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزوں کا جو ابتدائی حکم تھا اس میں علی الاطلاق روزے کے بدلے میں فدیہ دینے کی اجازت تھی۔ یعنی اگر کسی شخص کو بیماری یا سفر جیسا عذر بھی درپیش نہ ہوتا اور اس کے باوجود وہ روزہ نہ رکھنا چاہتا تو اسے اجازت تھی کہ وہ روزے کے بدلے فدیہ ادا کر دے۔ لیکن رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد فدیہ کی یہ رخصت ختم کر دی گئی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے اس رخصت کو ایسے شخص کے لیے باقی رکھا جو بہت بوڑھا ہو‘ یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس میں روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔

ان دو آیات (آیت ۱۸۳ اور ۱۸۴) کی مذکورہ تاویل کی طرف میرا ذہن بہت پہلے منتقل ہو چکا تھا لیکن چونکہ کسی تفسیر میں مجھے اس کا تذکرہ نہ مل سکا اس لیے اس کے اظہار کے حوالے سے میں جھجک محسوس کرتا رہا۔ پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور امام رازیؒ بھی ان آیات کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس تاویل پر میرا دل مطمئن ہو گیا۔ واضح رہے کہ ایامِ بیض کے نفل روزے رسول اللہ ﷺ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد بھی مستقل طور پر رکھتے رہے۔

روزے کے احکام پر مشتمل سورۃ البقرۃ کا تئیسواں (۲۳) رکوع چھ آیات پر مشتمل ہے۔ یہ رکوع اس اعتبار سے قرآن مجید کا منفرد مقام ہے کہ یہاں روزے کی حکمت‘ غرض و غایت اور اس موضوع سے متعلقہ تمام ضروری احکام ان چھ آیات میں ایک ہی جگہ بیان کر دیے گئے ہیں۔ جبکہ بہت سے دیگر موضوعات کے بارے میں احکام قرآن مجید میں عموماً متفرق مقامات پر آئے ہیں۔ مثلاً نماز کی فرضیت‘ اس کے بارے میں تاکید‘ نمازِ قصر‘ نمازِ خوف‘ وضو‘ تیمّم وغیرہ کے احکام اور نماز کے بارے میں دیگر تفصیلات کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ملتا ہے۔

آیت ۱۸۳ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ ’’اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔‘‘

جس طرح اہلِ عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کا عادی بناتے تھے اسی طرح تم نے بھی اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے کو بھوک‘ پیاس اور ترکِ شہوات کی مشق کرانی ہے تاکہ یہ سرکشی کی روش چھوڑ کر اطاعت کا خوگر ہو جائے اور یہ کہ اس طرح تم لوگ خود کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال کی سختیاں جھیلنے کے لیے تیار کر سکو۔ واضح رہے کہ سورۃ البقرۃ کے اگلے رکوع سے قتال کی بحث شروع ہو رہی ہے۔ چنانچہ

روزے سے متعلق یہ آیات ایک لحاظ سے قتال کے حکم کی تمہید کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

آیت ۱۸۴ ﴿اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ﴾ ''گنتی کے چند دن ہیں۔''

''مَعۡدُوۡدٰت'' جمع قلت ہے' جس کا اطلاق تین سے نو تک کے اعداد پر ہوتا ہے۔ یہ گویا اس کا ثبوت ہے کہ یہاں جن روزوں کا ذکر ہو رہا ہے ان سے مہینے بھر کے روزے مراد نہیں ہیں۔

﴿فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ﴾ ''اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

﴿وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ﴾ ''اور جو اس کی طاقت رکھتے ہوں (اور وہ روزہ نہ رکھیں) اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا۔''

ان دو آیات کی تفسیر میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں' لیکن میں یہاں وہ رائے بیان کر رہا ہوں جو میں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر قائم کی ہے اور جو مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور امام رازیؒ کی رائے کے عین مطابق ہے۔ امام رازیؒ کے بقول ابتداء میں روزوں کی یہ فرضیت علی التعین نہیں تھی بلکہ علی التخییر تھی۔ یعنی روزہ فرض تو کیا گیا لیکن اس کا بدل بھی دے دیا گیا کہ اگر تم روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود نہیں رکھنا چاہتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کرو۔ چونکہ لوگ پہلے سے روزے کے عادی نہیں تھے' لہٰذا یہ رعایت انہیں تدریجاً اس کا خوگر بنانے کے لیے دی گئی۔

﴿فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ ؕ﴾ ''اور جو اپنی مرضی سے کوئی خیر کرنا چاہے تو اُس کے لیے خیر ہے۔''

یعنی اگر کوئی روزہ بھی رکھ لے اور مسکین کو کھانا بھی کھلا دے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔

﴿وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''اور روزہ رکھو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

اس جملے کے اسلوب میں بھی رعایت کا وہی انداز پایا جاتا ہے — تو ان دو آیات میں روزوں کے بارے میں ابتدائی حکم ہے۔ ممکن ہے رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان نے ہر مہینے میں تین دن کے روزے اس حکم کی تعمیل میں رکھنے شروع کیے ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان روزوں کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو اپنے طور پر دیا ہو اور بعد میں ان آیات کے ذریعے آپ ﷺ کے اس حکم کی توثیق کر دی گئی ہو۔

آیت ۱۸۵ ﴿شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''

﴿ہُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ﴾ ''لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

﴿فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ ؕ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے (یا جو شخص بھی اس مہینے میں مقیم ہو) اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔''

اب یہ حکم خاص رمضان کے روزوں کے بارے میں ہے۔ اس حکم کے ذریعے وجوب علی التخییر کا وہ معاملہ ختم کر دیا گیا جس کا ذکر گزشتہ آیت (۱۸۴) میں آیا ہے' اور وجوب علی التعین کے انداز میں فرمادیا گیا ہے کہ رمضان کے روزے تم نے لازماً رکھنے ہیں۔

﴿وَمَنۡ كَانَ مَرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

یعنی معذوری کی صورت میں گزشتہ آیت میں دی گئی رعایت رمضان کے روزوں کے حوالے سے بھی برقرار رکھی گئی۔

﴿يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۡ﴾ ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

لہٰذا تم لوگ مرض یا سفر کی صورت میں روزہ رکھ کر اپنے اوپر خواہ مخواہ جبر مت کرو۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان بھی بہت واضح ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ رمضان کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کسی مہم پر تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سفر میں بھی روزہ رکھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ منزل پر پہنچ کر جب خیمے نصب کرنے کا وقت آیا تو بہت سے روزہ دار نڈھال ہو کر گر گئے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَيۡسَ مِنَ الۡبِرِّ الصَّوۡمُ فِى السَّفَرِ)) (متفق علیه) ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے''۔ لیکن ہمارے ہاں بعض لوگ نیکی کے بارے میں خود ساختہ معیارات پر عمل پیرا رہنے پر بضد رہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کو ۱۰۵ درجے کا بخار ہے لیکن اس کے باوجود بھی اسے اصرار ہے کہ ''روزہ تو میں نہیں چھوڑوں گا''۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا بھی ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے۔

﴿وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ﴾ ''تاکہ تم تعداد پوری کرو''

مرض یا سفر کے دوران جو روزے چھوٹ جائیں ان کی تعداد تمہیں دوسرے دنوں میں پوری کرنا ہوگی۔ یعنی فدیہ دینے کی مذکورہ رعایت رمضان کے روزوں کے حوالے سے ختم کر دی گئی۔

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰٮكُمۡ﴾ ''اور تاکہ تم بڑائی کرو اللہ کی اُس پر جو ہدایت اُس نے تمہیں بخشی ہے''

﴿وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝۱۸۵﴾ ''اور تاکہ تم شکر کر سکو۔''

وہ نعمتِ عظمیٰ جو قرآن حکیم کی شکل میں تمہیں عطا ہوئی ہے' تم اس کا شکر کرو۔ اس حوالے سے شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ماہِ رمضان کے دوران دن کے اوقات میں تم لوگ روزہ رکھو تاکہ اس سے تمہارا حیوانی

وجود اور اس کے حیوانی تقاضے کمزور پڑیں اور راتوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر اس کا کلام پڑھو اور سنو تاکہ تمہاری روح کی آبیاری ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تمہارے اندر سے تقرّب الی اللہ کی ایک پیاس اُبھرے گی۔ اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے میرے دو کتابچوں ''عظمتِ صوم'' اور ''عظمتِ صیام و قیام رمضان مبارک'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان کتابچوں میں روزے کی حکمت اور غرض و غایت سے متعلقہ تمام اہم موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں!

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (البقرۃ)

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں۔''

میرے نزدیک یہ جملہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے۔ کاش ہم انسان اس اعلان کی عظمت اور اہمیت کو سمجھ جائیں کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ فصل ہے تو ہماری اپنی خباثت کی وجہ سے ہے۔ اب ظاہر ہے جس شخص نے مستقل طور پر حرام خوری کی روش اپنا رکھی ہو وہ کس منہ سے اللہ کو پکارے گا۔ چنانچہ ایسے شخص کو جب اللہ تعالیٰ سے رابطے کی ''ضرورت'' محسوس ہوتی ہے تو وہ نذرانہ لے کر پیر صاحب کے پاس حاضر ہو جاتا ہے کہ حضور اس ''بندۂ عاجز'' کے لیے دعا کر دیجیے۔ تو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان دراصل خود انسان کا اپنا نفس حائل ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے' راہ روِ منزل ہی نہیں!

چنانچہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ کرنے کے لیے انسان کو کسی پوپ' پادری' پنڈت' پروہت یا پیر کا واسطہ ڈھونڈنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال نے اللہ تعالیٰ کی ''رضا'' کی نمائندگی کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''

میرا ہر بندہ جب چاہے' جہاں چاہے مجھ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔ ''اجابت'' کے مفہوم میں کسی کی پکار کا سننا' اس کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا بھی شامل ہے۔ یعنی پکارنے والے کی پکار سنی بھی جائے گی' پکار کا جواب بھی دیا جائے گا اور اس کی التجا کو قبول بھی کیا جائے گا' لیکن اس کے لیے ایک لازمی شرط ہے:

﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''

﴿وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان رکھیں''

گویا یہ معاملہ یک طرفہ طور پر نہیں' دوطرفہ انداز میں آگے بڑھے گا۔ جیسے اسی سورت کی آیت ۱۵۲ میں فرمایا گیا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہاری قدردانی کروں گا۔ تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میں تمہاری طرف دوڑ کر آؤں گا۔ تم بالشت بھر میرے قریب آؤ گے تو میں ہاتھ بھر تمہارے قریب آؤں گا۔ تم میری جناب میں توبہ کرو گے تو میں بھی اپنی نظر کرم تمہاری طرف متوجہ کرلوں گا۔ لیکن اگر تم رُخ موڑ لو گے تو میں بھی رُخ موڑ لوں گا —— تو بندے اور اللہ کے درمیان رابطے اور تعلق کی ''پالیسی'' بالکل واضح ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس رابطے اور تعلق کی ابتدا بندے کی طرف سے ہونی چاہیے' کیونکہ غرض اور ضرورت اس کی ہے' اللہ کی بندے سے کوئی غرض اور ضرورت نہیں۔

بندوں اور اللہ کے مابین اس دوطرفہ معاملے کا ذکر سورۂ محمد کی آیت ۷ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ لیکن اگر مسلمان دوستی کی پینگیں تو بڑھائیں اللہ کے دشمنوں کے ساتھ اور قنوتِ نازلہ پڑھ پڑھ کر مدد چاہیں اللہ سے' تو ایسی دعاؤں کی شنوائی کیسے ہوگی؟ بہرحال اللہ تعالیٰ سے رابطے کے لیے ضروری نہیں کہ انسان پہلے ولی کامل بنے' بلکہ اگر کوئی بھی انسان خلوصِ نیت سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کو پکارے گا تو وہ اس کی پکار کو ضرور سنے گا۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝﴾ ''تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان بالآخر رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے!

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ (البقرۃ)

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے''

یہ بہت سخت اور لرزا دینے والا انداز ہے۔ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مکہ سے جو اہلِ ایمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے وہ بہت سخت آزمائشوں کا سامنا کر چکے تھے' لیکن انصارِ مدینہ کو ان کے مقابلے میں نسبتاً کم تکالیف برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اب مدینہ میں نبی اکرم ﷺ کی تحریک چونکہ روز بروز مشکل حالات کی طرف بڑھ رہی تھی اور مستقبل قریب میں جہاد و قتال کی صورت میں اہلِ ایمان کو بڑے بڑے امتحانات سے واسطہ پڑنے والا تھا اس لیے انہیں ممکنہ حالات کے بارے میں پیشگی خبردار کیا جا رہا ہے کہ:

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بے — شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

اس آیت میں اگرچہ خطاب کا انداز تو عمومی ہے‘ لیکن روئے سخن خصوصی طور پر انصارِ مدینہ کی طرف ہے۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے جہاں خطاب تو عام انداز میں کیا گیا ہے‘ لیکن مخاطب کوئی خاص طبقہ یا گروہ ہے۔ درحقیقت یہاں انصارِ مدینہ کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا پھولوں کی سیج والا معاملہ نہیں ہے۔

﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ﴾ ’’حالانکہ ابھی تک تمہارے اوپر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔‘‘

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا﴾ ’’پہنچی ان کو سختی بھوک کی اور تکلیف اور وہ ہلا مارے گئے‘‘

﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’یہاں تک کہ (وقت کا) رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟‘‘

﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝۲۱۴﴾ ’’(تب انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ) آگاہ ہو جاؤ‘ یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔‘‘

دراصل اللہ تعالیٰ ایمان کے دعویداروں میں سے کھوٹے اور کھرے کو الگ کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے حق کے اس راستے میں اس کی طرف سے تکلیفیں اور آزمائشیں آتی ہیں۔ جیسے اس سورت (سورۃ البقرۃ) کی آیت ۱۵۵ میں واضح فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾ ’’اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے‘‘۔ تو حق کے علَم برداروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا راستہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے انہیں قدم قدم پر سختیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور قربانیاں دینی ہیں۔ بقول اقبال ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے ۔۔۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کے راستے پر چلنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور آتی ہے‘ لیکن آزمائشوں اور قربانیوں کے بعد۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی اہلِ ایمان سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کی پے در پے قربانیاں دیتے ہوئے بالآخر غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے سخت ترین امتحان میں بھی سرخرو ہو گئے تو تب انہیں یہ خوشخبری سنائی گئی: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ (الصف) ’’اور جو دوسری چیز تمہیں پسند ہے (وہ بھی تمہیں ملے گی)‘ اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اور (اے نبی ﷺ!) اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے!‘‘ یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے جب تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلتے چلے جائیں گے۔

زوجین کے حقوق و فرائض کا معاملہ

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ (البقرۃ)

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ﴾ ''اور جن عورتوں کو طلاق دے دی جائے اُن پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔''

طلاق کے بعد عورت کے لیے تین ماہ کی عدت ہے۔ اگر شوہر نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوں تو وہ اس عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے' البتہ تیسری طلاق کے بعد اسے رجوع کا حق نہیں ہے۔ طلاقِ رجعی (ایک یا دو طلاقوں) کے بعد بھی اگر عدت کے دوران شوہر رجوع نہ کرے تو عدت ختم ہونے پر رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ ''اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے ارحام میں جو کچھ پیدا کر دیا ہو وہ اسے چھپائیں''

﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''اگر وہ فی الواقع اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔''

تین حیض کی مدت اسی لیے مقرر کی گئی ہے کہ عورت کے حمل کے حوالے سے صورتِ حال واضح ہو جائے۔ اگر عورت حاملہ ہو لیکن وہ اپنا حمل چھپا رہی ہو تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ﴾ ''اور ان کے شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعۃً اصلاح چاہتے ہوں۔''

اسے ''رجعت'' کہتے ہیں۔ یعنی پہلی یا دوسری طلاق کے بعد عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس پر بیوی کو انکار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم تو مجھے طلاق دے چکے ہو' اب میں تمہاری بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪﴾ ''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔''

یعنی ان کے لیے جو حقوق ہیں وہ ان کی ذمہ داریوں کی مناسبت سے ہیں۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ ''اور مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

موجودہ زمانے میں بعض لوگ اس آیت سے مساواتِ مردوزن کا فلسفہ اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض مترجمین نے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪﴾ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''عورتوں کے حقوق بھی مَردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مَردوں کے اُن پر حقوق ہیں''۔ یہ ترجمہ اس لیے درست نہیں ہے کہ اسلامی شریعت میں شوہر اور بیوی کے درمیان مساوات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پھر یہ ترجمہ اس لیے بھی غلط ہے کہ اس میں ''لِ'' اور ''عَلٰی'' کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ واضح رہے کہ عربی میں ''لِ'' کسی کے حق کے لیے اور ''عَلٰی'' کسی کی ذمہ داری کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اس ٹکڑے کا ترجمہ اس طرح ہوگا: وَلَهُنَّ ''اوران کے لیے حقوق ہیں''، مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ ''جیسی کہ ان پر ذمہ داریاں ہیں''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے شوہر پر جیسی ذمہ داری ڈالی ہے ویسے ہی اسے حقوق دیے ہیں اور جیسی ذمہ داری بیوی پر ڈالی ہے اُسی مناسبت سے اس کو حقوق دیے ہیں۔ اور اگلے جملے میں مزید وضاحت فرمادی ہے: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ ''اور مردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے''۔ اس جملے کے بعد تو اس آیت سے میاں بیوی کے درمیان مساوات ثابت کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ آیت کے آخر پر تحکمانہ انداز میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو خواہ ناپسند ہو، یہ اُس اللہ کا حکم ہے جو عزیز اور زبردست ہے، وہ جو چاہے حکم دے۔ اور یہ کہ وہ کمال حکمت والا بھی ہے اور اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

اس آیت کی وضاحت کے لیے دراصل قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے، جس کا یہ موقع نہیں۔ البتہ درج ذیل سطور میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس موضوع سے متعلق چند اہم نکات پیش کیے جارہے ہیں:

۱۔ اسلام انسان کو متمدّن زندگی گزارنے کی تعلیم وترغیب دیتا ہے۔ تمدن انسانوں کے مل جل کر رہنے کا نام ہے۔ یہ انسان کی ضرورت بھی ہے اور اس کی فطرت و جبلت کا تقاضا بھی۔ انسانی تمدن یا معاشرے کی بنیادی اکائی خاندان ہے جس کی تشکیل ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کا یہ تعلق نسل انسانی کی بقا کی ضمانت بھی ہے اور انسانی جذبہ شہوت کی تسکین کا ذریعہ بھی۔ اس جذبے کی تسکین بلاشبہ انسانی ''حیوانی زندگی'' کے مسائل میں سے ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے، بلکہ دورِ حاضر کے مشہور ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶۔۱۹۳۹ء) کے مطابق تو یہ ''انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے''۔ اگرچہ اس موضوع سے متعلق فرائڈ کی بہت سی باتیں میرے نزدیک حقائق کے منافی اور مبالغے پر مبنی ہیں، لیکن اس میں بہرحال کوئی شک نہیں کہ انسان کا یہ داعیہ واقعتاً بہت قوی (potent) اور خطرناک حد تک منہ زور ہے، اور یہ کہ اگر اس ''منہ زور گھوڑے'' کو بے لگام چھوڑ دیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں انسانی تمدن کی صفوں میں ہر طرف فساد اور انتشار برپا ہو جائے گا۔ چنانچہ اسلام نے انسانی زندگی کے اس شعبہ میں نظم وضبط (discipline) قائم کرنے کے لیے نوعِ انسانی کو نہایت مفید اور مؤثر قوانین پر مشتمل ایک جامع پیکج عطا کیا ہے۔ اسلام نے انسانی معاشرے کے بنیادی یونٹ (خاندان) کی بنیاد نکاح پر رکھی ہے۔ نکاح کے بعد ایک مرد اور ایک عورت جائز اور قانونی طور پر ازدواجی

بندھن میں بندھ جاتے ہیں' اور اس طرح ایک صاف ستھرا مضبوط خاندانی ادارہ وجود میں آتا ہے۔

۲۔ مرد اور عورت انسان ہونے کے ناطے سے بالکل برابر ہیں۔ ایک ہی باپ کی صُلب سے بیٹا بھی پیدا ہوتا ہے اور بیٹی بھی۔ ایک ہی ماں کے رحم میں بھائی بھی پرورش پاتا ہے اور بہن بھی۔ چنانچہ شرفِ انسانیت کے اعتبار سے اور نوعِ انسانی کے افراد ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت باہم مل کر ایک خاندانی ادارے کی بنیاد رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس ادارے کے اندر ان دونوں کی حیثیت برابر نہیں رہتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شرفِ انسانیت کے اعتبار سے تو سب انسان برابر ہیں' لیکن ایک دفتر میں ملازمت کرتے ہوئے کوئی انسان چھوٹا ملازم ہے اور کوئی بڑا ملازم ہے' کوئی افسر ہے تو کوئی ماتحت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دانشور یا فلسفی اس نظریے کا پرچار کرتا ہے کہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان ہر لحاظ سے مساوات ہونی چاہیے اور یہ کہ ان دونوں کے حقوق بالکل برابر ہونے چاہئیں تو یہ ایک نہایت احمقانہ نظریہ ہے۔ اس لیے کہ خاندان ایک ادارہ ہے اور کسی بھی ادارے کا نظام چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ ایک ہو۔ جس طرح کسی محکمہ' ادارہ یا ملک کے ایک جیسے اختیارات کے حامل دو سربراہ نہیں ہو سکتے' اسی طرح خاندانی ادارے کے سربراہی اختیارات میں بھی میاں بیوی برابر کے شریک نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ادارہ بالکل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

۳۔ ایک مرد اور ایک عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے نتیجے میں جو خاندانی ادارہ وجود میں آتا ہے اسلام اس کا سربراہ مرد کو ٹھہراتا ہے۔ یہ مضمون سورۃ النساء آیت ۳۴ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ......﴾ میں پوری وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اس مضمون کی گویا تمہید آئی ہے' تاکہ اسلام کے اس فلسفے کی کڑوی گولی خواتین کے حلق سے تدریجاً نیچے اتاری جائے اور بیویاں اپنے شوہروں کی ''قوامیت'' کو قبول کرنے کے لیے آہستہ آہستہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔

۴۔ قرآن و حدیث میں مردوں کو خصوصی طور پر تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے (تقویٰ اختیار کیے) رہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی اس معاملے میں شرعی احکام کی نافرمانی کرتا ہے اور اپنی ''قوامیت'' کے بل پر ظلم و ناانصافی کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ چنانچہ ایسے شخص کو آخرت میں کڑے احتساب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۵۔ ہمارے ہاں جدید دانشور آیت زیر مطالعہ کے درمیانی فقرے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کو تو بڑی شد و مد سے موضوعِ بحث بناتے ہیں اور اس سے مساواتِ مرد و زن کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن اس سے پہلے جملے ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾ اور بعد کے الفاظ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ سے وہ صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ متعلقہ لوگوں کا یہ طرزِ عمل یقیناً بددیانتی اور تعصب پر مبنی ہے۔

۶۔ اسلام خاندانی ادارے کی اصلاح پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں عائلی معاملات اور خاندانی نظام سے متعلق بہت تفصیلی ہدایات آئی ہیں' بلکہ قرآن حکیم میں جس موضوع پر سب سے زیادہ احکام آئے ہیں وہ یہی عائلی معاملات کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے خاندان کا ادارہ نہ صرف معاشرے کی بنیادی اکائی ہے بلکہ معاشرے کی آئندہ نسلوں کی تربیت اور پرورش کی اہم اور نازک ذمہ داری بھی بنیادی طور پر اسی ادارے پر ہے۔ اس لیے اگر خاندانی اداروں کے اندر اصلاح وفلاح کی فضا قائم ہوگی تو معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ان اداروں میں فساد' بے چینی اور ظلم و ناانصافی کا ماحول ہوگا تو اس ماحول کے منفی اثرات معاشرے کی فضا کو بھی زہر آلود کر دیں گے۔

۷۔ آج کے دور میں کچھ لوگ ''مسلمانی'' کے دعویدار ہونے کے باوجود بھی اسلامی شریعت کے عائلی قوانین کی بعض شقوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں مرد کے حقِ طلاق اور اس سے متعلقہ قوانین کا معاملہ سرفہرست ہے۔ اسلام طلاق کا حق صرف مرد کو دیتا ہے۔ عورت عدالت یا پنچایت وغیرہ کے ذریعے اپنے شوہر سے خلع تو حاصل کر سکتی ہے لیکن اسے طلاق نہیں دے سکتی۔ اس طرح شوہر کو ایک یا دو طلاقوں کے بعد دورانِ عدت رجوع کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ رجوع کرنا چاہے تو عورت انکار نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اسلام کے ایسے ''امتیازی'' (نعوذ باللہ!) قوانین موجودہ دور میں فلسفۂ مساواتِ مرد و زن کے علمبرداروں اور ''پڑھی لکھی'' خواتین کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

۸۔ مساواتِ مرد و زن اور آزادئ نسواں (emancipation) کا فلسفہ موجودہ دور کے انسانی معاشروں کو تباہی و بربادی سے دوچار کرنے کے لیے شیطان کا بہت مؤثر اور انتہائی خطرناک ہتھیار ہے۔ اس فلسفے کے نام پر پیدا ہونے والی آگاہی (awarness) کی وجہ سے یورپ اور امریکا کے معاشرے تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔ خصوصی طور پر امریکی معاشرے میں عورت کی ''آزادی'' کے بعد خاندانی نظام بہت بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کا عملی نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ وہاں one parent family (خاندان صرف ماں اور بچوں پر مشتمل ہے اور بچوں کو باپ کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں) کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے عرصہ اقتدار کے دوران ایک مرتبہ قوم کے نام اپنے سالِ نو کے پیغام میں یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ عنقریب امریکی قوم کی اکثریت ''حرام زادوں'' (born without any wedlock) پر مشتمل ہوگی۔

۹۔ امریکہ اور یورپ میں اپنے مذکورہ مشن کی فتح کا جھنڈا لہرانے کے بعد آج کل شیطان نے سرزمین ایشیا کے مسلمان ممالک پر یلغار کر رکھی ہے' تاکہ مسلمانوں کو اسلامی اقدار سے لاتعلق کر کے ان کے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا جائے۔ اس سارے معاملے میں ہم مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے عوام غیر مسلم مغربی اقدار و روایات کی نقالی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں' جبکہ ہمارے بعض نام نہاد دانشور اپنے مادی مفادات کے لیے

لبرل ازم اور روشن خیالی کا لبادہ اوڑھ کر شیطانی قوتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ اس معاملے کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ خود ہمارے مسلمان معاشروں میں عورتوں کو عملی طور پر وہ حقوق آج تک نہیں مل سکے جو اسلام انہیں پندرہ سو سال پہلے عطا کر چکا ہے۔ اس کوتاہی کے حوالے سے ہمارا پاکستانی معاشرہ شاید سب سے آگے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے آباء واَجداد مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی تربیت نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ ہندو کلچر کی وساطت سے عورت کے بارے میں جو تصورات پشت ہا پشت سے ہماری سوچوں میں رچ بس گئے ہیں ہم آج تک ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ ظاہر ہے ہندو کلچر میں تو عورت کو مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا۔ اسے حق وراثت دینا تو بہت دور کی بات تھی‘ ان کے ہاں تو عورت کو اپنے شوہر کی موت کے بعد زندہ رہنے کا حق بھی نہیں تھا۔ گویا ہندوؤں کے ہاں عورت کا اپنا کوئی قانونی وجود (legal entity) تھا ہی نہیں۔

اس پس منظر کی وجہ سے پاکستانی مسلمان آج بھی عورتوں کو ان کے وہ حقوق دینے کو تیار نہیں جو ہماری اپنی شریعت نے ان کے لیے مختص کر رکھے ہیں‘ بلکہ ہمارے ہاں کے دینی گھرانے عام طور پر اپنی خواتین کے حقوق نظر انداز کرنے کے معاملے میں عوام الناس سے بھی آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں ’’مظلوم و بے بس‘‘ خواتین کو مساواتِ مرد وزن اور آزادیٔ نسواں کے نعرے آخر کیونکر پُرکشش محسوس نہیں ہوں گے؟ اور وہ ایسی تحریکوں کے علمبرداروں کو بھلا کیوں کر اپنا ہمدرد اور نجات دہندہ نہیں سمجھیں گی؟ گویا اس معاملے میں ہم خود شیطان کے معاون و مددگار بنے ہوئے ہیں اور مذکورہ مغربی یلغار کو راستہ فراہم کرنے کے لیے ہم خود اپنی زمین ہموار کر رہے ہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے مذکورہ طرزِعمل سے فوری طور پر رجوع کرتے ہوئے نہ صرف اپنے ہاں خواتین کے تمام شرعی وقانونی حقوق فراخ دلی سے واگزار کریں‘ بلکہ عام روزمرہ زندگی میں بھی اپنے گھروں کے اندر ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی روایات کو فروغ دیں۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي)) (سنن الترمذی) ’’تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھے ہوں‘ اور جان لو کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں‘‘۔ ظاہر ہے حضور اکرم ﷺ کے فرمان کی تعمیل اور آپ ﷺ کی سنت کی پیروی میں ہمیں بھی اپنے گھروں میں باہمی رواداری کا ماحول قائم کرنا چاہیے اور خصوصی طور پر خواتین کے ساتھ ہمیشہ دل جوئی اور نرمی کے برتاؤ کو فروغ دینا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رواداری کے نام پر کسی کو دین وشریعت کے احکام کے حوالے سے بے جا رعایت دی جائے‘ بلکہ ایک بندۂ مسلمان کا طرزِعمل تو یہ ہونا چاہیے کہ اپنی ذات کی حد تک تو وہ حتی الوسع صبر اور برداشت سے کام لے لیکن جب معاملہ حدود اللہ کی حفاظت کا ہو تو وہ دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برہنہ شمشیر بن جائے۔

ان تمام حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب آیت زیرِ مطالعہ کا ترجمہ ایک بار پھر پڑھ لیجیے: ’’اور ان کے شوہر

اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعۃً اصلاح چاہتے ہوں۔ اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔ اور مَردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکیم ہے''۔ خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ ان پر عائد کردہ فرائض کی مناسبت سے دیے ہیں۔ یہ دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ حقوق وفرائض کے مابین توازن رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں تو اس کے حقوق واختیارات بھی زیادہ ہوں گے۔ اس کے برعکس جہاں ذمہ داری کم ہوگی وہاں حقوق اور اختیارات بھی کم ہوں گے۔

ایک عظیم آیت ـــــ ایک عظیم دعا

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (البقرۃ)

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

آیت زیر مطالعہ کے اس جملے میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بہت بڑا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اندھے کی لاٹھی والا معاملہ نہیں ہے کہ تمام انسانوں سے محاسبہ ایک ہی سطح پر ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی وسعت اور استعداد کے مطابق ہی ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور ظاہر ہے ہر انسان کی ''وسعت'' دوسرے انسان کی ''وسعت'' سے مختلف ہے، اس لیے کہ ہر انسان کے موروثی genes کی اپنی اپنی خصوصیات (properties) اور تحدیدات (limitations) ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر انسان کو میسر آنے والے ماحول کا بھی اپنا الگ تشخص ہوتا ہے۔ تو ان موروثی عوامل (hereditary factors) اور ماحولیاتی عوامل (environmental factors) کے حاصل ضرب سے انسان کی شخصیت کا ایک ہیولیٰ بنتا ہے، جس کی مثال اس سانچے (pattern) کی سی ہے جو پگھلی ہوئی دھاتوں کو مخصوص شکل میں ڈھالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (ہمارے ہاں کاریگر لوگ اسے ''پاٹن'' کہتے ہیں۔) قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس سانچے کو ''شاکلہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰي شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝﴾ ''کہہ دیجیے کہ ہر کوئی اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کر رہا ہے، پس آپ کا ربّ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سیدھی راہ پر ہے''۔ چنانچہ ہر انسان کو اس دنیا میں اپنے شاکلہ کے اندر رہ کر محنت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس انسان کا شاکلہ کیسا تھا؟ کس کے genes میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا خامیاں تھیں؟ کس کو کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئیں تھیں اور فطری صلاحیتوں کی نشو ونما کے لیے کس کو کیسا

ماحول میسر آیا تھا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے شاکلہ (موروثی عوامل اور ماحولیاتی عوامل کے مجموعے سے تشکیل پانے والی شخصی استعدادات) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے حساب لے گا۔ اس صورتِ حال اور کیفیت کو سمجھنے کے لیے فرض کیجیے کہ ایک شخص کے اندر استعداد ہی ۲۰ درجے کی ہے اور اس نے ۱۸ درجے کام کر دکھایا تو وہ کامیاب ہو گیا‘ لیکن اگر کسی میں استعداد سو درجے کی تھی اور اس نے ۵۰ درجے کام کیا تو وہ ناکام ہو گیا‘ حالانکہ کمیت کے اعتبار سے ۵۰ درجے ۱۸ درجے سے زیادہ ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کا محاسبہ انفرادی سطح پر کرے گا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝﴾ ”اور سب لوگ قیامت کے دن اس کے حضور فرداً فرداً حاضر ہوں گے“۔ پس اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر ایک کا حساب اکیلے اکیلے ہوگا اور ہر ایک کی استعداد کے مطابق ہوگا۔

واضح رہے کہ بعض لوگ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ کے الفاظ کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کے معاملات میں تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اس میدان میں ہر وقت دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش میں رہتے ہیں‘ لیکن دین کے معاملے میں یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کیا کریں جی! ہمارے اندر صلاحیت اور استعداد ہی بس اتنی ہے۔ ایسے لوگ آخرت کے بارے میں دراصل خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ ظاہر ہے اگر ان میں استعداد و استطاعت کی کمی ہوتی تو وہ دنیوی معاملات کی دوڑ میں بھی دوسروں سے پیچھے رہ جاتے۔ لہٰذا ایک بندۂ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے پورے اخلاص سے اپنی شخصیت کو کھود کھود کر اس میں سے جو کچھ نکال سکتا ہے وہ سب کچھ نکالے اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کوتاہی نہ چھوڑے —— واضح رہے کہ اس مضمون کو قرآن مجید کے پانچ اور مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو اسی سورت کی آیت ۲۳۳‘ سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۲‘ سورۃ الاعراف کی آیت ۴۲‘ سورۃ المؤمنون کی آیت ۶۲ اور سورۃ الطلاق کی آیت ۷۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ﴾ ”اسی جان کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور اسی کے اوپر وبال بنے گا جو اس نے برائی کمائی۔“

یہاں ”ل“ اور ”عَلٰی“ کی وجہ سے فعل (کسب) کے مفہوم میں پیدا ہونے والی تبدیلی لائقِ توجہ ہے (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو آیت ۲۲۸ کی تشریح)۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ سے مراد ہے جو بھی نیکی اس نے کمائی ہوگی وہ اس کے لیے ہے‘ اس کے حق میں ہے‘ اس کا اجر و ثواب اسے ملے گا۔ جبکہ ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ﴾ کا مفہوم یوں ہوگا کہ جو بدی اس نے کمائی ہوگی اس کا وبال اسی پر آئے گا‘ اس کی سزا اسی کو ملے گی۔

اب آگے اس آیت کا بقیہ حصہ دعا پر مشتمل ہے۔ یہ بلاشبہ ایک جامع ترین اور عظیم ترین قرآنی دعا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ ”اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے۔“

اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان اور عمل صالح کے راستے پر چلتے ہوئے حسبِ استطاعت واستعداد اپنی شخصیتوں کے کونوں کھدروں میں سے بچی کھچی توانائیوں (residual energies) کو نکال نکال کر تیری راہ میں لگا رہے ہیں' لیکن اپنی محنت اور اپنے اعمال پر ہمیں کوئی غرہ نہیں۔ اے ہمارے رب! ہم انتہائی تواضع اور انکساری کے ساتھ تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ہماری بھول چوک پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔

انسان دراصل خطا اور نسیان سے مرکب ہے: (اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاِ وَالنِّسْیَانِ) خطا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی امکانی حد تک تو نشانہ ٹھیک لگانے کی کوشش کرے لیکن اس کے باوجود نشانہ مطلوبہ جگہ پر نہ لگ سکے۔ جیسے کسی مجتہد نے کسی معاملے میں اپنی امکانی حد تک درست رائے پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس سے خطا ہوگئی تو ایسی خطا کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا' بلکہ اس کی کوشش کے بدلے اسے ثواب بھی ملے گا۔ گویا مجتہد مخطی بھی ہو تو بھی اس کو ثواب ملے گا اور اگر مجتہد مصیب ہو یعنی صحیح رائے پر پہنچ جائے تو ایسی صورت میں اسے دوہرا ثواب ملے گا۔ نسیان یہ ہے کہ بھولے سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ)) (سنن ابن ماجه) ''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے خطا اور نسیان معاف فرما دیا ہے۔''

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ ''اور اے رب ہمارے! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے۔''

لفظ ''حَـــمـــل'' ایسے بوجھ کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے اٹھا کر انسان چل پھر سکتا ہو۔ اسی سے لفظ ''حَمّال'' (بھاری سامان اٹھانے والا' بوجھ ڈھونے والا) بنا ہے۔ اس کے مقابلے میں ''اِصر'' ایسا بوجھ ہے جو انسان کو بٹھا دے' یعنی جسے انسان اٹھانے اور اٹھا کر چلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں بھی آیا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس آیت کے یہ الفاظ: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ اس جملے میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کے کندھوں سے وہ بوجھ اتار دیے جو اُن کی طاقت سے بڑھ کر تھے۔ گویا ہم سے پہلے لوگوں پر فرائض و واجبات کے حوالے سے بہت بھاری بوجھ ڈالے گئے تھے۔ جیسے شریعتِ موسویٰ میں روزہ رات ہی سے شروع ہو جاتا تھا' پھر ان کے روزے میں خاموشی بھی شامل تھی۔ یعنی شام سے لے کر اگلی شام تک روزہ تھا اور روزہ بھی ایسا کہ کھانے پینے اور تعلق زن و شو قائم کرنے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ باہم گفتگو کرنے پر بھی مکمل پابندی! اس کے مقابلے میں ہمارے لیے روزہ بہت آسان کر دیا گیا۔ خاموشی کی شرط کو سرے سے ختم کر دیا گیا۔ روزے کا دورانیہ کم ہو کر تقریباً ''نصف'' رہ گیا اور رات کے اوقات پر سے نہ صرف روزے کی تمام پابندیاں اٹھالی گئیں بلکہ سحری کرنے کی خصوصی تاکید بھی فرمائی گئی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً)) (متفق علیه) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحریوں میں برکت رکھی گئی ہے''۔

اسی طرح شریعت موسوی میں یومِ سبت کی حرمت کے حوالے سے بھی حکم بہت سخت تھا۔ اس روز صبح سے شام تک بنی اسرائیل کو کسی قسم کا کوئی دنیوی کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی نسبت ہماری شریعت میں جمعہ کے روز صرف جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کی ادائیگی تک کاروبارِ دنیوی حرام ہے' لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد اس ضمن میں کوئی پابندی نہیں۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اور اے رب ہمارے! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ ''اور ہم سے درگزر فرماتا رہ!''

تو ہماری لغزشوں کو معاف کرتا رہ!

﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ ''اور ہمیں بخشتا رہ!''

ہماری خطاؤں کی پردہ پوشی فرما دے!

لفظ غفر میں ڈھانپ لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی سے لفظ مِغْفَرْ مشتق ہے جس کے معنی سر پر پہننے والے خَود (ہیلمٹ) کے ہیں جو سر کو ڈھانپ لیتا ہے اور دشمن کے وار یا چوٹ وغیرہ سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے گناہوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ دے اور ان کی پردہ پوشی فرما دے۔

﴿وَارْحَمْنَا﴾ ''اور ہم پر رحم فرما۔''

﴿اَنْتَ مَوْلٰىنَا﴾ ''تو ہمارا مولا ہے۔''

تو ہمارا پشت پناہ ہے' ہمارا والی ہے' ہمارا حامی و مددگار ہے۔ یہاں اس سورت کی آیت ۲۵۷ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا' وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔''

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾﴾ ''پس ہماری مدد فرما کافروں کے مقابلے میں۔''

نوٹ کیجیے! حضرت طالوت کے ساتھیوں کی وہ دعا جس کا ذکر اس سورت کی آیت ۲۵۰ میں آیا ہے' اس کے اختتام پر بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ گویا اہلِ ایمان کو یہ دعا اس سخت مرحلے کے لیے تلقین کی جا رہی ہے جس کا آغاز اس سورت کے نزول کے فوراً بعد کفار کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں ہونے والا تھا۔ اس مرحلے پر ہر بندۂ مؤمن کو اپنی متاعِ جانِ عزیز کو گویا ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں اترنا تھا: ؎

مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز! تاب لاتے ہی بنے گی غالب

چنانچہ اس دعا کے یہ الفاظ گویا غزوۂ بدر کی تمہید ہیں۔ واضح رہے کہ سورۃ البقرۃ غزوۂ بدر سے متصل قبل زمانے میں نازل ہوئی تھی۔

آیاتِ محکمات ومتشابہات کی تقسیم

هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشٰبَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِي الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝ (آلِ عمران)

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ﴾ ''وہی ہے جس نے آپؐ پر یہ کتاب نازل فرمائی''

قرآن حکیم میں اس مفہوم کے لیے کہیں لفظ نَزَّلَ آیا ہے اور کہیں اَنۡزَلَ۔ قرآن حکیم کا چونکہ اپنا ایک ملکوتی غنا (Divine Music) ہے‘ اس لیے اس میں الفاظ کا انتخاب متعلقہ آیت کے آہنگ (rhythm) کی مطابقت سے ہوتا ہے۔

﴿مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ﴾ ''اس میں محکم آیات ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں''

''محکم'' اور پختہ آیات وہ ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح ہو اور ان کے مفہوم میں کسی قسم کے ردوبدل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ قرآن حکیم کی جڑ‘ بنیاد اور اساس وہی آیات ہیں۔

﴿وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ﴾ ''اور کچھ دوسری آیات ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔''

یہ ایسی آیات ہیں جن کا حقیقی مفہوم معین کرنا بہت مشکل بلکہ عام حالات میں ناممکن ہے۔ واضح رہے کہ آیات الاحکام سب کی سب محکمات کے زمرے میں آتی ہیں‘ یعنی وہ آیات جن میں اوامر ونواہی‘ جائز وناجائز‘ حلال وحرام کے بارے میں احکام آئے ہیں۔ ایسی آیات میں عام طور پر ''كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ تو کتاب درحقیقت ہے ہی مجموعۂ احکام۔ لیکن دوسری طرف جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی بحث ہے ان کا فہم آسان نہیں ہے۔ ظاہر ہے اللہ کی ذات وصفات‘ اللہ کا ہاتھ‘ اللہ کا چہرہ‘ اللہ کی کرسی‘ اللہ کا عرش‘ ملائکہ‘ عالمِ برزخ‘ عالمِ آخرت‘ جنت‘ دوزخ وغیرہ کے حقائق ہم انسانوں کے فہم وتصور سے بالا ہیں۔ چنانچہ ایسے حقائق کے بارے میں قرآن حکیم میں کچھ معلومات ہماری ذہنی سطح کی مناسبت سے فراہم کی گئی ہیں کہ مَا لَا يُدۡرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتۡرَكُ كُلُّهٗ یعنی جو چیز پوری کی پوری حاصل نہ ہو سکے اسے پورے کا پورا چھوڑا بھی نہیں جاتا۔ یہ اس لیے ضروری تھا تاکہ ان حقائق کا ایک اجمالی تصور ہمارے ذہنوں میں قائم ہو جائے۔ اس اجمالی تصور کے بغیر انسان کے لیے سیدھے راستے پر چلنا ممکن نہیں۔ بہرحال ہمیں ایسے حقائق کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ دوسرے درجے میں طبیعیاتی مظاہر (Physical Phenomena) سے متعلق کچھ آیات بھی ایک وقت تک آیاتِ متشابہات میں سے رہی ہیں‘ لیکن جیسے جیسے سائنس کا علم بڑھتا چلا جا رہا ہے‘ رفتہ رفتہ ان کی حقیقت سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے اور اب ان میں سے بہت سی آیات محکمات کے دائرے میں آ چکی ہیں۔ تاہم

اب بھی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے حقیقی مفہوم سے متعلق ہم بے خبر ہیں۔ مثلاً ہم ابھی تک سات آسمانوں کی حقیقت کے متعلق کچھ نہیں جانتے' لیکن ہمارا یقین ہے کہ اِن شاءاللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے انسان کا علم ترقی کرے گا' ایسے بہت سے متشابہات رفتہ رفتہ محکمات کے درجے میں آتے جائیں گے اور انسان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ ایسے مظاہر کے بارے میں وہی معلومات درست ہیں جو قرآن حکیم میں درج ہیں۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ پیچھے لگتے ہیں ان آیات کے جو ان میں سے متشابہ ہیں' فتنے کی تلاش میں''

ایسے لوگ اپنے ٹیڑھے ذہنوں کی غذا کے لیے آیاتِ متشابہات سے ہمیشہ کسی نئے نکتے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد صرف اپنی ذہانت کا ڈنکا بجانا اور معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہوتا ہے۔

﴿وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ﴾ ''اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کے لیے۔''

ایسے لوگ ہر وقت آیات متشابہات کی حقیقت معلوم کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی کا علمی ذوق ہی ایسا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی ٹیڑھی فطرت کی تسکین کے لیے ایسا کر رہا ہو۔

﴿وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

﴿وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا﴾ ''اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر' یہ کُل کا کُل ہمارے ربّ کی طرف سے ہے۔''

جن لوگوں کو رسوخ فی العلم حاصل ہو گیا ہے' جن کے علم کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں وہ متشابہات کے بارے میں کسی مغالطے کا شکار نہیں ہوتے۔ ان میں سے جو باتیں ان کی سمجھ میں آجاتی ہیں وہ انہیں تسلیم کرتے ہیں اور جو نکات انہیں سمجھ نہیں آتے ان کے مفاہیم تک رسائی کے لیے وہ انتظار کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ لیکن ان کے دل اس یقین سے مسلسل معمور رہتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ حق ہے۔

﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ⑦﴾ ''اور یہ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں۔''

اور کسی انسان کے لیے سب سے بڑی ہوش مندی یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کی حدود (limitations) کو جان لے۔ اگر انسان اپنی عقل کی حدود سے آگاہ نہیں تو پھر وہ اولوا الالباب میں سے نہیں ہے۔ عقل بلاشبہ انسان کی بہت مفید صلاحیت ہے لیکن یہ ایک حد سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں اسی نکتے کی نشاندہی کی گئی ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے!

یعنی منزل تک پہنچانے والی شے عقل نہیں' بلکہ قلب ہے' لیکن عقل انسان کو راستہ دکھانے کے لیے روشنی تک پہنچنے کے لیے راہنمائی فراہم کرتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اتباع اور اطاعت کا خصوصی حکم

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣١ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٢ (آلِ عمران)

آیت ۳۱ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو اپنے رسول ﷺ کے اتباع سے مشروط کرتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی ﷺ! اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو‘ میرا اتباع کرو! اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

﴿يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ’’اللہ تم سے محبت کرے گا‘‘

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ﴾ ’’اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣١﴾ ’’اور اللہ بخشنے والا‘ رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ﴾ ’’کہہ دیجیے اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی۔‘‘

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٢﴾ ’’پھر اگر وہ پیٹھ موڑ لیں تو (یاد رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کو ایسے کافر پسند نہیں ہیں۔‘‘

یہ دو آیتیں رسول اللہ ﷺ کی ’’اطاعت‘‘ اور ’’اتباع‘‘ کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اطاعت کا تعلق حکم کے ساتھ ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی اطاعت کی جائے‘ لیکن اتباع کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن خود تلاش کرے کہ آنحضور ﷺ کے اعمال کیا تھے اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے‘ خواہ آپ ﷺ نے ان اعمال کے کرنے کا باقاعدہ حکم نہ بھی دیا ہو۔ ظاہر ہے انسان کو جس شخصیت سے محبت ہوتی ہے وہ اُس سے ہر طرح سے مناسبت و موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لباس جیسا لباس پہننا پسند کرتا ہے‘ جو چیزیں اُس کو کھانے میں پسند ہیں وہی چیزیں کھانا پسند کرتا ہے۔ ایک صحابیؓ کا واقعہ آتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے کُرتے کے بٹن نہیں لگے ہوئے تھے اور آپؐ کا گریبان کھلا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کُرتے کے بٹن نہیں لگائے‘ حالانکہ حضور ﷺ نے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ صحابیؓ کہیں دور دراز سے آئے ہوں گے اور ایک ہی مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے ہوں گے‘ لیکن انہوں نے اُس وقت حضور ﷺ کو جس شان میں دیکھا اس کیفیت کو اپنے اوپر زندگی بھر کے لیے لازم کر لیا۔

اتباع کے ضمن میں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ دین کے تقاضوں کو جس درجے میں رسول اللہ ﷺ نے پورا فرمایا اس درجے میں پورا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے اپنا کوئی مکان نہیں بنایا‘

کوئی جائیداد نہیں بنائی، بعثت کے بعد آپؐ نے کوئی دُنیوی کام نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اور اپنی توانائیوں کی ایک ایک رمق اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی اقامت میں لگا دی۔ اب ظاہر ہے ہمارے لیے اس مقام تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بہر حال ایک بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضور ﷺ کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھے اور اسی معیار کے مطابق عمل کے لیے کوشاں رہے۔ یعنی اپنے مال، اپنے وقت، اپنی صلاحیتوں اور اپنی جان کی صورت میں اپنے زیادہ سے زیادہ وسائل آپ ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔ اگر وہ خلوصِ دل سے اس روش پر گامزن رہے گا تو حضور ﷺ کی اتباع کا تقاضا کسی نہ کسی درجے میں پورا ہو جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں تک ''اطاعت'' کا تعلق ہے اس میں کوتاہی بالکل قابلِ قبول نہیں۔ یعنی جہاں واضح حکم آ گیا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، یہ فرض ہے یہ واجب ہے، وہاں حکم عدولی کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ اطاعت سے انکار کو یہاں آیت زیرِ مطالعہ میں کفر قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اتباعِ رسولؐ اللہ تعالیٰ کی محبت کی ضمانت ہے۔ اس کا اعلان خود رسول اللہ ﷺ سے کروایا گیا کہ اے نبی (ﷺ) اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، میری پیروی کرو۔ دیکھو، میرے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں؟ میری توانائیاں کن کاموں میں صرف ہو رہی ہیں؟ دنیا کے اندر میری دلچسپیاں کیا ہیں؟ لہٰذا تم لوگ میری سنت کی پیروی کرو۔ اس کے نتیجے میں تم اللہ تعالیٰ کے ''محب'' سے بڑھ کر ''محبوب'' بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ یقیناً غفور اور رحیم ہے۔ اور یاد رکھو! اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت ایمان کی لازمی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولؐ کی اطاعت سے منہ موڑے تو اللہ تعالیٰ کو ایسے کافر پسند نہیں ہیں۔

اُمتِ مُسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آلِ عمران)

ان آیات میں اُمتِ مُسلمہ کو ایک سہ نکاتی لائحہ عمل دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُمت اب قیامت تک قائم رہنے والی ہے اور قیامت تک اس نے ہر طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا ہے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ میں جب کبھی بھی تجدیدِ دین کی کوئی تحریک اٹھے گی یا اقامتِ دین کے لیے جدوجہد ہو گی تو اس کا لائحہ عمل وہی ہونا چاہیے جس کی نشاندہی ان تین آیات میں کی گئی ہے۔ ان آیات کے حوالہ سے اس موضوع پر میری ایک کتاب بھی

''اُمتِ مُسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل'' کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس لائحہ عمل کا پہلا نکتہ افراد کی شخصیت سازی سے متعلق ہے۔ اس بارے میں فرمایا گیا:

آیت ۱۰۲ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے''

قرآن مجید میں تقویٰ کی تلقین کے حوالے سے یہ سب سے گاڑھی آیت ہے۔ اس آیت کو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے اور بارگاہِ نبوی میں عرض گزار ہوئے کہ یارسول اللہ ﷺ! اللہ کے تقویٰ کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟ پھر جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) ''اپنی امکانی حد تک اللہ کا تقویٰ اختیار کرو'' تو تب ان کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرمانبرداری کی حالت میں۔''

مطلب یہ کہ مہلت زندگی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کیا معلوم کس لمحے موت آجائے اور یہ مہلت ختم ہو جائے۔ لہٰذا خبردار! تمہاری زندگی کا کوئی لمحہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہ گزرنے پائے۔ کیا خبر جس لمحے تم سے معصیت کا ارتکاب ہو اسی لمحے موت تمہیں دبوچ لے۔ اس آیت میں افراد کے کردار کی بنیاد تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن' ہمہ وقت اطاعت پر اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ افراد کی ایسی تربیت کسی بھی اجتماعی جدوجہد کے لیے ناگزیر ہے اور اس کے بغیر کوئی اجتماعی جدوجہد مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس آیت میں کردار سازی کے حکم کے بعد اب اگلی آیت میں اجتماعیت اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت ۱۰۳ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو مل جل کر اور تفرقے میں نہ پڑو۔''

یاد رہے کہ اس سورت (آلِ عمران) کی آیت ۱۰۱ ان الفاظ پر ختم ہوئی ہے: ﴿وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے چمٹ جائے (اللہ کی حفاظت میں آجائے) اُس کو تو ہدایت ہو گئی صراطِ مستقیم کی طرف''۔ اس کے علاوہ یہ مضمون سورۃ الحج کی آخری آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ﴾ ''اور اللہ سے چمٹ جاؤ!'' اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں کیسے آیا جائے؟ اور اللہ تعالیٰ سے چمٹنے کا طریقہ کیا ہے؟ آیت زیر مطالعہ کے متذکرہ بالا جملے میں دراصل اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ تم اللہ کی حفاظت میں آنا چاہتے ہو' اللہ سے چمٹنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کی رسّی سے چمٹ جاؤ' اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اب اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رسّی کون سی ہے؟ اس کا جواب ہمیں احادیث سے ملتا ہے کہ اللہ کی رسّی ''قرآن'' ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے قرب کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف انسان کے دل میں تقویٰ پیدا ہو' اور دوسری طرف وہ قرآن حکیم کے ساتھ اپنی وابستگی

کو یقینی بنائے۔ ظاہر ہے انسانوں کی اجتماعیت بھیڑ‘ بکریوں کی طرح نہیں ہوتی کہ ایک چرواہا ہاتھ میں لکڑی لیے سب کو ہانکے چلا جائے‘ بلکہ انسانوں کو جمع کرنے کے لیے ان میں نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان حیوانِ عاقل ہے‘ شعور رکھتا ہے۔ چنانچہ مختلف انسانوں کی بامقصد اجتماعیت تبھی ممکن ہے جب ان سب کی سوچ ایک ہو‘ ان کے نظریات اور مقاصد میں یکسانیت ہو۔ ایسی یکسانیت اور ہم آہنگی ایک ایسے مضبوط مرکز ومحور کے گرد ہی تشکیل پا سکتی ہے جو متعلقہ تمام افراد کے لیے مشترکہ طور پر قابل قبول ہو۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے لیے ایسا مرکز ومحور قرآن حکیم ہی ہے اور یہی وہ ''حبلُ اللہ'' ہے جسے یہاں مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) (سنن الترمذی) ''اور وہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ یعنی اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ، حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ)) (سنن الترمذی) ''اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا)‘ یہی وہ مضبوط رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَبْشِرُوْا اَبْشِرُوْا ...... فَإِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ سَبَبٌ، طَرَفُهُ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهُ بِأَيْدِيْكُمْ)) (مصنف ابن ابی شیبہ) ''خوش ہو جاؤ‘ خوشیاں مناؤ...... یہ قرآن ایک واسطہ ہے‘ جس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے''۔ چنانچہ قرآن تقرب الی اللہ کا وسیلہ بھی ہے‘ اور مسلمانوں کو آپس میں جوڑ کر رکھنے کا ذریعہ بھی۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ ''اور ذرا یاد کرو اللہ کا جو انعام تم پر ہوا جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے''

﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''تو اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر اُلفت پیدا کر دی''

﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ ''پس تم اللہ کے فضل وکرم سے بھائی بھائی بن گئے۔''

ان الفاظ کے اوّلین مخاطب انصارِ مدینہ ہیں جن کے دو قبیلوں (اوس اور خزرج) میں سو برس سے خون ریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا‘ لیکن جب اللہ کی کتاب آ گئی‘ محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور دلوں میں ایمان آ گیا تو ان کے جھگڑے ختم ہو گئے اور وہ سب باہم شیر وشکر ہو گئے۔ اسی طرح اسلام کی وجہ سے پورے عرب سے غارت گری کا سلسلہ ختم ہو گیا اور یہ پورا خطہ دارالامن بن گیا۔

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ ''اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے'' (بس اس میں گرنے ہی والے تھے)

﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ''تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔''

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾﴾ ''اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات واضح کر رہا ہے تاکہ تم راہ پاؤ (اور صحیح راہ پر قائم رہو)۔''

گزشتہ دو آیات میں اُمت مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل کے پہلے دو نکتے بیان ہوئے ہیں' یعنی سب سے پہلے افراد کے کردار کی تعمیر کرنا' انہیں تقویٰ اور فرمانبرداری جیسے اوصاف سے متصف کرنا' اور اس کے بعد ان کو ایک جمعیت' تنظیم یا جماعت کی صورت میں قرآن کے معنوی محور کے گرد منظم کرنا' جو حبل اللہ ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؏ اعتصامش کُن کہ حبلُ اللہ اوست! (اس کو مضبوطی سے تھام لو کہ یہی حبل اللہ ہے!) —— جب ایسی جمعیت وجود میں آ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس ضمن میں راہنمائی اگلی آیت میں فراہم کی جا رہی ہے:

آیت ۱۰۴ ﴿وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ﴾ ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔''

یہاں لفظ ''مِنۡكُمۡ'' بڑا معنی خیز ہے کہ تم میں سے ایک ایسی اُمت وجود میں آنی چاہیے۔ گویا ایک تو بڑی اُمت ہے یعنی اُمت مسلمہ' وہ تو کروڑوں اربوں نفوس پر مشتمل ہے اور ان میں سے اکثر خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' یعنی وہ اپنے منصب کو بھولے ہوئے ہیں اور دین سے بہت دور جا چکے ہیں لہٰذا اس اُمت کے اندر ایک چھوٹی اُمت (ایک جماعت) وجود میں آنی چاہیے جو ''جاگو اور جگاؤ'' کا فریضہ سرانجام دے۔ یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جاگنے کی توفیق دے دی ہے' وہ اوروں کو جگائیں' ایک منظم جماعت بنائیں اور غلبۂ دین کی تحریک کے لیے طاقت فراہم کریں۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یعنی وہ بڑی اُمت جو کروڑوں اربوں افراد پر مشتمل ہے' وہ اگر یہ کام نہیں کرتی اور اس کے باوجود فلاح اور نجات کی اُمید رکھتی ہے تو یہ ایک اُمیدِ موہوم ہے۔ فلاح پانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جو یہ تین کام کریں گے: (i) دعوت الی الخیر (ii) امر بالمعروف (iii) نہی عن المنکر۔ واضح رہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام بھی ''نہی عن المنکر بالید'' ہی کی صورت میں ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہی عن المنکر کے تین مراتب بیان فرمائے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنۡ رَاٰى مِنۡكُمۡ مُنۡكَرًا فَلۡيُغَيِّرۡهُ بِيَدِهٖ' فَاِنۡ لَمۡ يَسۡتَطِعۡ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنۡ لَمۡ يَسۡتَطِعۡ فَبِقَلۡبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضۡعَفُ الۡاِيۡمَانِ)) (صحیح مسلم)

''تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے اپنے زورِ بازو سے روک دے۔ پس اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے روکے۔ پھر اگر اس کی بھی ہمت نہیں ہے تو دل میں برائی سے نفرت ضرور رکھے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

اگر دل میں نفرت بھی ختم ہوگئی ہے تو سمجھ لو کہ متاعِ ایمان رخصت ہوگئی ہے۔ لیکن اگر دل میں برائی سے نفرت موجود ہے تو پھر لازم ہے کہ انسان اگلا قدم بھی اٹھائے۔ یعنی زبان سے کہنا شروع کرے کہ یہ کام غلط ہے' اللہ

نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے' اس سے باز آ جاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم خیال افراد مل کر ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش جاری رکھیں۔ اس طرح افرادی قوت کو مجتمع کریں اور جب خاطر خواہ حد تک طاقت جمع ہو جائے تو پھر نہی عن المنکر کے اگلے مرحلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں کہ اب ہم یہ غلط کام نہیں ہونے دیں گے۔ یہ ہے ''نہی عن المنکر بالید'' کی ممکنہ صورت' یعنی طاقت کے ساتھ برائی کو روکنے کا ایک طریقہ۔ اور یہ ہوگا اسلامی انقلاب کی جدوجہد کا آخری مرحلہ۔

ان تین آیات کے اندر اسلامی انقلاب کا پورا لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے کہ پہلے تقویٰ کی بنیاد پر افراد کی کردار سازی کی جائے' پھر ان افراد کو ایک مضبوط جماعت کی صورت میں منظم کیا جائے اور اس کے بعد اس جماعت کو لے کر اصلاحِ معاشرہ اور اسلامی انقلاب کی بامقصد جدوجہد کے لیے میدانِ عمل میں اترا جائے۔

اُمتِ مُسلمہ کا مقصدِ تاسیس

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (آلِ عمران)

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے''

اس آیت میں اُمت مسلمہ کی غرضِ تاسیس بیان کی گئی ہے کہ یہ پوری اُمت مسلمہ نوعِ انسانی کی ہدایت و راہنمائی کے لیے بنائی گئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اپنا مقصدِ تاسیس بھول چکی ہے۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ امت میں سے جو لوگ جاگ جائیں وہ دوسروں کو جگا کر ''اُمت کے اندر ایک اُمت'' (Ummah within Ummah) بنانے اور وہ تین کام سرانجام دینے کی کوشش کریں جن کا ذکر اس سورت کی آیت ۱۰۴ میں ہوا ہے: (i) دعوت الی الخیر (ii) امر بالمعروف' اور (iii) نہی عن المنکر۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں اُمت مسلمہ کے فرضِ منصبی کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ مسلمانو! یاد رکھو کہ دُنیا کی دیگر اقوام تو اپنے لیے زندہ رہتی ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنی ترقی' اپنی بہتری' اپنی بہبود اور اپنی عزت و عظمت ہوتی ہے' لیکن تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس مفہوم کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے!

گویا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے اور جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہے۔ تو اے مسلمانو! تمہیں جینا ہے لوگوں کے لیے، جبکہ لوگ جیتے ہیں اپنے لیے۔

﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''تم حکم کرتے ہو نیکی کا''

﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور تم روکتے ہو بدی سے''

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ''اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے دور میں تو پوری اُمتِ مسلمہ ہی ان فرائض کی بجا آوری کے لیے ہمہ تن مصروفِ عمل رہتی تھی، لیکن آج جبکہ اُمتِ مُسلمہ بحیثیت مجموعی اپنے مقصدِ تاسیس کو بھول چکی ہے تو ایسے حالات میں اُمت کے اندر اس مقصد کے لیے ایک منظم جماعت قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سورت کی آیت ۱۰۴ میں وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ کا حکم دراصل ایسی ہی صورتِ حال کے لیے دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر اُمتِ مسلمہ کی اکثریت ان فرائض کی طرف سے غافل ہو جائے تو ایسے حالات میں جن خوش نصیب اہلِ ایمان کو ہوش آ جائے وہ دوسروں کو جگانے کی کوشش کریں، اور اس مقصد کے لیے ایک خصوصی جمعیت تشکیل دینے کا اہتمام کریں۔

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ﴾ ''اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔''

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ''ان میں سے کچھ تو ایمان والے ہیں''

اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو ان آیات کے نزول کے وقت تک ایمان لا چکے تھے، اور وہ بھی جن کے اندر بالقوہ (potentially) ایمان موجود تھا اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد ایمان لے آئیں گے۔

﴿وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰﴾ ''لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔''

غزوۂ اُحد کے تناظر میں جماعتی زندگی سے متعلق اہم ہدایات

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آلِ عمران)

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ''اور اللہ نے تو تم سے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا جبکہ تم ان کو تہ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے۔''

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ غزوۂ اُحد

کے پہلے مرحلے میں قریش مکہ مسلمانوں کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے پسپائی پر مجبور ہو گئے تھے۔اس کے بعد کفار کا گھڑ سوار دستہ اچانک جب مسلمانوں کے عقب پر حملہ آور ہوا تو جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کفار کے بھاگتے ہوئے لشکر نے بھی پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ دو اطراف سے ان اچانک حملوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا' اور حضور اکرم ﷺ کو ذاتی طور پر بھی شدید زخم آئے۔اس کے بعد بالآخر اگرچہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا لیکن بھاری جانی نقصان کی وجہ سے ان کے دل شدید زخمی تھے۔اس سیاق وسباق میں آیت زیر مطالعہ کے اس جملے کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے مسلمانو! ہم نے تم سے تائید و نصرت کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس وقت پورا ہو گیا تھا جب تم انہیں ہمارے حکم سے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔اس وقت تمہیں مکمل فتح حاصل ہو گئی تھی۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا''

فَشِلْتُمْ کا ترجمہ مختلف مترجمین نے مختلف انداز میں کیا ہے' لیکن میرے نزدیک یہاں اس سے مراد نظم (ڈسپلن) کا ڈھیلا ہو جانا ہے۔ اسلامی نظمِ جماعت میں سمع وطاعت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' لیکن ظاہر ہے کہ سمع وطاعت کے نظام میں صرف ایک امیر کی اطاعت ہی مقصود نہیں ہوتی' بلکہ اُوپر سے لے کر نیچے تک' سپہ سالار سے لے کر لوکل کمانڈر تک' درجہ بدرجہ نظامِ سمع وطاعت کی پابندی ضروری ہے۔ جیسے فوج کے سپہ سالار کے تحت میسرہ' میمنہ' قلب' ہراول دستے' غرض ہر یونٹ کا ایک کمانڈر ہوتا ہے' اسی طرح جماعت کے اندر بھی درجہ بدرجہ نظامِ سمع وطاعت ہوتا ہے اور متعلقہ جماعت کے تمام ارکان کے لیے اُس نظام کی پوری پوری پابندی ضروری ہے۔اس لیے پہاڑ کے درے میں متعین تیر اندازوں پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی فرض تھی اور آپ ﷺ کے مقرر کردہ امیر (کمانڈر) کی اطاعت بھی فرض تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰى اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (متفق علیه)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے نامزد کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

یہاں پر یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ درّے کو چھوڑنے والے تیر اندازوں نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ان کے خیال کے مطابق حضور اکرم ﷺ کا درّہ نہ چھوڑنے سے متعلق حکم شکست کی صورت میں تھا کہ اگر ہم سب بھی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اور تم دیکھو کہ

چیلیں اور کوے ہمارا گوشت کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ چنانچہ جب فتح ہوگئی تو انہوں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ اب درّے میں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ گویا انہوں نے جانتے بوجھتے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے مقامی امیر (لوکل کمانڈر) کے حکم کی بہرحال خلاف ورزی کی تھی' اور میرے نزدیک یہاں ''عَصَیْتُمْ'' سے یہی حکم عدولی مراد ہے۔

﴿وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ تم نے وہ چیز دیکھ لی جو تمہیں محبوب ہے۔''

﴿عَصَیْتُمْ﴾ کے بارے میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد حضور اکرم ﷺ کی نافرمانی نہیں' بلکہ لوکل کمانڈر کی نافرمانی ہے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ سے اکثر مفسرین نے مالِ غنیمت مراد لیا ہے' کہ درّے پر مامور حضرات مالِ غنیمت کی طلب میں اپنی جگہ چھوڑ آئے تھے' لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے' اس لیے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون تو غزوۂ بدر کے بعد سورۃ الانفال میں نازل ہو چکا تھا۔ اس قانون کی رو سے اگر کوئی شخص کچھ بھی جمع نہ کرتا تب بھی اسے اس کے حصے کا مالِ غنیمت مل جاتا۔ چنانچہ یہاں ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ سے مراد دراصل ''فتح'' ہے اور اس کے لیے ''القرآن یفسّر بعضہ بعضًا'' کی رُو سے سورۃ الصّف کی یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ۭ﴾ (آیت ۱۳) ''اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔ اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح''۔ ظاہر ہے ایک مردِ مجاہد کو باطل کے خلاف اپنے جہاد کے حوالے سے دنیا میں فتح و نصرت محبوب تو ہوتی ہے' لیکن اس بارے میں درست طرزِ عمل یہ ہے کہ اسے دنیوی کامیابی کو اپنا مقصود نہیں بنانا چاہیے' بلکہ دنیا میں اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اپنے فرض کی ادائیگی ہونا چاہیے۔ باقی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کب اہل ایمان کی جدوجہد کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے اس بارے میں وہی بہتر جانتا ہے۔

﴿مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا﴾ ''تم میں سے وہ بھی ہیں جو دنیا چاہتے ہیں''

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ دنیا میں انہیں فتح و کامیابی حاصل ہو جائے' اللہ کے دین کا بول بالا ہو جائے اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ ''اور تم میں وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔''

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ﴾ ''پھر اللہ نے تمہارا رُخ پھیر دیا اُن کی طرف سے تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔''

پہلے وہ بھاگ رہے تھے اور تم ان کا تعاقب کر رہے تھے' اب معاملہ الٹا ہو گیا۔ اب تم پسپا ہو گئے اور اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔ تمہاری یہ پسپائی تمہارے لیے آزمائش تھی۔

﴿وَلَقَدۡ عَفَا عَنكُمۡ ۗ﴾ ''اور اللہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔''

اس دوران تم میں سے جس کسی سے جو بھی خطا ہوئی اللہ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُو فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِينَ ۝١٥٢﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے حق میں بہت فضل والا ہے۔''

امیرِ کارواں کے لیے اہم ہدایات

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الۡقَلۡبِ لَانفَضُّوا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡأَمۡرِ ۖ فَإِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِينَ ۝١٥٩ (آلِ عمران)

﴿فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمۡ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے حق میں بہت نرم ہیں۔''

یہ آیت جماعتی نظم کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ جماعتی زندگی میں جو لوگ صاحبِ امر ہوں' انہیں یہ خیال رہنا چاہیے کہ ان کے سب ساتھی بھی انسان ہیں' وہ جذبات و احساسات بھی رکھتے ہیں' انہیں عزتِ نفس بھی عزیز ہے' اور یہ کہ وہ ملازم نہیں' بلکہ رضا کار (volunteers) ہیں۔ لہٰذا اُمراء کو اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جماعتی زندگی کے اس پہلو کی اہمیت کو یہاں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے حوالے سے واضح کیا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ یہ اللہ کی رحمت کا مظہر ہے کہ آپ ان کے حق میں بہت نرم ہیں۔

﴿وَلَوۡ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الۡقَلۡبِ لَانفَضُّوا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ﴾ ''اور اگر آپؐ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپؐ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔''

کسی امیر' کمانڈر یا لیڈر کی تندخوئی اور سخت گیری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے: ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا' کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

﴿فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ﴾ ''پس آپؐ ان سے درگزر کریں''

اے نبی ﷺ! غزوۂ اُحد میں آپؐ کے بعض ساتھیوں سے اگرچہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے آپ لوگوں کو بہت بڑا چرکا لگا ہے' لیکن اس کے باوجود بھی آپؐ اپنے ان ساتھیوں کے لیے اپنے دل میں میل مت آنے دیجیے۔ ان کی غلطی اور کوتاہی کو اللہ نے معاف کر دیا ہے تو آپؐ بھی انہیں معاف کر دیں' اور عام حالات میں بھی آپ انہیں معاف کرتے رہا کریں۔

﴿وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ﴾ ''اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں''

ان سے جو بھی خطا ہو جائے اس پر ان کے لیے استغفار کیا کریں۔

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ''اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیں۔''

جن لوگوں سے غلطی سرزد ہوئی ہے انہیں معاف کر دینے کے بعد آپ انہیں بدستور اپنے مشورے میں شامل رکھیں۔ واضح رہے کہ مشاورت کے عمل سے جماعت کے اندر باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اس سے مامورین اطمینان محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا امیر ہم سے مشورہ کرتا ہے' ہماری بات کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ مشاورت کے عمل کا تسلسل کسی تنظیم یا جماعت کے لیے بہت ضروری ہے۔

﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ ''پھر جب آپؐ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔''

مشاورت کے بعد جب آپ ﷺ کا دل کسی رائے پر مطمئن ہو جائے اور اس رائے کے مطابق آپؐ فیصلہ کر لیں تو اس کے بعد کسی شخص کی بات کی پروا نہ کریں' بلکہ فقط اللہ کی ذات پر توکل کریں۔ غزوۂ اُحد سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تھا' تو اُس وقت اکثر لوگوں کی رائے وہی تھی جو آنحضور ﷺ کی رائے تھی' یعنی یہ کہ مدینہ میں محصور ہو کر جنگ کی جائے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تو کھلے میدان میں جنگ کرنا چاہتے ہیں' ہمیں تو شہادت کی موت چاہیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کا لحاظ کرتے ہوئے مدینہ سے باہر نکلنے کا فیصلہ فرمایا۔ اس کے بعد جب آپ ﷺ تیار ہو کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے سے باہر تشریف لائے تو خلافِ معمول آپؐ نے زرہ پہنی ہوئی تھی اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ اس سے لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ سخت معاملہ پیش آنے والا ہے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں نے معذرت چاہی کہ حضور! ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' جو آپؐ کی رائے ہے آپ اس کے مطابق فیصلہ کیجیے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کے لیے زیبا نہیں کہ ہتھیار باندھنے کے بعد جنگ کیے بغیر انہیں اتار دے۔ چنانچہ یہ جملہ گویا نبی اکرم ﷺ کے اس فیصلے کی توثیق میں نازل ہوا کہ جب آپؐ ایک فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس پر استقامت اختیار کریں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

کبائر سے بچنے والوں کے لیے بشارت

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾

(النساء)

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ ''اگر تم اجتناب کرتے رہو گے اُن بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے''

﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ ''تو ہم تمہاری چھوٹی برائیوں کو تم سے دور کر دیں گے''

تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے تمہاری برائیاں خود بخود دھلتی رہیں گی۔

﴿وَنُدۡخِلۡكُم مُّدۡخَلٗا كَرِيمٗا ۝٣١﴾ ''اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزت جگہ پر۔''

یہ مضمون اس آیت کے علاوہ سورۃ الشوریٰ (آیت ۳۷) اور سورۃ النجم (آیت ۳۲) میں بھی آیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں اور یہ مضمون قرآن میں تین بار آیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک اور اس کے بعد کفر ہے۔ پھر فرائض کا ترک کرنا اور حرام چیزوں کا ارتکاب کرنا کبائر میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں جو انسان سے اکثر ہو جاتی ہیں' وہ عموماً صغائر کے زمرے میں آتی ہیں' مثلاً آداب میں یا احکام کی جزئیات میں کوئی کوتاہی ہوگئی' یا بغیر کسی ارادے کے کہیں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھے جو غیبت کے حکم میں آگئی' وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں صحت مندانہ رویہ یہ ہے کہ کبائر سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے' فرائض کی پوری ادائیگی ہو' محرمات سے مطلق اجتناب ہو' لیکن چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے بارے میں نہ تو ایک دوسرے پر زیادہ گرفت کی جائے اور نہ ہی خود زیادہ دل گرفتہ ہوا جائے' بلکہ ان کے بارے میں استغفار کیا جائے اور توقع رکھی جائے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا۔ صغائر دراصل نیکیوں کے ذریعے سے خود بخود بھی ختم ہوتے رہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک شخص وضو کرتا ہے تو جب وہ کلی کرتا ہے اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اُس کے منہ اور ناک سے اس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے اُس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں' یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ دھل جاتے ہیں۔ جب وہ سر کا مسح کرتا ہے تو اُس کے سر اور کانوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں' یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ پھر اس کا مسجد کی طرف چلنا اور نماز پڑھنا اس کی نیکیوں میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

گویا صغیرہ گناہ نیکیوں کے اثرات سے معاف ہوتے رہتے ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿إِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ﴾ (ھود: ۱۱۴) ''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں''۔ یہاں برائیوں سے مراد کبائر نہیں' صغائر ہیں' کیونکہ کبائر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے (اِلا ماشاء اللہ!) اور جو اکبر الکبائر یعنی شرک ہے اس کے بارے میں تو سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ أَن يُشۡرَكَ بِهِۦ وَيَغۡفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا''۔ البتہ ہمارے ہاں مذہب کا جو مسخ شدہ (perverted) تصور پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے ایک مخصوص مذہبی مزاج تشکیل پا چکا ہے۔ اس مزاج کے حامل لوگ کبائر سے تو عموماً صرفِ نظر کیے رہتے ہیں' مگر صغائر کے بارے میں قدم قدم پر غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثلاً سود خوری اور حرام خوری سے تو انہیں کوئی کراہت نہیں

آتی لیکن چھوٹے چھوٹے مسائل پر لوگوں سے الجھتے پھرتے ہیں کہ تمہاری داڑھی شرعی سائز کے مطابق نہیں ہے اور تم اپنی شلوار ٹخنوں سے نیچے کیوں رکھتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس اہم معاملے میں ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ نسبت وتناسب کو پیش نظر رکھتے ہوئے طرزِ عمل اختیار کرے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ (النساء)

اس آیت میں اسلامی معاشرت کا جو اہم اصول بیان ہوا ہے اسے اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے پہلے درج ذیل دو آیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ دونوں آیات دراصل اس مضمون کے لیے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں جو زیر مطالعہ آیت میں بیان ہوا ہے: (۱) ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۲۸) ''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق' البتہ مردوں کے لیے اُن پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔'' (۲) ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ﴾ (النساء: ۳۲) ''اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے''۔ مذکورہ دو آیات میں گویا عورتوں کو اس قانون اور ضابطے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا گیا اور اس کے بعد آیت زیر مطالعہ میں دوٹوک انداز میں فرمایا گیا:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں''

نوٹ کیجیے! یہاں قَامَ 'عَلٰی' کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ قَامَ 'بِ' کے ساتھ آئے گا تو معنی ہوں گے ''کسی شے کو قائم کرنا''۔ جیسے کہ اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۳۵ میں فرمایا گیا: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ﴾ ''عدل کو قائم کرنے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ!'' جبکہ قَامَ عَلٰی کے معنی کسی پر مسلط ہونے کے ہیں' یعنی کسی کا حاکم اور منتظم ہونا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ سے یہ واضح ہدایت ملتی ہے کہ گھر کے ادارے کا سربراہ اور حاکم مرد ہے اور یہ کہ عورت کو بہرحال اس کے ساتھ ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ یوں تو ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے۔ گھر کے اندر خاوند بھی یہی چاہتا ہے اور بیوی کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے' لیکن گھر کا نظام تبھی چلے گا جب حتمی فیصلے کا اختیار ان میں سے کسی ایک کے پاس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار خاوند کو دیا ہے' لیکن ظاہر ہے عورت کی رائے جب مسترد ہوگی تو اُسے اس سے صدمہ تو پہنچے گا۔ اسی صدمے کا اثر کم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں نسیان کا مادہ زیادہ رکھ دیا ہے' جو ایک safety valve کا کام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ شہادت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کا نصاب رکھا گیا ہے'' تاکہ ان میں سے کوئی ایک

بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے“ (البقرۃ: ۲۸۲) ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے گھر کے ادارے کا سربراہ خاوند کو بنایا ہے۔ اس حیثیت میں خاوند اگر اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے گا‘ عورت پر ظلم کرے گا اور اس کے حقوق ادا نہیں کرے گا‘ تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی سخت پکڑ ہو گی۔ لیکن اس میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ مرد اپنی عورتوں پر ”قوام“ ہیں۔

﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ﴾ ”بسبب اُس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے“

مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے‘ اور اسی تفوق کی بنا پر قوامیت کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے۔

﴿وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ ؕ﴾ ”اور بسبب اس کے کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں اپنے اموال سے۔“

اسلام کے معاشرتی نظام میں کفالتی ذمہ داری تمام تر مرد پر ہے۔ اس کے اخراجات شادی کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ شادی اگرچہ مرد کی بھی ضرورت ہے اور عورت کی بھی‘ لیکن شریعت نے مرد کو مہر ادا کرنے کا پابند کیا ہے‘ جب کہ عورت مہر وصول کرتی ہے۔ پھر شادی کے بعد عورت کا نان نفقہ کُلّی طور پر مرد کے ذمے ہے۔

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ ”پس جو نیک بیویاں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں“

مرد کو قوامیت کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اب نیک بیویوں کا رویہ بتایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کے نزدیک ایک خاتونِ خانہ کی جو بہترین روش ہونی چاہیے وہ یہاں ان تین الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ﴾۔

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ﴾ ”غیب میں حفاظت کرنے والیاں“

وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے اموال اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ حفاظت تین اعتبارات سے ہے‘ شوہر کے مال کی حفاظت‘ شوہر کی عزت و ناموس کی حفاظت‘ اور شوہر کے رازوں کی حفاظت۔

﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ﴾ ”اللہ کی حفاظت سے۔“

اصل حفاظت و نگرانی تو اللہ تعالیٰ کی ہے‘ لیکن انسان کو اس حوالے سے اپنی ذمہ داری ادا کرنی پڑتی ہے۔ جیسے رازق تو اللہ تعالیٰ ہے‘ لیکن انسان کو کام کر کے رزق کمانا پڑتا ہے۔

﴿وَالّٰتِىۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ﴾ ”اور وہ خواتین جن کے بارے میں تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو“

بیوی کا ”نشوز“ یہ ہے کہ وہ سرکشی‘ سرتابی‘ ضد اور ہٹ دھرمی کی روش پر چل پڑے اور شوہر کی اطاعت کرنے کے بجائے اپنی بات منوانے پر اصرار کرے۔ ظاہر ہے بیوی کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے گھر میں فساد اور مزاحمت (friction) کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ ایسی صورت حال میں مرد کو قوام ہونے کی حیثیت سے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں‘ جن کے تین مراحل ہیں:

﴿فَعِظُوۡهُنَّ﴾ ”پس ان کو نصیحت کرو“

پہلا مرحلہ سمجھانے بجھانے کا ہے، جس میں ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل ہے۔

﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ ''اوران کوان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو''

اگر نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ چلے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے اپنے بستر علیحدہ کرلو۔ یعنی تادیبی کارروائی کے طور پر کچھ عرصہ کے لیے ان سے تعلق زن و شو منقطع کرلو۔

﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ''اوران کو مارو۔''

اگر اس پر بھی بیوی اپنی روش نہ بدلے تو مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ اس ضمن میں آنحضور ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ چہرے پر نہ مارا جائے اور کوئی ایسی چوٹ نہ لگائی جائے جس سے جسم پر مستقل نشان پڑنے کا امکان ہو۔ اس آیت کے حوالے سے یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ بالا تادیبی ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن حکیم میں بیان فرمائی گئی ہیں، چنانچہ انہیں بیان کرتے ہوئے ہمیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ معاشرتی زندگی کو درست رکھنے کے لیے ان ہدایات پر عمل درآمد کی ضرورت پیش آئے تو ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ ''پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف (خواہ مخواہ زیادتی کی) راہ مت تلاش کرو۔''

اگر عورت سرکشی و سرتابی کی روش چھوڑ کر اطاعت کی راہ پر آ جائے تو پچھلی تمام کدورتیں بھلا دو اور اس سے انتقام لینے کے بہانے مت تلاش کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے، بہت بڑا ہے۔''

عدالتِ خداوندی میں انبیاء و رسل ؑ کی شہادت کا معاملہ

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ (النساء)

''شہادت علی الناس'' کے موضوع پر یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس سے پہلے یہ مضمون سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام انبیاء و رسل ؊ سے ان کے فریضۂ رسالت کی ادائیگی سے متعلق پوچھا جائے گا اور ہر نبی کی گواہی کے بعد پھر متعلقہ امت کے افراد کا احتساب ہوگا۔ آیت زیر مطالعہ میں اس حوالے سے عدالتِ خداوندی کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ﴾ ''تو اُس دن کیا صورت حال ہوگی جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے''

یعنی ہر نبیؑ اور رسولؑ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اپنی امت پر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام اپنی اس قوم تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد تیرے احکام کی تعمیل کے حوالے سے یہ خود ذمہ دار ہیں۔

﴿وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ کو لائیں گے ہم ان پر گواہ بنا کر۔''

یعنی اے نبی ﷺ! آپ کو اپنی امت پر شہادت دینا ہوگی۔ ہماری عدالتی اصطلاح میں اسے استغاثہ کا گواہ (prosecution witness) کہا جاتا ہے۔ گویا عدالتِ خداوندی میں نبی مکرم ﷺ استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ! تیرا پیغام جو مجھ تک پہنچا تھا میں نے وہ من وعن ان تک پہنچا دیا تھا' اب یہ لوگ اس حوالے سے خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ یہاں گواہی کے حوالے سے لفظ عَلٰی خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ دربارِ خداوندی میں ہمارے خلاف گواہی دیں گے کہ اے اللہ! میں نے تیرا دین ان کے سپرد کیا تھا' اس کے بعد اس کی تعمیل اور تبلیغ کی ذمہ داری ان لوگوں کو نبھانا تھی۔ اس کے بعد اگر انہوں نے اس حوالے سے کوتاہی کی ہے تو وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ سورۃ الفرقان کی اس آیت میں اس حوالے سے بہت سخت الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ ''اور رسولؐ کہیں گے کہ پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا''۔ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ایک رقت انگیز واقعہ بھی احادیث میں منقول ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ! انہوں نے عرض کیا: حضورؐ کیا میں آپؐ کو قرآن سناؤں؟ آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں' لیکن مجھے کسی دوسرے سے سننا اچھا لگتا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کی۔ حضور ﷺ بڑے انہماک سے سن رہے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گردن جھکائے پڑھتے جا رہے تھے۔ جب آپؐ اس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ تو حضور ﷺ نے فرمایا: حَسْبُكَ' حَسْبُكَ (بس کرو' بس کرو!)۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے سر اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حضور ﷺ کے یہ آنسو ظاہر ہے اس احساس کی وجہ سے تھے کہ مجھے اپنی امت کے خلاف گواہی دینا ہوگی۔ اندازہ کریں! ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ہم ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے حضور ﷺ کی شفاعت کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

اسلامی ریاست کے دستور اور سیاسی و قانونی نظام کا خاکہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿﴾ (النساء)

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ﴾ ’’اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو‘‘

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ﴾ ’’اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔‘‘

اس آیت میں دو واضح احکام دیے گئے ہیں‘ ایک یہ کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور دوسرا یہ کہ تمہارے تمام فیصلے عدل وانصاف پر مبنی ہونے چاہئیں۔ امانتوں سے متعلق اس حکم کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جس شخص کے پاس بھی کوئی امانت رکھوائی جائے وہ اس کی حفاظت کرے اور اسے ذمہ داری سے متعلقہ فرد کو لوٹائے۔ لیکن اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر تمام سیاسی وانتظامی عہدے صرف ان افراد کو دیے جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ ملک اور ریاست کے اعلیٰ ترین منصب (صدر‘ وزیر اعظم‘ امیر المؤمنین وغیرہ) سے لے کر ایک چھوٹے سے چھوٹے اہلکار تک تمام ذمہ داروں کا انتخاب اور تقرر صرف اہلیت اور میرٹ کی بنیاد پر ہو۔ اسی طرح حق رائے دہی بھی ایک امانت ہے‘ اس کا استعمال بھی انتہائی ذمہ داری اور دیانتداری سے ہونا چاہیے۔ میرٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے ذات‘ برادری‘ رشتہ داری کی بنا پر یا مفادات کے لالچ میں یا کسی کی دھونس کی وجہ سے کسی کے حق میں رائے (vote) دینا بہت بڑی خیانت ہے۔ گویا یہ حکم دراصل ریاست کے انتظامی اور سیاسی نظام کو درست رکھنے سے متعلق ہے۔ اسی طرح دوسرے حکم کی اصل اہمیت ریاستی سطح پر عدلیہ (Judiciary) کے حوالے سے ہے کہ اے مسلمانو! تم اپنے ملک (اسلامی ریاست) میں عدل وانصاف کا ایسا نظام قائم کرو جس کے تحت ہر کسی کو بلا امتیاز عدل وانصاف میسر آئے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ﴾ ’’یقیناً یہ بہت ہی اچھی نصیحتیں ہیں جو اللہ تمہیں کر رہا ہے۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝۵۸﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا‘ دیکھنے والا ہے۔‘‘

جدید ریاست کے تین ستون انتظامیہ (Executive)‘ عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کا ذکر اس آیت میں آیا ہے‘ جبکہ اب اگلی آیت میں مقننہ کے بارے میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کے بنیادی اصول کیا ہوں گے۔

آیت ۵۹ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی‘‘

یعنی کوئی قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشا کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔ واضح رہے کہ اصولی طور پر یہ شرط پاکستان کے دستور میں بھی تسلیم کی گئی ہے:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

یعنی کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے منافی نہیں کی جائے گی۔ لیکن بدقسمتی سے آئین کے اندر اس کی تنفیذ و

تعمیل کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہمارا دستور منافقت کا ایک پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ بہرحال اس آیت کی رو سے اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمودات قانون سازی کے دو مستقل مآخذ (sources) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح یہاں منکرینِ سنت کے موقف کی نفی ہوگئی ہے جو اس ضمن میں مؤخر الذکر ماخذ کا انکار کرتے ہیں۔

﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔''

اس آیت کے اسلوب کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے کہ یہاں تین ہستیوں یعنی اللہ، رسول ﷺ اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے ''اَطِیْعُوْا'' کا لفظ الگ الگ آیا ہے، جبکہ اُولی الامر کے لیے یہ لفظ الگ سے نہیں آیا۔ آیت کے مذکورہ جملے کا ایک اسلوب یہ بھی ہوسکتا تھا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''۔ یعنی لفظ ''اَطِیْعُوا'' ایک مرتبہ آتا اور اس کا اطلاق تینوں صاحبِ امر ہستیوں پر ہو جاتا۔ اس طرح یہ تینوں برابر ہو جاتے۔ دوسرا اسلوب یہ ہوسکتا تھا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِیْعُوْا اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''۔ یعنی لفظ ''اَطِیْعُوْا'' تیسری مرتبہ بھی آتا۔ اس طرح بھی اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اولی الامر شخصیت تینوں برابر ہو جاتے۔ لیکن قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے (لفظ ''اَطِیْعُوْا'' اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ الگ الگ آیا ہے اور اُولی الامر کے ساتھ نہیں آیا) اس سے اولوالامر کی اطاعت کا مرتبہ (status) متعین ہو جاتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مطلق، دائم اور غیر مشروط نہیں۔ جبکہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق، دائم، غیر مشروط اور غیر محدود ہے، اور صاحبِ امر کی اطاعت اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کے تابع ہوگی۔ وہ جو حکم بھی جاری کرے گا اس کے بارے میں اسے بتانا ہوگا کہ میں کتاب وسنت سے کیسے اس کا استنباط کر رہا ہوں۔ گویا اسے کم از کم یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس کا یہ حکم کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہے۔ پھر یہاں اولی الامر کے ساتھ لفظ ''مِنْكُمْ'' بہت اہم ہے۔ یعنی اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے لازم ہے کہ وہ مسلمان ہو، کسی غیر مسلم شخص کی حکومت کو ذہناً تسلیم کرنا، اللہ تعالیٰ سے بغاوت کے مترادف ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں قانون ساز ادارے کا نام، کانگریس ہو، پارلیمنٹ ہو، مجلس ملی ہو، جو بھی ہو وہ قانون سازی اس شرط کے ساتھ کرے گا کہ اس کا بنایا ہوا کوئی قانون قرآن وسنت سے متصادم نہ ہو۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ ''پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے''

مثلاً ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ اولوالامر کہے کہ میں تو اپنے اس حکم کو اسلام کے عین مطابق سمجھتا ہوں، لیکن کچھ صاحبِ رائے لوگ کہیں کہ آپ کا یہ حکم خلافِ اسلام ہے تو ایسے کسی تنازعہ کی صورت میں حکم دیا گیا:

﴿فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف''

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ ’’اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘ ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ۧ۵۹﴾ ’’یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔‘‘

یعنی تنازعہ کی صورت میں ہر ایک کو اپنا موقف درست ثابت کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ یعنی قرآن وسنت سے دلیل لانا ہوگی۔ میری پسند‘ میرا خیال‘ میرا نظریہ والا استدلال قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ البتہ اس حکم میں ایک خلا چھوڑا گیا ہے جو ہر زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پُر کیا جائے گا۔ وہ خلا یہ ہے کہ حتمی فیصلہ کون کرے گا کہ فریقین میں سے کس کی رائے صحیح ہے۔ جیسے آج کے ریاستی نظام میں یہ خلا ایک آزاد عدلیہ پُر کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب عرب میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس طرح علیحدہ علیحدہ ریاستی ادارے ابھی واضح طور پر وجود میں نہیں آئے تھے اور ان کی الگ الگ شناخت نہیں تھی کہ یہ مقننہ (Legislature) ہے‘ یہ عدلیہ (Judiciary) ہے اور یہ انتظامیہ (Executive) ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک تو باقاعدہ کوئی قاضی تھے ہی نہیں۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شعبہ قضاء قائم کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ ریاستی ادارے پروان چڑھے۔ بہرحال جدید دور میں ایسے تنازعات کے حل کا ادارہ عدلیہ ہے۔

سلام کا جواب دینے کے آداب

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْھَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶ (النساء)

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْھَا ۭ﴾ ’’اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔‘‘

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات رائج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد باہمی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کے لیے بولتے ہیں۔ جیسے مغربی معاشرے میں گڈ مارننگ‘ گڈ ایوننگ وغیرہ کلمات رائج ہیں۔ عربوں کے ہاں ’’صَبَاحَ الْخَيْر‘‘ اور ’’مَسَاءَ الْخَيْر‘‘ کے علاوہ سب سے زیادہ رواج ’’حَيَّاكَ اللّٰه‘‘ کہنے کا تھا کہ اللہ تمہاری زندگی بڑھائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں سرائیکی علاقے میں کہا جاتا ہے ’’حیاتی ہووے‘‘۔ درازیٔ عمر کی اس دعا کو تَحِيَّہ کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے لفظ تَحِيَّہ کا اطلاق ’’سلام‘‘ اور اس کے ہم معنی تمام دعائیہ کلمات پر بھی ہوتا ہے۔ عرب میں جب اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تو مذکورہ بالا حوالے سے ’’اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ‘‘ کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم ’’اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ‘‘ کے جواب میں ’’وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ‘‘ کے ساتھ ’’وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ‘‘ کا اضافہ کر کے متعلقہ شخص کو لوٹاؤ‘ اور اگر یہ نہیں تو کم از کم سلام کرنے والے کے اپنے الفاظ تو ضرور اس کی طرف لوٹاؤ۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔''

یاد رکھو! اجتماعی زندگی میں ایسے آداب بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا لحاظ رکھنے سے معاشرتی زندگی کے اندر حسن پیدا ہوتا ہے اور آپس میں محبت و مودّت پیدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کے نزدیک ایسے معاملات بہت اہم ہیں۔

اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ عدل و انصاف کے لیے!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ (النساء)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ (المائدة)

النساء:۱۳۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ ''اے اہلِ ایمان' کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''

سورۃ النساء کی اس آیت کے انداز و اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں عدلِ اجتماعی کے نظام کا قیام چاہتا ہے اور یہ عظیم الشان کارنامہ وہ اپنے اہل ایمان بندوں سے سرانجام دلوانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس مقصد کے لیے ہر سطح پر جدوجہد کریں' اس راستے کی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کریں' اپنے مالوں کی قربانیاں دیں' اپنی جانوں کے نذرانے پیش کریں اور یوں اس کے دشمنوں کو شکست دے کر دین اسلام اور عدل اجتماعی کے نظام کو دنیا میں عملی طور پر نافذ کر دیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (اللہ کے گواہ) قرار دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں عدلِ اجتماعی (Social Justice) کے قیام کا معاملہ جتنا اہم ہے بدقسمتی سے آج ہمارا مذہبی طبقہ اتنا ہی اس فریضہ سے بے بہرہ ہے۔ آج اُمت مسلمہ کی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو عدل اجتماعی کے نظام کے قیام کی ضرورت واہمیت کا سرے سے شعور تک ہی نہیں۔ اسلامی قوانین اور حدود و تعزیرات کے نفاذ کی اہمیت تو سب جانتے ہیں' لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ باطل نظام کی ناانصافیاں کیسے ختم ہوں گی؟ جاگیردارانہ ظلم و ستم اور غریبوں کے استحصال (exploitation) کی بیخ کنی کس طرح ممکن ہو گی؟ سرمایہ دار جو غریبوں کا خون چوس چوس کر روز بروز موٹے ہوتے جا رہے ہیں' ان کا احتساب کون کرے گا؟

باطل نظام دراصل ایک ایسی چکی ہے جو آٹا پیس پیس کر ایک ہی طرف ڈالتی جا رہی ہے' جبکہ دوسری طرف محرومی ہی محرومی ہے۔ اس نظام میں دولت کی تقسیم کا نظام ہی غلط ہے کہ ایک طرف وسائل کی ریل پیل ہے تو

دوسری طرف بھوک ہی بھوک۔ ایک طرف امیر امیر تر ہو رہے ہیں تو دوسری طرف غریب غریب تر' اور غربت تو ایسی لعنت ہے جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے' ازروئے حدیثِ نبویؐ: ((کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَکُوْنَ کُفْرًا)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان) ''قریب ہے کہ فقر کفر بن جائے''۔ لہٰذا سب سے پہلے وہ نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں عدل ہو' انصاف ہو اور جس میں ضمانت دی گئی ہو کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہو گی۔ جب نظام درست ہو جائے تو پھر حدود و تعزیرات کا نفاذ ہو۔ یعنی پہلے عوام کو کفالت عامہ کی ضمانت ملے' پھر جو کوئی چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ لیکن موجودہ حالات میں اگر اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو ان کا فائدہ الٹا ان لٹیروں' حرام خوروں اور بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کو ہو گا جنہوں نے حرام خوری سے دولت جمع کر رکھی ہے۔ چور کا ہاتھ کٹے گا تو انہیں چوری کا ڈر رہے گا نہ ڈاکے کا خطرہ۔ چنانچہ اصل کام نظام کا بدلنا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ (معاذ اللہ) شریعت نافذ نہ کی جائے' بلکہ مقصد یہ ہے کہ شریعت نافذ کرنے سے پہلے نظام (system) کو بدلا جائے۔ اسلامی نظام یعنی نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کیا جائے اور پھر اس نظام کو قائم رکھنے' اس کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لیے اسلامی شریعت کے قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے' کیونکہ قانون ہی کسی نظام کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے اور قانون کے صحیح نفاذ سے ہی کوئی نظام مضبوط ہوتا ہے۔

﴿وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ﴾ ''خواہ یہ (انصاف کی بات اور شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے یا تمہارے قرابت داروں کے۔''

یعنی بندۂ مؤمن کو عدل و انصاف اور قسط کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے' چاہے اس کا یہ اقدام اس کے قریب ترین رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

﴿اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۟﴾ ''چاہے وہ شخص غنی ہے یا فقیر' اللہ ہی دونوں کا پشت پناہ ہے۔''

یعنی ہر کسی کا رازق اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے' تم کسی کے کفیل اور ذمہ دار نہیں ہو۔ تمہیں تو وہ فیصلہ کرنا ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ تمہیں کسی کی جانب داری نہیں کرنی' نہ ماں باپ کی' نہ بھائی بہن کی' نہ خود اپنی اور نہ ہی کسی غریب و مسکین کی۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا کے الفاظ نے یہاں جانبدارانہ فیصلوں کا یہ چور دروازہ بھی بند کر دیا ہے ''فلاں شخص کا حق تو نہیں بنتا' لیکن یہ بہت غریب ہے' لہٰذا اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے تو اس کی مدد ہو جائے گی''۔ چنانچہ واضح کر دیا گیا کہ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' تمہیں کسی صورت میں بھی کسی کی جانب داری نہیں کرنی۔ تمہیں تو ہر صورت میں اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہونا ہے۔ ہر حق بات جو اللہ کی طرف سے ہو اس کا علمبردار بننا ہے۔

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝۱۳۵﴾ ''تو تم خواہشات کی پیروی نہ کرو' مبادا کہ تم عدل سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم زبانوں کو مروڑو

گے یا اعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔''

یعنی اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا جانتے بوجھتے حق گوئی سے پہلو تہی کی تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ کو تمہارے تمام اعمال کی پوری پوری خبر ہے۔ ''تَلْوٗا'' کا صحیح مفہوم انگریزی زبان میں ہوگا: chewing the words یعنی کسی شخص کا اپنی زبان کو اس طرح سے حرکت دینا کہ وہ بات کہنا بھی چاہتا ہے لیکن کہہ بھی نہیں پاتا' حق بات منہ سے نکالنا نہیں چاہتا اور غلط بات نکل نہیں رہی ہے۔ یا پھر یہ کہ وہ حق بات کہنے والی صورتِ حال کا سامنا کرنے سے کنی کترا رہا ہے اور موقع سے بچ نکلنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ ایسی کسی کوشش سے انسانوں کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو تو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا جو انسان کی ہر سوچ' ہر نیت اور ہر حرکت سے باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں نظامِ عدل وقسط کے قیام کا یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ سورۃ المائدۃ میں اس حکم کو انہی الفاظ میں پھر سے دہرایا گیا ہے:

المائدۃ ۸:۵ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''

ان دونوں آیات کے الفاظ ایک سے ہیں لیکن الفاظ کی ترتیب میں فرق ہے۔ اس فرق سے ایک نکتہ تو یہ معلوم ہوا کہ ''اللہ'' اور ''قِسط'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں فرمایا گیا ہے: ''قسط کے لیے کھڑے ہو جاؤ'' اور سورۃ المائدہ کی اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے: ''اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ''۔ اسی طرح ایک جگہ اللہ کے گواہ بن جانے اور دوسری جگہ قسط کے گواہ بننے کا حکم ہے۔ گویا ان دونوں آیات میں ''اللہ'' اور ''قسط'' کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ ان آیات کے مطالعہ سے ہمارے سامنے یہ آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانی معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہے۔ انصاف عام انسان کی نفسیات اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ آج پوری نوعِ انسانی انصاف کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ انصاف ہی کے لیے انسان نے بادشاہت سے نجات حاصل کی اور جمہوریت کو اپنایا تاکہ انسان پر انسان کی حاکمیت ختم ہو' مگر جمہوریت کی منزل بھی اس کے لیے سراب ثابت ہوئی' اس لیے کہ جمہوریت کو اپنا کر انسان سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کے جال میں پھنس گیا۔ پہلے وہ بادشاہت کا محکوم تھا' اب سرمایہ دار اس کے آقا اور ڈکٹیٹر بن گئے۔ اس لعنت سے نجات کے لیے اُس نے کمیونزم (Communism) کا دروازہ کھٹکھٹایا' مگر یہاں بھی متعلقہ پارٹی کی آمریت (One Party Dictatorship) اس کی منتظر تھی۔ اس طرح اپنی قسمت بدلنے کے لیے اس نے جو بھی کوشش کی اس کا نتیجہ ''رُستَ از یک بند تا اُفتاد در بندے دِگر'' کی صورت میں اس کے سامنے آیا۔ یعنی ایک مصیبت سے نجات پائی تو دوسری آفت میں گرفتار ہو گیا۔

ایسی صورتِ حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان عدل اور انصاف کے حصول کے لیے آخر کہاں جائے؟ کیا کرے؟ اس سوال کے جواب کے لیے بنیادی طور پر راہنمائی تو انسان کو اپنی فطرت کے اندر سے ملتی ہے کہ اس کی فطرت انصاف کا تقاضا کرتی ہے اور اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وہ عدل قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو' مگر راہنمائی اور ہدایت کی ایک منزل اس کے اوپر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''العدل'' اللہ کی ذات ہے اور صرف اسی کا دیا ہوا نظام ہی نسل انسانی کو عدل فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے اس نظام کو دنیا میں بالفعل نافذ کرنے کی ذمہ داری ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں دراصل ہمیں ہماری اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ﴾ کہ اے اہلِ ایمان! یہ صرف فطرتِ انسانی ہی کا تقاضا نہیں بلکہ تمہاری عبدیت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہاری وفاداری کے رشتے کا تقاضا بھی ہے کہ تم پوری قوت کے ساتھ' اپنے تمام تر وسائل اور اسباب و ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل و انصاف کو دنیا میں عملی طور پر قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

یہاں عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے والے دو اہم عوامل کا سدِ باب بھی کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک عامل مثبت تعلق یعنی محبت ہے۔ اپنی ذات سے محبت' والدین اور رشتہ داروں وغیرہ کی محبت انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں اپنے خلاف کیسے فتویٰ دے دوں؟ اپنے ہی والدین کے خلاف کیونکر فیصلہ سنا دوں؟ سچی گواہی دے کر اپنے عزیز رشتہ دار کو کیسے پھانسی چڑھا دوں؟ لہٰذا سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت (آیت ۱۳۵) میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جانے کے حکم کے بعد ''وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ......'' فرما کر اس نوعیت کی تمام عصبیتوں کی جڑ کاٹ دی گئی کہ تمہیں ہر صورت میں حق و انصاف کی بات کہنی ہے خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو' تمہارے والدین پر ہی اس کی زد کیوں نہ پڑ رہی ہو' تمہارے عزیز رشتہ دار ہی اس کی کاٹ کے شکار کیوں نہ ہو رہے ہوں۔ غرض حق بات کا اظہار تمہیں بغیر کسی مصلحت کے ڈنکے کی چوٹ پر کرنا ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا عامل منفی تعلق ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کی دشمنی' جس کی وجہ سے انسان حق بات کہنے سے پہلو تہی کر جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سوچتا ہے کہ بات تو یہی حق ہے مگر اپنے دشمن کے حق میں آخر کیسے فیصلہ دے دوں؟ چنانچہ اس عصبیت کی بیخ کنی آیت زیرِ مطالعہ کے اس حکم میں کی گئی ہے:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ﴾ ''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے منحرف ہو جاؤ۔''

﴿اِعْدِلُوْا ﴾ ''عدل سے کام لو''

﴿هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ﴾ ''یہی قریب تر ہے تقویٰ کے''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۸﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جو کچھ تم کر رہے

ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال وافعال سے باخبر ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے تمہیں ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔(آیت زیر نظر اور سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کے معانی ومفہوم کا باہمی ربط اور الفاظ کی عکسی اور reciprocal ترتیب کا حسن لائقِ توجہ ہے۔)

اہلِ ایمان کو ایمان لانے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۝ (النساء)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ ’’اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر‘ اُس کے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے نازل فرمائی اپنے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے پہلے نازل فرمائی۔‘‘

ایمان والوں سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے‘ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان کے دعویدارو! اقرار باللّسان والا ایمان تو تمہیں موروثی طور پر حاصل ہو چکا ہے۔ تم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے تو وراثت میں ایمان بھی تمہیں مل گیا‘ یا یہ کہ جب پورا قبیلہ اسلام لے آیا تو اس میں پکّے مسلمانوں کے ساتھ کچھ کچے مسلمان بھی شامل ہو گئے۔ زبان سے تو سب نے ’’اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ‘‘ پڑھ لیا۔ اس طرح اقرار باللّسان کے درجے میں تو ایمان سب کو حاصل ہو گیا‘ لیکن اس کے بعد اب تم یقین بالقلب والا ایمان بھی حاصل کرو۔ واضح رہے کہ اقرار باللّسان ایمان کا محض قانونی درجہ ہے۔ جیسا کہ اسی سورۃ کی آیت ۹۴ سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے تو تمہیں اس کے اس دعوے کو تسلیم کرنا ہوگا۔ تم اس کے ایمان کو جھٹلا نہیں سکتے‘ اس لیے کہ جس نے زبان سے کلمۂ شہادت ادا کر لیا تو قانونی طور پر وہ مؤمن ہے۔ لیکن کیا حقیقی ایمان یہی ہے؟ نہیں‘ بلکہ حقیقی ایمان تو یقینِ قلبی کا نام ہے۔ اس لیے فرمایا: ’’اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر......‘‘ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ہم اِس آیت کا ترجمہ اس طرح کریں گے کہ ’’اے اہل ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے‘ اور مانو اللہ کے رسول ﷺ کو جیسا کہ ماننے کا حق ہے......‘‘ ظاہر ہے یہ حق اُسی وقت ادا ہوگا جب اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان دل میں گھر کر لے گا۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سورۃ الحجرات کی آیت ۷ میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ’’اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے‘‘۔ آگے چل کر اسی سورۃ کی آیت ۱۴ میں کچھ لوگوں کے بارے میں یوں فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ

الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط﴾ ''یہ بدولوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے نبی (ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں' لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ چنانچہ اصل ایمان وہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ یہ درجہ تصدیق بالقلب کا ہے۔ واضح رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں بنیادی طور پر روئے سخن منافقین کی طرف ہے' جو زبانی ایمان تو لائے تھے لیکن اس کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں تھی۔

﴿وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ﴿۱۳۶﴾﴾

''اور جو کوئی کفر (انکار) کرے گا اللہ کا' اس کے فرشتوں کا' اس کی کتابوں کا' اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا' تو وہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بہت دُور نکل گیا''۔

انبیاء ورُسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۶۵﴾ (النساء)

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ﴾ ''یہ رسول (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر''

﴿لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ط﴾ ''تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد''۔

اس جملے میں لِلنَّاسِ کا 'لِ' اور عَلَی اللّٰہِ کا عَلٰی خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے۔ یہ دونوں حروف باہم متضاد ہیں۔ لِلنَّاسِ کے معنی ہیں لوگوں کے حق میں حجت' جبکہ عَلَی اللّٰہِ کے معنی ہیں اللہ کے خلاف حجت۔

﴿وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکمت والا ہے''۔

اس آیت میں احتسابِ آخرت کے حوالے سے بہت اہم فلسفہ بیان ہوا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کے اعمال ناموں کی جانچ پڑتال ہوگی اور اس جانچ پڑتال کے نتیجے میں کوئی پاس ہوگا اور کوئی فیل۔ یہ جانچ پڑتال دراصل انسان کی ان صلاحیتوں کے حوالے سے ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے دنیوی زندگی میں ودیعت کی گئی ہیں۔ قرآن مجید کے بنیادی فلسفہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع' بصر اور عقل تین بڑی چیزیں دی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾ ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی''۔ اس کے علاوہ انسانی نفس کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز بھی ودیعت کر دی گئی ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىہَا ﴿۷﴾ فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰىہَا ﴿۸﴾﴾ (الشمس) ''اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔ پس اس کے

اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا‘‘۔ پھر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح بھی پھونکی گئی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی نبی نہ بھی آتا‘ کوئی کتاب نہ بھی نازل ہوتی تو بھی ان صلاحیتوں اور اہلیتوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں انسانوں کی جوابدہی (accountability) کا جواز برحق تھا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حُجت کے لیے انبیاء و رسلؑ بھیجے۔ یہ گویا اتمامِ حجت کا اضافی انتظام تھا۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی وحی کی راہنمائی میں لوگوں پر واضح کرتے رہے‘ کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ان کے امتحان کو آسان کر دیا۔ لیکن انبیاء و رسلؑ کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسانوں پر اتمامِ حجت ہو جائے اور قیامت کے دن کوئی انسان یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ پروردگار! میں تو بے دین ماحول میں پیدا ہو گیا تھا‘ وہاں سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یا یہ کہ پروردگار! میں تو اپنی دو وقت کی روٹی کے دھندے میں ہی ایسا مصروف رہا کہ مجھے کبھی ہوش ہی نہیں آیا کہ دین و ایمان اور اللہ و آخرت کے بارے میں سوچتا‘ وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال انبیاء و رسلؑ اس لیے بھیجے گئے کہ حق کھل کر سامنے آ جائے‘ حق و باطل کے درمیان امتیاز واضح ہو جائے اور لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے محاسبہ کے مقابلے میں پیش کرنے کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ تو یہ ہے اتمامِ حجت کا فلسفہ اور طریقہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وضع فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے انبیاء و رسلؑ لوگوں کو ہدایت پر لانے کے لیے اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے؟ وہ کسی کو زبردستی تو ہدایت پر نہیں لا سکتے تھے۔ تو جن لوگوں نے انبیاء و رسلؑ کی تعلیمات کو قبول کیا اور ان پر عمل کیا ان کے لیے اللہ کے رسول ’’مبشر‘‘ تھے‘ یعنی انہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور جنت کی نعمتوں کی بشارت دیتے تھے: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾﴾ (الواقعہ) کہ ان کے لیے آخرت میں راحت و سرور اور نعمتوں والی جنت ہو گی۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی غلط راستوں پر چلتے رہے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسولؑ ’’نذیر‘‘ تھے‘ یعنی اُن کو وہ خبردار کرتے تھے کہ اب تمہارے لیے بدترین انجام کے طور پر جہنم تیار ہے۔ چنانچہ رسولوںؑ کی بعثت کا بنیادی مقصد تھا تبشیر اور انذار۔

تبشیر و انذار کے اس فلسفے کو سمجھ لینے کے بعد اب اس آیت کو پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ ’’رسول بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر‘‘ —— یہ تبشیر اور انذار کس لیے؟ ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ﴾ ’’تاکہ باقی نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت‘ کوئی عذر‘ کوئی بہانہ‘ رسولوں کے آنے کے بعد‘‘۔ ﴿وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾﴾ ’’اور اللہ زبردست ہے‘ حکیم ہے‘‘۔ وہ عزیز ہے‘ غالب ہے‘ زبردست ہے‘ وہ بغیر رسولوں کے بھی محاسبہ کر سکتا تھا‘ اس کا اختیار مطلق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ حکیم بھی ہے‘ اُس نے محاسبۂ اُخروی کے لیے جو نظام بنایا ہے وہ مبنی بر حکمت ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ رسالت کا ایک تکمیلی مقصد بھی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا طُرۂ امتیاز ٹھہرا' اور وہ ہے روئے ارضی پر اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ آپ ﷺ نے دعوت کا آغاز اسی تبشیر اور انذار ہی سے فرمایا' جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴿۴۶﴾﴾ ''اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا' اور اللہ کی طرف بلانے والا اُس کے حکم سے اور ایک روشن چراغ بنا کر''۔ اس سے بلندتر درجے میں آپ ﷺ کی رسالت کی تکمیلی حیثیت کا ذکر سورۃ التوبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصف آیت ۹ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّہٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ اسے غالب کر دے پورے دین پر''۔ رسالت کے اس تکمیلی مقصد کے اعتبار سے آپ ﷺ تمام انبیاء و رسلؑ میں ممتاز ہیں۔

ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۴﴾ (المائدۃ)

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ﴾ ''اے ایمان والو! جو کوئی بھی پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے''

﴿فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ﴾ ''تو اللہ (کو کوئی پرواہ نہیں' وہ) عنقریب (تمہیں ہٹا کر) ایک ایسی قوم کو لے آئے گا''

﴿یُّحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ﴾ ''جنہیں اللہ محبوب رکھے گا اور وہ اُسے محبوب رکھیں گے''

﴿اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ ''وہ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے''

﴿اَعِزَّةٍ عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ ۫﴾ ''کافروں پر بہت بھاری ہوں گے''

﴿یُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے''

﴿وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ؕ﴾ ''اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں کریں گے۔''

یہاں پر لفظ یَرۡتَدَّ سے ایک تو قانونی یا ظاہری ارتداد مراد ہے اور دوسرے باطنی ارتداد۔ قانونی یا ظاہری ارتداد یہ ہے کہ ایک شخص اسلام کو چھوڑ کر کافر ہو جائے۔ دوسری طرف باطنی ارتداد یہ ہے کہ ظاہری طور پر اسلام

کا لبادہ تو جوں کا توں ہے‘ لیکن عملی طور پر پسپائی اختیار کر لی گئی ہے۔ پہلے غلبۂ دین کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے‘ وقت لگا رہے تھے‘ ایثار کر رہے تھے‘ انفاق کر رہے تھے‘ بھاگ دوڑ کر رہے تھے‘ اور اب کوئی آزمائش آتی ہے تو ٹھٹک کر سورۃ البقرۃ کی اس آیت کی تصویر بن جاتے ہیں: ﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ﴾ (آیت ۲۰) ”جب ذرا روشنی ہوتی ہے ان پر تو اس میں کچھ چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں“۔ اس کے بعد پھر وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ صرف کھڑے ہونے پر ہی اکتفا نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ پسپائی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں ایسے لوگوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ اللہ تمہارا محتاج نہیں ہے‘ بلکہ تم اللہ کے محتاج ہو۔ تمہیں اپنی نجات کے لیے اقامتِ دین کی جدوجہد کے اس فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر تم نے پسپائی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے گا۔

یہاں پر مؤمنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ تین جملے خصوصی طور پر لائق توجہ ہیں:

(۱) ﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ﴾ ”اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے۔“ (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!)

(۲) ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ﴾ ”وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے‘ کافروں پر بہت سخت ہوں گے“۔ یہی مضمون سورۃ الفتح میں اس انداز سے آیا ہے: ﴿اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۹) ”آپس میں بہت رحیم و شفیق‘ کفار پر بہت سخت“۔ بقولِ اقبال: ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

(۳) ﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ﴾ ”اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں کریں گے“۔ ان کے رشتہ دار اُن کو سمجھائیں گے‘ دوست احباب نصیحتیں کریں گے کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ تم fanatic ہو گئے ہو؟ تمہیں اپنی اولاد کا بھی خیال نہیں‘ اپنے مستقبل کی بھی کوئی فکر نہیں! وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ لوگ کسی کی کوئی پروا نہیں کریں گے‘ بس اپنی ہی دھن میں مگن ہوں گے۔ جیسے زبانِ حال سے اعلان کر رہے ہوں: ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں‘ راحتِ تن‘ صحتِ داماں سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری تنہا پسِ زنداں‘ کبھی رسوا سرِ بازار
کڑکے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر گرجے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق‘ نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

یہ دراصل ایک کردار ہے جس کو واضح کرنے کے لیے اس آیت میں دو دو اوصاف کے تین جوڑوں کا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کردار کو عملاً اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

﴿ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' جس کو چاہے عطا کرتا ہے' اور اللہ بہت وسعت رکھنے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ اگر تم اپنے بھائیوں' عزیزوں' دوستوں' ساتھیوں اور رفیقوں کو دیکھتے ہو کہ ان پر اللہ کا بڑا فضل ہے' انہوں نے بڑے بڑے مرحلے سر کر لیے ہیں تو تم بھی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ہمت دے گا۔ اس لیے کہ دین کے کام میں اس قسم کا رشک بہت پسندیدہ ہے۔ جیسے غزوۂ تبوک کے لیے انفاق کے حوالے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رشک آیا تھا۔ جب غزوۂ تبوک کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا تو آپؓ نے سوچا کہ آج تو میں ابوبکرؓ سے بازی لے جاؤں گا' کیونکہ انفاق سے اِس وقت میرے پاس خاصا مال ہے۔ چنانچہ آپؓ نے اپنے پورے مال کے دو برابر حصے کیے اور پورا ایک حصہ یعنی آدھا مال لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا' لیکن اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں جو کچھ تھا وہ سب لے آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا: میں نے آج جان لیا کہ ابوبکرؓ سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا۔ تو دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ﴾ (المائدۃ:۴۸) یعنی نیکیوں میں' خیر میں' بھلائی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں رہو!

گر یہ نہیں تو جان لو کہ تم کچھ بھی نہیں!

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ حَتّٰى تُقِيۡمُوا التَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ؕ وَلَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا‌ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ (المائدۃ)

﴿قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے کتاب والو! تم کسی چیز پر نہیں ہو''

﴿حَتّٰى تُقِيۡمُوا التَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ؕ﴾ ''جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ نازل کیا گیا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔''

قرآن حکیم میں اہلِ کتاب کا تذکرہ چونکہ ہماری عبرت اور راہنمائی کے لیے آیا ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی امت کے حوالے سے اس آیت کو اس طرح پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں: يٰۤاَهۡلَ الۡقُرۡاٰنِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ حَتّٰى تُقِيۡمُوا الۡقُرۡاٰنَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ''اے قرآن کے ماننے والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں......'' تم سمجھتے ہو کہ ہم اُمتِ مسلمہ ہیں' اللہ والے ہیں' اللہ کے لاڈلے ہیں' اللہ کے آخری رسول ﷺ کے اُمتی ہیں۔ لیکن تم یہ نہیں دیکھتے ہو کہ آج ذلت و خواری تمہارا مقدر بنی ہوئی ہے' ہر طرف سے تم پر یلغار ہو رہی

ہے' عزت و وقار نام کی کوئی شے تمہارے پاس نہیں رہی۔ اربوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود دُنیا میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ یاد رکھو! ''تمہاری کوئی اصل نہیں جب تک تم قائم نہ کرو قرآن کو اور اس کے ساتھ جو کچھ مزید تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے''۔ یہاں وَمَآ اُنْزِلَ اِلَـيْكُمْ کے الفاظ میں سنت رسول ﷺ کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن وحی جلی ہے' لیکن ظاہر ہے اس کے علاوہ حضور ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے بھی تو احکامات ملتے تھے۔ چنانچہ سُنّتِ رسولؐ دراصل وحی خفی کا ظہور ہے۔ تو جب تک تم لوگ کتاب و سنت کا نظام قائم نہیں کرتے' تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ واضح رہے کہ ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ'' کا خطاب خود حضور ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں وہ حدیث موجود ہے جس میں حضور ﷺ سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ' وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ' وَاَفْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَدَبَّرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

''اے اہلِ قرآن' قرآن کو اپنا تکیہ نہ بنالینا' بلکہ اسے پڑھا کرو رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی' جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے' اور اسے عام کرو اور خوش الحانی سے پڑھو اور اس میں تدبر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ!) جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے یہ ان کے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں یقیناً اضافہ کرے گا۔''

اے نبی (ﷺ) آپ پر قرآن کے نزول کی وجہ سے اہلِ کتاب حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی سرکشی اور طغیانی میں اور بھی اضافہ ہوگا اور آپ کے ساتھ ان کی مخالفت مزید بڑھتی چلی جائے گی۔

﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸﴾ ''تو آپ ان کافروں کے بارے میں افسوس نہ کریں۔''

نبی چونکہ اپنی اُمت کے حق میں نہایت رحیم و شفیق ہوتا ہے لہٰذا اپنی قوم پر عذاب کے تصور سے اسے صدمہ ہوتا ہے۔ پھر خصوصاً جب مخاطبین نبی کی اپنی برادری سے ہوں' جیسا کہ بنی اسماعیلؑ حضور ﷺ کی برادری سے تھے' تو یہ رنج و صدمہ دو چند ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جب قریش مکہ کے بارے میں سورۂ یونسؑ اور سورۂ ہودؑ میں عذاب کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو حضور ﷺ بہت فکرمند اور غمگین رہنے لگے تھے۔ آپ کی یہ فکر اور تشویش اس قدر شدید تھی کہ اس کی وجہ سے آپ کے بالوں میں یک دم سفیدی آ گئی۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: حضور ﷺ کیا ہوا؟ آپ پر بڑھاپا طاری ہوگیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَاَخَوَاتُھَا)) (سنن الترمذی) ''مجھے سورۂ ہود اور اس کی بہنوں (ہم مضمون سورتوں) نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ ان سورتوں کے اسلوب سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کفارِ مکہ کی مدتِ مہلت اب ختم ہوا چاہتی ہے اور عذاب کا دھارا ان پر چھوٹنے ہی والا ہے۔

دعوتی تحریک کے حوالے سے اُمّ القریٰ کی اہمیت

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (الانعام)

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ﴾ ''اور (اسی طرح کی) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے' بڑی بابرکت ہے' تصدیق کرنے والی ہے اُس کی جو اس کے سامنے موجود ہے' تاکہ آپ خبردار کر دیں اُمّ القریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو۔''

قُرٰی جمع ہے قریہ کی اور اُمُّ القُریٰ کا مطلب ہے بستیوں کی ماں' یعنی کسی علاقے کا سب سے بڑا شہر۔ ہر ملک میں ایک سب سے بڑا اور سب سے اہم شہر ہوتا ہے' اسے دار الخلافہ کہیں یا دار الحکومت یا capital city' وہ بڑا شہر پورے ملک کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب کے علاقے میں اگرچہ کوئی مرکزی حکومت تو موجود نہیں تھی جس کا کوئی دار الحکومت ہوتا' لیکن خانہ کعبہ کی وجہ سے مکہ مکرمہ کو پورے عرب میں ایک مرکزی شہر کی حیثیت ضرور حاصل تھی۔ عرب کے تمام قبائل یہاں حج کے لیے آتے تھے۔ کعبہ ہی کی وجہ سے قریش مکہ کو تجارتی سرگرمیوں کے حوالے سے پورے خطے میں ایک خاص اجارہ داری (monopoly) حاصل تھی۔ اسی وجہ سے اہلِ مکہ کے ہاں پیسے کی ریل پیل تھی اور عام لوگ خوشحال تھے۔ یہاں تجارتی قافلوں کا آنا جانا سارا سال لگا رہتا تھا۔ یمن سے قافلے چلتے تھے جو مکہ سے ہو کر شام کو جاتے تھے اور شام سے چلتے تھے تو مکہ سے ہو کر یمن کو جاتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر شہر مکہ بجا طور پر علاقے میں ''اُمُّ الْقُرٰی'' کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہاں پر وَمَنْ حَوْلَهَا کے الفاظ میں جو فصاحت اور وسعت ہے اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ''ماحول'' کا ایک تو بالکل قریبی (immediate) دائرہ ہوتا ہے' پھر اس سے باہر ذرا زیادہ فاصلے پر' اور پھر اس سے باہر مزید فاصلے پر۔ اس طرح یہ دائرہ پھیلتے پھیلتے پورے کُرۂ ارض پر محیط ہو جائے گا۔ اگر دورِ نبویؐ میں کُرۂ ارض کی آبادی کو دیکھا جائے تو اُس وقت براعظم ایک لحاظ سے تین ہی تھے' ایشیا' یورپ اور افریقہ۔ امریکہ بہت بعد میں دریافت ہوا جبکہ آسٹریلیا اور انٹارکٹکا بھی اس وقت معلوم دنیا کا حصہ نہ تھے۔ دُنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو ایشیا' یورپ اور افریقہ تینوں براعظم جہاں پر ملتے ہیں یہ تقریباً وہ علاقہ ہے جسے اب ''مڈل ایسٹ'' یا مشرقِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ نام (مڈل ایسٹ) اس علاقے کے لیے misnomer ہے' یعنی درست نام نہیں ہے' لیکن بہرحال یہ علاقہ ایک نقطۂ اتصال ہے جہاں ایشیا' یورپ اور افریقہ آپس میں مل رہے ہیں اور اس جنکشن پر جزیرہ نمائے عرب واقع ہے۔ اس اعتبار سے یہ علاقہ پوری دنیا کے لیے بھی ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پس دنیا کے اس مرکزی علاقے میں واقعہ شہر مکہ (اُمّ القریٰ) میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا اور پھر حَوْلَهَا مَنْ کے الفاظ میں پورے کُرۂ ارض کو آپؐ کے حلقہ دعوت میں شامل کر دیا گیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ ''اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس (قرآن) پر بھی ایمان لے آئیں گے''۔

﴿وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩٢﴾﴾ ''اور وہی اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔''

یعنی قرآن حکیم کے مخاطب لوگوں میں سے کچھ تو مشرک ہیں اور کچھ وہ ہیں جو بعث بعد الموت کے سرے سے ہی منکر ہیں، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونے کا ذرا سا بھی تصور موجود ہے وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ اشارہ صالحین اہلِ کتاب کی طرف ہے۔

جانتے بوجھتے حق سے روگردانی کی سزا

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾ (الانعام)

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ ایمان نہیں لائے تھے پہلی مرتبہ''

اس آیت میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اگر وہ ان کو استعمال کرتا ہے تو ان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو علم سکھائیں گے تو آپ کے علم میں اضافہ ہوگا۔ آپ آنکھ کا استعمال کریں گے تو آنکھ صحت مند رہے گی، اس کی بصارت برقرار رہے گی، لیکن اگر آپ آنکھ پر پٹی باندھ دیں گے تو دو چار مہینے کے بعد آپ کی بصارت زائل ہو جائے گی۔ انسانی جوڑوں کو حرکت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، اگر آپ کسی جوڑ پر پلاسٹر چڑھا دیں گے تو کچھ عرصے کے بعد اس کی حرکت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ جو صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اگر وہ اس کا استعمال نہیں کرے گا تو وہ صلاحیت تدریجاً زائل ہو جائے گی۔ اسی طرح حق کو پہچاننے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو باطنی طور پر صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اگر ایک شخص پر کسی وقت حق منکشف ہوا، اس کے اندر اسے پہچاننے کی صلاحیت بھی موجود تھی اور اس کے دل نے گواہی بھی دے دی کہ یہ حق ہے، لیکن اس گواہی کے بعد اگر کسی تعصب کی وجہ سے، کسی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب اس نے اس حق کو دیکھنے، سمجھنے اور ماننے سے انکار کر دیا، تو اس کی وہ صلاحیت قدرے کم ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد پھر دوبارہ کبھی حق کی کوئی چنگاری اس کے دل میں روشن ہوئی تو اس کا اثر اس پر پہلے سے کم ہوگا اور پھر حق کی طرف سے مسلسل بے اعتنائی کے باعث تدریجاً وہ نوبت آ جائے گی کہ حق کو پہچاننے کی اس کی باطنی صلاحیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ یہ فلسفہ سورۃ البقرۃ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾﴾ ''اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کی سماعت پر، اور ان کی آنکھوں کے آگے پردے ڈال دیے ہیں، اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔ یعنی

جب ضد اور تعصب کی بنا پر وہ لوگ سمجھتے بوجھتے حق کا مسلسل انکار کرتے رہے تو اُن کی حق کو پہچاننے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ اب وہ اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کو point of no return کہتے ہیں۔ ہر معاملے میں واپسی کا ایک وقت ہوتا ہے‘ لیکن وہ وقت گزر جانے کے بعد ایسا کرنا ممکن نہیں رہتا۔

تو جب پہلی مرتبہ ان لوگوں پر حق منکشف ہوا‘ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کر دی‘ انہوں نے حق کو پہچان لیا‘ ان کے دلوں‘ ان کی روحوں اور باطنی بصیرت نے گواہی دے دی کہ یہ حق ہے‘ اس کے بعد اگر وہ اس حق کو فوراً مان لیتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ لیکن چونکہ انہوں نے حق کو پہچان لینے کے بعد اس سے جان بوجھ کر روگردانی کی اس لیے ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ سو معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿وَنَذَرُهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾﴾ ”اور ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی کے اندر بھٹکتے رہیں۔“

خبردار! اس راہ پہ دشمن قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھا ہے!

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾ (الانعام)

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنا دیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین“

سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ انبیاء کو تو مدد کی ضرورت تھی‘ تو پھر اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو ان کے خلاف کیوں کھڑا کر دیا؟ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو راہِ حق کے ہر مسافر کو معلوم ہونا چاہیے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ حق و باطل میں اس نوعیت کی کشاکش نہیں ہوگی تو پھر کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھی نہیں ہو سکے گی۔ آزمائش کے بغیر آخر کیسے معلوم ہوگا کہ کون واقعی حق پرست ہے اور کون جھوٹا دعویدار۔ کون اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرتا ہے اور کون دودھ پینے والا مجنوں ہے۔ یہ دنیا تو آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں اگر شر کا وجود ہی نہ ہو‘ ہر جگہ خیر ہی خیر ہو تو پھر خیر کے طلبگاروں کی آزمائش کیسے ہوگی؟ لہٰذا فرمایا کہ یہ کشمکش کی فضا ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ ہم خود حق پر چلنے والوں کو تلاطم خیز موجوں کے سپرد کر کے ان کی استقامت کو پرکھتے ہیں اور پھر ثابت قدم رہنے والوں کو نوازتے ہیں۔ اس میدان میں جو جتنا آزمایا جاتا ہے‘ اور آزمائش کی صورت میں جو جتنی استقامت دکھاتا ہے‘ جو جتنا ایثار کرتا ہے‘ اتنا ہی اُس کا مرتبہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس خوبصورت شعر میں شاعر نے یہی فلسفہ بیان کیا ہے:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ۔۔۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

﴿يُوحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ﴾ ''وہ ایک دوسرے کو اشاروں کنایوں میں پُرفریب باتیں پہنچاتے رہتے ہیں گمراہ کرنے کے لیے۔''

مثلاً ایک جن شیطان آ کر اپنے ساتھی انسان شیطان کے دل میں خیال ڈالتا ہے کہ شاباش تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو' اسی کا نام استقامت ہے۔ دیکھو کہیں پھسل نہ جانا اور اپنے مخالف کے موقف کو قبول نہ کر لینا۔ چنانچہ شیاطین کا آپس میں اس طرح کا گٹھ جوڑ چلتا رہتا ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُن کو یہ چھوٹ دے رکھی ہے۔

﴿وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ ''اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو وہ یہ نہ کر سکتے''

ظاہر بات ہے اس کائنات میں کوئی پتا بھی اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ وہ حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرتا۔ لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوٹ تھی کہ ٹھیک ہے' تم ہماری اس بندی کو جتنا آزمانا چاہتے ہو آزما لو۔ ان آزمائشوں سے ہمارے ہاں اس کے مراتب بلند سے بلندتر ہوتے چلے جارہے ہیں۔

﴿فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝١١٢﴾ ''تو چھوڑیے آپؐ ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو۔''

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہماری سنت ہے' ہمارا طریقہ ہے' ہم نے خود ان کو یہ سب کچھ کرنے کی ڈھیل دے رکھی ہے' لہٰذا آپؐ ان سے اعراض فرمائیے اور ان کو ان کی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دیجیے۔

لباس — نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝٢٦ (الاعراف)

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ﴾ ''اے آدمؑ کی اولاد' ہم نے تم پر لباس اُتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور آرائش وزیبائش کا سبب بھی ہے۔''

عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت کے غلط رسم ورواج اور نظریات میں سے ایک راہبانہ نظریہ یا تصور یہ بھی تھا کہ لباس انسانی جسم کے لیے خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور یہ شرم کا احساس جو انسان نے اپنے اوپر اوڑھ رکھا ہے یہ بھی انسان کا خود اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس نظریے کے تحت ان کے مرد اور عورتیں مادر زاد ننگے ہو کر کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ نفئ ذات (self annihiliation) کا بہت بڑا مظاہرہ اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ایک خاص ذریعہ تھا۔ اس طرح کے خیالات ونظریات بعض معاشروں میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض ملنگ قسم کے لوگ لباس پر عریانی کو ترجیح دیتے ہیں' جبکہ عوام الناس عام طور پر ایسے لوگوں کو اللہ کے مقرب بندے سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں دراصل ایسے جاہلانہ نظریات کی نفی کی جارہی ہے کہ اے بنی آدم! تمہارے لیے لباس کا تصور اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ ہے۔ یہ نہ صرف تمہاری ستر پوشی کرتا ہے بلکہ تمہارے

لیے زیب و زینت کا باعث بھی ہے۔

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ ''اور (اس سے بڑھ کر) تقویٰ کا لباس جو ہے وہ سب سے بہتر ہے۔''

سب سے بہتر لباس تقویٰ کا لباس ہے' اگر یہ نہ ہو تو بسا اوقات انسان لباس پہن کر بھی ننگا ہوتا ہے' جیسا کہ انتہائی تنگ لباس' جس میں جسم کے نشیب و فراز ظاہر ہو رہے ہوں یا عورتوں کا اس قدر باریک لباس جس میں جسم جھلک رہا ہو۔ ایسا لباس پہننے والی عورتوں کے بارے میں حضور ﷺ نے ''کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں' یعنی جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ عورتیں جنت میں داخل ہونا تو درکنار' جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکیں گی' جبکہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے بھی محسوس ہو جاتی ہے۔ (صحیح مسلم) چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد ایک طرف تو یہ ہے کہ انسان جو لباس زیب تن کرے وہ حقیقی معنوں میں تقویٰ کا مظہر ہو اور دوسری طرف یہ بھی کہ انسانی شخصیت کی اصل زینت وہ لباس ہے جس کا تانا بانا شرم و حیا اور خدا خوفی سے بنتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ ''یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تا کہ یہ لوگ نصیحت اخذ کریں۔''

کھاؤ پیو' لیکن اسراف نہ کرو!

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ (الاعراف)

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ''اے آدمؑ کی اولاد! اپنی زینت استوار کیا کرو ہر نماز کے وقت''

اس آیت میں اچھے لباس کو زینت کہا گیا ہے' جیسا کہ اس سورت کی آیت ۲۶ میں لباس کو رِيْشًا فرمایا گیا ہے' یعنی لباس انسان کے لیے زیب و زینت کا ذریعہ ہے۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس سورت کی جن تین آیات (۲۶' ۲۷ اور ۳۱) میں لباس کا ذکر ہوا ہے' ان تینوں میں بنی آدم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس کا معاملہ پوری نوع انسانی سے متعلق ہے۔ بہرحال اس آیت میں جو اہم حکم دیا جا رہا ہے وہ نماز کے وقت بہتر لباس زیب تن کرنے کے بارے میں ہے۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں عام طور پر اُلٹی روش چلتی ہے۔ یعنی دفتر اور عام میل ملاقات کے لیے تو عموماً بہت اچھے لباس کا اہتمام کیا جاتا ہے' لیکن مسجد جانا ہو تو میلے کچیلے کپڑوں سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب تمہیں میرے دربار میں آنا ہو تو پورے اہتمام کے ساتھ' اچھا اور صاف ستھرا لباس پہن کر آیا کرو۔

﴿وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾﴾ ''اور کھاؤ اور پیو البتہ اسراف

نہ کرو‘ یقیناً وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

اے بنی آدم! یہ دنیا کی چیزیں تمہارے لیے ہی بنائی گئی ہیں اور ان چیزوں سے جائز اور معروف طریقوں سے استفادہ کرنے پر تمہارے لیے کوئی پابندی نہیں ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں کے بے جا استعمال اور اسراف سے اجتناب بھی ضروری ہے‘ کیونکہ اسراف اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ یہاں ایک طرف تو اس رہبانی نظریہ کی نفی ہو رہی ہے جس میں اچھے کھانے‘ اچھے لباس اور زیب وزیبائش کو سرے سے اچھا نہیں سمجھا جاتا اور مفلسانہ وضع قطع اور ترکِ لذات کو روحانی ارتقاء کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے‘ جبکہ دوسری طرف دُنیوی نعمتوں کے بے جا اسراف اور ضیاع سے دوٹوک انداز میں منع کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں افراط وتفریط سے بچنے کے لیے ضروریاتِ زندگی کے اکتساب وتصرّف کے معیار اور اسلامی فلسفے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک مسلمان جہاں کہیں بھی رہتا بستا ہے اس کو ان دو صورتوں میں سے ایک صورت حال بہر حال درپیش ہوتی ہے‘ کہ اس کے ملک میں یا تو دین غالب ہے یا مغلوب۔ چنانچہ اگر تو آپ کے ملک میں اللہ کا دین مغلوب ہے تو آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جدوجہد کریں اور اس کے لیے کسی باقاعدہ تنظیم میں شامل ہو کر اپنا بیشتر وقت اور صلاحیتیں اس جدوجہد میں لگائیں۔ ایسی صورتِ حال میں دُنیوی طور پر ترقی کرنا اور پھلنا پھولنا آپ کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں ہونا چاہیے‘ بلکہ آپ کی پہلی ترجیح دین کے غلبے کے لیے جدوجہد ہونی چاہیے اور آپ کا ماٹو ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ہونا چاہیے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مادی لحاظ سے بہت بہتر معیارِ زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ اس لیے نہیں ہوگا کہ آپ رہبانیت یا ترکِ لذات کے قائل ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دُنیا اور دُنیوی آسائشیں کمانے کے لیے نہ آپ کوشاں ہیں اور نہ ہی اس کے لیے آپ کے پاس وقت ہے۔ آپ تو شعوری طور پر ضروریاتِ زندگی کو کم سے کم معیار پر رکھ کر اپنی تمام تر صلاحیتیں‘ اپنا وقت اور اپنے وسائل دین کی سربلندی کے لیے کھپا رہے ہیں۔ یہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ ایک مثبت جہادی نظریہ ہے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ نے سختیاں جھیلیں اور اپنے گھربار اسی دین کی سربلندی کے لیے چھوڑے۔ کیونکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان سے فرشتوں کو نازل نہیں کرے گا‘ بلکہ یہ کام انسانوں نے کرنا ہے‘ مسلمانوں نے کرنا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ انقلاب کے داعی بنے ہیں انہیں قربانیاں دینا پڑی ہیں‘ انہیں سختیاں اٹھانا پڑی ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی انقلاب قربانیوں کے بغیر نہیں آیا۔ لہٰذا اگر آپ واقعی اپنے دین کو غالب کرنے کے لیے انقلاب کے داعی بن کر نکلے ہیں تو آپ کا معیارِ زندگی خود بخود کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

البتہ اگر آپ کے ملک میں دین غالب ہو چکا ہے‘ نظامِ خلافت قائم ہو چکا ہے‘ اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آ چکی ہے تو دین کی مزید نشر واشاعت‘ دعوت وتبلیغ‘ نظامِ خلافت کی توسیع‘ عوامی فلاح وبہبود کی نگرانی‘ امن و

امان کا قیام اور ملکی سرحدوں کی حفاظت' یہ سب حکومت اور ریاست کی ذمہ داریاں ہیں۔ ایسی اسلامی ریاست میں ایک فرد کی ذمہ داری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک حکومت کی طرف سے اسے مکلف کیا جائے۔ وہ کسی ٹیکس کی صورت میں ہو یا پھر کسی اور نوعیت کی ذمہ داری ہو۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں ایک فرد' ایک عام شہری آزاد ہے کہ وہ دین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی اپنی مرضی سے گزارے۔ اچھا کمائے' اپنے بچوں کے لیے بہتر معیارِ زندگی اپنائے' دُنیوی ترقی کے لیے محنت کرے' علمی و تحقیقی میدان میں اپنی صلاحیتوں کو آزمائے یا روحانی ترقی کے لیے مجاہدے کرے' تمام راستے اس کے لیے کھلے ہیں۔

عالَمِ خلق اور عالَمِ امر کا معاملہ

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الاعراف)

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ﴾ ''بیشک تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین چھ دنوں میں' پھر متمکن ہوا عرش پر۔''

عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کی کیفیت ہمارے تصور سے بالاتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ممکن ہے واقعتاً یہ اللہ تعالیٰ کا عرش کوئی مجسّم شے ہو اور کسی خاص جگہ پر موجود ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض استعارہ ہو۔ واضح رہے کہ عالمِ غیب کی خبریں دینے والی اس طرح کی قرآنی آیات مستقل طور پر آیاتِ متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں۔ البتہ جن آیات میں بعض سائنسی حقائق بیان ہوئے ہیں' ان میں سے اکثر کی صداقت سائنسی ترقی کے باعث منکشف ہو چکی ہے' اور وہ ''متشابہات'' کے دائرے سے نکل کر ''محکمات'' کے درجے میں آ چکی ہیں۔ اس سلسلے میں آئندہ تدریجاً مزید پیش رفت کی توقع بھی ہے۔ (واللہ اعلم!)

﴿يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ﴾ ''وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر (یا رات کو ڈھانپ دیتا ہے دن سے) جو اُس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا''

دن رات کے پیچھے آتا ہے اور رات دن کے پیچھے آتی ہے۔

﴿وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾ ''اور اُس نے سورج' چاند اور ستارے پیدا کیے جو اُس کے حکم سے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔''

سورج' چاند اور ستاروں کے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی قاعدہ یا قانون ان کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے' وہ اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ اُسی کے لیے ہے خلق اور (اُسی کے لیے ہے) امر۔‘‘
اس جملے کا ایک تو بہت سادہ اور سطحی مفہوم ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ہے اور اب اس میں اُسی کا حکم کارفرما ہے۔ یعنی احکامِ طبیعیہ بھی اُسی کے بنائے ہوئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا نظام چل رہا ہے' اور احکامِ تشریعیہ بھی اُسی کے نازل کردہ ہیں کہ یہ اوامر ہیں اور یہ نواہی ہیں' انسان ان کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ مگر اس کا دوسرا اور گہرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے کائنات میں تخلیق دو سطح پر فرمائی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دو الگ الگ عالم ہیں' ایک عالمِ خلق ہے اور دوسرا عالمِ امر۔ عالمِ امر میں عدمِ محض سے تخلیق (creation ex nihilio) ہوتی ہے اور اس میں تخلیق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بس ’’کُن‘‘ کہا جاتا ہے تو متعلقہ چیز وجود میں آ جاتی ہے (فَیَکُون)۔ اس کے لیے نہ وقت درکار رہا ہے اور نہ کسی مادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرشتوں' انسانی ارواح اور وحی کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ اسی لیے ان کے سفر کرنے کے لیے بھی کوئی وقت درکار نہیں ہوتا۔ فرشتہ آنکھ جھپکنے کی دیر میں زمین سے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسری طرف عالمِ خلق میں ایک شے سے کوئی دوسری شے طبعی قوانین اور ضوابط کے مطابق بنتی ہے۔ اس میں مادہ بھی درکار ہوتا ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔ جیسے رحمِ مادر میں بچے کی تخلیق میں کئی ماہ لگتے ہیں۔ آم کی گٹھلی سے پودا اُگنے اور بڑھ کر درخت بننے کے لیے کئی سال کا وقت درکار ہوتا ہے۔ عالمِ خلق میں جب زمین اور آسمانوں کی تخلیق ہوئی تو قرآن کے مطابق یہ چھ دنوں میں مکمل ہوئی۔ (اس حوالے سے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی متعلقہ آیات بھی ابھی تک متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں' اگرچہ اس بارے میں اب جلد حقیقت منکشف ہونے کے امکانات ہیں۔) اس کی حقیقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ان چھ دنوں سے کتنا زمانہ مراد ہے۔ اس کا دورانیہ کئی لاکھ سال پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ خود قرآن کے مطابق ہمارا ایک دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہزار سال کا بھی ہو سکتا ہے (السجدۃ: ۵) اور پچاس ہزار سال کا بھی (المعارج: ۴)۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہ انتہائی پیچیدہ علمی نکتے کو بھی ایسے الفاظ اور ایسے پیرائے میں بیان کر دیتا ہے کہ ایک عمومی ذہنی سطح کا آدمی بھی اسے پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے' جبکہ ایک فلسفی و حکیم انسان کو اس نکتے کے اندر علم و معرفت کا بحرِ بے کراں موجزن نظر آتا ہے۔ چنانچہ پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کے ایک بدو کو اس آیت کا یہ مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں ہوئی ہوگی کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اسی کو حق ہے کہ اس پر اپنا حکم چلائے۔ مگر جب ایک صاحبِ علم محقق اس لفظ ’’امر‘‘ پر غور کرتا ہے اور پھر قرآن مجید میں غوطہ زنی کرتا ہے کہ یہ لفظ ’’امر‘‘ قرآن مجید میں کہاں کہاں' کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے' اور پھر ان تمام مطالب و مفاہیم کو آپس میں مربوط کر کے دیکھتا ہے تو اس پر بہت سے علمی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ بہرحال عالمِ خلق ایک الگ عالم ہے اور عالمِ اَمر الگ' اور اِن دونوں کے قوانین و ضوابط بھی الگ الگ ہیں۔

﴿تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’بہت بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔‘‘

انبیاءؑ کی دعوت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ایک سُنّت کا ذکر

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ (الاعراف)

آیت ۹۴ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بھی بستی میں کسی بھی نبی کو مگر یہ کہ ہم نے پکڑا اُس کے بسنے والوں کو سختیوں سے اور تکلیفوں سے تا کہ وہ گڑگڑائیں (اور ان میں عاجزی پیدا ہو جائے)۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے ایک خاص قانون کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کے علاوہ یہ مضمون سورۃ الانعام (آیات ۴۲ تا ۴۵) میں بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی طرف کسی رسول کو بھیجا جاتا تو اس قوم کو سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کے لیے رسول کی دعوت کو قبول کرنے کا ماحول پیدا کیا جاتا۔ کیونکہ خوشحالی اور عیش کی زندگی گزارتے ہوئے انسان ایسی کوئی نئی بات سننے کی طرف کم ہی مائل ہوتا ہے‘ البتہ اگر انسان تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ ضرور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لہٰذا کسی رسول کی دعوت کے آغاز کے ساتھ ہی اس قوم پر زندگی کے حالات تنگ کر دیے جاتے تھے‘ لیکن اگر وہ لوگ اس کے باوجود بھی ہوش میں نہ آتے‘ اپنی ضد پر اڑے رہتے‘ اور رسول کی دعوت کو رد کرتے چلے جاتے‘ تو ان پر سے وہ سختیاں اور تکلیفیں دور کر کے ان کو غیر معمولی آسائشوں اور نعمتوں سے نواز دیا جاتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا ڈھیل دینے کا ایک انداز تھا کہ اب اس قوم نے برباد تو ہونا ہی ہے مگر آخری انجام کو پہنچنے سے پہلے ان کی نافرمانی کی آخری حدود بھی دیکھ لی جائیں کہ اپنی اس روش پر وہ کہاں تک جا سکتے ہیں۔ یہ ہے وہ قانون یا اللہ تعالیٰ کی سنت‘ جس پر ہر رسول کے آنے پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ سورۃ السجدۃ میں اس قانون کی وضاحت بایں الفاظ آئی ہے: ﴿وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور ہم انہیں مزا چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ یہ رجوع کریں''۔ بڑا عذاب تو عذابِ استیصال ہوتا ہے جس کے بعد کسی قوم کو تباہ و برباد کر کے نسیاً منسیا کر دیا جاتا ہے۔ اس بڑے عذاب کی کیفیت مکی سورتوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۚ﴾ (الاعراف: ۹۲ اور ھود: ۶۸‘ ۹۵) ''وہ لوگ ایسے ہو گئے جیسے وہاں بستے ہی نہیں تھے''۔ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۭ﴾ (الانعام: ۴۵) ''پس ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی''۔ ﴿لَا یُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ﴾ (الاحقاف: ۲۵) ''اب صرف ان کے مسکن ہی نظر آ رہے ہیں''۔ یعنی عذابِ استیصال کے بعد اب اُن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے عالیشان محل تو نظر آ رہے ہیں‘ لیکن ان کے مکینوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا — تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت کسی قوم پر اس نوعیت کے ''عذاب الاکبر'' سے پہلے چھوٹی چھوٹی تنبیہات آتی ہیں تا کہ وہ لوگ خوابِ غفلت سے جاگ جائیں‘ ہوش میں آ جائیں‘ استکبار کی روش ترک

کر کے عاجزی اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے عذابِ استیصال سے بچ سکیں۔

آیت ۹۵ ﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ﴾ ''پھر ہم نے اس برائی کو بھلائی سے بدل دیا' یہاں تک کہ وہ لوگ خوب بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے آباء واَجداد پر بھی تکلیف اور خوشی آتی رہی ہے''

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ ''پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور انہیں اس کا شعور بھی نہیں تھا۔''

جب وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اَڑے رہے تو ان پر دنیاوی آسائشوں کے دہانے کھول دیے گئے کہ اب کھاؤ' پیو اور عیش کرو۔ پھر وہ عیش و عشرت کی زندگی میں اس قدر مگن ہوئے کہ سختیوں کے دَور کو بالکل ہی بھول گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے ہی رہے ہیں' اس میں امتحان اور آزمائش کی کون سی بات ہے' حتیٰ کہ ان کی پکڑ کی گھڑی آن پہنچی اور انہیں اس کا شعور ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت یوں اچانک آ جائے گی۔

نبی اُمی ﷺ کی امتیازی شان اور آپؐ کے متبعین کا خصوصی اعزاز

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿الاعراف﴾

آیت ۱۵۶ ﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ﴾ ''اور تو ہمارے لیے اس دُنیا (کی زندگی) میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی''

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے الفاظ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے یہاں نقل فرمائے ہیں۔ اس سے ملتی جلتی دعا اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں مسلمانوں کو بھی سکھائی ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں

بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ و ممنون فرما۔

﴿اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''ہم تیری جناب میں رجوع کرتے ہیں۔''

یعنی ہم سے جو خطا ہو گئی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ہم معافی چاہتے ہیں۔

﴿قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ﴾ ''(اللہ نے) فرمایا کہ میں عذاب میں مبتلا کروں گا جس کو چاہوں گا' اور میری رحمت ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔''

یعنی میری ایک رحمت تو وہ ہے جو ہر شے کے شاملِ حال ہے' ہر شے پر محیط ہے۔ ہر شے کا وجود اور بقا میری رحمت ہی سے ممکن ہے۔ یہ پوری کائنات اور اس کا تسلسل میری رحمت ہی کا مرہونِ منت ہے۔ میری اس رحمتِ عامہ سے میری تمام مخلوقات حصہ پا رہی ہیں' لیکن جہاں تک میری رحمتِ خاصہ کا تعلق ہے' جس کے لیے تم لوگ ابھی سوال کر رہے ہو:

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۱۵۶﴾ ''تو اسے میں لکھ دوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے' زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو لوگ ہماری آیات پر پختہ ایمان رکھیں گے۔''

آیت ۱۵۷ ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ﴾ ''جو اتباع کریں گے رسولِ نبی اُمّی (ﷺ) کا''

یعنی وہ لوگ جو ہمارے نبی اُمّی ﷺ کا اتباع کریں گے۔ نبی آخر الزماں ﷺ نے دُنیوی اعتبار سے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ آپؐ دُنیوی معیار کے مطابق پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ بھی اُمّی تھے اور جن لوگوں میں آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا وہ بھی اُمّی تھے' کیونکہ اُن لوگوں کے پاس اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی شریعت۔

﴿الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘﴾ ''جسے پائیں گے وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں''

یعنی آخری نبی ﷺ کے بارے میں پیشین گوئیاں' آپ ﷺ کے حالات اور آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق معلومات کے بارے میں واضح علامات اُن کو تورات اور انجیل دونوں میں ملیں گی۔

﴿یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ﴾ ''وہ انہیں نیکی کا حکم دیں گے' تمام برائیوں سے روکیں گے اور ان کے لیے تمام پاک چیزیں حلال کر دیں گے''

بنی اسرائیل پر کچھ چیزیں ان کی شرارتوں کی وجہ سے بھی حرام کر دی گئی تھیں' ان میں سے بعض چیزوں کا ذکر سورۃ النساء کی آیت ۱۶۰ میں آیا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نبی اُمّی ﷺ ان پر سے ایسی تمام بندشیں اٹھا دیں گے اور تمام پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کر دیں گے۔

﴿وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ ''اور حرام

کر دیں گے ان پر ناپاک چیزوں کو' اور ان سے اتار دیں گے ان کے بوجھ اور طوق جو اُن (کی گردنوں) پر پڑے ہوں گے۔''

یہ بوجھ اور طوق وہ بے جا اور خود ساختہ پابندیاں اور رسومات بھی ہیں جو معاشرے کے اندر کسی خاص طبقہ کے مفادات یا نمود و نمائش کی خواہش کی وجہ سے رواج پاتی ہیں' بعد میں غریب لوگوں کو انہیں نبھانا پڑتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ان کی وجہ سے ایک عام آدمی کی زندگی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے کی بلند ترین سطح پر بھی بڑی بڑی قباحتیں اور لعنتیں جنم لیتی ہیں جن کے بوجھ تلے مختلف اقوام بُری طرح پس جاتی ہیں۔ مثلاً بادشاہت کا جبر' جاگیرداری کا استحصالی نظام' سیاسی و معاشی غلامی' رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانیت میں تفریق وغیرہ۔ یہاں نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی بتایا گیا کہ آپ ﷺ انسانیت کو غلط رسومات' خود ساختہ عقائد اور نظام ہائے باطلہ کے بوجھوں سے نجات دلا کر عدل اور قسط کا نظام قائم کریں گے۔

اس کے بعد اس آیت میں حضور ﷺ کے ساتھ تعلق کی شرائط مذکور ہیں جن میں سے ہر شرط پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع کو تفصیلی طور پر سمجھنے کے لیے میرے کتابچے بعنوان: ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ﴾ ''تو جو لوگ آپ (ﷺ) پر ایمان لائیں گے''

یہ حضور ﷺ کے ساتھ تعلق کی پہلی اور بنیادی شرط ہے' یعنی آپؐ پر ایمان لانا۔ واضح رہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لانے کے دو بنیادی تقاضے ہیں۔ جب تک یہ تقاضے پورے نہ کیے جائیں اس ایمان کی حیثیت زبانی دعوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپؐ پر ایمان لانے کا پہلا تقاضا ہے آپ ﷺ کی اطاعت اور دوسرا تقاضا ہے آپ ﷺ کی محبت۔ ان دونوں تقاضوں کے بارے میں دو احادیث ملاحظہ کیجیے۔ پہلی حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ)) (اربعین نووی و مشکاۃ المصابیح) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہے جب تک کہ اس کی خواہش نفس تابع نہ ہو جائے اس چیز کے جو میں (ﷺ) لے کر آیا ہوں''۔ یعنی جو احکام اور شریعت حضور ﷺ لے کر تشریف لائے ہیں' اگر کوئی شخص ایمان رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اسے اس سب کچھ کو تسلیم کر کے اس پر عمل کرنا ہوگا۔ دوسری حدیث متفق علیہ ہے اور اس کے راوی حضرت انس بن مالک ؓ ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے باپ' بیٹے اور تمام انسانوں سے''۔ چنانچہ یہ دونوں تقاضے پورے ہوں گے تو آپ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ حقیقت بنے گا۔ یعنی ایک غایت درجہ میں آپ ﷺ کا اتباع اور اطاعت' دوسرے غایت درجے میں آپ ﷺ کی محبت۔

﴿وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ﴾ ’’اور آپ (ﷺ) کی تعظیم کریں گے اور آپ کی مدد کریں گے‘‘

جب مذکورہ بالا دو تقاضے پورے ہوں گے تو ان کے لازمی نتیجے کے طور پر دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی تعظیم پیدا ہوگی‘ آپ ﷺ کی عظمت دلوں پر راج کرے گی۔ جب اور جہاں آپ ﷺ کا نام مبارک سنائی دے گا بے ساختہ زبان پر درود وسلام آ جائے گا۔ آپ ﷺ کا فرمان سامنے آنے پر منطق و دلائل کا سہارا چھوڑ کر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے گا۔ یہاں حضور ﷺ کے ادب واحترام کے سلسلے میں یہ اصول بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ اگر کہیں کسی مسئلے پر بحث ہو رہی ہو‘ دونوں طرف دلائل کو دلائل کاٹ رہے ہوں اور ایسے میں اگر کوئی کہہ دے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس ضمن میں یوں فرمایا ہے تو حدیث کے سنتے ہی زبانیں فوراً بند ہو جانی چاہئیں۔ کیونکہ ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ آپ ﷺ کا فرمان سن لینے کے بعد بھی کسی معاملے میں رائے زنی کرے۔ بعد میں تحقیق کی جا سکتی ہے کہ آپ ﷺ سے منسوب کر کے جو فرمان سنایا گیا ہے درحقیقت وہ حدیث ہے بھی یا نہیں‘ اور اگر حدیث ہے تو روایت و درایت کے اعتبار سے اس کا کیا مقام ہے۔ حدیث صحیح ہے یا ضعیف! یہ سب بعد کی باتیں ہیں‘ لیکن حدیث سن کر وقتی طور پر چپ ہو جانا اور سرِ تسلیم خم کر دینا آپ ﷺ کے ادب کا تقاضا ہے۔

’’وَنَصَرُوْهُ‘‘ کے ضمن میں یہ نکتہ اہم ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو کس کام میں مدد درکار ہے؟ کیا آپ ﷺ کو اپنے کسی ذاتی کام کے لیے مدد چاہیے؟ ظاہر ہے آپ ﷺ نے کوئی ذاتی سلطنت وحکومت تو قائم نہیں کی‘ جس کے قیام واستحکام کے لیے آپ ﷺ کو مدد کی ضرورت ہوتی۔ آپ ﷺ کی کوئی ذاتی جاگیر یا جائیداد بھی نہیں تھی‘ جس کو سنبھالنے کے لیے آپ ﷺ کو مدد درکار ہوتی۔ دراصل آپ ﷺ کو اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے مدد چاہیے تھی جس کے لیے آپ ﷺ بھیجے گئے تھے اور وہ تھا غلبہ حق اور اقامتِ دین کا مشن: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۹) ’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ؑ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر‘‘۔ دینِ حق کے غلبے کے لیے کی جانے والی جاں گسل جدوجہد میں آپ ﷺ کو مددگاروں کی ضرورت تھی اور اس کے لیے آپ ﷺ کی طرف سے ’’مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ؟‘‘ کی صلائے عام تھی‘ کہ مجھے اللہ کا دین غالب کرنا ہے‘ یہ میرا فرضِ منصبی ہے‘ تو اب کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے اور میرا مددگار بنے؟ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی محنت‘ صحابہ کرام ؓ کی قربانیوں اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے جزیرہ نمائے عرب میں دین کو غالب کر کے اپنے اس مشن کی تکمیل کر دی۔ آپ ﷺ کے بعد کچھ عرصہ تک دین غالب رہا‘ پھر مغلوب ہو گیا اور آج تک مغلوب ہے۔ آج دنیا میں کہیں بھی دین غالب نہیں ہے۔ لہٰذا اب دین کو ساری دنیا میں غالب کرنا امت کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کے حوالے سے آپ ﷺ کا مشن آج بھی زندہ ہے‘ یہ میدان اب بھی کھلا ہے۔ گویا آج بھی حضور ﷺ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصف: ١٤) کا قرآنی حکم آج بھی ہمیں پکار رہا ہے۔

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ ﴾ ’’اور پیروی کریں گے اُس نور کی جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا جائے گا‘‘

ان الفاظ میں گویا اس کٹھن مشن کی تکمیل کا راستہ بتا دیا گیا کہ دین کے غلبے کی تکمیل قرآن حکیم کے ذریعے سے ہوگی‘ یعنی تذکیر بالقرآن‘ تبشیر بالقرآن‘ تبلیغ بالقرآن‘ انذار بالقرآن‘ تعلیم بالقرآن وغیرہ۔ جیسے محمد عربی ﷺ نے خود قرآن حکیم کے ذریعے سے لوگوں کا تزکیہ کیا: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ ﴾ (الجمعة: ۲) اسی طرح آج بھی ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعے سے لوگوں کو ترغیب دی جائے‘ ان کے دلوں کی صفائی کی جائے‘ انہیں جہالت کے اندھیروں سے ہدایت کے اُجالے کی طرف لایا جائے‘ تاریک دلوں کے اندر ایمان کی شمعیں روشن کی جائیں۔ پھر ان لوگوں کو ایک مشن پر اکٹھا کیا جائے‘ انہیں منظم کیا جائے‘ ان میں منزل کی تڑپ پیدا کی جائے اور پھر باطل سے ٹکرا کر اس کو پاش پاش کر دیا جائے۔ یہ ہے آپ ﷺ کی مدد کرنے کا صحیح طریقہ‘ اور یہ ہے اس نور (قرآن) کی پیروی کرنے کا معروف راستہ۔ پھر جو لوگ اس راستے پر چلیں گے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷﴾ ’’وہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔‘‘

آیت ۱۵۸ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف‘‘

واضح رہے کہ یہ مضمون مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں قرآن حکیم کے پانچ مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ ان میں سورۃ سبا کی آیت ۲۸ سب سے نمایاں ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ’’ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے محمد ﷺ) آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔‘‘

گزشتہ آیات کے سیاق وسباق میں اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے محمد (ﷺ) اب آپ اعلان کر دیجیے کہ اے لوگو! میں ہی وہ رسول ہوں جس کا ذکر تورات اور انجیل میں ہے۔ مجھ پر ہی ایمان لانے کی تاکید کی گئی تھی موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو بھی‘ میری ہی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لیے وعدہ ہے اللہ کی خصوصی رحمت کا اور اب میری ہی نصرت اور اطاعت کا حق ادا کرنے والوں کو ضمانت ملے گی ابدی واخروی فلاح کی!

﴿الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ ﴾ ’’(اُس اللہ کا) جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے‘ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت وارد کرتا ہے۔‘‘

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۸﴾

’’تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر جو نبی اُمی ہے‘ جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اُس کے سب کلاموں

پر اور اُس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔‘‘

یہ گویا اعلانِ عام ہے حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کہ میری بعثت اُس وعدے کے مطابق ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا۔

واقعہ سبت کے تناظر میں نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ (الاعراف)

آیت ۱۶۳ ﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾ ’’اور ان سے ذرا پوچھیے اُس بستی کے بارے میں جو ساحل سمندر پر تھی۔‘‘

اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بستی اس مقام پر واقع تھی جہاں آج کل ’’ایلات‘‘ کی بندرگاہ ہے۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر نے اسی بندرگاہ کا گھیراؤ کیا تھا‘ جس کے خلاف اسرائیل نے شدید ردّعمل کا اظہار کیا تھا اور مصر‘ شام اور اردن پر حملہ کر کے ان کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہرحال ایلات کی اس بندرگاہ کے علاقے میں مچھیروں کی وہ بستی آباد تھی جس کا حوالہ ان آیات میں آیا ہے۔

﴿اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ﴾ ’’جب کہ وہ سبت کے قانون میں حد سے تجاوز کرنے لگے‘‘

﴿اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا﴾ ’’جب کہ آتی تھیں اُن کی مچھلیاں اُن کے پاس ہفتے کے دن چھلانگیں لگاتی ہوئی‘‘

شُرَّع کے معنی ہیں سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے۔ یہاں یہ لفظ بہت زیادہ تعداد میں پانی کی سطح پر ابھرتی اور چھلانگیں لگاتی ہوئی مچھلیوں کے لیے آیا ہے۔ یعنی ان مچھلیوں کی بے خوف اچھل کود کا منظر ایسے تھا جیسے کہ نیزے چل رہے ہوں۔ دراصل تمام حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے چھٹی حس سے نواز رکھا ہے۔ ان مچھلیوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہفتے کے دن خاص طور پر ہمیں کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس لیے اس دن وہ بے خوف ہو کر ہجوم کی صورت میں ساحل پر اٹھکیلیاں کرتی تھیں‘ جبکہ وہ لوگ جن کا پیشہ ہی مچھلیاں پکڑنا تھا وہ ان مچھلیوں کو بے بسی سے دیکھتے تھے‘ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے‘ کیونکہ ان کی شریعت کے مطابق ہفتے کے دن انہیں ہر قسم کے کاروبارِ دنیوی کی ممانعت تھی۔

﴿وَيَوۡمَ لَا يَسۡبِتُونَ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ ۚ﴾ ''اور جس دن سبت نہیں ہوتا تھا وہ ان کے قریب نہیں آتی تھیں'' ہفتے کے باقی چھ دن مچھلیاں ساحل سے دور گہرے پانی میں رہتی تھیں' جہاں سے وہ انہیں پکڑ نہیں سکتے تھے' کیونکہ اس زمانے میں ابھی ایسے جہاز اور آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے کہ وہ لوگ گہرے پانی میں جا کر مچھلیوں کا شکار کر سکتے۔

﴿كَذٰلِكَ ۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ۝﴾ ''اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

آئے دن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو اس آزمائش میں ڈالا گیا کہ شریعت کے حکم پر قائم رہتے ہوئے فاقے برداشت کرتے ہیں یا پھر نافرمانی کرتے ہوئے شریعت کے ساتھ تمسخر کی کوئی صورت نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگوں نے سبت کے قانون میں ایک چور دروازہ نکال لیا۔ اس کے لیے انہوں نے ساحل پر بڑے بڑے گڑھے کھود لیے اور ان گڑھوں کو نالیوں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا۔ ہفتے کی صبح وہ لوگ ان نالیوں کو کھول دیتے۔ اس طرح سمندر کے پانی کے ساتھ جب مچھلیاں بھی گڑھوں میں آ جاتیں تو وہ ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیتے۔ پھر اگلے روز اتوار کو جا کر وہ ان مچھلیوں کو آسانی سے پکڑ لیتے اور کہتے کہ ہم ہفتے کے روز تو مچھلیوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس طرح شریعت کے حکم کے ساتھ انہوں نے مذاق کا یہ انداز اپنا کر اس حکم کی اصل روح کو مسخ کر دیا۔ حکم کی اصل روح تو یہ تھی کہ چھ دن دنیا کے کام کرو اور ساتواں دن اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے وقف رکھو' جبکہ انہوں نے یہ دن بھی ساحل پر جا کر گڑھے کھودنے' پانی کھولنے اور بند کرنے میں صرف کرنا شروع کر دیا۔

اب اس آبادی کے لوگ اس معاملے میں تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ تو براہِ راست اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا۔ جب کہ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو اس گناہ میں ملوث تو نہیں تھے مگر گناہ کرنے والوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے' بلکہ اس معاملے میں یہ لوگ خاموش اور غیر جانبدار رہے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو گناہ سے بچے بھی رہے اور پہلے گروہ کے لوگوں کو ان حرکتوں سے منع کر کے باقاعدہ نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ اب اگلی آیت میں دوسرے اور تیسرے گروہ کے افراد کے درمیان اس موضوع پر ہونے والی گفتگو نقل ہوئی ہے۔ غیر جانبدار رہنے والے لوگ نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کے نافرمان لوگ تو تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں انہیں سمجھانے اور نصیحتیں کرنے کا کیا فائدہ؟

آیت ۱۶۴ ﴿وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ﴾

''اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ کیوں نصیحت کر رہے ہو ان لوگوں کو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا پھر انہیں عذاب دینے والا ہے بہت سخت عذاب۔''

دوسرے گروہ کے لوگ تیسرے گروہ کے لوگوں سے کہتے کہ تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان مجرموں کے پیچھے ہلکان کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تباہی اور بربادی ان کا مقدر بن چکی ہے۔

﴿قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ ''انہوں نے کہا کہ تمہارے رب کے ہاں معذرت پیش کرنے کے لیے''

تیسرے گروہ کے لوگ جواب دیتے کہ اس طرح ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر پیش کر سکیں گے کہ اے پروردگار! ہم آخری وقت تک نافرمان لوگوں کو ان کی غلط حرکتوں سے باز رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے' نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے رہے۔ ہم نہ صرف خود اس گناہ سے بچے رہے بلکہ ان ظالموں کو خبردار بھی کرتے رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے سلسلے میں حد سے تجاوز نہ کریں۔

﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٦٤﴾﴾ ''اور شاید کہ وہ تقویٰ اختیار کر ہی لیں۔''

اور ہم انہیں اس لیے بھی سمجھاتے ہیں کہ شاید ہماری نصیحت ان پر اثر کر جائے اور اس طرح سمجھانے بجھانے سے کسی نہ کسی کے دل میں خدا خوفی کا جذبہ پیدا ہو ہی جائے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((لَاَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ)) (متفق علیہ)

''(اے علیؓ) اگر اللہ تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ دولت تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے۔''

آیت ۱۶۵ ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ ''پھر جب انہوں نے نظرانداز کر دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی' تو ہم نے بچا لیا ان کو جو برائی سے روکتے تھے''

﴿وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾﴾ ''اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جو ظلم کے مرتکب ہوئے تھے بہت ہی برے عذاب میں' ان کی نافرمانی کے سبب۔''

آیت ۱۶۶ ﴿فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿١٦٦﴾﴾ ''تو جب وہ بہت بڑھ گئے اس میں جس سے ان کو روکا گیا تھا' تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ!''

آخر کار ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اس صورت میں آیا کہ ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندر بنا دیا گیا اور پھر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ اس واقعہ کی تفصیل ہے جس کا اجمالی ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ المائدۃ میں بھی آ چکا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عذاب ان گروہوں میں سے صرف اس گروہ پر آیا تھا جو گناہ میں براہِ راست ملوث تھا۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ نہی عن المنکر کرنے والے لوگوں کے بارے میں واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ کہ ہم نے ان کو بچا لیا جو بدی سے روک رہے تھے اور جو گناہگار تھے ان کے بارے میں بھی صراحت سے بتا دیا گیا: ﴿وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ﴾ کہ ہم نے پکڑ لیا اُن لوگوں کو جو گناہ

میں ملوث تھے ایک بہت ہی برے عذاب میں۔ جب کہ تیسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا گیا ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی شخص براہِ راست کسی گناہ کا ارتکاب کرنے سے بچا رہتا ہے تو فریضہ نہی عن المنکر میں کوتاہی ہونے کی صورت میں بھی وہ اس گناہ کی پاداش میں آنے والے دنیوی عذاب سے بچ جائے گا۔ یہ موقف یا نظریہ دراصل ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کے پیچھے وہ انسانی نفسیات کارفرما ہے جس کے تحت انسان فطری طور پر ذمہ داری سے فرار چاہتا ہے اور پھر اس کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا ہے اور بہانے تراشتا ہے۔ اس مضمون کی وضاحت سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۵ کی تشریح کے ضمن میں بھی آ چکی ہے۔ سورۃ المائدہ کی اس آیت کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خصوصی خطبہ ارشاد فرمانا پڑا تھا کہ لوگو! تم ﴿عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ۚ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ‌ؕ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ دعوت و تبلیغ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہاری ذمہ داری نہیں ہے' بلکہ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم اس سلسلے میں اپنی پوری کوشش کرو' اپنا فرض ادا کرو' لیکن اس کے باوجود بھی اگر لوگ کفر یا گناہ پر اڑے رہیں تو پھر ان کا وبال تم پر نہیں ہوگا۔

یہاں اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نہی عن المنکر نصِ قرآنی کے مطابق فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس ماحول میں اللہ تعالیٰ کے کسی واضح حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہو تو ان حالات میں گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو نہ روکنا' نہی عن المنکر کا فرض ادا نہ کرنا' بذاتِ خود ایک بہت بڑا جرم ہے۔ لہٰذا اس واقعہ میں ''اَلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا'' کے زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اگرچہ براہِ راست تو گناہ میں ملوث نہیں تھے' لیکن مجرموں کو گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر خاموش تھے۔ اس طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے لوگوں کو نہ روکنے کے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اس ضمن میں نصِ قطعی کے طور پر ایک حدیث قدسی بھی موجود ہے اور ایک بہت واضح قرآنی حکم بھی۔ پہلے حدیث ملاحظہ فرمائیں' یہ حدیث مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے مرتب کردہ خطباتِ جمعہ میں شامل کی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَوۡحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبۡرِيۡلَ عَلَيۡهِ السَّلَامُ اَنِ اقۡلِبۡ مَدِيۡنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهۡلِهَا۔ قَالَ: يَارَبِّ اِنَّ فِيۡهِمۡ عَبۡدَكَ فُلَانًا لَمۡ يَعۡصِكَ طَرۡفَةَ عَيۡنٍ)) قَالَ: ((فَقَالَ: اِقۡلِبۡهَا عَلَيۡهِ وَعَلَيۡهِمۡ، فَاِنَّ وَجۡهَهٗ لَمۡ يَتَمَعَّرۡ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

''اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو وحی کی کہ فلاں فلاں شہر کو اس کے باسیوں پر اُلٹ دو۔ جبرائیلؑ نے عرض کیا کہ پروردگار' اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے کی دیر بھی تیری معصیت میں نہیں گزاری''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(اس پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُلٹو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میری غیرت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔''

یعنی اس کے سامنے میرے احکام پامال ہوتے رہے' شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور یہ اپنی ذاتی پرہیزگاری کو

سنبھال کر ذکر اذکار' نوافل اور مراقبوں میں مصروف رہا۔ لہٰذا یہ دوسروں سے بڑھ کر مجرم ہے!

اب اس سلسلے میں نص قرآنی کے طور پر سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ کا یہ واضح حکم بھی ملاحظہ کر لیجیے: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ ''اور ڈرو اس فتنہ (عذاب) سے جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں سے گنہگار ہیں''۔ یعنی جب کسی قوم میں بحیثیت مجموعی منکرات پھیل جائیں اور اس وجہ سے ان کے لیے اس دنیا میں کسی اجتماعی سزا کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ایسی سزا کی لپیٹ میں صرف گنہگار لوگ ہی نہیں آئیں گے۔ اس لحاظ سے یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔ مگر آیت زیر مطالعہ میں ﴿اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ کے الفاظ میں امید دلائی گئی ہے کہ ایسے ماحول میں جو لوگ اپنی استطاعت کے مطابق' آخری وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے' کسی اجتماعی عذاب کی صورت میں انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بچا لے گا۔

عہدِ اَلست کا بیان

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ (الاعراف)

آیت ۱۷۲ ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ''اور یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو''

یہ واقعہ عالَمِ ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔ اہلِ عرب قرآن حکیم کے مخاطبین اوّل تھے' اُن کی اُس وقت کی ذہنی استعداد کے مطابق یہ ایک ثقیل مضمون تھا۔ چنانچہ اسے بیان کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ انہیں پہلے تفصیل سے بتایا جاتا کہ انسانوں کی پہلی تخلیق عالَمِ ارواح میں ہوئی تھی اور یہ کہ دنیا میں طبعی اجسام کے ساتھ یہ ان کی دوسری تخلیق ہے اور پھر بتایا جاتا کہ یہ میثاق عالَمِ ارواح میں لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس مضمون کو آسان پیرائے میں بیان کرنے کے لیے عام فہم الفاظ عام فہم انداز میں استعمال کیے گئے کہ جب ہم نے نسلِ آدم کی تمام ذریت کو ان کی پیٹھوں سے نکال لیا۔ یعنی قیامت تک اس دنیا میں جتنے بھی انسان آنے والے تھے' ان سب کی ارواح اس میثاق کے وقت وہاں موجود تھیں۔

﴿وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ﴾ ''اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر' (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟''

یعنی اس عہد کے وقت تمام انسان (ارواح) پوری طرح ہوش وحواس اور خود شعوری (self conciousness) کی کیفیت میں تھے۔ اس عہد کو عام طور پر ''عہدِ اَلست'' کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ انسان کی خود شعوری

ہی اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے' حیوانات میں شعور (conscious) تو ہوتا ہے لیکن خود شعوری نہیں ہوتی۔ انسان کی اس خود شعوری کا تعلق اس کی روح سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص صرف انسان میں پھونکی ہے۔ چنانچہ جب یہ عہد لیا گیا تو وہاں تمام ارواح موجود تھیں اور انہیں اپنی ذات کا پورا شعور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ارواحِ انسانیہ سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب' تمہارا مالک' تمہارا آقا نہیں ہوں؟ (self conciousness)

﴿قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ ''انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔''

تمام ارواح نے یہی جواب دیا کہ اے اللہ! تو ہی ہمارا رب ہے' ہم اقرار کرتے ہیں' اور ہم اس پر گواہ ہیں۔ یہ اقرار تمام انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۹ میں اہلِ کتاب پر بایں الفاظ حجت قائم کی گئی: ''اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آ چکا ہے ہمارا رسول جو تمہارے لیے (دین کو) واضح کر رہا ہے' رسولوں کے ایک وقفے کے بعد' مبادا کہ تم یہ کہو کہ ہمارے پاس تو آیا ہی نہیں تھا کوئی بشارت دینے والا اور نہ کوئی خبردار کرنے والا''۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: ''مبادا کہ تم یہ کہو کہ کتابیں تو دی گئی تھیں ہم سے پہلے دو گروہوں کو اور ہم تو ان کتابوں کو (غیر زبان ہونے کی وجہ سے) پڑھ بھی نہیں سکتے تھے''۔ یعنی یہ کہ اے بنی اسماعیل! اب تمہارے لیے ہم نے اپنا ایک رسول (ﷺ) تم ہی میں سے بھیج دیا ہے اور وہ تمہارے لیے ایک کتاب لے کر آیا ہے جو تمہاری اپنی ہی زبان میں ہے۔ لہٰذا اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے اپنی کتابیں تو ہم سے پہلے والی اُمتوں پر نازل کی تھیں' اور یہ کہ اگر ہم پر بھی کوئی ایسی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے کہیں بڑھ کر ہدایت یافتہ ہوتے۔

بہرحال آیت زیر نظر میں جس گواہی کا ذکر ہے وہ نوعِ انسانی کے ہر فرد کے لیے حجت ہے۔ یہ عہد ہر روحِ انسانی اللہ تعالیٰ سے کر کے دنیا میں آئی ہے اور اُخروی مواخذے کی اصل بنیاد یہی گواہی فراہم کرتی ہے۔ نبوت' وحی اور الہامی کتب کے ذریعے جو اتمامِ حجت کیا گیا' وہ دراصل تاکید مزید اور تکرار کے لیے اور لوگوں کے امتحان کو مزید آسان کرنے کے لیے کیا گیا۔ لیکن اگر کوئی ہدایت بذریعہ نبوت' وحی وغیرہ نہ بھی آتی تو روزِ محشر کے عظیم محاسبہ (accountability) کے لیے عالمِ ارواح میں لیا جانے والا یہ عہد ہی کافی تھا جس کا احساس اور شعور ہر انسان کی فطرت میں سمو دیا گیا ہے۔

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ ''مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔''

آیت ۱۷۳ ﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ﴾ ''یا تم یہ کہو کہ شرک تو پہلے ہمارے آباء و اَجداد نے کیا تھا' اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں سے تھے۔''

﴿اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ ''تو (پروردگار!) کیا تو ہمیں ہلاک کرے گا ان باطل پسند لوگوں کے فعل کے بدلے میں؟''

ہمارے بڑے جوراستہ اور جوطور طریقے چھوڑ گئے تھے‘ ہم توان پر چلتے رہے‘ لہٰذا ہمارا کوئی قصور نہیں‘ اصل مجرم تو وہ ہیں جو ہمیں اس دلدل میں پھنسا کر چلے گئے۔ یہ باطل طور طریقے انہوں نے ہی ایجاد کیے تھے‘ ہم تو صرف ان کے مقلد تھے۔ تو ان لوگوں کی وجہ سے ہمیں سزا نہیں ملنی چاہیے۔

ایک اسرائیلی عالم کا عبرت انگیز واقعہ

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ (الاعراف)

آیت ۱۷۵ ﴿وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا﴾ ’’اور سنا یئے انہیں خبر اُس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں‘‘

لفظ ’’نبا‘‘ کے لغوی معنی ’’خبر‘‘ کے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی تمثیل نہیں بلکہ حقیقی واقعہ ہے۔ دوسرے جو یہ فرمایا گیا کہ اس شخص کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں‘ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص صاحبِ کرامت بزرگ تھا۔ اس واقعے کی تفصیل ہمیں تورات میں بھی ملتی ہے جس کے مطابق یہ شخص بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اس کا نام بلعم بن باعوراء تھا اور یہ ایک بہت بڑا عابد‘ زاہد اور عالم تھا۔

﴿فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ﴾ ’’تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا‘‘

اس واقعہ کے حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ گناہ کا ارتکاب انسان خود کرتا ہے‘ شیطان اسے کسی برائی پر مجبور نہیں کر سکتا‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (الحجر) شیطان کو کسی بندے پر کوئی اختیار حاصل نہیں‘ لیکن جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لپکتا ہے اور برائی کر بیٹھتا ہے تو وہ شیطان کا آسان شکار بن جاتا ہے۔ شیطان ایسے شخص کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ کر کے رجوع نہ کرے تو اسے تدریجاً دُور سے دُور لے جاتا ہے یہاں تک کہ اسے برائی کی آخری منزل تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۱۷۵﴾﴾ ’’تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔‘‘

آیت ۱۷۶ ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ ’’اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے ذریعے سے اسے اور بلند کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف ہی دھنستا چلا گیا‘‘

یعنی اللہ کی آیات اور جو بھی علم اس کو عطا ہوا تھا اس کے ذریعے سے اس کو بڑا بلند مقام مل سکتا تھا مگر وہ تو زمین ہی کی طرف دھنستا چلا گیا۔ یہاں پر زمین کی طرف دھنسنے کے استعارے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسان دراصل حیوانی جسم اور ملکوتی روح سے مرکب ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی کا تعلق زمین سے ہے‘

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۵ میں فرمایا گیا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ﴾ کہ ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا۔ اس کے برعکس انسانی روح کا تعلق عالم بالا سے ہے اور وہ اللہ سے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۷۲) والا عہد کر کے آئی ہے۔ چنانچہ اصل کے اس تضاد کی بنیاد پر جسم اور روح میں متواتر کشمکش رہتی ہے۔ ''كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ'' (ہر چیز اپنے منبع کی طرف لوٹتی ہے) کے مصداق رُوح اُوپر اٹھنا چاہتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کر سکے' جبکہ جسم کی ساری کشش زمین کی طرف ہوتی ہے۔ چونکہ جسم کی تقویت کا سارا سامان' غذا وغیرہ زمین ہی کے مرہونِ منت ہے' اس لیے زمینی اور دنیاوی لذتوں میں ہی اسے سکون ملتا ہے اور ع ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کا نعرہ اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص فیصلہ کر لیتا ہے کہ جسمانی ضرورتوں اور لذتوں کے حصول کے لیے اس نے زمین کے ساتھ ہی چمٹ کر رہنا ہے تو گویا اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محروم کرا لیا۔ ایسے انسان کی روح روحانی غذا نہ ملنے کی وجہ سے سسکتی رہے گی' احتجاج کرتی رہے گی اور اگر زیادہ مدت تک اسے ایسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑے تو ایسی صورت میں روح کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی انسان کے جیتے جی اس کی روح کے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے' یعنی اس کی روح کی موت واقع ہو جائے تو گویا وہ چلتا پھرتا حیوان بن جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنی زندگی کے سارے تقاضے حیوانی انداز میں پورے کرتا ہے اور زمینی غذائیں' سفلی آرزوئیں اور مادی امنگیں ہی اس کی زندگی کا مقصد ومحور قرار پاتی ہیں۔ نتیجتاً اسے فیضانِ سماوی اور توفیقِ الٰہی سے کُلی طور پر محروم کر دیا جاتا ہے۔

﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ﴾ ''اور اُس نے پیروی کی اپنی خواہشات کی۔''

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ﴾ ''تو اس کی مثال کُتے کی سی ہے' اگر تم اس کے اوپر بوجھ رکھو تب بھی ہانپے گا اور اگر چھوڑ بھی دو تب بھی ہانپتا رہے گا۔''

یعنی اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے خود کو کُتے سے مشابہ کر لیا' جو ہر وقت زبان نکالے ہانپتا رہتا ہے اور حرص وطمع کے غلبے کی وجہ سے ہر وقت زمین کو سونگھتے رہنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ﴾ ''یہی مثال ہے اُس قوم کی (بھی) جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔''

قرآن حکیم میں قومِ یہود کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ پوری کی پوری قوم شروع سے ہی بلعم بن باعوراء بنی رہی ہے' جبکہ آج اس واقعہ کا سب سے بڑا مصداق پاکستانی قوم ہے۔ پاکستان کا بن جانا اور اس کا قائم رہنا ایک معجزہ تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو یقین تھا کہ پاکستان کی بقا بحیثیت ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ممکن نہیں ہے' اس لیے یہ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ ملک نہ صرف قائم رہا بلکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ جیسی بڑی بڑی آزمائشوں سے بھی سرخرو ہو کر نکلا۔ بہرحال ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے اس ملک کو حاصل کیا تھا اسلام کے نام پر کہ اسے اسلامی نظام کی تجربہ گاہ بنائیں گے' تاکہ پوری دنیا اسلامی نظام کے

عملی نمونے اور اس کی برکات کا مشاہدہ کر سکے۔ قائد اعظم نے بھی فرمایا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں تاکہ ہم عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں' لیکن اس کے بعد عملی طور پر ہمارا طرزِ عمل ''فَانْسَلَخَ مِنْهَا'' کے الفاظ کی عبرتناک تصویر بن کر رہ گیا۔ یعنی ہم ان تمام وعدوں سے پیچھا چھڑا کر نکل بھاگے اور شیطان کے پیروکار بن گئے۔ پھر بحیثیتِ قوم ہمارا جو حال ہوا اور آج کے دن تک مسلسل جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں ان آیات کا مطالعہ اس حوالے سے بھی کرنا چاہیے۔

﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ ''سو (اے نبی ﷺ!) آپ یہ واقعات سنا دیجیے شاید کہ یہ تفکر کریں۔''

سورۃ الانفال کے مضامین کا اجمالی تعارف

سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے متصلاً بعد اور سورۂ آلِ عمران کے اکثر حصے سے پہلے نازل ہوئی۔ چنانچہ اس سورت کے مضامین کو سمجھنے کے لیے غزوۂ بدر کے پس منظر کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ اور اس پس منظر کے مطالعہ سے پہلے نبی اکرم ﷺ کی دعوتی وانقلابی تحریک کے منہج ومراحل کے حوالے سے غزوۂ بدر کی خصوصی اہمیت اور حیثیت کا تعین بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب ہم واقعہ غزوۂ بدر کو قرآن کے فلسفۂ تذکیر بایام اللہ اور سورۃ الانفال کے خصوصی تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس کے مندرجہ ذیل دو بہت اہم پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) مشرکینِ مکہ پر عذاب کا پہلا کوڑا: اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق رسولوں کا انکار کرنے والی اقوام پر اجتماعی طور پر عذابِ استیصال نازل ہوتا رہا ہے۔ اسی قانونِ قدرت کا اطلاق ہجرت کے بعد مشرکینِ مکہ پر بھی ہونے والا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے بارہ تیرہ برس تک مختلف انداز میں دعوت دے کر اپنی قوم پر اتمامِ حجت کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے لیے ہجرت کا حکم گویا ایک واضح اشارہ تھا کہ مشرکین مکہ اپنے مسلسل انکار کے باعث اب عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں' لیکن حکمتِ الٰہی کے پیش نظر قریش کا معاملہ اپنی نوعیت میں اس لحاظ سے منفرد رہا کہ ان پر عذاب یکبارگی ٹوٹ پڑنے کے بجائے بالاقساط نازل ہوا۔ لہٰذا اس عذاب کی قسط اوّل اُن پر بدر کے میدان میں نازل ہوئی۔ انہیں حرمِ مکہ سے نکال کر میدانِ بدر میں بالکل اسی طرح سے لایا گیا جیسے آلِ فرعون کو سمندر میں غرق کرنے کے لیے اُن کے محلات سے نکالا گیا تھا۔

میدانِ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے' ستّر افراد قیدی بنے اور متعدد زخمی ہوئے۔ یہ انجام ان جنگجوؤں کا ہوا جو فنِ حرب کی مہارت اور بہادری میں پورے عرب میں مشہور تھے' اپنے دور کے جدید ترین اسلحہ سے لیس اور تعداد میں اپنے حریف لشکر سے تین گنا تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ تین سو تیرہ میں سے صرف آٹھ افراد کے پاس تلواریں تھیں۔ ان نہتے تین سو تیرہ مجاہدین کے ہاتھوں ایک

ہزار کے مسلح لشکر کی یہ ذلت اور ہزیمت دراصل قریش مکہ کے لیے عذاب الٰہی کی پہلی قسط تھی' جس کا ذکر سورۃ الانفال میں ہوا ہے۔ (اس عذاب کا آخری مرحلہ سن ۹ ہجری میں آیا' جس کا ذکر سورۃ التوبہ میں ہے۔)

(۲) غلبۂ دین کی جدّ و جہد کا حتمی اور ناگزیر مرحلہ (اقدام): غزوۂ بدر رسول اللہ ﷺ کی غلبۂ دین کی جدوجہد کے پانچویں اور آخری مرحلے یعنی حق و باطل کے درمیان باقاعدہ تصادم کا نقطۂ آغاز تھا اور اس مرحلے کو سر کرنے کے بعد یہ تحریک بالآخر تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور جامع ترین انقلاب پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کے ابتدائی چار مراحل یعنی دعوت' تنظیم' تربیت اور صبر محض تو مکہ مکرمہ میں طے ہو گئے تھے۔ اس سلسلے کے چوتھے مرحلے (صبر محض) کا تذکرہ سورۃ النساء کی آیت ۷۷ میں ﴿ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ﴾ کے الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اپنے ہاتھ باندھ کر رکھو' یعنی تمہارے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو بھی تمہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے' حتیٰ کہ اس مرحلے میں تم لوگوں کو مدافعانہ کارروائی کی بھی اجازت نہیں ہے۔

ان چار مراحل کو کامیابی سے طے کرنے کا نتیجہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جاں نثاروں کی ایک مختصر مگر انتہائی مضبوط جماعت تیار ہو گئی تھی' جو سرد و گرم چشیدہ تھے' ہر طرح کی سختیاں جھیل چکے تھے' ہر قسم کی قربانیاں دے چکے تھے اور ان کے اخلاص مع اللہ میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس تربیت یافتہ' منظم اور مضبوط جماعت کی تیاری کے بعد اب باطل کو للکارنے کا وقت قریب آ چکا تھا۔ لہٰذا مدینہ کی طرف ایک کھڑکی کھول کر دارالہجرت کا انتظام کر دیا گیا' تا کہ یہ ساری قوت ایک جگہ مجتمع ہو کر آخری مرحلے (اقدام) کے لیے تیاری کر سکے اور یہی وجہ تھی کہ یہ ہجرت تمام اہل ایمان پر فرض کر دی گئی تھی۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ ہجرت فرار (flight) نہیں تھی' جیسا کہ مغربی مؤرخین اسے یہ نام دیتے ہیں' بلکہ ایک باقاعدہ سوچی سمجھی' طے شدہ حکمت عملی تھی' جس کے تحت اس تحریک کے ہیڈ کوارٹر کو متبادل base کی تلاش میں مکہ سے مدینہ منتقل کیا گیا' تا کہ وہاں سے فیصلہ کن انداز میں اقدام کیا جا سکے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس موضوع پر میری کتاب ''منہج انقلاب نبوی ﷺ'')

اس ضمن میں یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اٹھارہویں صدی میں مغربی علوم و تہذیب کی شدید یلغار کے سامنے مسلمان ہر میدان میں پسپا ہوتے چلے گئے' چنانچہ جب مغرب کی طرف سے یہ الزام لگایا گیا کہ ؏ ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' یعنی یہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو اس کے جواب میں ہمارے کچھ بزرگوں کی طرف سے پورے خلوص کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا۔ شاید یہ اس وقت کے حالات کی وجہ سے مجبوری بھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں محکومی و غلامی کی حالت میں مسلمان خصوصی طور پر انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان حالات میں کچھ مسلمان رہنما ایک طرف اپنی قوم کے تحفظ کے بارے میں فکر مند تھے تو دوسری طرف وہ اسلام اور سیرت النبی ﷺ کا دفاع بھی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس الزام کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے خود سے کوئی ایسا جارحانہ

اقدام نہیں کیا' بلکہ تمام جنگیں آپ ﷺ پر مسلط کی گئی تھیں اور آپ ﷺ نے تمام جنگیں اپنے دفاع میں لڑیں۔

ہندوستان میں ان خطوط پر سب سے زیادہ کام علامہ شبلی نعمانی ؒ نے کیا ہے۔ وہ سر سیّد احمد خان کے زیر اثر تھے اور یہ سب لوگ مل کر جدید مغربی افکار وخیالات' تہذیب وتمدن اور اقدار ونظریات کے طوفان کا خلوصِ نیت سے مقابلہ کر رہے تھے' جو بہر حال کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں انہیں معذرت خواہانہ (apologetic) انداز اختیار کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ''سیرت النبی ﷺ'' تحریر کرتے ہوئے غزوۂ بدر سے پہلے کی آٹھ مہمات (جن میں چار غزوات اور چار سرایہ تھیں) کو تقریباً نظر انداز کر دیا ہے' تاکہ یہ ثابت نہ ہو کہ پہل کا اقدام (initiative) حضور اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا تھا۔

مذکورہ مصلحت آمیز حکمت عملی ایک خاص دور کا تقاضا تھی' لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ آج اسلام کا یہ فکر و فلسفہ پوری وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جو انسانی معاشرے میں عملی تنفیذ کے لیے اپنا غلبہ چاہتا ہے اور یہ کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی دین کو غالب کرنا تھا۔ اسی طرح دین کو غالب کرنے کی اس انقلابی جدوجہد کی آج بھی ضرورت ہے۔ یہ جدوجہد جب بھی اور جہاں بھی شروع کی جائے گی اس کے لیے منظم انداز میں تیاری کی ضرورت ہوگی۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضور نبی اکرم ﷺ کی تحریک نے یہ کٹھن سفر بتدریج پانچ مراحل میں طے کیا' یعنی دعوت' تنظیم' تربیت' صبر محض اور اقدام۔ اگر پہلے چار مراحل کامیابی سے طے کر لیے جائیں تو اس کے بعد یہ جدوجہد آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے جس میں باطل کو للکار کر اس سے ٹکر لی جاتی ہے۔ اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ حق اور باطل دو ایسی متضاد اور متحارب قوتیں ہیں جو متوازی انداز میں نہیں چل سکتیں۔ دونوں میں بقائے باہمی (co-existence) کے اصول پر مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک قوت غالب ہوگی تو دوسری کو لازمی طور پر مغلوب ہونا پڑے گا۔ لہٰذا اگر حق اور اہل حق طاقتور ہیں تو وہ کسی قیمت پر باطل سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حالات کی نزاکت کے تحت منکرین زکوٰۃ کے ساتھ رعایت کرنے کے مشورے کے جواب میں فرمایا تھا: اَيُبَدَّلُ الدِّيْنُ وَاَنَا حَيٌّ (کیا دین میں ترمیم کی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں!)۔ لہٰذا سورۃ الانفال کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فلسفے کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھنا اور ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

غزوۂ بدر کا پس منظر: مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے داخلی استحکام پر ترجیحی طور پر توجہ مرکوز فرمائی۔ اس سلسلے میں پہلے چھ ماہ میں آپ ﷺ نے تین انتہائی اہم امور سرانجام دیے۔ اوّلاً آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر مکمل کروائی' جس کی صورت میں آپ ﷺ کو ایک ایسا مرکز میسر آ گیا جو بیک وقت ایک سیکرٹیریٹ بھی تھا اور پارلیمنٹ ہاؤس بھی' دار العلوم اور خانقاہ بھی تھا اور عبادت گاہ بھی۔ ثانیاً آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار میں مواخات کا رشتہ قائم کرا دیا' جس کی وجہ سے نہ صرف مہاجرین کے معاشی و معاشرتی مسائل حل ہو گئے' بلکہ مدینہ میں ان دونوں فریقوں کے افراد پر مشتمل ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس کے

افراد باہمی محبت اور اخلاص کے گہرے رشتہ میں منسلک تھے۔ اس سلسلے کا تیسرا اور اہم ترین کارنامہ میثاق مدینہ تھا۔ یعنی یہودی قبائل کے ساتھ مدینہ کے مشترک دفاع کا معاہدہ' جس کے تحت حملے کی صورت میں مدینہ کے یہودی قبائل مسلمانوں کے ساتھ مل کر شہر کا دفاع کرنے کے پابند ہو گئے۔

داخلی محاذ پر ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد ہجرت کے ساتویں ماہ سے آپ ﷺ نے مدینہ کے اطراف و جوانب میں چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قریش مکہ کی معیشت کا دار و مدار تجارت پر تھا اور مکہ سے یمن اور شام کی طرف اُن کے تجارتی قافلے سارا سال رواں دواں رہتے تھے۔ یہ دونوں تجارتی شاہراہیں قریشِ مکہ کی معیشت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ ﷺ نے اِن دونوں شاہراہوں پر اپنے فوجی دستوں کی نقل و حرکت سے قریش کو یہ باور کرا دیا کہ ان کی یہ معاشی شہ رگ اب ہماری زد میں ہے اور ہم جب چاہیں اسے کاٹ سکتے ہیں۔ غزوۂ بدر (۲ ہجری) سے پہلے' ڈیڑھ سال کے دوران میں ایسی آٹھ مہمات کا بھیجا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ ان میں سے چار مہمات میں رسول اللہ ﷺ کی بنفسِ نفیس شرکت بھی ثابت ہے۔ آپ ﷺ جن جن علاقوں میں تشریف لے گئے وہاں پر آباد قبائل کے ساتھ آپ ﷺ نے دوستی کے معاہدے کر لیے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے اطراف و جوانب میں آباد اکثر قبائل جو پہلے قریش کے دوست تھے اب مسلمانوں کے حلیف بن گئے' جبکہ کچھ قبائل نے غیر جانبدار رہنے کے معاہدے کر لیے' اور یوں آپ ﷺ کی کامیاب حکمت عملی سے مدینہ کے مضافاتی علاقوں سے قریش کا دائرۂ اثر سکڑنے لگا۔ قریش کے لیے مکہ کی معاشی ناکہ بندی کا خدشہ ہی کچھ کم پریشان کن نہیں تھا کہ اب انہیں اس علاقے سے اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بساط بھی لپٹتی ہوئی دکھائی دینے لگی' چنانچہ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ مدینہ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے منصوبہ بندی کرنے لگے۔ اسی دوران میں دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے حالات تیزی سے خراب ہو کر غزوۂ بدر پر منتج ہوئے۔

پہلا واقعہ یوں ہوا کہ حضور ﷺ نے ایک چھوٹا سا دستہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع نخلہ کے مقام پر بھیجا۔ ان لوگوں کو آپ ؐ نے یہ مشن سونپا تھا کہ وہ اس علاقے میں موجود رہیں اور قریش کی نقل و حرکت کے بارے میں مطلع کرتے رہیں۔ اتفاق سے اس دستے کی مڈ بھیڑ قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہو گئی۔ مقابلے میں ایک مشرک عبداللہ بن حضرمی مارا گیا جبکہ ایک دوسرے مشرک کو قید کر لیا گیا۔ مالِ غنیمت اور قیدی کے ساتھ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا' کیونکہ ایسا کرنے کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا' لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ گویا مسلمانوں کی طرف سے قریش کے خلاف پہلا باقاعدہ مسلح اقدام تھا جس میں ان کا ایک شخص بھی قتل ہوا۔ لہٰذا اس واقعہ سے ماحول کی کشیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

دوسرا واقعہ ابوسفیان کے قافلے سے متعلق ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تھا جو مکہ سے شام کی طرف جا رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کا تعاقب کیا' مگر وہ لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب یہ قافلہ پچاس ہزار

دینار کی مالیت کے ساز وسامان کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا تو ممکنہ خطرے کے پیش نظر ابوسفیان نے قافلے کی حفاظت کے لیے دوہری حکمت عملی اختیار کی۔ انہوں نے ایک طرف تو ایک تیز رفتار سوار کو اپنے تحفظ کی خاطر مدد حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ کیا اور دوسری طرف انہوں نے معمول کا راستہ جو بدر کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا' اس کو چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جو مدینہ سے دور ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ بہرحال اتفاق سے مکہ میں یہ دونوں اشتعال انگیز خبریں یکے بعد دیگرے پہنچیں۔ ایک طرف نخلہ سے جان بچا کر بھاگنے والے افراد روتے پیٹتے عبداللہ بن حضرمی کے قتل کی خبر لے کر پہنچ گئے اور دوسری طرف ابوسفیان کا ایلچی بھی دہائی دیتے ہوئے آپہنچا کہ لوگو! بھاگو! دوڑو! کچھ کر سکتے ہو تو کرو' تمہارا قافلہ مسلمانوں کے ہاتھوں لٹنے والا ہے۔ ان خبروں سے مکہ میں تو گویا آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ فوری طور پر ایک ہزار کا لشکر تیار کیا گیا' جس کے لیے ایک سو گھوڑے اور نو سو اونٹ مہیا کیے گئے' وافر مقدار میں سامانِ رسد اور اسلحہ وغیرہ بھی فراہم کیا گیا۔

مشاورت کے بارے میں غلط فہمی کی وضاحت: غزوۂ بدر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جس مشاورت کا ذکر قرآن حکیم اور تاریخ میں ملتا ہے اس کے بارے میں اکثر لوگ مغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دو مواقع اور دو مقامات پر الگ الگ مشاورت کا انعقاد فرمایا تھا مگر اکثر و بیشتر لوگوں نے اسے ایک ہی مشاورت سمجھا ہے۔

پہلی مجلس مشاورت مدینہ میں ہوئی اور اس کا مقصد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ابوسفیان کے قافلے کو شام سے واپسی پر روکنا چاہیے یا نہیں؟ اور جب مشورہ کے بعد اس سلسلے میں اقدام کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو آپ ﷺ کچھ صحابہؓ کو لے کر اس مقصد کے لیے مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ چونکہ اس وقت تک جنگ کے بارے میں کوئی گمان تک نہیں تھا اس لیے اس مہم کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی تھی۔ بس جس کے ہاتھ میں جو آیا وہ لے کر چل پڑا۔ چنانچہ دو گھوڑوں' آٹھ تلواروں اور کچھ چھوٹے موٹے ہتھیاروں کے ساتھ چند صحابہؓ کی معیت میں جب آپ ﷺ مقامِ صفراء پر پہنچ گئے تو آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ابوجہل ایک ہزار کا لشکر لے کر مکہ سے چل پڑا ہے۔ اور اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آ گئی کہ جنوب (مکہ) کی طرف سے ایک لشکر آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے جبکہ شمال کی جانب سے قافلہ' اور میرا یہ وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک پر آپ ﷺ کو ضرور فتح حاصل ہو گی۔ لہٰذا اہل ایمان کو خوشخبری بھی دیں اور ان سے مشورہ بھی کریں۔ چنانچہ اس وحی کے بعد مقامِ صفراء پر آپ ﷺ نے یہ فیصلہ کرنے کے لیے دوسری مشاورت کا انعقاد فرمایا کہ پہلے لشکر کے مقابلے کے لیے جایا جائے یا قافلے کو روکنے کے لیے؟ چنانچہ جن محققین اور مفسرین سے اس پس منظر کی تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے اور انہوں نے مشاورت کے دو واقعات کو ایک ہی واقعہ سمجھا ہے' انہیں اس سورت کی متعلقہ آیات کو سمجھنے اور ان کا ترجمہ و تشریح کرنے میں بہت خلجان رہا ہے۔

سورت کے اسلوب کا ایک خاص انداز: یہ سورت دس رکوعات پر مشتمل ایک مکمل خطبہ ہے' لیکن اس میں

سے ایک خاص مسئلہ کو درمیان سے نکال کر آغاز میں بیان کیا گیا ہے‘ یعنی مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس مسئلہ کی تفصیلات سورت کے اندر اپنی جگہ پر ہی بیان ہوئی ہیں‘ لیکن اس موضوع کو اتنی اہمیت دی گئی کہ سورت کا آغاز غیر معمولی انداز میں اس کے ذکر سے کیا گیا۔ یہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ اس لیے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا کہ غزوۂ بدر جزیرہ نمائے عرب میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے عرب میں کہیں بھی کسی باقاعدہ منظم (disciplined) فوج کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ چنانچہ عسکری نظم وضبط اور جنگی معاملات کے بارے میں کوئی ضابطہ اور قانون بھی پہلے سے موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس غزوہ میں فتح کے بعد میدانِ جنگ سے جو چیز جس کے ہاتھ لگ گئی‘ اس نے سمجھا کہ بس اب یہ اس کی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے بہت سنجیدہ نوعیت کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بعض لوگوں نے تو بھاگ دوڑ کر کے بہت زیادہ مال جمع کر لیا‘ جبکہ مختلف وجوہات کی بنا پر کچھ لوگوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا۔ کچھ لوگ اپنی بزرگانہ حیثیت اور وضع داری کی بنا پر بھاگ دوڑ کر مال اکٹھا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ لوگ اہم مقامات پر پہرہ دے رہے تھے اور بعض رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور تھے۔ مالِ غنیمت میں سے ایسے تمام لوگوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ضمن میں اختلافات پیدا ہوئے۔ چنانچہ سورت کی پہلی آیت میں ہی جتلا دیا گیا کہ اللہ کے ہاں اس معاملے کا خاص نوٹس لیا گیا ہے اور پھر بات بھی اس طرح سے کی گئی کہ مسئلے کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی گئی۔ بالکل دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا کہ مالِ غنیمت صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کا ہے‘ کسی اور کا اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔ سورۃ الانفال کا یہ اسلوب اگر اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے تو اس سے ہمیں سورۃ التوبہ کے مضامین کی ترتیب کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

مؤمنین صادقین کی پہچان

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (الانفال)

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا﴾ ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (یعنی مہاجرین) اور وہ لوگ (انصارِ مدینہ) جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی“

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ ”یہی لوگ ہیں سچے مؤمن۔ اُن کے لیے ہے مغفرت اور رزقِ کریم۔“

اس آیت میں مہاجرین اور انصار کے دونوں گروہوں کا اکٹھے ذکر کر کے ان مؤمنین صادقین کی خصوصیات کے حوالے سے ایک حقیقی مؤمن کی تعریف (definition) کے دوسرے رُخ کی جھلک دکھائی گئی ہے‘ جبکہ اس کے پہلے حصے یا رُخ کی تصویر سورۃ الانفال کی ان آیات میں دکھائی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''حقیقی مؤمن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے' اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔'' ﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ ''جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ......) یعنی کلمۂ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ۔ یہ پانچ ارکان ''مسلمان'' ہونے کے لیے ضروری ہیں' لیکن ''حقیقی مؤمن'' ہونے کے لیے ان پر دو چیزوں کا مزید اضافہ ہوگا' جن کا ذکر ہمیں سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ملتا ہے' یعنی ''یقینِ قلبی'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ''۔ گویا ایمان میں زبان کی شہادت کے ساتھ ''یقین قلبی'' کا اضافہ ہوگا اور اعمال میں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے ساتھ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا۔ گویا یہ سات چیزیں یا سات شرطیں پوری ہوں گی تو ایک شخص ''بندۂ مؤمن'' کہلائے گا۔ ایسے بندۂ مؤمن کی شخصیت کا جو نقشہ اس سورت (سورۃ الانفال) کی آیت ۲ اور ۳ میں دیا گیا ہے اس کے مطابق اس کے دل میں یقین والا ایمان ہے' اللہ کی یاد سے اُس کا دل لرز اُٹھتا ہے' آیاتِ قرآنی پڑھتا ہے یا سنتا ہے تو دل میں ایمان بڑھ جاتا ہے' وہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ رکھتا ہے' نماز قائم کرتا ہے' زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اِن خصوصیات کے ساتھ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ﴾ کی مہر لگا دی گئی اور اس مہر کے ساتھ وہاں پر (آیت ۴ میں) بندۂ مؤمن کی شخصیت کا ایک رُخ یا ایک صفحہ مکمل ہو گیا۔

اب بندۂ مؤمن کی شخصیت کا دوسرا صفحہ یا رُخ آیت زیرِ نظر میں یوں بیان ہوا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ لازمی شرط کے طور پر اس میں شامل کر دیا گیا اور پھر اس پر بھی وہی مہر ثبت کی گئی ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ﴾ چنانچہ یہ دونوں رُخ مل کر بندۂ مؤمن کی تصویر مکمل ہو گئی۔ ایک شخصیت کی تصویر کے یہ دو رخ ایسے ہیں جن کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دو صفحے ہیں جن سے مل کر ایک ورق بنتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں کے اندر یہ دونوں رخ ایک ساتھ پائے جاتے تھے' مگر جیسے جیسے اُمت زوال پذیر ہوئی' بندۂ مؤمن کی شخصیت کی خصوصیات کے بھی حصے بخرے ہو گئے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

اُڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

چنانچہ آج مسلمانوں کی مجموعی حالت یہ ہے کہ اگر کچھ حلقے ذکر کے لیے مخصوص ہیں تو اُن کو جہاد اور فلسفہ جہاد سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسری طرف جہادی تحریکیں ہیں تو اُن کو رُوحانی کیفیات سے شناسائی نہیں۔ لہٰذا آج اُمت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے ایسے اہلِ ایمان کی ضرورت ہے جن کی شخصیات میں یہ دونوں رنگ اکٹھے ایک ساتھ جلوہ گر ہوں۔ جب تک مؤمنین صادقین کی ایسی شخصیات وجود میں نہیں آئیں گی' جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح دونوں پہلوؤں میں توازن ہو' اس وقت تک مسلمان اُمت کی بگڑی تقدیر نہیں سنور سکتی۔

اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی کیفیات کا پیدا ہونا تو آج ناممکنات میں سے ہے، لیکن کسی نہ کسی حد تک اُن ہستیوں کا عکس اپنی شخصیات میں پیدا کرنے اور ایک ہی شخصیت کے اندر ان دونوں طرز کی خصوصیات کا کچھ نہ کچھ توازن پیدا کرنے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ان میں سے ایک کیفیت ایک شخصیت کے اندر ۲۵ فیصد ہو اور دوسری کیفیت بھی ۲۵ فیصد کے لگ بھگ ہو تو قابل قبول ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ روحانی کیفیت تو ۷۰ فیصد ہے مگر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ صفر ہے یا جہاد کا جذبہ تو ۸۰ فیصد ہے مگر روحانیت کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی تو ایسی شخصیت نظریاتی و عملی لحاظ سے غیر متوازن ہوگی۔ بہرحال ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ دونوں رُخ ناگزیر ہیں۔ اِن کو اکٹھا کرنے اور ایک شخصیت میں توازن کے ساتھ جمع کرنے کی آج کے دور میں سخت ضرورت ہے۔

سورۃ التوبہ کے مضامین کا اجمالی تعارف

سورۃ التوبہ کئی خطبات پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر خطبہ الگ پس منظر میں نازل ہوا ہے۔ جب تک ان مختلف خطبات کے پس منظر اور زمانۂ نزول کا الگ الگ تعین درست انداز میں نہ ہو جائے، متعلقہ آیات کی درست توضیح و تشریح کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس سورت کی تفسیر کرتے ہوئے پوری احتیاط سے تحقیق نہیں کی، وہ خود بھی مغالطوں کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ سورت قرآن حکیم کی مشکل ترین سورت ہے اور اس کی تفہیم کے لیے انتہائی محتاط تحقیق اور گہرے تدبر کی ضرورت ہے۔

<u>سورۃ التوبہ اور حضور ﷺ کی بعثت کے دو پہلو:</u> حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے قبل جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص علاقے اور خاص قوم کی طرف مبعوث کیا گیا، مگر آپ ﷺ اپنی قوم (بنو اسماعیل) کی طرف بھی رسول بن کر آئے اور قیامت تک کے لیے پوری دنیا کے تمام انسانوں کی طرف بھی۔ یہ فضیلت تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام میں صرف آپ ﷺ کے لیے مخصوص ہے کہ آپؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا گیا، ایک بعثتِ خصوصی اور دوسری بعثتِ عمومی۔ آپ ﷺ کی بعثت کے ان دونوں پہلوؤں کے حوالے سے سورۃ التوبہ کی آیات میں بھی ایک بڑی خوبصورت تقسیم ملتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سورت کے بھی بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ آپ ﷺ کی بعثت کے خصوصی پہلو سے متعلق ہے، جبکہ دوسرے حصے کا تعلق آپؐ کی بعثت کے عمومی پہلو سے ہے۔ چنانچہ سورت کے ان دونوں حصوں کے موضوعات و مضامین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے حضور ﷺ کی بعثت کے ان دونوں پہلوؤں کے فلسفے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

<u>حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی:</u> آپ ﷺ کی خصوصی بعثت مشرکین عرب یا بنو اسماعیل کی طرف تھی۔ آپؐ کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا اور آپ ﷺ نے ان لوگوں کے اندر رہ کر، خود ان کی زبان میں، اللہ تعالیٰ کا پیغام اُن تک پہنچایا اور اس حوالے سے ان پر آخری حد تک اتمامِ حجت بھی کر دیا۔ اس کے بعد مشرکینِ عرب پر اللہ تعالیٰ کے

اس قدیم قانون کا نفاذ بھی عمل میں آیا کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ رسول اپنی دعوت کے سلسلے میں اس قوم پر اتمامِ حجت کر دے' پھر اگر وہ قوم اپنے رسول کی دعوت کو رد کر دے تو اس پر عذابِ استیصال مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مشرکین عرب پر عذابِ استیصال کی نوعیت معروضی حالات کے پیش نظر پہلی قوموں کے مقابلے میں مختلف نظر آتی ہے۔ یعنی مشرکینِ عرب پر یہ عذاب یکبارگی نازل ہونے کے بجائے دو اقساط میں آیا۔ اس عذاب کی پہلی قسط غزوۂ بدر میں مشرکینِ مکہ کی ہزیمت وشکست کی صورت میں سامنے آئی جبکہ دوسری اور آخری قسط کا ذکر سورۃ التوبہ کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ بہر حال اپنی بعثتِ خصوصی کے حوالے سے حضور ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں دین کو غالب کر دیا اور وہاں آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اقامتِ دین کا عملی نقشہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا۔

حضور ﷺ کی بعثتِ عمومی: نبی اکرم ﷺ کی بعثت عمومی پوری انسانیت کی طرف قیامت تک کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں دعوت کا آغاز آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ (۶ ہجری) کے بعد فرمایا۔ اس سے پہلے آپ ﷺ نے کوئی مبلغ یا داعی عرب سے باہر نہیں بھیجا' بلکہ تب تک آپؐ نے اپنی پوری توجہ جزیرہ نمائے عرب تک مرکوز رکھی اور اپنے تمام وسائل اسی خطہ میں دین کو غالب کرنے کے لیے صرف کیے۔ لیکن جونہی آپ ﷺ کو اس سلسلے میں ٹھوس کامیابی ملی' یعنی قریش نے آپ ﷺ کو بطورِ فریق ثانی تسلیم کر کے آپ ﷺ سے صلح کر لی' (قرآن حکیم نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت میں اس صلح کو ''فتح مبین'' قرار دیا ہے) تو آپؐ نے اپنی بعثتِ عمومی کے تحت دعوت کا آغاز کرتے ہوئے عرب سے باہر مختلف سلاطین وامراء کی طرف خطوط بھیجنے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے جن فرماں رواؤں کو خطوط لکھے' اُن میں قیصرِ روم' ایران کے بادشاہ کسریٰ' مصر کے بادشاہ مقوقس اور حبشہ کے فرمانروا نجاشی (یہ عیسائی حکمران اس نجاشی کا جانشین تھا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جن کی غائبانہ نمازِ جنازہ حضور ﷺ نے خود پڑھائی تھی) کے نام شامل ہیں۔ [نوٹ: ماضی قریب میں یہ چاروں خطوط اصل متن کے ساتھ اصل شکل میں دریافت ہو چکے ہیں۔] آپ ﷺ کے اسی اقدام کے ردِ عمل کے طور پر سلطنتِ روما کے ساتھ مسلمانوں کے ٹکراؤ کا آغاز ہوا' جس کا نتیجہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں جنگِ مُوتہ اور غزوۂ تبوک کی صورت میں نکلا۔ بہر حال ان تمام حالات وواقعات کا تعلق آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی سے ہے' جس کی دعوت کا آغاز آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا' اور پھر خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنی بعثت عمومی کے حوالے سے دعوت وتبلیغ کا فریضہ واضح طور پر اُمت کے ہر فرد کی طرف منتقل فرما دیا۔ چنانچہ اب تا قیامِ قیامت آپ ﷺ پر ایمان رکھنے والا ہر مسلمان دعوت وتبلیغ اور اقامتِ دین کے لیے محنت وکوشش کا مکلف ہے۔

موضوعات: مضامین وموضوعات کے حوالے سے یہ سورت دو حصوں پر مشتمل ہے' جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصہ اوّل: یہ حصہ سورت کے پہلے پانچ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ خصوصی کے تکمیلی مرحلے سے ہے۔ آیات کی ترتیب کے مطابق اگرچہ یہ پانچ رکوع بھی مزید تین حصوں میں بٹے ہوئے

ہیں‘ مگر موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حصہ ہمیں دو خطبات پر مشتمل نظر آتا ہے‘ جن کا الگ الگ تعارف ذیل کی سطور میں دیا جا رہا ہے۔

پہلا خطبہ: پہلا خطبہ دوسرے اور تیسرے رکوع پر مشتمل ہے اور یہ فتح مکہ (۸ ہجری) سے پہلے نازل ہوا۔ ان آیات میں مسلمانوں کو فتح مکہ کے لیے نکلنے پر آمادہ کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ بہت نازک اور حساس تھا۔ مسلمان مہاجرین کی مشرکین مکہ کے ساتھ براہِ راست قریبی رشتہ داریاں تھیں‘ ان کے خاندان اور قبیلے مشترک تھے‘ حتیٰ کہ اس وقت تک بہت سے مسلمانوں کے اہل و عیال مکہ میں موجود تھے۔ کچھ غریب‘ بے سہارا مسلمان‘ جو مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت نہیں کر سکے تھے‘ ابھی تک مکہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر جنگ ہوگی‘ مکہ پر حملہ ہوگا تو ان سب کا کیا بنے گا؟ کیا گندم کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا؟ دوسری طرف قریشِ مکہ کا بظاہر یہ اعزاز بھی نظر آتا تھا کہ وہ بیت اللہ کے متولی تھے اور حجاج کی خدمت کرتے تھے۔ اس حوالے سے سادہ دل مسلمان اپنے خدشات کا اظہار کر رہے تھے تو منافقین ان اشکالات کی آڑ لے کر لگائی بجھائی میں مصروف تھے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ پس منظر مدِ نظر رہنا چاہیے۔

دوسرا خطبہ: دوسرا خطبہ پہلے‘ چوتھے اور پانچویں رکوع پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ ذوالقعدہ ۹ ہجری کے بعد نازل ہوا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں سے پہلی چھ آیات کو مقدم کر کے سورت کے آغاز میں لایا گیا ہے۔ یہ وہی آیات ہیں جن کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قافلۂ حج کے پیچھے بھیجا تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ۹ ہجری میں حضور ﷺ خود حج پر تشریف نہیں لے گئے تھے‘ اس سال آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا تھا۔ مذکورہ آیات اس قافلہ حج کے روانہ ہونے کے بعد نازل ہوئیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ حج کے موقع پر علی الاعلان یہ احکامات سب کو سنا دیے جائیں۔ سن ۹ ہجری کے اس حج میں مشرکین مکہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ وہاں حج کے اجتماع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیات پڑھ کر سنائیں‘ جن کے تحت مشرکین کے ساتھ ہر قسم کے معاہدے سے اعلانِ براءت کر دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ مشرکین عرب کے لیے چار ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایمان لانا چاہیں تو لے آئیں‘ ورنہ اُن کا قتل عام ہوگا۔

یہ آیات چونکہ قرآن کریم کی سخت ترین آیات ہیں‘ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے پس منظر کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ یہ احکامات دراصل اس عذابِ استیصال کے قائم مقام ہیں جو قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ‘ قومِ شعیبؑ‘ قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون پر آیا تھا۔ ان تمام قوموں پر عذابِ استیصال اللہ تعالیٰ کے اس اٹل قانون کے تحت آیا تھا کہ جب کوئی قوم اپنے رسول کی دعوت کو رد کر دے تو اتمامِ حجت کے بعد اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس قانون کے تحت مشرکین مکہ اب عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے‘ اس لیے کہ حضور ﷺ نے انہی کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات ان تک پہنچا کر اُن پر حجت تمام کر دی تھی۔ اس سلسلے میں اللہ کی مشیت کے

مطابق ان کو جو مہلت دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان پر عذابِ استیصال کی پہلی قسط میدانِ بدر میں نازل کی گئی اور دوسری اور آخری قسط کے طور پر اب انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا کہ تمہارے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے صرف چار ماہ ہیں۔ اس مدت میں ایمان لانا چاہو تو لے آؤ' ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس حکم کے اندر اُن کے لیے یہ آپشن خود بخود موجود تھا کہ وہ چاہیں تو جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی جا سکتے ہیں' مگر اب اس خطہ کے اندر وہ بحیثیتِ مشرک نہیں رہ سکتے' کیونکہ اب جزیرہ نمائے عرب کو شرک سے بالکل پاک کر دینے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ خصوصی کی تکمیلی شان کے ظہور کا وقت آن پہنچا تھا۔

ایک اشکال کی وضاحت: یہاں ایک اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ سورت کے اندر آیات کی موجودہ ترتیب ان کی زمانی ترتیب کے بالکل برعکس ہے۔ جو خطبہ پہلے (۸ ہجری میں) نازل ہوا ہے وہ سورت میں دوسرے رکوع سے شروع ہو رہا ہے' جبکہ بعد (۹ ہجری) میں نازل ہونے والی آیات کو مقدم کر کے اِن سے سورت کا آغاز کیا گیا ہے۔ پھر یہ دوسرا خطبہ بھی آیات کی ترتیب کے باعث دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اس کی ابتدائی چھ آیات پہلے رکوع میں آ گئی ہیں' جبکہ بقیہ آیات چوتھے اور پانچویں رکوع میں ہیں۔ دراصل ترتیب آیات میں اس پیچیدگی کی وجہ قرآن کا وہ خاص اسلوب ہے جس کے تحت کسی انتہائی اہم بات کو موضوع کی منطقی اور روایتی ترتیب میں سے نکال کر شہ سرخی (head line) کے طور پر پہلے بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کو سمجھنے کے لیے سورۃ الانفال کے آغاز کا انداز ذہن میں رکھیے۔ وہاں مالِ غنیمت کا مسئلہ انتہائی اہم اور حساس نوعیت کا تھا' جس پر تفصیلی بحث تو بعد میں ہونا مقصود تھی' لیکن اس ضمن میں بنیادی اصول سورت کی پہلی آیت میں بیان کر دیا گیا اور مسئلے کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر اس موضوع سے سورت کا آغاز فرمایا گیا۔ بالکل اسی انداز میں اس سورت کا آغاز بھی ایک انتہائی اہم مسئلے کے بیان سے کیا گیا' البتہ اس مسئلے کی بقیہ تفصیل بعد میں چوتھے اور پانچویں رکوع میں بیان ہوئی۔

حصہ دوم: اس سورت کا دوسرا حصہ چھٹے رکوع سے لے کر آخر تک گیارہ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق حضور اکرم ﷺ کی بعثت عمومی سے ہے۔ اس لیے کہ اس حصے کا مرکزی موضوع غزوۂ تبوک ہے' اور غزوۂ تبوک تمہید تھی اس جدوجہد کی جس کا آغاز اقامتِ دین کے سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب سے باہر بین الاقوامی سطح پر ہونے والا تھا۔ اِن گیارہ رکوعوں میں سے ابتدائی چار رکوع تو وہ ہیں جو غزوۂ تبوک کے لیے مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے سے متعلق ہیں' چند آیات وہ ہیں جو تبوک جاتے ہوئے دورانِ سفر نازل ہوئیں' چند آیات تبوک میں قیام کے دوران اور چند تبوک سے واپسی پر راستے میں نازل ہوئیں' جبکہ ان میں چند آیات ایسی بھی ہیں جو تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوئیں۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند!

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ

اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ (التوبة)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسول اور اس کے رستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

اس آیت میں اہل ایمان کے لیے آٹھ چیزیں گنوائی گئی ہیں کہ اگر تم میں سے کسی کے دل میں ان آٹھ چیزوں کی محبتوں میں سے کسی ایک یا سب محبتوں کا جذبہ اللہ‘ اُس کے رسول ﷺ اور اُس کے راستے میں جہاد کی محبتوں کے جذبے کے مقابلے میں زیادہ ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بہت سخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا لہجہ اور انداز ہے۔ چنانچہ ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کرے۔ اس کے ایک پلڑے میں یہ آٹھ محبتیں ڈالے اور دوسرے میں اللہ‘ اس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ کی تین محبتیں ڈالے اور پھر اپنا جائزہ لے کہ میں کہاں کھڑا ہوں؟ چونکہ انسان خود اپنے نفس سے خود واقف ہے —— ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾﴾ (القیامہ) ’’بلکہ انسان تو اپنے نفس کے احوال پر خود ہی خوب بصیرت رکھتا ہے‘‘۔ اس لیے ایسے تجزیے کے ذریعے اسے اپنے باطن کی صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے گی۔ بہرحال اس سلسلے میں ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تو اس کی ساری خواہشیں‘ محبتیں ان تین محبتوں کے تابع ہیں تو اس کے معاملاتِ ایمان درست ہیں‘ لیکن اگر مذکورہ آٹھ چیزوں میں سے کسی ایک بھی چیز کی محبت کا گراف مؤخر الذکر تین محبتوں کے گراف سے اوپر چلا گیا تو بس یوں سمجھیں کہ وہاں توحید ختم ہے اور شرک شروع! اسی فلسفہ کو علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

یہ مال و دولتِ دنیا‘ یہ رشتہ و پیوند   بتانِ وہم و گماں‘ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ!

آیت زیر نظر میں جو آٹھ چیزیں گنوائی گئی ہیں ان میں پہلی پانچ ’’رشتہ و پیوند‘‘ کے زُمرے میں آتی ہیں‘ جب کہ آخری تین ’’مال و دولت دنیا‘‘ کی مختلف شکلیں ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہے‘ یہ ہمارے وہم اور توہم کے بنائے ہوئے بت ہیں۔ جب تک لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شمشیر سے اِن بتوں کو توڑا نہیں جائے گا‘ بندۂ مؤمن کے نہاں خانۂ دل میں توحید کا عَلم بلند نہیں ہوگا۔

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۳۳﴾ (التوبۃ)

آیت ۳۲ ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ ”یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے“

﴿وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲﴾ ”اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے‘ چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔“

اس اسلوب میں یہودیوں پر ایک طرح کا طنز ہے کہ وہ خفیہ سازشوں کے ذریعے سے اسلام کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں رہتے ہیں اور کبھی علی الاعلان میدان میں آکر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس آیت کی ترجمانی مولانا ظفر علی خان نے اپنے ایک شعر میں اس طرح سے کی ہے: ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

آیت ۳۳ ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۳۳﴾ ”وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر‘ خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔“

واضح رہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کا بنیادی مقصد تو دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام کی طرح تبشیر‘ انذار‘ تذکیر‘ دعوت اور تبلیغ ہی ہے‘ جس کا تذکرہ سورۃ النساء میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵) لیکن اس کے علاوہ حضور ﷺ کی بعثت کا ایک امتیازی اور خصوصی مقصد بھی ہے اور وہ ہے تکمیلِ رسالت‘ یعنی دین کو دنیا میں بالفعل قائم اور غالب کرنا۔ اِن دو آیات میں آپ ﷺ کی رسالت کی اسی تکمیلی شان کا ذکر ہے۔ آیات کا یہ جوڑا بالکل اسی ترتیب سے سورۃ الصف (آیت ۸ اور ۹) میں بھی آیا ہے۔ ان میں سے پہلی آیت سورۃ الصف میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس طرح آئی ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸﴾ جبکہ دوسری آیت وہاں جوں کی توں ہے‘ اس میں اور سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بالکل کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نے اس آیت پر جو بیس صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا ہے جو ”نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت“ کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس مقالے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے خصوصی یا امتیازی مقصد کی کُلی انداز میں تکمیل یعنی دنیا میں دین کو قائم اور غالب کرنے کی جدوجہد ہم سب پر حضور ﷺ کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے فرض ہے۔

اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس فرض سے جان چھڑانے کے لیے بھی دلائل تیار کر رکھے ہیں کہ دین کو ہم انسانوں نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے غالب کرنا ہے‘ لیکن اس کتاب کے مطالعے سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس فرض سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ارتکازِ دولت —— ایک سخت وعید

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبۃ)

آیت ۳۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾

’’اے اہلِ ایمان‘ یقیناً بہت سے علماء اور درویش ہڑپ کرتے ہیں لوگوں کے مال باطل طریقے سے‘‘

مختلف مسلمان اُمتوں میں مذہبی پیشواؤں کے لیے مختلف نام اور القاب رائج رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں انہیں احبار اور رہبان کہا جاتا تھا۔ آیت زیرنظر کے اسلوب اور الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طبقے میں اکثریت ایسے لوگوں کی رہی ہے جو باطل اور ناجائز ذرائع سے مال و دولت جمع کرنے اور جائیداد بنانے کے مکروہ دھندے میں ملوث تھے۔ واضح رہے کہ ایک عام دنیادار آدمی اگر جائز طریقے سے مال و دولت کماتا ہے یا جائیداد بناتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر ایک ایسا شخص جو دین کی خدمت میں مصروف ہے اور اسی حقیقت سے جانا پہچانا جاتا ہے‘ اگر وہ بھی مال و دولت جمع کرنے اور جائیداد بنانے میں مشغول ہو جائے‘ اور مزید یہ کہ دین کو استعمال کرتے ہوئے اور اپنی دینی حیثیت کو نیلام کرتے ہوئے لوگوں کے مال ہڑپ کرنے لگے اور مال و دولت جمع کرنے ہی کو اپنا مقصدِ زندگی بنالے‘ تو ایسا انسان آسمان کی چھت کے نیچے بدترین انسان ہوگا۔ اپنی امت کے علماء کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

عَنْ عَلِیٍّ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((**يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِیَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ، وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِیَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ**)) (رواه البيهقی فی شعب الايمان)

حضرت علی ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مجھے اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا جب اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ان کی مسجدیں بہت آباد (اور شاندار) ہوں گی مگر وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے‘ فتنہ انہی میں سے برآمد ہوگا اور ان ہی میں

لوٹ جائے گا۔''

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور روکتے ہیں لوگوں کو اللہ کے راستے سے۔''

جب کوئی دینی تحریک اٹھتی ہے' کوئی اللہ کا مخلص بندہ لوگوں کو دین کی طرف بلاتا ہے' تو ایسے مذہبی پیشواؤں کو اپنی مسندیں خطرے میں نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے عقیدت مند انہیں چھوڑ کر کسی دوسری دعوت کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ انہی عقیدت مندوں کے نذرانوں سے تو ان کے دولت کے انباروں میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے اور ان کی جائیدادیں بن رہی ہوتی ہیں۔ وہ آخر کیونکر چاہیں گے کہ اُن کے نام لیوا کسی دوسری دعوت پر لبیک کہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں' تو ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔''

اس آیت کے حوالے سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنا مطلقاً حرام ہے' مگر دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' حضرت ابوذر غفاریؓ کی اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ دین کا عام قانون اس سلسلے میں یہی ہے کہ اگر کسی نے کوئی مال جائز طریقے سے کمایا ہو اور وہ اس میں سے زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو تو اس مال کو وہ اپنے پاس رکھ سکتا ہے' چاہے اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ ہو اور چاہے وہ سونے یا چاندی ہی کی شکل میں ہو۔ ایسا مال ایک شخص کی موت کے بعد اس کے ورثاء کو جائز مال کے طور پر قانونِ وراثت کے مطابق منتقل بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانونِ وراثت خود اس بات پر دلیل ہے کہ مال و دولت کو اپنی ملکیت میں رکھنا ناجائز نہیں ہے' کیونکہ اگر مال جمع نہیں ہوگا تو وراثت کس چیز کی ہوگی اور قانونِ وراثت کا عملاً کیا مقصد رہ جائے گا؟ اس لحاظ سے قرآن حکیم کے وہ احکام روحانی اور اخلاقی تعلیم کے زمرے میں آتے ہیں جن میں بار بار مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ﴿قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرة: ۲۱۹) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی جو بھی زائد از ضرورت ہو اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے باوجود قانونی نقطہ نظر سے یہی فیصلہ ہوا تھا کہ سونا' چاندی جمع رکھنا مطلقاً حرام نہیں ہے' مگر حضرت ابوذر غفاریؓ اپنی رائے میں کسی قسم کی لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ چونکہ آپؓ کے اختلاف کی شدت کے باعث مدینہ کے ماحول میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو رہی تھی' اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپؓ کو حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ اس پر آپؓ مدینہ سے نکل گئے اور صحرا میں ایک جھونپڑی بنا کر اس میں رہنے لگے۔

میرے نزدیک اس آیت کا یہ حکم احبار اور رہبان یعنی مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جنہوں نے اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں دین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہیں اور اُن کا اپنا

کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ ایسے مذہبی پیشواؤں کو لوگ ہدیے دیتے ہیں اور اُن کی مالی معاونت کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکیں۔ جیسے حضور ﷺ خود بیت المال سے اپنی ضروریات پوری فرماتے تھے‘ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو نان نفقہ بھی دیتے تھے اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسنِ سلوک بھی کرتے تھے‘ مگر بیت المال سے کچھ میسر نہ ہونے کی صورت میں فاقے بھی کرتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مثال بھی ہے۔ چنانچہ ایسے مذہبی پیشواؤں پر بھی لازم ہے کہ وہ دوسروں کے ہدیے اور وظائف صرف معروف انداز میں اپنی اور اپنے زیر کفالت افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے استعمال میں لائیں۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی مذکورہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دولت اکٹھا کرنا اور جائیدادیں بنانا شروع کر دیں‘ اور پھر یہ جائیدادیں قانونِ وراثت کے تحت اُن کے ورثاء کو بھی منتقل ہوں تو ایسی صورت میں اِن لوگوں پر اس آیت میں مذکور وعید کا حرف بہ حرف انطباق ہوگا۔ چنانچہ آج بھی اگر آپ علماءِ حق اور علماءِ سوء کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو میرے نزدیک یہ آیت اس کے لیے ایک طرح کا لٹمس ٹیسٹ (litmus test) ہے۔ اگر کوئی مذہبی پیشوا یا عالم اپنے دینی کیریئر کے نتیجے میں جائیداد بنا کر اور اپنے پیچھے دولت چھوڑ کر مرا ہو تو وہ بلاشک وشبہ علماءِ سوء میں سے ہے۔

آیت ۳۵ ﴿یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ﴾ ”جس دن ان (سونے اور چاندی) کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں اور پھر داغا جائے گا ان سے ان کی پیشانیوں‘ ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو۔“

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵﴾ ”(اور ساتھ کہا جائے گا:) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے اکٹھا کیا تھا‘ تو اب چکھو مزا اس کا جو کچھ تم جمع کرتے تھے۔“

منافقین کے خلاف جہاد کے حکم کا اصل مفہوم

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۷۳﴾ (التوبة)

”اے نبیؐ! جہاد کیجیے کفار اور منافقین سے‘ اور ان پر سختی کیجیے۔ اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔“

یہ آیت بالکل انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التحریم میں بھی آئی ہے جو اٹھائیسویں پارے کی آخری سورت ہے۔ یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں جہاد بمعنی قتال استعمال نہیں ہوا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے کبھی جنگ نہیں کی۔ لہٰذا یہاں جہاد سے مراد قتال سے نچلے درجے کی جدوجہد (دُوْنَ الْقِتَالِ) ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ منافقین کی ریشہ دوانیوں کا توڑ کرنے اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک (وقت کی سپر پاور

سلطنتِ روما کے خلاف جہاد) سے واپس آ رہے تھے تو اسی حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ)) (تخریج الکشاف للزیلعی) کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ عام طور پر اس حدیث کی توجیہہ اس طرح کی گئی ہے کہ نفس کے خلاف جہاد سب سے بڑا جہاد ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟ یعنی سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِیْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (حلیة الاولیاء لابی نعیم) ''یہ کہ تم جہاد کرو اپنے نفس اور اپنی خواہشات کے خلاف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں''۔ لہٰذا اس حدیث کی بنیاد پر جہاد اکبر والی مذکورہ حدیث کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جہاد بالنفس دشمن کے خلاف قتال سے بھی بڑا جہاد ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس حدیث کا اصل مفہوم سمجھنے کے لیے اس کے موقع محل اور پس منظر کے حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ کے اندر منافقین دراصل مسلمانوں کے حق میں مارِ آستین تھے' مگر ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنا اتنا آسان اور سادہ معاملہ نہیں تھا۔ ان منافقین کے اوس اور خزرج کے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اس صورت حال میں اُن کے خلاف اقدام کرنے سے اندرونی طور پر کئی طرح کے مسائل جنم لے سکتے تھے۔ مگر آیت زیر مطالعہ کے نزول کے بعد تبوک سے واپس آکر آپ ﷺ نے منافقین کے خلاف کئی سخت اقدامات کیے تھے۔ جیسے آپ ﷺ نے مسجد ضرار کو گرانے اور جلانے کا حکم دیا اور پھر اس پر عمل بھی کرایا۔ یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا۔ منافقین مسجد کے تقدس کے نام پر لوگوں کو مشتعل بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ منافقین کے خلاف جہاد کے اس حکم کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اے نبی (ﷺ) آپ ان لوگوں کی سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیے۔

اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کی سزا —— مسلمانانِ پاکستان کے لیے لمحہ فکریہ!

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝ (التوبة)

آیت 75 ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝﴾ ''اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا تو ہم خوب صدقہ وخیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے۔''

آیت 76 ﴿فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ ''پھر جب اللہ نے انہیں نوازدیا اپنے فضل سے (غنی کردیا) تو انہوں نے اس دولت کے ساتھ بخل کیا اور پیٹھ موڑلی اور اعراض کیا۔''

آیت 77 ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''تو اللہ نے سزا کے طور پر ڈال دیا ان کے دلوں میں نفاق''

﴿اِلٰی یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَهٗ﴾ ’’(اور یہ نفاق اب رہے گا) اُس دن تک جس دن یہ لوگ ملاقات کریں گے اُس سے‘‘

﴿بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا كَانُوۡا یَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾ ’’بسبب اُس وعدہ خلافی کے جو انہوں نے اللہ سے کی اور بسبب اس جھوٹ کے جو وہ بولتے رہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے اس سے پھر جانے کی دنیا میں نقد سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں میں نفاق پیدا فرما دیتے ہیں' اور بدقسمتی سے یہی روگ آج مسلمانانِ پاکستان کے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ یعنی پاکستانی قوم بحیثیت مجموعی اس سزا کی مستحق ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانانِ برصغیر نے تحریک پاکستان کے دوران اللہ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ ایک نعرہ بن کر بچے بچے کی زبان پر آ گیا تھا: ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه!‘‘ گویا دنیا کے نقشے پر یہ نیا ملک اسلام کے نام پر بنا اور اسلام کے لیے بنا۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمانوں نے تو ووٹ دے کر اپنا فرض کفایہ ادا کر دیا' مگر مسلمانانِ پاکستان نے اس سلسلے میں اب تک کیا کیا ہے؟ کہاں ہے اسلام اور کہاں ہے لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه؟ یہ دراصل پاکستانی قوم کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اجتماعی بے وفائی اور بدعہدی کی بدترین مثال ہے۔ اس بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے نفاق اس قوم پر مسلط کر دیے۔ ایک باہمی نفاق' جس کے باعث یہ قوم اب قوم نہیں رہی بلکہ مختلف قومیتوں اور فرقوں میں بٹ چکی ہے اور اس میں مختلف عصبیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ صوبائیت' مذہبی فرقہ واریت وغیرہ نے قوم کا باہمی اتحاد پارہ پارہ کر دیا ہے۔ دوسرے جب یہ نفاق ہمارے دلوں کا روگ بنا تو اس سے ہمارے شخصی کردار اور پھر قومی کردار کا بیڑا غرق ہو گیا۔ اس کے بارے میں ایک متفق علیہ حدیث ملاحظہ کیجیے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ [وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ :وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ] اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ' وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ ' وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))

’’منافق کی تین نشانیاں ہیں [اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ’’اگرچہ روزہ رکھتا ہو' نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔‘‘] (i) جب بولے جھوٹ بولے (ii) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (iii) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔‘‘

اگر آپ اس حدیث کو کسوٹی بنا کر اپنی قوم کے کردار کو پرکھیں گے تو حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ اس قوم میں جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی بڑا جھوٹا ہے' اتنا ہی بڑا وعدہ خلاف ہے اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ (الا ماشاء اللہ!)

تیسرا نفاق جو اس قوم کے حصے میں آیا وہ بہت ہی بڑا ہے اور وہ ہے آئین کا نفاق۔ کسی ملک کی اہم ترین دستاویز اس کا دستور ہوتا ہے' اور ہمارے ملک کے آئین کو بھی منافقت کا پلندہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پاکستان کے آئین میں ایک ہاتھ سے اسلام داخل کیا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے نکال لیا جاتا ہے۔ الفاظ دیکھو تو آئین

میں اسلام ہی اسلام ہے‘ تعمیل دیکھو تو اسلام کہیں ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کو دیکھئے اور غور کیجیے یہ کتنی بڑی بات ہے جو ہمارے آئین میں لکھ دی گئی ہے:

No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah.

یعنی ملک میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ ان الفاظ پر غور کریں تو ایسے لگتا ہے کہ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت کا ترجمہ کر کے دستور میں لکھ دیا گیا ہے‘ لیکن ملک اور معاشرے کے اندر اس کے عملی پہلو پر نظر ڈالیں تو قرآن وسنت کے احکام پر عمل ہوتا کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ الفاظ صرف آئینی اور قانونی تقاضا پورا کرنے کے لیے لکھ دیے گئے ہیں‘ ان پر عمل کرنے کی کبھی کسی نے کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی۔ بس ایک اسلامی نظریاتی کونسل بنادی گئی ہے جو اپنی سفارشات پیش کرتی رہتی ہے۔ یہ سفارشات سالانہ رپورٹس کے طور پر باقاعدگی سے حکومت کو پیش کی جاتی ہیں‘ مگر ان کی کوئی تعمیل نہیں ہوتی۔ اسی طرح فیڈرل شریعت کورٹ بھی دکھاوے کا ایک ادارہ ہے۔ بڑے بڑے علماء اس کے تحت بڑی بڑی تنخواہیں اور مراعات لے رہے ہیں‘ مگر عملی پہلو دیکھا جائے تو دستورِ پاکستان اُن کے دائرۂ عمل سے ہی خارج ہے۔ اسی طرح عدالتی قوانین‘ عائلی قوانین‘ مالی قوانین وغیرہ سب فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ غرض دستور کی سطح پر اتنی بڑی منافقت شاید پوری دنیا میں اور کہیں نہ ہو۔ بہرحال یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک پاکستانی قوم کی اُس سزا کی جو اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کے جرم کے نتیجے میں ان کے حصے میں آئی ہے۔

اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبۃ)

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ﴾ ”اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے‘ اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ“

﴿رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ ”اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے‘ اور اس نے ان کے لیے وہ باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی‘ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰﴾ ”یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔“

اس آیت میں اہلِ ایمان کے دو بلند ترین مراتب کا ذکر آیا ہے۔ یعنی سب سے اوپر اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ

اوراس کے بعدان کے پیروکار۔ بنیادی طور پران دونوں گروہوں کے لوگ نیک سیرت ہیں اورفطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم سے نوازے گئے ہیں' البتہ ان کی آپس کی درجہ بندی میں جوفرق ہے وہ ان کی طبیعت اور ہمت کے فرق کے باعث ہے۔ان میں سے درجہ اول (السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ) پرفائز دراصل وہ لوگ ہیں جوحق کوسامنے آتے ہی فوراً قبول کرلیتے ہیں۔حق ان کے لیے اس قدرقیمتی متاع ہے کہ اس کی قبولیت میں ذراسی تاخیر بھی انہیں گوارا نہیں ہوتی۔ وہ اتنے باہمت لوگ ہوتے ہیں کہ قبولِ حق کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ اس کے نتائج وعواقب کے بارے میں سوچ بچار میں نہیں پڑتے۔وہ اس خیال کوخاطر میں نہیں لاتے کہ اس کے بعدانہیں کیا کچھ چھوڑنا ہوگا اور کیا کچھ بھگتنا پڑے گا۔نہ وہ لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے آگے اس راستے پر پہلے سے کوئی چل بھی رہا ہے یا نہیں'اوراگرنہیں چل رہا توکسی اور کے آنے کا انتظار کرلیں' سب سے پہلے' اکیلے وہ کیونکر اس پرخطروادی میں کود پڑیں! وہ ان سب پہلوؤں پرسوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتے' حق کوقبول کرنے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے' کسی مصلحت کوخاطر میں نہیں لاتے' عقل کے دلائل کی منطق میں نہیں پڑتے اور ع ''ہرچہ بادا باد' ما کشتی درآب انداختیم'' کے مصداق بے خطر آتشِ ابتلا میں کود جاتے ہیں۔ بقولِ اقبالؔ: ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

دوسرے درجہ میں وہ لوگ ہیں جوان السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن کے اتباع میں داعیٔ حق کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔یہ بھی سلیم الفطرت لوگ ہوتے ہیں' حق کوپہلی نظر میں پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اوراس کی قبولیت کے لیے آمادہ بھی ہوتے ہیں' مگران میں ہمت قدرے کم ہوتی ہے۔ یہ ''ہرچہ بادا باد'' والانعرہ بلند نہیں کرسکتے اور چاہتے ہیں کہ یہ نئی پگڈنڈی ذرا راستے کی شکل اختیار کرلے' ہمارے آگے کوئی دوچار لوگ چلتے ہوئے نظر آئیں تو ہم بھی اُن کے پیچھے چل پڑیں گے۔یعنی اس میں معاملہ نیت کے کسی خلل کا نہیں' صرف ہمت کی کمی کا ہے۔اوروہ بھی اس لیے کہ ان کی طبائع ہی اس نہج پر بنائی گئی ہیں' حضوراکرم ﷺ کاارشاد ہے: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ)) (صحیح مسلم) ''انسان (معدنیات کی) کانوں کی طرح ہیں' جیسے چاندی اورسونے کی کانیں ہوتی ہیں''۔یعنی جس طرح معدنیات کی اپنی اپنی قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح انسانوں کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ظاہر ہے سونا آپ کوسونے کی کچ دھات (ore) سے ہی حاصل ہوگا۔چاندی کی ore کوخواہ کتنا ہی صاف کرلیں وہ سونا نہیں بن سکتی۔اسی طرح انسانوں کے طبائع میں جو بنیادی فرق ہوتا ہے اس کے سبب سب انسان برابر نہیں ہوسکتے۔

بہرحال یہاں پراللہ تعالیٰ نے ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن'' اوراُن کے اتباع میں حق کوقبول کرنے والوں کا ذکرایک ساتھ کیا ہے' کیونکہ ان کے پیروکاروں نے بھی حق کوحق سمجھ کرقبول کیا ہے' پوری نیک نیتی سے قبول کیا ہے اورصرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قبول کیا ہے۔اس سلسلے میں کوئی اورغرض' کوئی اور عامل' کوئی اور مفادان کے پیش نظر نہیں تھا۔بس تھوڑی سی ہمت کی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ سبقت نہ لے سکے' مگر دوسرے

درجے پر فائز ہو گئے۔

اب یہاں ایک اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' مہاجرین میں سے بھی ہیں اور انصار میں سے بھی' اور پھر ان میں ان کے اپنے اپنے متبعین ہیں۔ انصار چونکہ کہیں دس سال بعد ایمان لائے تھے' اس لیے اگر زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو گروہِ مہاجرین میں سے جو اصحاب متبعین قرار پائے ہیں وہ انصار کے ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' سے بھی بہت پہلے ایمان لائے تھے' مگر اس درجہ بندی اور مراتب میں وہ ان سے پیچھے ہی رہے۔ اس لیے کہ یہاں پہلے یا بعد میں آنے کا اعتبار زمانی لحاظ سے نہیں' بلکہ یہ مزاج کا معاملہ ہے اور اس پہلے ردِعمل کا معاملہ ہے جو کسی کے مزاج سے اس وقت ظہور پذیر ہوا جب اس نے پہلی دفعہ حق کو پہچانا۔ لہٰذا اگرچہ اہلِ مدینہ (جو بعد میں انصار کہلائے) بہت بعد میں ایمان لائے تھے مگر ان میں بھی وہ لوگ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' ہی قرار پائے جنہوں نے حق کو پہچان کر فوراً لبیک کہا' پھر نہ انہوں نے نتائج کی پروا کی اور نہ کوئی مصلحت ان کے آڑے آئی۔

توبہ کرنے کا قابلِ رشک انداز

(۱) وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبۃ)

(۲) وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبۃ)

(۳) وَّعَلَي الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (التوبۃ)

آیت ۱۰۲ ﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ﴾ ''اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں''

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کے لیے جھوٹ نہیں بولتے' جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے' جھوٹے بہانے نہیں بناتے' بلکہ کھلے عام اعتراف کر لیتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوگئی' معمولاتِ زندگی کی مصروفیات اور اہل و عیال کی مشغولیات نے ہمیں اس قدر اُلجھایا کہ ہم دینی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا ارتکاب کر بیٹھے۔ جب غلطی کا ایسا کھلا اعتراف ہو جاتا ہے تو نفاق کا احتمال نہیں رہتا اور متعلقہ شخص کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔

﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ﴾ ''انہوں نے اچھے اور برے اعمال کو گڈمڈ کر دیا ہے۔''

یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جو نیک اعمال بھی کرتے ہیں مگر کبھی کوئی غلطی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ رضائے الٰہی کے لیے انفاق بھی کرتے ہیں مگر دنیاداری کے جھمیلوں میں اُلجھ کر کہیں کوئی تقصیر بھی ان سے ہو جاتی ہے۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ کو قبول فرمائے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

ایک روایت کے مطابق یہ آیت حضرت ابولُبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان لوگوں سے سستی اور دنیاداری کی مصروفیات کے باعث یہ کوتاہی ہوئی کہ وہ غزوۂ تبوک کی مہم میں شریک نہ ہو سکے' مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے شدید احساسِ ندامت کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس مدینہ تشریف لانے سے پہلے اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ستونوں سے باندھ لیا کہ اب یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا کر ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمائیں گے اور ہمیں اپنے دستِ مبارک سے کھولیں گے یا پھر ہم یہیں بندھے بندھے اپنی جانیں دے دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یہ آیات نازل ہوئیں تو آپؐ نے تشریف لے جا کر انہیں کھولا اور خوشخبری سنائی کہ ان کی توبہ قبول ہو گئی ہے۔

توبہ کرنے اور توبہ کی قبولیت کا یہ وہی اصول تھا جس کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾﴾ یعنی کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد ہونے کے فوراً بعد انسان کے اندر ایمانی جذبات لوٹ آئیں' اسے احساسِ ندامت ہو اور وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے ایسی توبہ کو قبول کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ مگر ان اصحابؓ کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ ان کی توبہ کی قبولیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی حکم نازل ہوا۔

آیت ۱۰۶ ﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾﴾

''اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کے معاملے کو اللہ کے فیصلے تک مؤخر کر دیا گیا ہے' چاہے انہیں عذاب دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول فرما لے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' حکمت والا ہے۔''

یہ آیت تین اصحاب کعب بن مالک' ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان سے بھی غزوۂ تبوک کی مہم میں شرکت کے حوالے سے کوتاہی ہوئی تھی۔ اس آیت میں ان کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک صحابی حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو کُتبِ احادیث اور تفاسیر میں منقول ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بھی تفہیم القرآن میں بخاری شریف کے حوالے سے یہ طویل حدیث نقل کی ہے۔ یہ بہت سبق آموز اور عبرت انگیز واقعہ ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد مدینہ کے اس معاشرے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت افراد کے اندازِ فکر اور جماعتی زندگی کے نظم و ضبط کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ حیران کن بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔

یہ تینوں حضرات سچے مسلمان تھے' مہم پر جانا بھی چاہتے تھے مگر سستی کے باعث ان سے تاخیر ہو گئی اور اس طرح وہ جانے سے رہ گئے۔ حضرت کعبؓ بن مالک خود فرماتے ہیں کہ میں اس زمانے میں بہت صحت مند اور خوشحال تھا' میری اونٹنی بھی بہت توانا اور تیز رفتار تھی۔ جب سستی کی وجہ سے میں لشکر کے ساتھ روانہ نہ ہو سکا تو بھی

میرا خیال تھا کہ میں آج کل میں روانہ ہو جاؤں گا اور راستے میں لشکر سے جا ملوں گا۔ میں اسی طرح سوچتا رہا اور روانہ نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ وقت نکل گیا اور پھر ایک دن اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ اب خواہ میں کتنی ہی کوشش کرلوں، لشکر کے ساتھ نہیں مل سکتا۔

جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ ﷺ نے پیچھے رہ جانے والوں کو بلا کر باز پرس شروع کی۔ منافقین آپ ﷺ کے سامنے قسمیں کھا کھا کر بہانے بناتے رہے اور آپ ﷺ ان کی باتوں کو مانتے رہے۔ جب کعبؓ بن مالک کی باری آئی تو حضور ﷺ نے اُن کو دیکھ کر تبسم فرمایا۔ ظاہر ہے حضور ﷺ جانتے تھے کہ کعبؓ سچے مؤمن ہیں۔ آپ ﷺ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ لوگ جھوٹی قسمیں کھا کر چھوٹ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی زبان دی ہے، میں بھی بہت سی باتیں بنا سکتا ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر مانع نہیں تھا۔ میں ان دنوں جتنا صحت مند تھا اتنا پہلے کبھی نہ تھا، جتنا غنی اور خوشحال تھا ایسا پہلے کبھی نہ تھا۔ مجھے کوئی عذر مانع نہیں تھا سوائے اس کے کہ شیطان نے مجھے ورغلایا اور تاخیر ہو گئی۔ ان کے باقی دو ساتھیوں نے بھی اسی طرح سچ بولا اور کوئی بہانہ نہ بنایا۔

ان تینوں حضرات کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے بات نہ کرے اور یوں ان کا مکمل طور پر معاشرتی مقاطعہ (social boycott) ہو گیا، جو پورے پچاس دن جاری رہا۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس دوران ایک دن انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی اور بچپن کے دوست سے بات کرنا چاہی تو اس نے بھی جواب نہ دیا۔ جب انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ کے بندے تمہیں تو معلوم ہے کہ میں منافق نہیں ہوں تو اس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ چالیس دن بعد حضور ﷺ کے حکم پر انہوں نے اپنی بیوی کو بھی علیحدہ کر دیا۔ اسی دوران والیٔ غسان کی طرف سے انہیں ایک خط بھی ملا، جس میں لکھا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے ساتھی آپ پر ظلم ڈھا رہے ہیں، آپ باعزت آدمی ہیں، آپ ایسے نہیں ہیں کہ آپ کو ذلیل کیا جائے، لہٰذا آپ ہمارے پاس آ جائیں، ہم آپ کی قدر کریں گے اور اپنے ہاں اعلیٰ مراتب سے نوازیں گے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی آزمائش تھی، مگر انہوں نے وہ خط تنور میں جھونک کر شیطان کا یہ وار بھی ناکام بنا دیا۔ ان کی اس سزا کے پچاسویں دن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس آزمائش اور ابتلا میں سرخرو فرمایا اور ان کی توبہ کی قبولیت کی سند کے طور پر اسی سورت (التوبہ) میں یہ حکم نازل فرمایا:

آیت ۱۱۸ ﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ﴾ ''اور ان تین پر بھی (اللہ نے رحمت کی نگاہ کی) جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا۔''

﴿حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود ان پر تنگ پڑ گئی اور ان پر اپنی جانیں بھی بوجھ بن گئیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ ہے ہی نہیں۔''

یہ ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی بچہ ماں سے پٹتا ہے مگر اس کے بعد اسی سے لپٹتا ہے۔ اللہ کے بندوں پر بھی اگر اللہ کی طرف سے سختی آتی ہے' کوئی سزا ملتی ہے تو نہ صرف وہ اس سختی کو خوش دلی اور صبر سے برداشت کرتے ہیں' بلکہ پناہ کے لیے رجوع بھی اسی کی طرف کرتے ہیں' کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ انہیں پناہ ملے گی تو اسی کے حضور میں ملے گی' ان کے دکھوں کا مداوا ہوگا تو اسی کی جناب سے ہوگا۔ علامہ اقبال نے اس خوبصورت حقیقت کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو' ترے عفوِ بندہ نواز میں!

﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوبُوٓاۚ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾﴾ ''تو اُس نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ بھی پھر متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا' بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرلیں اور اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور کرلیں۔

بائیکاٹ کے اختتام پر ہر فرد کی طرف سے ان حضرات کے لیے خلوص ومحبت کے جذبات کا جس طرح سے اظہار ہوا اور پھر ان تینوں اصحابؓ نے اپنی آزمائش اور ابتلا کے دوران اخلاص واستقامت کی داستان جس خوبصورتی سے رقم کی' یہ ایک دینی جماعتی زندگی کی مثالی تصویر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے ان کے جان ومال خرید لیے ہیں!

إِنَّ ٱللَّهَ ٱشۡتَرَىٰ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ أَنفُسَهُمۡ وَأَمۡوَٰلَهُم بِأَنَّ لَهُمُ ٱلۡجَنَّةَۚ يُقَٰتِلُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيَقۡتُلُونَ وَيُقۡتَلُونَۖ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقّٗا فِي ٱلتَّوۡرَىٰةِ وَٱلۡإِنجِيلِ وَٱلۡقُرۡءَانِۚ وَمَنۡ أَوۡفَىٰ بِعَهۡدِهِۦ مِنَ ٱللَّهِۚ فَٱسۡتَبۡشِرُواْ بِبَيۡعِكُمُ ٱلَّذِي بَايَعۡتُم بِهِۦۚ وَذَٰلِكَ هُوَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ﴿١١١﴾ ٱلتَّٰٓئِبُونَ ٱلۡعَٰبِدُونَ ٱلۡحَٰمِدُونَ ٱلسَّٰٓئِحُونَ ٱلرَّٰكِعُونَ ٱلسَّٰجِدُونَ ٱلۡأٓمِرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَٱلنَّاهُونَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِ وَٱلۡحَٰفِظُونَ لِحُدُودِ ٱللَّهِۗ وَبَشِّرِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿١١٢﴾ (التوبة)

آیت ۱۱۱ ﴿إِنَّ ٱللَّهَ ٱشۡتَرَىٰ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ أَنفُسَهُمۡ وَأَمۡوَٰلَهُم بِأَنَّ لَهُمُ ٱلۡجَنَّةَۚ﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

یہ دو طرفہ سودا ہے جو ایک صاحب ایمان بندے کا اپنے رب کے ساتھ ہوتا ہے۔ بندہ اپنی جان اور اپنا مال بیچتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے جان ومال کو جنت کے عوض خرید لیتا ہے۔

﴿يُقَٰتِلُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيَقۡتُلُونَ وَيُقۡتَلُونَۖ﴾ ''وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

جیسے جنگ بدر میں مسلمانوں نے ستر کافروں کو جہنم رسید کیا اور میدانِ اُحد میں ستر اہلِ ایمان شہید ہو گئے۔

﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ﴾ ''یہ وعدہ اللہ کے ذمے ہے سچا' تورات' انجیل اور قرآن میں۔''

یہاں بین السطور میں دراصل یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ یہ سودا اگرچہ ادھار کا سودا ہے مگر یہ ایک پختہ عہد ہے جس کو پورا کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی وسوسہ تمہارے دلوں میں نہ آنے پائے۔ دراصل یہ اس سوچ کا جواب ہے جو طبع بشری کی کمزوری کے سبب انسانی ذہن میں آتی ہے۔ انسان کو بنیادی طور پر ''نو نقد نہ تیرہ ادھار'' والا فلسفہ ہی اچھا لگتا ہے۔ ظاہر ہے کامیاب سودا تو وہی ہوتا ہے جو ایک ہاتھ دو اور دوسرے ہاتھ لو کے اصول کے مطابق ہو۔ مگر یہاں تو دُنیوی زندگی میں سب کچھ قربان کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اس کے انعام کے لیے وعدۂ فردا کا انتظار کرنے کو کہا جا رہا ہے کہ اس قربانی کا انعام مرنے کے بعد آخرت میں ملے گا۔ لہٰذا ایک عام انسان اس ''جنت موعودہ'' کا ہلکا سا تصور ہی اپنے ذہن میں لا سکتا ہے۔ اس بارے میں یقین کی پختگی تو صرف خواص کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کو ادھار کے اس سودے پر اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدے کی توثیق تین دفعہ ہو چکی ہے' تورات میں' انجیل میں اور پھر اب قرآن مجید میں بھی۔

﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اپنی اس بیع پر جس کا سودا تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔''

بَايَعْتُمْ بِهٖ یعنی آپس میں جو سودا تم نے کیا۔ مُبَايَعَة باب مفاعلہ بَايَعَ يُبَايِعُ (آپس میں سودا کرنا) ثلاثی مجرد بَاعَ يَبِيْعُ (بیچنا) سے ہے۔ اسی مادہ سے لفظ ''بیعت'' مشتق ہے۔ ایک بندہ جو بیعت کرتا ہے اس میں وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کے ہاتھ پر صحابہ کرام ﷺ نے جو بیعت کی' اس کا مطلب یہی تھا کہ انہوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ سامنے موجود نہیں تھا اس لیے بظاہر یہ بیعت حضور ﷺ کے دست مبارک پر ہوئی تھی' مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی (ﷺ) جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں دراصل وہ اللہ سے ہی بیعت کرتے ہیں اور وقت بیعت ان کے ہاتھوں کے اوپر ایک تیسرا غیر مرئی ہاتھ اللہ کا بھی موجود ہوتا ہے۔ (الفتح: ۱۰)

یہ سودا اور یہ بیع جس کا ذکر آیت زیر نظر میں ہوا ہے' دراصل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو یہ سودا کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اپنی جانیں اور اپنے اموال بیچ دیں۔ اس سودے کے اثرات عملی طور پر جب انسانی شخصیت پر مترتب ہوتے ہیں تو متعلقہ انسان کی شخصیت سے جن صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کیفیت کا نقشہ آئندہ آیت میں دکھایا گیا ہے:

آیت ۱۱۲ ﴿اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰکِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ﴾ ''توبہ کرنے والے‘(اللہ کی) بندگی کرنے والے‘(اللہ کی) حمد کرنے والے‘ دُنیوی آسائشوں سے لاتعلق رہنے والے‘ رکوع کرنے والے‘ سجدہ کرنے والے''

'سَآئِحُوۡنَ' کا معنی ہے ''سیاحت کرنے والے'' لیکن اس سے مراد محض سیر و سیاحت نہیں بلکہ عبادت و ریاضت کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہونا ہے۔ پچھلی اُمتوں میں روحانی ترقی کے لیے لوگ لذاتِ دنیوی کو ترک کر کے اور انسانی آبادیوں سے لاتعلق ہو کر جنگلوں میں چلے جاتے تھے اور رہبانیت اختیار کر لیتے تھے‘ مگر ہمارے دین میں ایسی سیاحت اور رہبانیت کی اجازت نہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ وَلَا سِيَاحَةَ)) (فتح الباری لابن رجب) ''اسلام میں نہ رہبانیت ہے اور نہ سیاحت''۔ سابقہ ادیان کے برعکس اسلام نے سیاحت اور رہبانیت کا جو تصور متعارف کرایا ہے اس کے لیے ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ سِيَاحَةً وَاِنَّ سِيَاحَةَ اُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَاِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَهْبَانِيَّةً وَرَهْبَانِيَّةُ اُمَّتِي الرِّبَاطُ فِي نُحُورِ الْعَدُوِّ)) (مجمع الزوائد للبیهقی)

''ہر اُمت کے لیے سیاحت کا ایک طریقہ تھا اور میری اُمت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے‘ اور ہر اُمت کی ایک رہبانیت تھی‘ جبکہ میری اُمت کی رہبانیت دشمن کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونا ہے۔''

ایک موقع پر ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے سیاحت کی اجازت دیجیے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ سِيَاحَةَ اُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ)) (سنن ابی داؤد) ''میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ گویا ہماری اُمت کے لیے 'سیاحت' کا اطلاق جہاد و قتال کے لیے گھر سے نکلنے اور اس راستے میں صعوبتیں برداشت کرنے پر ہوتا ہے۔

یہ چھ اوصاف جو اوپر گنوائے گئے ہیں ان کا تعلق انسانی شخصیت کے نظریاتی پہلو سے ہے۔ اب اس کے بعد تین ایسی خصوصیات کا ذکر ہونے جا رہا ہے جو انسان کی عملی جدوجہد سے متعلق ہیں اور دعوت و تحریک کی صورت میں معاشرے پر عملاً اثر انداز ہوتی ہیں:

﴿الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاہُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

''نیکی کا حکم دینے والے‘ بدی سے روکنے والے‘ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور (اے نبی ﷺ) آپ ان اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے۔''

امر بالمعروف گویا دین کے لیے عملی جدوجہد کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ جدوجہد جب آگے بڑھ کر نہی عن المنکر بالید کے مرحلے تک پہنچتی ہے تو پھر ان خدائی فوجداروں کی ضرورت پڑتی ہے جن کو یہاں ﴿وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ﴾ کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اگر پوری طرح منظم ہوں تو اپنی تنظیمی طاقت کے بل پر کھڑے ہو کر

اعلان کریں کہ اب ہم اپنے معاشرے میں منکرات کا سکہ نہیں چلنے دیں گے اور کسی کو اللہ کی حدود کو توڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! واضح رہے کہ منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ کے اس مرحلے کے ضمن میں آج اجتہاد کی ضرورت ہے کہ موجودہ حالات میں نہی عن المنکر بالید کے لیے اجتماعی اور منظم جدوجہد کی صورت کیا ہوگی۔

غلبۂ دین کے لیے مسلسل جہاد کرنے کا حکم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ (التوبة)

”اے اہلِ ایمان! جنگ کرو ان کافروں سے جو تم سے قریب ہیں اور وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔“

یہ حکم گویا ایک اعلان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے بین الاقوامی اور آفاقی دور کا آغاز ہو چکا ہے‘ اب اس دعوت کو چہار سو پھیلنا ہے اور دار الاسلام کی سرحدوں کو مسلسل وسیع ہونا ہے۔ چنانچہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اسلامی حکومت کی سرحدوں پر جو کفار بستے ہیں ان سے قتال کرو‘ اور جیسے جیسے یہ سرحدیں آگے بڑھتی جائیں تمہارے قتال کا سلسلہ بھی اُن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے‘ حتیٰ کہ اللہ کا دین پوری دنیا پر غالب آ جائے۔ جیسے سورۃ الانفال میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک قتال جاری رکھنے کا یہ حکم ہوا تھا: ﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰہِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) یعنی جب تک جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور اللہ کا دین اس پورے علاقے میں غالب نہیں ہو جاتا یہ جنگ جاری رہے گی۔ بہرحال آیت زیرِ نظر میں غلبۂ دین کے لیے بین الاقوامی سطح پر جدوجہد کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم موجود ہے اور اس سلسلے میں اسلام کا چارٹر بھی۔ اسی پر عمل کرتے ہوئے جزیرہ نمائے عرب سے اسلامی افواج جہاد کے لیے نکلی تھیں اور پھر اسلامی سرحدوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تھا۔

ایک سبق آموز مثال

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِھَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ (الرعد)

﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِھَا﴾ ”وہ آسمان سے پانی برساتا ہے‘ پھر تمام ندیاں بہنے لگتی ہیں اپنی اپنی وسعت کے مطابق“

قرآن چونکہ علاقہ حجاز میں نازل ہوا ہے اس لیے اس میں زیادہ تر مثالیں بھی اسی سرزمین سے دی گئی ہیں۔ اس مثال میں بھی علاقہ حجاز کے پہاڑی سلسلوں اور وادیوں کا ذکر ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو ہر وادی میں اُس کی وسعت کے مطابق سیلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی کے بہاؤ کے لیے کسی وادی کا پھیلاؤ (catchment area) زیادہ ہے تو وہاں زیادہ زوردار سیلاب آ جاتا ہے اور جس کا پھیلاؤ کم ہے وہاں تھوڑا سیلاب آتا ہے۔

﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ﴾ ''پھر اٹھالاتا ہے سیلاب اُبھرتے جھاگ کو۔''

پانی جب زور سے بہتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ سا بن جاتا ہے' لیکن اس جھاگ کی کوئی حقیقت اور وقعت نہیں ہوتی۔

﴿وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ﴾ ''اور جن (دھاتوں) کو یہ لوگ آگ پر تپاتے ہیں زیور یا دوسری چیزیں بنانے کے لیے ان پر بھی اسی طرح کا جھاگ اُبھرتا ہے۔''

﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ﴾ ''اسی طرح اللہ حق و باطل کو ٹکراتا ہے۔''

اس کا دوسرا ترجمہ یوں ہوگا: ''اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔''

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ﴾ ''تو جو جھاگ ہے وہ خشک ہو کر زائل ہو جاتا ہے۔''

جھاگ کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہوتی' اصل نتائج کے اعتبار سے اس کا ہونا یا نہ ہونا گویا برابر ہے۔

﴿وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ ٹھہر جاتی ہے زمین میں۔''

سیلاب کا پانی زمین میں جذب ہو کر اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے جبکہ جھاگ ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پگھلی ہوئی دھات کے اوپر پھولا ہوا جھاگ اور میل کچیل فضول چیز ہے' اصل خالص دھات اس جھاگ کے نیچے کٹھالی کی تہہ میں موجود ہوتی ہے جو زیورات یا دوسری چیزیں بنانے کے کام آتی ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾﴾ ''اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔''

یہ آیت کارل مارکس کے جدلیاتی مادیت (dialectical materialism) کے فلسفے کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس فلسفے کا جتنا حصہ درست ہے وہ اس آیت میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ دورِ جدید کے ہر نظریے (theory) میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ہو یا فرائیڈ اور مارکس کے نظریات' ان میں سے کوئی نظریہ بھی سو فیصد غلط نہیں ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان نظریات میں غلط اور درست خیالات گڈ مڈ ہیں۔ جہاں تک مارکس کے نظریہ جدلیاتی مادیت (dialectical materialism) کا تعلق ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی معاشرے میں ایک خیال یا نظریہ جنم لیتا ہے جس کو thesis کہا جاتا ہے۔ اس کے ردِعمل کے طور پر اینٹی تھیسس (antithesis) وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ تھیسس اور اینٹی تھیسس ٹکراتے ہیں اور ان

کے ٹکرانے سے ایک نئی شکل پیدا ہوتی ہے جسے سِن تھیس (synthesis) کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ اس نظریہ کی بہتر شکل ہوتی ہے مگر یہ بھی اپنی جگہ کامل نہیں ہوتی' اس کے اندر بھی نقائص موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِسی سن تھیس کی کوکھ سے ایک اور اینٹی تھیس جنم لیتا ہے۔ ان کا پھر آپس میں اسی طرح ٹکراؤ ہوتا ہے اور پھر ایک نیا سن تھیس وجود میں آتا ہے۔ یہ عمل (process) اسی طرح بتدریج آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس تصادم میں جو چیز فضول' غلط اور بیکار ہوتی ہے وہ ضائع ہوتی رہتی ہے' مگر جو علم اور خیال معاشرے اور نسل انسانی کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔

دراصل دورِ جدید کے بیشتر نظریے (theories) ایسے لوگوں کی تخلیق ہیں جن کے علم اور سوچ کا انحصار کُلّی طور پر مادے پر تھا۔ یہ لوگ روح اور اس کی حقیقت سے بالکل نابلد تھے۔ بنیادی طور پر یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے اخذ کردہ نتائج اکثر و بیشتر غلط اور گمراہ کن تھے۔ بہرحال اس سارے عمل (process) میں غلط اور باطل خیالات و مفروضات خود بخود چھنٹتے رہتے ہیں اور نسل انسانی کے لیے مفید علوم کی تطہیر (purification) ہوتی رہتی ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ میں یہ حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ﴾ ''ہم دے مارتے ہیں حق کو باطل پر' تو وہ باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے' پھر وہ (باطل) غائب ہو جاتا ہے''۔ حق و باطل اور خیر و شر کی اس کش مکش کے ذریعے سے گویا نسل انسانی تدریجاً تمدن و ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے رفتہ رفتہ بہتری کی طرف آ رہی ہے۔

علامہ اقبال کے مطابق نسل انسانی کے لیے کامل بہتری یا حتمی کامیابی اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کی تعمیل میں پوشیدہ ہے جس کا کامل عملی نمونہ اس دنیا میں پندرہ سو سال پہلے نبی آخر الزماں ﷺ نے پیش کیا تھا۔ ارتقاءِ فکر انسانی کے سفر کے نام پر انسانی تمدن کے چھوٹے بڑے تمام قافلے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی مینارۂ نور (light house) کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر کسی ماحول میں روشنی کی کوئی کرن اجالا بکھیرتی نظر آتی ہے تو وہ اسی منبع نور کی مرہونِ منت ہے' اور اگر کسی ماحول کے حصے کی تاریکیاں ابھی تک گہری ہیں تو جان لیجئے کہ وہ نسل فطری اور حتمی منزل سے ہنوز دور ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو — آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ است

اعمال کی قبولیت کے لیے ''ایمان'' لازمی شرط ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ٕاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ (ابراهيم)

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ٕاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ﴾

''مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اپنے ربّ کے ساتھ (ایسی ہے) کہ ان کے اعمال ہوں راکھ کی مانند جس پر زور دار ہوا چلے آندھی کے دن۔''

اللہ کے ہاں کسی بھی نیک عمل کی قبولیت کے لیے ایمان لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے رب کا کفر کرتے ہیں ان کے نیک اعمال کو یہاں راکھ کے ایسے ڈھیر سے تشبیہہ دی گئی ہے جس پر تیز آندھی چلی اور اس کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو گیا۔ یعنی بظاہر تو وہ بہت بڑا ڈھیر نظر آتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کچھ بھی حیثیت باقی نہ رہی۔ یہ بہت اہم مضمون ہے اور قرآن کریم میں مختلف مثالوں کے ساتھ اسے تین بار دہرایا گیا ہے۔ سورۃ النور کی آیت ۳۹ میں کفار کے اعمال کو سراب سے تشبیہہ دی گئی ہے اور سورۃ الفرقان کی آیت ۲۳ میں منکرینِ آخرت کے اعمال کو ﴿هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾ یعنی ''ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات'' کی مانند قرار دیا گیا ہے۔

دراصل ہر انسان اپنی ذہنی سطح کے مطابق نیکی کا ایک تصور رکھتا ہے، مگر نیکی کا تعلق چونکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی قبولیت کے ساتھ ہے، اس لیے اس کے لیے معیار بھی وہی قابلِ قبول ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے خود قائم کیا ہے، اور وہ معیار سورۃ البقرۃ کی آیت البر کی روشنی میں یہ ہے:

﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۝١٧٧﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ اصل نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر۔ اور اس نے خرچ کیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کے جب کوئی عہد کر لیں۔ اور صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکالیف میں اور حالتِ جنگ میں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

اگر کسی انسان کی نیکی اس معیار کے مطابق ہے تو پھر یہ واقعی نیکی ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو وہ نیکی کی شکل میں دھوکہ، سراب اور فریب ہے، نیکی نہیں ہے۔ دراصل جب انسان کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا نیکی کا تصور بھی مسخ ہو جاتا ہے۔ نیکی چونکہ ایک بُرے سے بُرے انسان کے بھی ضمیر کی ضرورت ہے اس لیے بجائے اس کے کہ ایک برا انسان اپنی اصلاح کر کے اپنے اعمال و کردار کو نیکی کے مطلوبہ معیار پر لے کر آئے، وہ الٹا نیکی کے معیار کو گھسیٹ کر اپنے خیالات و نظریات کی گندگی کے ڈھیر کے اندر اس کی جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں چور ڈاکو اور لٹیرے صدقہ و خیرات کرتے اور خدمتِ خلق

کے بڑے بڑے کام کرتے نظر آتے ہیں اور جسم فروش عورتیں مزاروں پر دھمال ڈالتی اور نیاز بانٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے پیشے میں قدرے قباحت کا عنصر پایا جاتا ہے تو کیا ہوا' اس کے ساتھ ساتھ ہم نیکی کے فلاں فلاں کام بھی تو کرتے ہیں!

اسی طرح جب مذہبی مزاج رکھنے والے لوگوں کی فطرت مسخ ہوتی ہے تو وہ کبیرہ گناہوں کی طرف سے بے حس اور صغائر کے بارے میں بہت حساس ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ صغائر کے بارے میں تو بڑے زوردار مباحثے اور مناظرے کر رہے ہوتے ہیں' مگر کبائر سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام کو وہ لائق اعتناء ہی نہیں سمجھتے۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ پہلے کبائر سے کُلّی طور پر اجتناب کیا جائے اور پھر اس کے بعد صغائر کی طرف توجہ کی جائے۔ بہرحال قیامت کے دن بے شمار ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے زعم میں بہت زیادہ نیکیاں لے کر آئے ہوں گے' مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی نیکیوں کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہوگی۔

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑱﴾ ''انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا اُس میں سے جو کمائی انہوں نے کی ہوگی۔ یہی تو ہے دُور کی گمراہی۔''

ان کو زعم ہوگا کہ انہوں نے دنیا میں بہت نیک کام کیے تھے' خدمتِ خلق کے بڑے بڑے پراجیکٹ شروع کر رکھے تھے' مگر اُس دن وہاں ان میں سے کوئی نیکی بھی ان کے کام آنے والی نہیں ہوگی۔

قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨ (الحجر)

''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

اس آیت کے پہلے حصے کا حکم تورات پر بھی صادق آتا ہے اور انجیل پر بھی۔ یعنی یہ دونوں کتابیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ قرآن حکیم میں اس کی بار بار تصدیق بھی کی گئی ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۴ میں تورات کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق اس طرح کی گئی ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ﴾۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳ میں ان دونوں کتابوں کا ذکر فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③﴾۔ البتہ آیت زیر مطالعہ کے دوسرے حصے میں جو حکم آیا ہے وہ صرف اور صرف قرآن حکیم کی شان ہے۔ اس سے پہلے کسی الہامی کتاب یا صحیفۂ آسمانی کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سابقہ کُتب کی ہدایات وتعلیمات حتمی اور ابدی نہیں تھیں' بلکہ وہ عبوری ادوار کے لیے وقتی اور عارضی ہدایات تھیں اور اس لحاظ سے انہیں ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب جبکہ قرآن حکیم کی صورت میں ہدایت کامل ہوگئی تو اسے تاابد محفوظ کر دیا گیا۔

یہ آیت ختمِ نبوت پر بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے' بایں طور کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ کے مطابق قرآن حکیم میں ہدایت درجۂ کاملیت تک پہنچ گئی اور آیت زیرِنظر کے مطابق وہ ابدی طور پر محفوظ بھی ہوگئی' تو ظاہر ہے

وحی کے جاری رہنے کی ضرورت بھی ختم ہوگئی۔ چنانچہ قادیانیوں کے پاس اِن دونوں قرآنی حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد (اوران کے لیے انہیں تسلیم کیے بغیر چارا بھی نہیں) وحی کے جاری رہنے کے جواز کی کوئی عقلی و منطقی دلیل باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی ضرورت ان دونوں میں سے کسی ایک صورت میں ہی ہوسکتی ہے کہ یا تو ابھی ہدایت کامل نہیں ہوئی تھی اوراس کی تکمیل کے لیے وحی کے تسلسل کی ضرورت تھی۔ یا پھر ہدایت کامل تو ہوگئی تھی مگر بعد میں غیر محفوظ ہوگئی یا گم ہوگئی اوراس وجہ سے پیدا ہوجانے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے وحی کی ضرورت تھی۔ بہر حال اگران دونوں میں سے کوئی صورت بھی درپیش نہیں ہے تو سلسلۂ وحی کے جاری رہنے کا کوئی جواز نہیں' اور اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) عبث کام نہیں کرتا کہ ضرورت کے بغیر ہی سلسلۂ وحی کو جاری کیے رکھے۔

اس آیت میں قرآن حکیم کے لیے ''الـذِّکـر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح اس سے قبل آیت ۶ (سورۃ الحجر) اورسورۂ ''نٓ'' کی آخری دو آیات میں بھی قرآن حکیم کے لیے یہ لفظ آیا ہے۔ لفظ ''ذِکر'' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ قرآنی فلسفے کے مطابق قرآن مجید کا ''الذکر'' ہونا اس مفہوم میں ہے کہ ایمانی حقائق خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اوراس کی صفات کا علم انسانی روح کے اندر موجود ہے' مگر اس علم پر ذُہول (بھول اور غفلت) کا پردہ طاری ہوجاتا ہے۔ جیسے ایک وقت میں انسان کو ایک چیز یاد ہوتی ہے مگر بعد میں یاد نہیں رہتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے بارے میں معلومات اس کی یادداشت کے تہہ خانے میں دب جاتی ہیں۔ پھر بعد میں کسی وقت جونہی کوئی چیز ان معلومات سے متعلق سامنے آتی ہے تو انسان کے ذہن میں وہ بھولی بسری معلومات پھر سے تازہ ہوجاتی ہیں۔ اس طرح ذہن میں موجود معلومات کو پھر سے تازہ کرنے والی چیز گویا یاد دہانی (reminder) کا کام کرتی ہے۔ مثلاً ایک دوست سے آپ کی سالہا سال سے ملاقات نہیں ہوئی اوراس کا خیال بھی کبھی نہیں آیا' مگر ایک دن اچانک اس کا دیا ہوا ایک قلم یا رومال سامنے آنے سے اس دوست کی یاد یکدم ذہن میں تازہ ہوگئی۔ اس صورت حال میں اس قلم یا رومال کی حیثیت گویا ایک یاد دہانی اور نشانی (یا آیت) کی ہے جس سے آپ کے ذہن میں ایک بھولی بسری یاد پھر سے تازہ ہوگئی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم انسانی روح میں خفتہ (dormant) حالت میں موجود ہے۔ اس علم کو پھر سے جگا کر تازہ کرنے اوراس پر پڑے ہوئے ذہول اور نسیان کے پردوں کو ہٹانے کے لیے آیاتِ آفاقیہ' آیاتِ انفسیہ اور آیاتِ قرآنیہ گویا یاد دہانی کا کام دیتی ہیں اوراس طرح اللہ تعالیٰ کی یاد کو انسان کے ذہن میں تازہ کرتی ہیں۔ چنانچہ اس معنی و مفہوم میں قرآن حکیم کو ''الذکر'' (یاد دہانی) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دُنیوی معاملات کا ادھورا پن ایک دوسری دنیا کا متقاضی ہے

اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾

(النحل)

’’تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے‘ تو وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔‘‘

یہاں اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں آخرت کا یقین نہیں ہے وہ حق بات کو قبول کرنے سے کیوں جھجکتے ہیں اور ان کے اندر استکبار کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص فطرتِ سلیمہ کا مالک ہے اس کے اندر اچھائی اور برائی کی تمیز فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس کا دل اس حقیقت کا قائل ہوتا ہے کہ اچھائی کا اچھا بدلہ ملنا چاہیے اور برائی کا برا ع ’’گندم از گندم بروید‘ جو ز جو!‘‘

یہی فلسفہ یا تصور منطقی طور پر ایمان بالآخرت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مگر دنیا میں جب پوری طرح نیکی کی جزا اور برائی کی سزا ملتی ہوئی نظر نہیں آتی تو ایک صاحبِ شعور انسان لازماً سوچتا ہے کہ اعمال اور اس کے نتائج کے اعتبار سے دنیوی زندگی ادھوری ہے اور یہ کہ اس دنیا میں انصاف کی فراہمی کما حقہ ممکن ہی نہیں۔ مثلاً اگر ایک ستر سالہ بوڑھا ایک نوجوان کو قتل کر دے تو اس دنیا کا قانون اسے کیا سزا دے گا؟ ویسے تو یہاں انصاف تک پہنچنے کے لیے بہت سے کٹھن مراحل طے کرنے پڑتے ہیں‘ لیکن اگر یہ تمام مراحل طے کر کے انصاف مل بھی جائے تو قانون زیادہ سے زیادہ اس بوڑھے کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ لیکن کیا اس بوڑھے کی جان واقعی اس نوجوان مقتول کی جان کے برابر ہے؟ نہیں‘ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ نوجوان تو اپنے خاندان کا واحد سہارا تھا‘ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہوئے‘ ایک نوجوان عورت بیوہ ہوئی‘ خاندان کا معاشی سہارا چھن گیا۔ اس طرح اس کے لواحقین اور خاندان کے لیے اس قتل کے اثرات کتنے گھمبیر ہوں گے اور کہاں کہاں تک پہنچیں گے‘ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ دوسری طرف وہ بوڑھا شخص جو اپنی طبعی عمر گزار چکا ہے‘ جس کے بچے خود مختار زندگیاں گزار رہے ہیں‘ اور جس کی کوئی معاشی ذمہ داری بھی نہیں ہے‘ اس کے پھانسی پر چڑھ جانے سے اس کے پس ماندگان پر ویسے اثرات مرتب نہیں ہوں گے جیسے اس نوجوان کی جان جانے سے اس کے پس ماندگان پر ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں دنیا کا کوئی قانون مظلوم کو پورا پورا بدلہ دے ہی نہیں سکتا۔ ایسے حقائق و واقعات عقلی اور منطقی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ یہ دُنیا نامکمل ہے۔ اس دنیا کے معاملات اور افعال کا ادھورا پن ایک دوسری دنیا کا تقاضا کرتا ہے جس میں یہاں کے تشنۂ تکمیل رہ جانے والے معاملات پورے انصاف کے ساتھ اپنے اپنے منطقی انجام کو پہنچیں۔ اب ایک ایسا شخص جو فطرتِ سلیمہ کا مالک ہے اور جس کے شعور میں نیکی اور بدی کا ایک واضح اور غیر مبہم تصور موجود ہے‘ وہ لازمی طور پر اپنی فطرت کی راہنمائی کے ذریعے سے آخرت کے بارے میں مذکورہ منطقی نتیجے پر پہنچے گا اور پھر وہ قرآن حکیم کے تصورِ آخرت کو قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرے گا‘ مگر اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جس کے شعور میں نیکی اور بدی کا واضح تصور موجود نہیں‘ وہ قرآن حکیم کے تصورِ آخرت پر دل سے یقین نہیں رکھتا۔ ایسا شخص فکرِ آخرت سے بے نیاز ہو کر غرور اور تکبر میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کا دل پیغامِ حق کو قبول کرنے سے بھی منکر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنۡ فَیَکُوۡنُ اور تخلیقِ کائنات کا واقعہ

اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۰﴾ (النحل)

''ہمارا قول تو کسی چیز کے بارے میں بس یہ ہوتا ہے' جب ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں کہ ہم فرماتے ہیں اُسے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

یہاں اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ حکم عالمِ امر کے بارے میں ہے' جبکہ عالمِ خلق میں یوں نہیں ہوتا (عالمِ امر اور عالمِ خلق کے بارے میں وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴)۔ عالمِ امر میں کسی واقعے یا کسی چیز کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسباب' وسائل اور وقت درکار نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ ارادہ فرما کر کُنۡ فرماتے ہیں تو وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ عالمِ خلق میں بھی کُلّی اختیار تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر اس عالم کو عام طبعی قوانین کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ چنانچہ عالمِ خلق میں کسی چیز کو وجود میں آنے اور مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے اسباب' وسائل اور وقت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ یہ کائنات اپنے تمام طبعی موجودات کے ساتھ عالمِ خلق کا اظہار ہے۔ آیت زیر نظر کے موضوع کی مناسبت سے یہاں میں کائنات کی تخلیق کے آغاز سے متعلق اپنی سوچ اور فکر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

کائنات کی تخلیق کے بارے میں ایک طرف تو پرانے فلسفیانہ تصورات ہیں اور دوسری طرف جدید سائنسی نظریات (theories)۔ فلسفیانہ تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وجودِ باری تعالیٰ سے عقلِ اوّل وجود میں آئی۔ عقلِ اوّل سے فلکِ اوّل اور پھر فلکِ اوّل سے فلکِ ثانی وغیرہ۔ یہ دراصل مشّائین کے خیالات ہیں جو ارسطو اور اس کے شاگردوں کے نظریات کے ساتھ دنیا میں پھیلے اور مسلمانوں میں بھی بہت سے متکلمین ان سے متاثر ہوئے۔ بہرحال جدید سائنسی انکشافات کے ذریعے ان میں سے کسی بھی نظریے کی کہیں کوئی تائید و تصدیق نہیں ہوئی۔

دوسری طرف جدید فزکس کے میدان میں اعلیٰ علمی سطح پر اس سلسلے میں جتنے بھی نظریات (theories) ہیں اُن میں ''عظیم دھماکے'' (Big Bang) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت Big Bang کے نتیجے میں انتہائی شدید درجۂ حرارت کے حامل بے شمار ذرات وجود میں آئے۔ یہ ذرات تیزی سے حرکت کرتے ہوئے مختلف forms میں اکٹھے ہوئے تو کہکشائیں (galaxies) وجود میں آئیں اور چھوٹے بڑے بے شمار ستاروں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ انہی ستاروں میں ایک ستارہ ہمارا سورج بھی تھا' جس کے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں اس کے سیارے (planets) وجود میں آئے۔ سورج کے ان سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری زمین ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوتی رہی اور بالآخر اس پر نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لیے سازگار ماحول وجود میں آیا۔ آج کی سائنس فی الحال ''بگ بینگ'' سے آگے کوئی نظریہ قائم کرنے سے قاصر ہے۔ اس نظریے سے جو معلومات سائنس نے اخذ کی ہیں وہ ان تمام حقائق کے ساتھ مطابقت (corroboration) رکھتی ہیں جن کا علم اس موضوع پر ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ اس سے پہلے مادے کے بارے میں سائنس قانون بقائے مادہ

(Law of conservation of mass) کی قائل تھی کہ مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا' مگر نئے نظریے کو اپنا کر سائنس نے نہ صرف بگ بینگ کو کائنات کا نقطہ آغاز تسلیم کر لیا ہے بلکہ یہ بھی مان لیا ہے کہ مادہ ایک خاص وقت تک کے لیے ہے اور ایک خاص وقت کے بعد ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک کائنات کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں میری اپنی سوچ کا تعلق ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے ایک امر ''کُن'' سے ہوئی (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے' نہ کہ اُس کی ذات سے)۔ پھر اس امر ''کن'' کا ظہور ایک خنک نور یا ٹھنڈی روشنی کی صورت میں ہوا (یہ خنک نور حرفِ کُن کا ظہور تھا نہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا)۔ اس روشنی میں حرارت نہیں تھی' گویا یہ مادی روشنی (material light) کے وجود میں آنے سے پہلے کا دور تھا۔ آج جس روشنی کو ہم دیکھتے یا پہچانتے ہیں اس میں حرارت ہوتی ہے اور اسی حرارت کی وجہ سے یہ material light ہے۔ امر ''کُن'' سے ظہور پانے والے اس خنک نور سے پہلے مرحلے پر ملائکہ کی پیدائش ہوئی۔ جیسے کہ مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے حدیث مروی ہے کہ ((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ)) ''اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نور سے پیدا کیا''۔ اسی نور سے انسانی ارواح پیدا کی گئیں' اور سب سے پہلے روحِ محمدی ﷺ پیدا کی گئی' جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِيْ))[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا۔ ''نُوْرِیْ'' اور ''رُوْحِیْ'' گویا دو مترادف الفاظ ہیں' کیونکہ روح کا تعلق بھی نور سے ہے۔ بہرحال کائنات کی تخلیق کے مرحلہ اول میں فرشتوں اور انسانی ارواح کی تخلیق ہوئی۔

اس کے بعد کسی مرحلے پر اس خنک نور میں کسی نوعیت کا زوردار دھماکہ (explosion) ہوا جس کو آج کی سائنس ''بگ بینگ'' کے نام سے پہچانتی ہے۔ اس دھماکے کے نتیجے میں حرارت کا وہ گولا وجود میں آیا' جو بہت چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھا۔ ان ذرات کا درجہ حرارت ناقابلِ تصور حد تک زیادہ تھا۔ یہ گویا طبعی دنیا (Physical World) کا نقطہ آغاز تھا۔ اسی دور میں اس آگ کی لپٹ سے جنات پیدا کیے گئے اور انہی انتہائی گرم ذرات سے کہکشائیں' ستارے اور سیارے وجود میں آئے۔

ان سیاروں میں سے ایک سیارہ یا کُرّہ ہماری زمین ہے جو ابتدا میں انتہائی گرم تھی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے پر اس کے اندر سے بخارات نکلے جو اس کے گرد ایک ہالے کی شکل میں جمع ہو گئے۔ ان بخارات سے پانی وجود میں آیا جو ہزارہا برس تک زمین پر بارش کی صورت میں برستا رہا۔ اس کے نتیجے میں تمام روئے زمین پر ہر طرف پانی ہی پانی پھیل گیا۔ اُس وقت تک زمین پر پانی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہی وہ دور تھا جس کا ذکر قرآن حکیم میں

---

(۱) اس روایت کو امام سیوطیؒ نے شرح المواقف میں نقل کیا ہے۔ محدثین کی تحقیق کے مطابق یہ حدیث موضوع ہے۔ تاہم اس کو استشہاداً ذکر کرنے والوں میں بڑے بڑے علماء شامل ہیں۔ مثلاً علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اور مُلّا علی قاری نے المرقاۃ میں اسے ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا استدلال بہرحال صحیح حدیث ((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ)) سے ہے اور یہ حدیث محض استشہاداً بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ شاید اس حدیث کے موضوع ہونے سے واقف نہیں تھے' لہٰذا حاشیہ میں تصریح کرنا ضروری سمجھا گیا۔ (ادارہ)

بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ (ھود: ۷) ''اور اُس کا عرش (اُس وقت) پانی پر تھا''۔ پھر زمین جب مزید ٹھنڈا ہونے پر سکڑی تو اس کی سطح پر نشیب و فراز نمودار ہوئے۔ کہیں پہاڑ وجود میں آئے تو کہیں سمندر۔ اس کے بعد نباتاتی اور حیوانی حیات کا آغاز ہوا۔ اس حیات کے ارتقاء کے بلند ترین مرحلے پر انسان کی تخلیق ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کی روح ان کے وجود کو سونپی گئی۔ حضرت آدمؑ کی تاجپوشی کا یہی واقعہ ہے جہاں سے قرآن حکیم آدمؑ کی تخلیق کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا اعلیٰ ترین شاہکار بھی ہے اور اس پوری کائنات کی تخلیق کا اصل مقصود و مطلوب بھی۔

یہاں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیں کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف' آیت ۵۴) بالکل الگ الگ نہیں ہیں۔ یعنی یوں نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں تک تو عالم خلق ہے اور یہاں سے آگے عالمِ امر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ یہ دونوں عالم ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط اور باہم گندھے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ دنیا عالم خلق ہے' لیکن اس میں تمام انسانوں کی ارواح بھی موجود ہیں جن کا تعلق عالمِ امر سے ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵) ۔سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت واضح کرتی ہے کہ روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کی ارواح کو فرشتوں کے طبقۂ اسفل میں شامل کر لیتے ہیں' چنانچہ یہ نیک ارواح ان فرشتوں کے ساتھ دنیا میں سرگرمِ عمل رہتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ میں مصروف ہیں۔ مطلب یہ کہ فرشتے جو کہ عالم امر کی مخلوق ہیں وہ بھی یہاں عالم خلق میں ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ دو دو فرشتے تو ہم میں سے ہر انسان کے ساتھ بطور نگران مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف امور کے حوالے سے دنیا میں جگہ جگہ فرشتے موجود ہوتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ بھی فرشتوں کی دنیا میں موجودگی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ)) (صحیح مسلم)

''اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کچھ لوگ کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جمع نہیں ہوتے مگر یہ کہ ان کے اوپر سکینت نازل ہوتی ہے' اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے' فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین (ملأ اعلیٰ) میں ان کا ذکر کرتا ہے۔''

چنانچہ ارواح' فرشتے اور وحی تینوں کا تعلق اگرچہ عالم امر سے ہے مگر ان کا عمل دخل عالم خلق میں بھی ہے۔ اس طرح عالمِ خلق اور عالمِ امر کو بالکل الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدمؑ کے اس فلسفہ کو بہت خوبصورتی سے واضح کرتا ہے:

ہر دو عالم خاک شُد تا بست نقشِ آدمی اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

مرزا عبدالقادر بیدلؔ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے عظیم فلسفی اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا شمار دنیا کے چوٹی کے فلسفیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے سامنے مرزا غالب بھی پانی بھرتے اور ان کی طرز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے نظر آتے ہیں:۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے!

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مرزا بیدلؔ کے مندرجہ بالا شعر کی وضاحت ضروری ہے۔ اس شعر میں وہ فرماتے ہیں ''ہر دو عالم خاک شُد'' یعنی دونوں عالم خاک ہو گئے۔ شاعر کے اپنے ذہن میں اس کی وضاحت کیا تھی اس کے بارے میں تو شاعر خود جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ —— لیکن میں اس کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر کو تنزّل کے مختلف مراحل سے گزار کر عالمِ خلق کی شکل دی۔ پھر اس کے مزید تنزلات کے نتیجے میں زمین (مٹی) پیدا کی گئی۔ گویا دونوں جہانوں نے خاک کی صورت اختیار کر لی' تب جا کر کہیں حیاتِ ارضی کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر اس سلسلے میں ارتقاء کا وہ بلند ترین مرحلہ آیا: ''تا بست نقشِ آدمی!'' جب آدمی کا نقش بننا شروع ہوا۔

دوسرے مصرعے میں (اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!) ''نیست'' کے فلسفے کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ''وحدت الوجود'' کے فلسفے کے مطابق حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے' باقی جو کچھ بھی ہمیں نظر آتا ہے اس میں سے کسی چیز کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کائنات کی ہر چیز ''نیست'' ہے ''ہست'' نہیں ہے:

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَال اَوْ عُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَال

یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کے علاوہ جو جو وجود بھی نظر آتے ہیں وہ وہم ہیں یا خیالی تصویریں۔ اس طرح یہ تمام عالم گویا ''نیست'' ہے اور اس عالمِ نیست کی ''بہار'' انسان ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ﴾ (ص: ۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک ہاتھ گویا عالمِ امر اور دوسرا ہاتھ عالم خلق ہے۔ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عملِ تخلیق کا کلائمکس' مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ ہے۔ چنانچہ مرزا بیدل کے مذکورہ شعر کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ (اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!) اے انسان! اے اس عالمِ نیستی کی بہار! ذرا اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانو! تمہیں وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق کو نہ جانے تنزلات کی کن کن منازل سے نیچے اُتار کر خاک کیا' تب کہیں جا کر تمہارا نقش بنا۔

اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان کرنے کی ممانعت

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل)

''تو اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کیا کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہاں اس سورت (سورۃ النحل) کی آیت ۶۰ کے یہ الفاظ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ ''اور اللہ کی مثال سب سے بلند ہے''۔ اس جملے کا ترجمہ بالعموم یوں کیا جاتا ہے: ''اللہ کی صفت بہت بلند ہے'' یا ''اللہ کی شان بہت بلند ہے''۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مثال بیان نہیں کی جاسکتی۔ واضح رہے کہ انسانی سطح پر بات سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ نہ کچھ تمثیلی الفاظ کا استعمال کرنا اگرچہ ہماری مجبوری ہے (مثلاً اللہ کا چہرہ' اللہ کا ہاتھ' اللہ کا تخت' اللہ کی کرسی' اللہ کا عرش وغیرہ) لیکن ایسے الفاظ سے ہم نہ تو حقیقت کا اظہار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے افعال کی حقیقت کو جان سکتے ہیں۔ اسی لیے منع کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان نہ کیا کرو۔ اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ انسان اگر اس ہستی کے لیے کوئی مثال لائے گا تو اس عالم خلق ہی سے لائے گا' جس کی ہر چیز محدود ہے۔ یا پھر ایسی کسی مثال کا کوئی تصور انسان اپنے ذہن میں تخلیق کرے گا' جبکہ انسانی سوچ' قوتِ متخیلہ اور تصورات بھی سب محدود ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ذات مطلق (Absolute) ہے اور اس کی صفات بھی مطلق ہیں۔ چنانچہ انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی مطلق ہستی کے لیے کوئی مثال بیان کر سکے۔ اسی لیے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۱ میں دوٹوک انداز میں فرما دیا گیا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کہ اس کی مثال کی سی بھی کوئی شے موجود نہیں۔

ایک آیت —— چھ احکام

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل)

''یقیناً اللہ حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا اور قرابت داروں کو (ان کے حقوق) ادا کرنے کا' اور وہ روکتا ہے بے حیائی' برائی اور سرکشی سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔''

یہ آیت اکثر جمعۃ المبارک کے خطبات میں شامل کی جاتی ہے۔ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے انداز میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین ہی چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔ پہلا حکم عدل کا ہے اور دوسرا احسان کا۔ عدل تو یہ ہے کہ جس کا جس قدر حق ہے عین اسی قدر اسے دے دیا جائے' لیکن احسان ایک ایسا عمل ہے جو عدل سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ یعنی احسان یہ ہے کہ آپ کسی کو اس کے حق سے زیادہ دیں اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ محسنین کو محبوب رکھتا ہے۔ تیسرا حکم قرابت داروں کے حقوق کا خیال رکھنے کے بارے میں ہے' یعنی ان سے حسنِ سلوک سے پیش آنا' صلہ رحمی کے تقاضے پورے کرنا اور انفاقِ مال کے حوالے سے ان کو ترجیح دینا۔ یہ تین احکام اُن اعمال کے بارے میں ہیں جو ایک اچھے معاشرے کی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

جن چیزوں سے یہاں منع فرمایا گیا ہے ان میں سب سے پہلے بے حیائی ہے۔ حیا گویا انسان اور ہر برے کام کے درمیان ایک پردہ ہے۔ جب تک یہ پردہ قائم رہتا ہے انسان عملی طور پر برائی سے بچا رہتا ہے' اور جب یہ پردہ اُٹھ جاتا ہے تو پھر انسان بے شرم ہو کر آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ع ''بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!'' کا مصداق بن کر جو جی میں آتا ہے کرتا پھرتا ہے۔ بے حیائی کے بعد اس آیت میں منکر سے منع کیا گیا ہے۔ منکر ہر وہ کام ہے جس کے برے ہونے پر انسان کی فطرت گواہی دے۔ تیسرا ناپسندیدہ عمل یا جذبہ جس کا یہاں ذکر آیا ہے وہ البغی یعنی سرکشی ہے۔ یہ سرکشی اگر اللہ تعالیٰ کے خلاف ہو تو بغاوت یعنی کفر ہے' اور اگر یہ انسانوں کے خلاف ہو تو اسے ''عُدوان'' کہا جاتا ہے' جس کے معنی ظلم اور زیادتی کے ہیں۔ بہر حال ان دونوں سطحوں پر یہ انتہائی ناپسندیدہ اور مذموم جذبہ ہے۔

ایک عبرت آموز تمثیل

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

(النحل)

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ ''اور اللہ نے مثال بیان کی ہے ایک بستی کی جو بالکل امن و اطمینان کی حالت میں تھی' آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بافراغت ہر طرف سے''

﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''تو اُس نے ناشکری کی اللہ کی نعمتوں کی' تو اسے چکھا (پہنا) دیا اللہ نے لباس بھوک اور خوف کا' اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں۔''

اس تمثیل کے بارے میں مفسرین کے ہاں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ ایک عام تمثیل ہے' یعنی اس کا تعلق کسی خاص بستی سے نہیں ہے۔ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ قومِ سبا کی مثال ہے جس کے بارے میں تفصیل سورۂ سبا میں آئی ہے۔ ایک تیسری رائے یہ ہے کہ اس مثال کے آئینے میں مکہ اور اہل مکہ کا ذکر ہے کہ یہ شہر امن و سکون کا گہوارہ تھا۔ تجارتی سرگرمیوں اور حج و عمرہ کے اجتماعات کے باعث یہاں خوشحالی اور فارغ البالی کا ماحول تھا۔ دنیا بھر سے انواع و اقسام کا رزق فراوانی سے اس شہر کی طرف کھنچا چلا آتا تھا' مگر حضور ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ؐ کی دعوت کا انکار کرنے کی پاداش میں یہاں کے باشندوں پر قحط کا عذاب مسلّط کر دیا گیا۔ مکہ میں یہ قحط اسی قانونِ خداوندی کے تحت آیا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت ۴۲ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۹۴ میں ہوا ہے۔ اس اصول یا قانون کے تحت ہر رسولؑ کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم پر چھوٹے

چھوٹے عذاب آتے ہیں تاکہ انہیں خوابِ غفلت سے جاگنے اور سنبھلنے کا موقع مل جائے اور وہ اپنے رسول کی دعوت پر ایمان لا کر بڑے عذاب سے بچ جائیں۔

میری رائے اس ضمن میں یہ ہے کہ تاویلِ خاص کے اعتبار سے اس آیت میں یقیناً مکہ ہی کی طرف اشارہ ہے' مگر اس کے ساتھ اس تمثیل کی عمومی حیثیت بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ کوئی بستی بھی اس قانونِ خداوندی کی زد میں آ سکتی ہے۔ جیسے پاکستان کے عروس البلاد کراچی کے حالات کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب کراچی میں امن و امان' وسائلِ رزق کی فراوانی اور خوشحالی کی کیفیت ملک بھر کے لوگوں کے لیے باعثِ کشش تھی' مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر وہی نقشہ پیش کرنے لگا جس کی جھلک اس آیت میں دکھائی گئی ہے۔ یعنی کفرانِ نعمت کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس کے باشندوں کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔

دعوت الی الحق کے تین مدارج

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (النحل)

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ ''آپ دعوت دیجیے اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ''

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ ''اور ان سے بحث کیجیے بہت اچھے طریقے سے۔''

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝﴾ ''یقیناً آپ کا رب خوب واقف ہے اُن سے جو اُس کے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے اُن کو بھی جو راہِ ہدایت پر ہیں۔''

اپنے موضوع کے حوالے سے یہ بہت عظیم آیت ہے۔ اس میں انسانی معاشرے کے اندر انسانوں کی تین بنیادی اقسام کے حوالے سے دعوتِ دین کے تین مدارج بیان کیے گئے ہیں' مگر عام طور پر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس پہلو کو اجاگر نہیں کیا جاتا۔

کسی بھی معاشرے میں علم و دانش کی بلند ترین سطح پر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اس معاشرے کا دانشور طبقہ (intelligentsia) یا ذہین اقلیت (intellectual minority) کہا جاتا ہے۔ اس طبقے کی حیثیت اس معاشرے یا قوم کے دماغ کی سی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے بہت چھوٹی اقلیت پر مشتمل ہوتے ہیں مگر کسی معاشرے کی مجموعی سوچ اور اس کے مزاج کا رخ متعین کرنے میں اُن کا کردار یا حصہ فیصلہ کُن حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو جذباتی تقاریر اور خوش کن وعظ متاثر نہیں کر سکتے' بلکہ ایسے لوگ کسی سوچ یا نظریے کو قبول کرتے ہیں تو مصدّقہ علمی و منطقی دلائل سے قبول کرتے ہیں اور اگر رد کرتے ہیں تو ایسے ہی ٹھوس دلائل سے

ردّ کرتے ہیں۔

آیت زیرِ نظر میں بیان کردہ دعوت کا پہلا درجہ دراصل ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے اور وہ ہے ''حکمت''۔ یہ علم وعقل کی پختگی کی بہت اعلیٰ سطح ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۹ میں اللہ تعالیٰ نے حکمت کو 'خیرِ کثیر' قرار دیا ہے: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ''اور جسے حکمت دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا''۔ قرآن حکیم میں تین مقامات (البقرۃ:۱۲۹' آلِ عمران:۱۶۴ اور الجمعہ:۲) پر اِن مراحل اور درجات کا ذکر کیا گیا ہے جن کے تحت حضور ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی۔ ان میں بلند ترین مرحلہ یا درجہ حکمت کا ہے۔ حکمت کے سبب کسی انسان کی سوچ اور علم میں پختگی آتی ہے' اس کی گفتگو میں جامعیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی تجزیاتی اہلیت بہتر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ کسی سے بات کرتے ہوئے یا کسی کو دین کی دعوت دیتے ہوئے معروضی صورتِ حال' مخاطب کے ذہنی رجحان اور ترجیحات کا درست تجزیہ کرنے کے بعد اپنی گفتگو کے نکات اور دلائل کو ترتیب دیتا ہے۔ اسے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ کس وقت اسے کونسی بات کرنی ہے اور کس انداز میں کرنی ہے۔ اس کی گفتگو میں کون سا نکتہ بنیادی حیثیت کا درجہ رکھتا ہے اور کون سی دلیل ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔ بہرحال کسی بھی معاشرے کے وہ لوگ جو علم' عقل اور شعور میں غیر معمولی اہلیت کے حامل ہوں' اُن کو دعوت دینے کے لیے کسی ایسے داعی کی ضرورت ہے جو علم وحکمت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور ان سے برابری کی سطح پر کھڑے ہو کر بات کر سکے۔ کیونکہ جب قرآن حکیم اپنے مخالفین کو چیلنج کرتا ہے: ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اپنی دلیل لاؤ اگر تم واقعی سچے ہو'' تو ایسی صورت میں مخالفین کو بھی حق ہے کہ وہ بھی دلیل مانگیں اور متعلقہ داعی کا فرض ہے کہ وہ عقل اور منطق کی اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر ان کی تسلی وتشفی کا سامان فراہم کرے۔ لہٰذا آیت زیرِ نظر میں دعوت وتبلیغ کا پہلا درجہ ''حکمت'' بیان کیا گیا ہے جس کا حق ادا کرنے کے لیے داعی کا صاحبِ حکمت ہونا لازمی ہے۔

حکمت کے بعد دعوت کا دوسرا درجہ ''موعظۂ حسنہ'' کا ہے' یعنی اچھا اور خوبصورت وعظ۔ یہ درجہ عوام الناس کے لیے ہے۔ کسی بھی معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کے ذہنوں میں عقل اور منطق کی چھلنیاں نہیں لگی ہوتیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے منطقی مباحث اور فلسفیانہ تقاریر ''تکلیف مالا یطاق'' کے مترادف ہیں۔ ان کے دل کھلی کتاب اور ذہن صاف سلیٹ کی مانند ہوتے ہیں' آپ ان پر جو لکھنا چاہیں لکھ لیں۔ ایسے لوگوں کو دعوت دینے کے لیے ان کے جذبات کو اپیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ پُرتاثیر وعظ اور خلوص و ہمدردی سے کی گئی بات سے بآسانی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ایک مخلص داعی کو وہ بہت جلد پہچان لیتے ہیں کہ وہ ہم پر اپنے علم کا رعب نہیں ڈالنا چاہتا' ہم پر دھونس نہیں جمانا چاہتا' وہ ہم سے اظہارِ نفرت نہیں کر رہا' ہماری تحقیر نہیں کر رہا' بلکہ اس کے پیش نظر ہماری خیر خواہی ہے۔ چنانچہ ایک مخلص داعی کی زبان سے نکلی ہوئی بات ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق سیدھی ان کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔

دعوتِ حق کا تیسرا درجہ ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ اُن عناصر کے لیے ہے جو کسی معاشرے میں خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کے مشن کے علمبردار ہوتے ہیں۔ آج کل بہت سی تنظیموں کی طرف سے باقاعدہ پیشہ وارانہ تربیت سے ایسے لوگ تیار کر کے میدان میں اتارے جاتے ہیں۔ یہ لوگ منطق و دلیل یا خلوص و اخلاص سے کی گئی بات کو کسی قیمت پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہر حال میں اپنے نظریے اور موقف کی طرف داری کرنا ان لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے، چاہے وہ کسی علمی و عقلی دلیل سے ہو یا ہٹ دھرمی سے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو مسکت جواب دے کر لاجواب کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بعض اوقات عوامی سطح کے اجتماعات میں اُن کی بحث برائے بحث کی پالیسی بہت خطرناک ہو سکتی ہے، کیونکہ ایسی صورت حال میں عوام الناس کے ذہن منفی طور پر بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بحث و مباحثہ کے عمل کو ہمارے ہاں ''مناظرہ'' کہا جاتا ہے، جبکہ قرآن حکیم نے اسے ''مجادلہ'' کا نام دیا ہے۔ بہر حال قرآن حکیم نے اپنے پیروکاروں کے لیے اس درجہ کے لیے بھی بہت اعلیٰ معیار مقرر کیا ہے کہ مخالفین سے مجادلہ بھی ہو تو احسن انداز میں ہو۔ مثلاً اگر آپ کا مخالف کسی طور سے گھٹیا پن کا مظاہرہ بھی کرے تب بھی آپ کو جواب میں اچھے اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں، جیسا کہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۸ میں حکم دیا گیا: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ﴾ ''اور جن کو یہ (مشرک) اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں برا بھلا نہ کہو کہ کہیں یہ بھی بغیر سوچے سمجھے مخالفت میں اللہ کو برا بھلا کہنے لگ جائیں''۔ آج کل مختلف مذاہب کی تنظیمیں (مثلاً عیسائی مشنریز) باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اسلام کو ہدف بنانے کے لیے کچھ خاص موضوعات اور مسائل کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں مخصوص موضوعات و مسائل پر مناظرے کرنے کے لیے باقاعدہ ٹریننگ کے ذریعے اسپیشلسٹ (specialist) تیار کرتی ہیں۔ ایسے پیشہ وارانہ لوگوں کے مقابلے اور مجادلے کے لیے داعیانِ حق کو بھی خصوصی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کے آئینے میں اُمّتِ مُسلمہ کے حالات کی تصویر

وَقَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا۝ۙ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۝ (بنی اسرائیل)

وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًاؕ (بنی اسرائیل)

آیت ۴ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝۴ ''اور ہم نے متنبہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔''

یعنی تم پر دو ادوار ایسے آئیں گے کہ تم زمین میں سرکشی کرو گے‘ فساد برپا کرو گے‘ دین سے دور ہو جاؤ گے‘ لہو ولعب میں مبتلا ہو جاؤ گے‘ اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر عذاب کے کوڑے برسیں گے۔

یہاں پر بین السطور یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ایک بہتر دور بھی آیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان کے اس اچھے دور کے بارے میں کچھ تفصیلات سورۃ البقرہ میں بھی ملتی ہیں۔ قارئین کی یاددہانی کے لیے درج ذیل سطور میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۴۰۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلے تھے۔ صحرائے سینا میں جبل طور کے پاس پڑاؤ کے زمانے میں آپ کو تورات عطا کی گئی۔ وہاں سے آپ کو شمال مشرق کی طرف کوچ کرنے اور فلسطین پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا گیا۔ جہاد کے اس حکم سے انکار کی پاداش میں بنی اسرائیل کو صحرا نوردی کی سزا ملی۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ صحرا نوردی کے دوران پروان چڑھنے والی نسل بہادر اور جفاکش تھی۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد کیا جس کے نتیجے میں فلسطین فتح ہو گیا۔ فلسطین کا جو شہر سب سے پہلے فتح ہوا اس کا نام اریحا (Jericho) تھا۔ فلسطین کی فتح کے بعد بنی اسرائیل سے ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ وہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت بنانے کے بجائے یہ علاقہ ان کے بارہ قبیلوں نے آپس میں بانٹ لیا اور ہر قبیلے نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں نہ صرف بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں بہت کمزور تھیں بلکہ بہت جلد انہوں نے آپس میں بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا‘ جس کے نتیجے میں ان کے زیر تسلّط علاقے بہت جلد انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے شام اور اُردن کے ہمسایہ علاقوں میں بسنے والی مشرک اقوام نے ان پر تسلّط حاصل کر کے ان کی بیشتر آبادی کو اس علاقے سے نکال باہر کیا۔

اس حالت کو پہنچنے پر انہوں نے اپنے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اُن کے لیے ایک بادشاہ یا سپہ سالار مقرر کر دیں تاکہ اس کی قیادت میں تمام قبیلے اکٹھے ہو کر جہاد کر سکیں۔ اس مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت طالوت کو اُن کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ حضرت طالوت نے دشمن فوج کے خلاف لشکر کشی کی۔ اس جنگ میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی شامل تھے۔ آپ نے دشمن فوج کے سپہ سالار جالوت کو قتل کر دیا‘ جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو فتح نصیب ہوئی اور وہ اس علاقے میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب

ہو گئے۔ حضرت طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام ان کے جانشین ہوئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد آپؑ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے۔

حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے لے کر طالوت اور جالوت کی جنگ تک تین سو سال کا وقفہ ہے۔ حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کا دورِ اقتدار تقریباً ایک سو سال کے عرصے پر محیط تھا۔ سولہ برس تک حضرت طالوت نے حکومت کی' اس کے بعد چالیس برس تک حضرت داؤدؑ اور پھر چالیس برس تک ہی حضرت سلیمانؑ برسرِ اقتدار رہے۔ یہ دور گویا بنی اسرائیل کی خلافتِ راشدہ کا دور تھا جو ہمارے دورِ خلافتِ راشدہ سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ اگرچہ ان کی پہلی تین خلافتیں ایک سو برس کے عرصے پر محیط تھیں اور ہماری امت کی پہلی تین خلافتوں کا عرصہ چوبیس برس تھا' لیکن جس طرح اُن کے پہلے خلیفہ کا دورِ اقتدار مختصر اور بعد کے دونوں خلفاء کا دور نسبتاً طویل تھا' اسی طرح ہمارے ہاں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت مختصر' جبکہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا دور نسبتاً طویل تھا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبول نہیں کیا تھا' جس کی وجہ سے شام اور مصر کے علاقے علیحدہ ہو گئے تھے' بالکل اسی طرح بنی اسرائیل کی مملکت بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد آپؑ کے دو بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ شمالی مملکت کا نام اسرائیل رکھا گیا جس کا دار الخلافہ سامریہ تھا' جبکہ جنوبی مملکت کا نام ''یہودیہ'' تھا اور اس کا دار الخلافہ یروشلم تھا۔

اس عظیم سلطنت کی تقسیم کے بعد بھی مادی اعتبار سے ایک عرصے تک بنی اسرائیل کا عروج برقرار رہا' لیکن رفتہ رفتہ عوام میں مشرکانہ عقائد' اوہام پرستی اور ہوسِ دنیا جیسی نظریاتی و اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی گئیں اور احکامِ شریعت کا استہزا ان کا اجتماعی وطیرہ بن گیا۔ چنانچہ اخلاق و کردار کا یہ زوال منطقی طور پر ان کے مادی زوال پر منتج ہوا۔ بنی اسرائیل کا یہ عہدِ زوال بھی تقریباً تین سو سال ہی کے عرصے میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ سب سے پہلے آشوریوں کے ہاتھوں ان کی شمالی سلطنت ''اسرائیل'' (سات آٹھ سو قبل مسیح کے لگ بھگ) تباہ ہوئی۔ اس کے بعد ۵۸۷ قبل مسیح میں عراق کے نمرود بخت نصر (Nebukadnezar) نے ان کی جنوبی سلطنت ''یہودیہ'' پر حملہ کیا اور پوری سلطنت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یروشلم کو اس طرح تباہ و برباد کیا گیا کہ کسی عمارت کی دو اینٹیں بھی سلامت نہ رہیں۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں۔ اس دوران بخت نصر نے چھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا جبکہ چھ لاکھ مردوں' عورتوں اور بچوں کو جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا' جہاں یہ لوگ سوا سو سال تک اسیری (Captivity) کی حالت میں رہے۔ ذلت و رسوائی کے اعتبار سے یہ ان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔

بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز حضرت عزیر علیہ السلام کی اصلاحی کوششوں سے ہوا۔ آپؑ کو بنی اسرائیل کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے نقیب کی حیثیت حاصل ہے۔ ۵۳۹ ق م میں ایران کے بادشاہ کیخورس (Cyrus) یا ذوالقرنین نے عراق (بابل) کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے

بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ ان کی فلسطین میں دوبارہ آبادکاری کا یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ ۴۵۸ ق م میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ یروشلم پہنچے اور اس شہر کو آباد کرنا شروع کیا۔ اسی دوران ہیکل سلیمانی کو بھی ازسرِنو تعمیر کیا گیا۔ اس سے قبل حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سو برس تک سلائے بھی رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سو سال کے لیے موت طاری کر دی تھی۔ سو سال کے بعد انہیں زندہ کیا۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۹ میں آیا ہے۔ بہرحال حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے توبہ کی منادی کے ذریعے ایک زبردست تجدیدی اور اصلاحی تحریک چلائی جس کے نتیجے میں اس قوم کے نظریات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح ہونا شروع ہوئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے تورات کو بھی یادداشتوں کی مدد سے ازسرِنو مرتب کیا جو بخت نصر کے حملے کے دوران گم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ایرانی سلطنت کے زوال، سکندر مقدونی کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے شدید دھچکا لگا۔ یونانی سپہ سالار انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یونانی فاتحین نے پوری جابرانہ طاقت سے یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنا چاہی، لیکن وہ بنی اسرائیل کو مغلوب نہ کر سکے، بلکہ اس جبر کے ردِعمل کے طور پر ان کے ہاں ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں ''مکابی بغاوت'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت عزیرؑ کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اثر تھا کہ انہوں نے بالآخر یونانیوں کو علاقے سے نکال کر اپنی ایک عظیم آزاد ریاست ''مکابی سلطنت'' کے نام سے قائم کر لی۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج میں قائم ہونے والی یہ سلطنت ۱۷۰ ق م سے لے کر ۶۷ ق م تک پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی۔ مکابی سلطنت اپنے وقت کی معلوم دنیا کے تمام علاقوں پر محیط تھی۔ چنانچہ رقبے کے اعتبار سے یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بھی وسیع تھی۔ اس زمانہ عروج میں ان کی نظریاتی و اخلاقی حالت پھر سے بگڑنے لگی اور رفتہ رفتہ مشرکانہ عقائد سمیت بہت سی اخلاقی برائیاں ان میں پیدا ہوتی گئیں۔ مکابی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج ختم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور اس طرح یہ قوم ایک دفعہ پھر عذابِ خداوندی کی زد میں آ گئی۔

اس مرتبہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر اس طرح مسلط ہوا کہ ان کے ایک گروہ نے رومی فاتح پومپئی کو فلسطین پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے ڈالی۔ چنانچہ پومپئی نے ۶۳ ق م میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقے میں رومی سلطنت کے زیرِ سایہ ایک ذیلی ریاست قائم کر دی۔ یہ ریاست بالآخر ۴۰ ق م میں ہیرودنامی ایک ہوشیار یہودی کے قبضے میں آ گئی۔ یہ شخص تاریخ میں ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی فرماں روائی پورے فلسطین اور شرقِ اردن پر ۴۰ سے ۴ ق م تک رہی۔ اس شخص نے قیصرِ روم کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اس کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ گئی۔ ہیرود اعظم کے بعد اس کی ریاست اس کے تین بیٹوں کے درمیان

تقسیم ہوگئی' لیکن ۶ء میں قیصر آگسٹس نے ہیرود کے بیٹے ارخلاؤس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور ۴۱ء تک وہاں یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے' لیکن یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر آپؑ کی مخالفت کی اور آپؑ کو واجب القتل قرار دے دیا۔ ان لوگوں نے اپنے اس فیصلے کی روشنی میں رومی گورنر پونٹس پیلاطس سے آپؑ کو سزائے موت دلوانے کی کوشش بھی کی' بلکہ اپنے خیال کے مطابق تو انہوں نے آپؑ کو سولی پر چڑھوا ہی دیا۔

۴۱ء میں رومیوں نے ہیرود اعظم کے پوتے ''ہیرود اگر پا'' کو ان تمام علاقوں کا حکمران بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آ کر مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ ان حالات کی وجہ سے کچھ ہی عرصے کے بعد یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہوگئی اور ۶۴ء تا ۶۶ء کے دوران یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دی' جو بالآخر اُن کے عروجِ ثانی کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ یہودیوں کی بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے بالآخر رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی کی اور ۷۰ء میں ٹائٹس (Titus) نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ ہیکل سلیمانی ایک دفعہ پھر مسمار کر دیا گیا۔ جنرل ٹائٹس کے حکم پر شہر میں قتل عام ہوا۔ ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی قتل ہوئے' جبکہ ۶۷ ہزار کو غلام بنالیا گیا۔ اس طرح رومیوں نے پورے شہر میں کوئی متنفس باقی نہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی ارضِ فلسطین سے بنی اسرائیل کا عمل دخل مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے شروع (پورے دو ہزار برس) تک یہ لوگ جلاوطنی اور انتشار (Diaspora) کی حالت میں ہی رہے۔ جنرل ٹائٹس کے ہاتھوں ۷۰ء میں ہیکل سلیمانی مسمار ہوا تو آج تک تعمیر نہ ہو سکا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی پیدائش (۵۷۱ء) کے وقت اسے مسمار ہوئے پانچ سو برس گزر چکے تھے۔

یہ خلاصہ ہے اُس قوم کی داستانِ عبرت کا جو اپنے وقت کی امتِ مسلمہ تھی۔ جس کے اندر چودہ سو برس تک مسلسل نبوت رہی۔ جس کو تین الہامی کتابوں سے نوازا گیا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷﴾ (البقرۃ) ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم لوگوں کو عطا کی اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تمام جہان والوں پر۔''

آخر کار بنی اسرائیل کو اُمتِ مسلمہ کے منصب سے معزول کر کے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت کو اس مسندِ فضیلت پر متمکن کر دیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کو واضح طور پر متنبہ فرمایا تھا کہ تم لوگوں پر بھی عین وہی حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں کو پہلا عروج عربوں کے زیر قیادت نصیب ہوا۔ اس کے بعد جب زوال آیا تو صلیبیوں کی یلغار کی صورت میں ان پر عذاب کے کوڑے برسے۔ پھر تاتاریوں نے ہلاکو خان اور چنگیز خاں کی قیادت میں عالمِ اسلام کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے بعد

قدرت نے عالم اسلام کی قیادت عربوں سے چھین کر انہی تاتاریوں کے ہاتھوں میں دے دی، جنہوں نے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی تاریخی حقیقت کا ذکر کیا ہے: ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے!

چنانچہ ترکوں کی قیادت میں اس اُمت کو ایک دفعہ پھر عروج نصیب ہوا۔ ترکانِ تیموری، ترکانِ صفوی، ترکانِ سلجوقی اور ترکانِ عثمانی نے عظیم الشان حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد اُمتِ مسلمہ پر دوسرا دورِ زوال آیا۔ بنی اسرائیل پر دوسرا دورِ عذاب یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھوں آیا تھا جبکہ اُمتِ مسلمہ پر دوسرا عذاب اقوامِ یورپ کے تسلّط کی صورت میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریز، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور ولندیزی (Dutch) پورے عالمِ اسلام پر قابض ہو گئے۔ اس یلغار کے نتیجے میں بیسویں صدی کے آغاز میں عظیم عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ ان حالات و واقعات کا خلاصہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے آیت زیرِنظر میں فرمایا ہے کہ ہم نے تو پہلے ہی بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کہ تم لوگ اپنی قومی زندگی میں دو دفعہ فساد مچاؤ گے اور سرکشی دکھاؤ گے۔

آیت ۵ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۞۵﴾ ’’پھر جب ان دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آ گیا تو ہم نے تم پر مسلّط کر دیے اپنے سخت جنگجو بندے تو وہ تمہاری آبادیوں میں گھس گئے، اور (یوں ہمارا) جو وعدہ تھا وہ پورا ہو کر رہا۔‘‘

یعنی بنی اسرائیل کے دین سے برگشتہ ہو جانے کے بعد آشوریوں اور عراق کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ان پر عذاب آیا، جس کے نتیجے میں دونوں اسرائیلی سلطنتیں ختم ہو گئیں، یروشلم مکمل طور پر تباہ ہو گیا، ہیکلِ سلیمانی مسمار کر دیا گیا، چھ لاکھ یہودی قتل ہو گئے جبکہ چھ لاکھ کو غلام بنا لیا گیا۔

آیت ۶ ﴿ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ﴾ ’’پھر ہم نے تمہاری باری لوٹائی ان پر‘‘

یعنی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر تمہیں سہارا دیا اور ان پر غلبے کا موقع عطا کر دیا۔ اس سہارے کا باعث ایرانی بادشاہ کیخورس (Cyrus) یا ذوالقرنین بنا۔ اس نے عراق (بابل) پر تسلط حاصل کر لینے کے بعد بنی اسرائیل کو آزاد کر کے واپس یروشلم جانے اور اس شہر کو ایک دفعہ پھر سے آباد کرنے کی اجازت دے دی۔

﴿وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ۞۶﴾ ’’اور ہم نے مدد کی تمہاری مال و دولت اور بیٹوں کے ذریعے سے اور بنا دیا تمہیں کثیر تعداد (والی قوم)۔‘‘

پھر جب تم یروشلم میں دوبارہ آباد ہوئے تو ہم نے تمہیں مال و اولاد میں برکت دی جس کے نتیجے میں تم لوگ خوب پھلے پھولے اور جلد ہی ایک مضبوط قوم بن کر ابھرے۔

آیت ۷ ﴿اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا‌ ؕ﴾ ’’اگر تم نے کوئی بھلائی کی تو خود

اپنے ہی لیے کی' اور اگر کوئی برائی کمائی تو وہ بھی اپنے ہی لیے کمائی۔''

تمہارے نیک اعمال کا فائدہ بھی تمہیں ہوا اور تمہاری برائیوں اور نافرمانیوں کا وبال بھی تم ہی کو بھگتنا پڑا۔ یہ وبال اور اس کے نتائج کا سامنا تمہیں آخرت میں بھی کرنا پڑے گا۔

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ﴾ ''پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا''

جب دوبارہ تم نے اللہ تعالیٰ کے دین سے سرکشی اختیار کی' تمہارے اعتقادات' نظریات اور اخلاق پھر سے مسخ ہو گئے تو وعدے کے عین مطابق تم پر عذاب کے دوسرے مرحلے کا وقت آ پہنچا۔

﴿لِیَسُوۡٓءٗا وُجُوۡہَکُمۡ﴾ ''تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں''

ان الفاظ سے پہلے آیت ۵ کا یہ فقرہ محذوف مانا جائے گا: ﴿بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ﴾۔ اس فقرے کا مفہوم یہاں بھی پایا جاتا ہے' لیکن یہاں دوبارہ اسے دہرایا نہیں گیا۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ ہم نے پھر تم پر اپنے سخت جنگجو بندے مسلط کیے تاکہ وہ تمہارے حلیے بگاڑ دیں۔

﴿وَلِیَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ کَمَا دَخَلُوۡہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ﴾ ''اور وہ داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے کہ داخل ہوئے تھے پہلی مرتبہ''

یہاں اشارہ ہے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کی بارِ دگر بے حرمتی کی طرف۔ جیسے ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا تھا' ویسے ہی رومی جرنیل ٹائیٹس نے ۷۰ء میں ایک دفعہ پھر ان کے تقدس کو پامال کیا۔

﴿وَّلِیُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِیۡرًا ﴿۷﴾﴾ ''اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیں (ہر اُس شے کو) جس کے اوپر بھی انہیں قبضہ حاصل ہو جائے۔''

ان آیات میں بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے نشیب و فراز کی تفصیلات کو سمو دیا گیا ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے دو مرتبہ عروج دیکھا اور دو دفعہ ہی وہ زوال سے دوچار ہوئے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے زمانے میں ان آیات کے نزول کے وقت ان کے دوسرے دورِ زوال کو شروع ہوئے پانچ سو برس ہونے کو آئے تھے۔ اس سیاق و سباق میں انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ:

آیت ۸ ﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ﴾ ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے۔''

اگر تم نے پہلے کی طرح پھر ہماری نافرمانی کی اور احکامِ شریعت سے اعراض کی روش اختیار کی تو ہم بھی اسی طرح پھر تمہیں سزا دیں گے۔

﴿وَجَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ﴿۸﴾﴾ ''اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔''

تمہاری نافرمانیوں کی سزا دنیا میں تو تمہیں ملے گی ہی' جبکہ جہنم کا عذاب اس کے علاوہ ہوگا۔

آیت ۹ ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''

یاد رکھو! اب راہِ ہدایت وہی ہوگی جس کی نشان دہی یہ کتاب کرے گی جسے ہم اپنے آخری رسول ﷺ پر نازل کر رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کے قصرِ رحمت میں داخل ہونے کا ''شاہدرہ'' ایک ہی ہے اور وہ ہے یہ قرآن۔ چنانچہ اب اگر تم اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت میں پناہ لینا چاہتے ہو تو اس قرآن کے راستے سے ہو کر آؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے ایک بار پھر تمہارے لیے کھل جائیں گے اور جو رحمتیں اور برکتیں اس آخری نبی ﷺ کی اُمت کے لیے لکھی گئی ہیں تم بھی ان میں حصہ دار بن جاؤ گے۔

﴿وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝۹﴾ ''اور بشارت دیتا ہے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝۱۰﴾ ''اور یہ کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے آخرت پر' اُن کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے ایک دردناک عذاب۔''

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں اعمال کی خرابی کی بات ہوتی ہے وہاں ایمان بالآخرت کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔

اس رکوع کے حوالے سے یہ نکتہ ہمیں خصوصی طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں بنی اسرائیل کے عروج و زوال کے آئینے میں جو تصویر دکھائی گئی ہے اس میں ہمارے لیے ایک دعوتِ فکر ہے۔ الحمد للہ! آج ہم (امتِ محمد ﷺ) اُمت مسلمہ ہیں' لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک زمانے میں بنی اسرائیل بھی اُمتِ مسلمہ ہی تھے۔ وہ بحیثیت نسل آج بھی ایک قوم کے طور پر موجود ہیں مگر اب انہیں اُمتِ مسلمہ کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ اب ان لوگوں کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی ہے۔ پچھلے دو ہزار برس سے یہ لوگ بہت زیادہ سختیوں کا شکار رہے ہیں۔ ہمیں ان کی قومی تاریخ کے نشیب و فراز کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کون سے عوامل تھے اور ان کے عقائد و اعمال کی وہ کون سی خرابیاں تھیں جن کے باعث وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں مغضوب و معتوب ٹھہرے۔

یہاں دوسرا نکتہ یہ ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ اس وقت دنیا میں سابقہ امتِ مسلمہ اور موجودہ اُمتِ مسلمہ کے درمیان مقابلے کے لیے میدان تیزی سے تیار ہو رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس وقت دو پتنگیں فضا میں تیر رہی ہیں' جن کے درمیان مستقبل میں پیچ پڑنے والا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے انتہائی زوال کو پہنچنے کے بعد بحیثیت ایک قوم کے پچھلے ایک سو سال سے مادی لحاظ سے رو بہ ترقی ہیں۔ ان کی پتنگ ۱۹۱۷ء میں بالفور (Balfor) ڈیکلریشن کی منظوری کے بعد اوپر چڑھنا شروع ہوئی اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نام کی ریاست باقاعدہ معرضِ وجود میں آگئی۔ ۱۹۶۶ء میں اس کی مزید توسیع عمل میں آئی اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے غیر معمولی

اقدامات کیے گئے۔ عرب دنیا کا واحد ملک عراق تھا جس سے اسرائیل کو خطرہ ہو سکتا تھا' اسے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس پورے خطے میں اب کوئی ایسا ملک نہیں جو اسرائیل کی طاقت کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو مسلم دنیا بھی اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد اب بیداری کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ گویا مسلمانوں کے زوال کی انتہا تھی۔ اس کے بعد عالم اسلام میں آزادی کی تحریکیں چلیں اور متعدد مسلم ممالک یورپی اقوام کے تسلّط سے آزاد ہو گئے۔ مزید برآں اُمتِ مسلمہ میں بہت سی احیائی تحریکیں بھی اٹھیں' مثلاً پاک و ہند میں جماعت اسلامی' مصر میں الاخوان المسلمون' ایران میں فدائی تحریک اور انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی وغیرہ' اس طرح امتِ مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کا گویا آغاز ہو چکا ہے۔ چنانچہ پچھلی صدی سے اُمتِ مسلمہ کی صفوں میں زوال اور احیائی عمل پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سابقہ اور موجودہ اُمتِ مسلمہ کی صورت میں دو پتنگیں فضا میں تیر رہی ہیں اور ان کا آپس میں کسی وقت بھی پیچ پڑ سکتا ہے۔

آیت ۱۰۴ ﴿وَّقُلۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ لِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اسۡکُنُوا الۡاَرۡضَ﴾ ''اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم لوگ زمین میں آباد ہو جاؤ''

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ جِئۡنَا بِکُمۡ لَفِیۡفًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''پھر جب آئے گا پچھلے وعدے کا وقت تو ہم لے آئیں گے تم سب کو سمیٹ کر۔''

اکثر و بیشتر مفسّرین نے یہاں وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ سے آخرت یعنی قیامت مراد لی ہے۔ یعنی جب قیامت آئے گی تو تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو گے سب کو اکٹھا کر کے ہم میدانِ حشر میں لے آئیں گے۔ لیکن میرے خیال میں ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جب قیامت کا وقت قریب آئے گا تو بنی اسرائیل کو دنیا بھر کے مختلف علاقوں سے اکٹھا کر کے ایک جگہ جمع کر لیا جائے گا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس کے بعد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلا کر وہ اپنے اس جرم کی مزید توثیق بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قوم کی حیثیت اس قیدی کی سی ہے جس کو اس کے جرم کی سزا سنائی جا چکی ہو' مگر اس سزا کی تعمیل (execution) ابھی باقی ہو۔

اس سورت کے نزول کے وقت بنی اسرائیل کے دورِ انتشار (Diaspora) یعنی فلسطین سے بے دخل ہوئے ساڑھے پانچ سو سال ہو چکے تھے۔ پچھلی صدی تک بھی ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے تھے۔ چونکہ کسی اجتماعی سزا یا عذاب کے لیے ان کا ایک جگہ اکٹھے ہونا ضروری تھا اس لیے قدرت کی طرف سے اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا اور آیت زیر نظر کے الفاظ کے عین مطابق دنیا کے کونے کونے سے تمام یہودیوں کو اکٹھا کر کے یہاں آباد کیا گیا۔ اب اپنے زعم میں تو ان لوگوں نے عظیم تر اسرائیل

(Greater Israel) کا منصوبہ اور نقشہ تیار کر رکھا ہے اور عین ممکن ہے ان کے اس منصوبے پر عمل درآمد بھی ہو جائے‘ مگر بالآخر یہ عظیم تر اسرائیل ان کے لیے عظیم تر قبرستان ثابت ہو گا (واللہ اعلم!)۔ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپؑ ہی کے ہاتھوں یہ قوم اپنے آخری انجام کو پہنچے گی۔

ان تمام تفصیلات سے خصوصی طور پر ان لوگوں کو ضرور آگاہ ہونا چاہیے جو دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ انہیں زمان و مکان کے اعتبار سے درست ادراک ہونا چاہیے کہ اس وقت وہ کہاں کھڑے ہیں‘ ان کے دائیں بائیں کیا حالات ہیں؟ ماضی میں اس دنیا کے اندر کیا ہوتا رہا ہے‘ ابھی سامنے کیا حالات ہیں اور مستقبل میں کیا کچھ ہونے کے امکانات ہیں؟

ہر انسان کی قسمت کا لکھا اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا ہے

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴ (بنی اسرائیل)

آیت ۱۳ ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ﴾ ”اور ہر انسان کی قسمت چپکا دی ہے ہم نے اس کی گردن میں۔“

لفظ ”طَـائِر“ عربی میں عام طور پر شگون‘ نحوست اور بد قسمتی کے لیے بولا جاتا ہے‘ لیکن یہاں پر خوش بختی اور بد بختی دونوں ہی مراد ہیں۔ یعنی کسی انسان کا جو بھی مقسوم و مقدور ہے‘ زندگی میں اچھا برا جو کچھ بھی اسے ملنا ہے‘ جیسے بھی اچھے برے حالات اسے پیش آنے ہیں‘ اس سب کچھ کے بارے میں اس کا جو کھاتہ ”اُمّ الکتاب“ میں موجود ہے اس کا حاصل اس کی گردن میں چپکا دیا گیا ہے۔ گردن میں چپکانے کے الفاظ کا استعمال یہاں محاورۃً بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی کچھ مادی حقیقت بھی ہو۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی گردن میں کسی gland کی صورت میں واقعی کوئی مائیکرو کمپیوٹر نصب کر رکھا ہو۔ واللہ اعلم!

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳﴾ ”اور ہم نکال لیں گے اس کے لیے قیامت کے روز (اسے) ایک کتاب (کی شکل میں) وہ پائے گا اسے کھلی ہوئی۔“

ان الفاظ سے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے اندر ہی کوئی ایسا سسٹم لگا دیا گیا ہے جس میں اس کے تمام اعمال و افعال ریکارڈ ہو رہے ہیں اور قیامت کے دن ایک chip کی شکل میں اسے اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس chip کے اندر اس کی زندگی کی ساری فلم موجود ہو گی‘ ایک ایک حرکت جو اُس نے کی ہو گی‘ ایک ایک لفظ جو اس نے زبان سے بولا ہو گا‘ ایک ایک خیال جو اُس کے ذہن میں پیدا ہوا ہو گا اور ایک ایک نیت جو اس کے دل میں پروان چڑھی ہو گی‘ سب کا سب ڈیٹا پوری تفصیل کے ساتھ اس میں محفوظ ہو گا۔ قیامت کے دن اس chip کو کھول کر کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا:

آیت ۱۴ ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ ”پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم

خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔"

تمہاری زندگی کی کتاب کا ایک ایک ورق اس قدر تفصیل سے تمہارے سامنے موجود ہے کہ اب اس کی مدد سے تم خود ہی اپنا حساب کر سکتے ہو۔

اے انسان! تجھے دنیا کا خریدار بننا ہے یا آخرت کا طلب گار!!

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ (بنی اسرائیل)

آیت ۱۸ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ "جو کوئی عاجلہ کا طلب گار بنتا ہے ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں سے جو کچھ ہم چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں"

یہاں پر "دنیا" کی بجائے "عاجلہ" کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ مؤنث ہیں۔ "ادنیٰ" قریب کی چیز کو کہا جاتا ہے، اس کی مؤنث "دنیا" ہے، جبکہ "عاجل" کے معنی جلدی والی چیز کے ہیں اور اس کی مؤنث "عاجلہ" ہے۔ یہ دنیا نقد کا سودا ہے، یہاں پر راحت بھی فوراً آسودگی دیتی ہے اور اس کی تکلیف بھی فوری طور پر خود کو محسوس کراتی ہے۔ اسی لیے اسے "عاجلہ" کہا گیا ہے۔ عاجلہ کے مقابلے میں اگلی آیت میں "آخرت" کا لفظ آیا ہے جو کہ قرآن حکیم میں اکثر "دنیا" کے مقابلے میں بھی آتا ہے۔ دنیا یا عاجلہ کے مقابلے میں آخرت کو آخرت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا ثواب و عذاب بعد میں آنے والی چیز ہے۔

آیت زیر نظر میں جو اصول بیان ہوا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی عیش و عشرت اور دنیا کی دولت و شہرت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اور صرف اسی کے لیے منصوبہ بندی، محنت اور دوڑ دھوپ کرے، اس کی محنت اور دوڑ دھوپ کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی درجہ میں کامیاب کر دیتا ہے، مگر ضروری نہیں کہ جس قدر کوئی دنیا سمیٹنا چاہے اسی قدر اسے مل بھی جائے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کوئی بھی اس "عاجلہ" کو پانے کی دوڑ میں شامل ہو، کامیاب ٹھہرے، بلکہ ہر کسی کو وہی کچھ ملے گا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا، اور صرف اسی کو ملے گا جس کے لیے وہ چاہے گا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حصولِ دنیا کے لیے ساری عمر اپنے آپ کو ہلکان کر دیتے ہیں مگر دنیا پھر بھی ہاتھ نہیں آتی۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جس کو وہ چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے دنیا میں اس کی محنت کا صلہ دے دیتا ہے۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾﴾ "پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم۔ وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ، دھتکارا ہوا۔"

اس شخص کی خواہش اور محنت سب چونکہ دنیا کے لیے کی تھی، اس لیے دنیا کسی نہ کسی قدر اسے دے دی گئی۔

آخرت کے لیے نہ تو اس نے خواہش کی تھی اور نہ ہی محنت' لہٰذا آخرت میں سوائے جہنم کے اس کے لیے اور کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۱۹ ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو' اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو''

یعنی اس کی یہ طلب صرف زبانی دعویٰ تک محدود نہ ہو' بلکہ حصولِ آخرت کے لیے وہ ٹھوس اور حقیقی کوشش بھی کرے' جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے ہو' کیونکہ ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی سے بڑی نیکی بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾ ''تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! یہ آیت ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک لٹمس ٹیسٹ ہے۔ اس ٹیسٹ کی مدد سے ہر شخص ٹھیک سے معلوم کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کس موڑ پر' کس حیثیت سے کھڑا ہے؟ چنانچہ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی منصوبہ بندیوں اور شبانہ روز بھاگ دوڑ کی ترجیحات کا تجزیہ کر کے اپنا احتساب کرے کہ وہ کس قدر دنیا کا طالب ہے اور کس حد تک فلاحِ آخرت کو پانے کا خواہش مند؟ بہرحال دنیا پر آخرت کو ترجیح دینا اور پھر اپنے قول و فعل سے اپنی ترجیحات کی سچائی کو ثابت کرنا ایک کٹھن اور دشوار کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۲۰ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ﴾ ''ہم سب کو مدد پہنچائے جا رہے ہیں' ان کو بھی اور ان کو بھی' آپ کے رب کی عطا سے۔''

یہ دنیا چونکہ دارالامتحان ہے اس لیے جب تک انسان یہاں موجود ہیں' ان میں سے کوئی مجرم ہو یا اطاعت گزار' ہر ایک کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش ہے جس میں سے وہ اپنے نافرمانوں اور دشمنوں کو بھی نواز رہا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰﴾ ''اور آپ کے رب کی عطا رکی ہوئی نہیں ہے۔''

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی یہ عطا اور بخشش عام ہے۔ اس میں دوست اور دشمن کے امتیاز کی بنیاد پر کوئی قدغن یا روک ٹوک نہیں ہے۔

انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے بارے میں جواب دہ ہے

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (بنی اسرائیل)

﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ﴾ ''اور مت پیچھے پڑو اُس چیز کے جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں۔''

اس حکم کا بنیادی مدعا یہ ہے کہ بحیثیت اشرف المخلوقات انسان کا طرزِ عمل خالص علم پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے کسی عمل یا نظریے کی بنیاد توہمات پر رکھے یا ایسی معلومات کو لائق اعتناء سمجھے جن کی کوئی علمی سند نہ ہو۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود انسانی علم کی بنیاد اور اس کا منبع کیا ہے؟ اس ضمن میں ہم جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر انسانی علم کی دو اقسام ہیں: ایک اکتسابی علم (acquired knowledge) اور دوسرا الہامی علم (revealed knowledge)۔ اکتسابی علم کی بنیاد وہی علم الاسماء ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا تھا اور جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں آیا ہے۔ اس علم کا تعلق انسانی حواس اور ذہن سے ہے۔ انسان اپنے حواس کی مدد سے یہ علم حاصل کر کے اپنے ذہن میں اسے محفوظ کرتا رہتا ہے۔ جوں جوں انسان کے تجربے اور مشاہدے کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے اس علم میں بھی توسیع ہوتی جاتی ہے اور یوں یہ علم کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے روزِ اوّل سے لے کر آج تک مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ دوسری طرف الہامی علم ہے جس کا انسان کے حواس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس علم کے تمام ذرائع مثلاً وحی (جلی یا خفی)' الہام' کشف اور رؤیائے صادقہ (سچے خواب) کا تعلق انسان کے حیوانی وجود کے بجائے اس کے روحانی وجود سے ہے۔ انسانی روح اس علم کو براہِ راست وصول کرتی ہے اور اس کا مسکن و مرکز انسانی قلب ہے۔ الہامی علم کے بارے میں یہ نکتہ مدِ نظر رہنا چاہیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحی' چاہے جلی ہو یا خفی' نبوت کا حصہ ہے اور علمی لحاظ سے ایک قطعی دلیل یا برہانِ قاطع ہے۔ لیکن کسی عام شخص کو وحی خفی' الہام یا کشف کے ذریعے ملنے والا علم دوسروں کے لیے کوئی علمی دلیل فراہم نہیں کرتا۔ ایسا علم صرف متعلقہ شخص کے لیے دلیل ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ وہ خلافِ شریعت نہ ہو۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آیت زیرِ نظر میں انسان کا اکتسابی علم زیرِ بحث ہے۔

﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡئُوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کے اکتساب و استعمال کے لیے حواسِ خمسہ (جن میں سے دو اہم ترین حواس کا ذکر یہاں آیا ہے) اور عقل سے نوازا ہے اور اس لحاظ سے اس کی ان صلاحیتوں کا احتساب بھی ہو گا۔ یہاں پر لفظ فُؤاد بہت اہم ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ عام طور پر اس لفظ کا ترجمہ ''دل'' کیا گیا ہے' مگر اس ترجمے کے لیے کوئی لغوی بنیاد موجود نہیں۔ اس لفظ کا مادہ وہی ہے جس سے لفظ ''فائدہ'' مشتق ہے اور لفظ ''فائدہ'' کے معنی کسی چیز کے اس جوہر یا لُبِّ لُباب کے ہیں جو اس چیز میں سے اصل مقصود ہوتا ہے۔ پرانے دور کی کتب میں یہ انداز عام ملتا ہے کہ کوئی حکایت یا روایت بیان کرنے کے بعد اس کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے لفظ ''فائدہ'' یا صرف ''ف'' لکھ دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی تفصیل کے خلاصہ یا کسی کام کے نتیجہ کو

فائدہ کہا جاتا ہے۔لفظ ''فـیـد'' بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔عربی میں ''فـیـد'' کسی سبزی یا گوشت وغیرہ کی بھجیا کو کہا جاتا ہے۔گویا اس لفظ (فـیـد) میں بھی نتیجہ یا خلاصہ وغیرہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔یعنی گوشت وغیرہ کو اُبالنے یا بھوننے سے جب اس کا فالتو پانی خشک ہو جاتا ہے تب اس میں سے بہت تھوڑی مقدار میں وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس پر لفظ فئید کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس لغوی وضاحت کے بعد اب لفظ ''فؤاد'' کے مفہوم اور انسانی حواس کے ساتھ اس کے تعلق کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔حواسِ انسانی اپنے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر کے دماغ تک پہنچاتے ہیں۔دماغ کا کمپیوٹر ان معلومات کو process کرتا ہے' پہلے سے موجود اپنے ذخیرۂ معلومات کے ساتھ ان کا تطابق (tally) یا تقابل (compare) کر کے اس سارے عمل سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے اور پھر اس نتیجہ کو اپنے ذخیرۂ معلومات (memory) میں محفوظ (store) کر لیتا ہے۔اسی ذخیرۂ معلومات کا نام علم ہے اور انسان کی وہ قوت یا صلاحیت جو اس سارے عمل کو ممکن بناتی ہے ''فؤاد'' کہلانے کی مستحق ہے۔عرفِ عام میں اس قوت یا صلاحیت کو عقل یا شعور کہا جاتا ہے۔چنانچہ میرے نزدیک لفظ ''فؤاد'' کا درست ترجمہ عقل یا شعور ہی ہے۔

اس تناظر میں میرے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف حواس (sense organs) عطا کیے ہیں اور ان حواس سے حاصل ہونے والی معلومات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے اسے نوازا ہے۔اب اگر انسان اپنے ان حواس سے استفادہ نہ کرے' عقل و شعور کی صلاحیت سے کوئی کام نہ لے اور اپنے نظریات کی بنیاد توہمات پر رکھ لے تو وہ بہت بڑے ظلم کا مرتکب ہوگا —— یہی وجہ ہے کہ انسان کو اپنی ان صلاحیتوں کے حوالے سے اس ہستی کے سامنے جواب دہ رکھا گیا ہے جس نے اسے یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔چنانچہ انسان کو چاہیے کہ جس چیز یا خبر کی بنیاد میں الہامی یا اکتسابی و تجرباتی علم کی کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو' اسے قابلِ اعتناء نہ سمجھے اور اپنے افکار و نظریات کی بنیاد ایسے ٹھوس علمی حقائق پر رکھے جن کی وہ سائنٹیفک انداز میں توثیق و تصدیق بھی کر سکتا ہو۔یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس نے علمی میدان میں نوعِ انسانی کی راہنمائی اس راستے کی طرف کی ہے جو انسان کے شایانِ شان ہے۔

موضوع کی مناسبت سے یہاں ارسطو کے استخراجی فلسفے کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ایک مدت تک پوری دنیا میں اس فلسفے کا ڈنکا بجتا رہا۔عالمِ اسلام میں بھی یہ فلسفہ بہت مقبول رہا اور کئی صدیوں کے بعد اب جا کر کہیں اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے۔استخراجی منطق (deductive knowledge) کے مطابق صرف دستیاب معلومات سے ہی نتائج اخذ کیے جاتے تھے۔چنانچہ پرانے زمانے میں کسی موضوع پر جو تھوڑی بہت معلومات دستیاب ہوتی تھیں' وقت کے فلسفی اور حکیم انہی میں سے بال کی کھال اتار اتار کر نتائج اخذ کرتے رہتے تھے۔اس کے مقابلے میں قرآن نے استقرائی منطق (inductive knowledge) کا فلسفہ متعارف کرایا اور انسان کو مشاہدے اور تجربے کی مدد سے مسلسل علم حاصل کرنے کی راہ دکھائی۔اس حوالے سے قرآن حکیم کا

اسلوب ملاحظہ ہو: ﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾﴾ (الغاشیۃ) ”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹ کی طرف کہ کیسے پیدا کیا گیا ہے۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے نصب کیے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کیسے ہموار کی گئی ہے!“ علامہ اقبال نے اس اسلوبِ قرآنی کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

کھول آنکھ‘ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

فطرت اور مظاہرِ فطرت کے بارے میں ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے قوانین بہت مضبوط اور مستحکم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے فطرت کے ان قوانین کو معطل کر سکتا ہے یا بدل سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اصل حقیقت یہی ہے کہ اس کائنات کا عمومی نظام بہت مضبوط‘ محکم اور اٹل طبعی اصول وقوانین پر چل رہا ہے اور ان قوانین کو معطل کرنے کے معجزات روز روز رونما نہیں ہوتے۔ سمندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نوعِ انسانی کی تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ پھٹا تھا اور آگ نے صرف ایک ہی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے سے انکار کیا تھا۔ بہر حال دنیا میں طبعی سائنس (Physical Science) کی مختلف ٹیکنالوجیز کا وجود فطرت کے اٹل قوانین کا ہی مرہونِ منت ہے اور اسی وجہ سے آج طرح طرح کی سائنسی ترقی ممکن ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن حکیم ان مظاہرِ فطرت کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں قرار دیتا ہے اور انسان کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کو غور سے دیکھے‘ ان کے اندر کارفرما قوانین کا تجزیاتی مطالعہ کر کے نتائج اخذ کرے اور پھر ان نتائج کو کام میں لا کر اپنی زندگی میں ترقی کی نئی منازل تلاش کرے۔

علامہ اقبال نے اسی حوالے سے اپنے خطبات میں فرمایا ہے: "The inner core of the western civilization is Quranic." کہ موجودہ مغربی تہذیب کا اندرونی محور خالص قرآنی ہے‘ کیونکہ اس کی بنیاد سائنس پر ہے اور سائنسی علوم کی طرف انسان کی توجہ قرآن نے مبذول کروائی ہے۔ قرآن انسان کو ہر قسم کے توہمات‘ رمل‘ نجوم‘ پامسٹری وغیرہ سے بیزار کر کے اپنے عمل اور نظریات کی بنیاد ٹھوس علمی حقائق پر رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔

انسانی زندگی کے معمولات میں توازن رکھنے کے لیے مذکورہ دونوں قسم کے علوم (اکتسابی اور الہامی) اپنے اپنے دائرۂ عمل میں نہایت اہم ہیں۔ دونوں کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے فوراً بعد آپ کو علم الاسماء (یہ وہی علم ہے جس کا تعلق انسانی حواس سے ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے) سے بھی نوازا گیا تھا اور آپ کو زمین پر بھیجتے وقت الہامی علم کے اتباع کی ہدایت بھی کر دی گئی تھی: ﴿فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ

یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (البقرۃ) ''پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت' تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

یورپی معاشرہ اس سلسلے میں بہت بڑی کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے کہ اس معاشرے میں ساری توجہ اکتسابی علم پر مرکوز کر کے الہامی علم سے بالکل ہی صرفِ نظر کر لیا گیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی تھیں' ان میں ایک اکتسابی علم کی آنکھ تھی اور دوسری الہامی علم کی۔ یورپ میں ایک آنکھ کو مکمل طور پر بند کر کے ہر چیز کو دیکھنے اور پرکھنے کے لیے دوسری اکیلی آنکھ پر ہی انحصار کر لیا گیا ہے۔ نتیجتاً نہ تو اس معاشرے کے افراد کی سوچ میں اعتدال رہا ہے نہ عمل میں توازن' اور یوں اس پورے معاشرے نے یک چشمی دجالیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

انسان اپنے شاکلہ کے مطابق ہی عمل کرنے کا مکلّف ہے

قُلۡ کُلٌّ یَّعۡمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ ؕ فَرَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ہُوَ اَہۡدٰی سَبِیۡلًا ﴿٪۸۴﴾ (بنی اسرائیل)

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ ہر شخص کام کرتا ہے اپنے شاکلہ کے مطابق۔ پس آپ کا رب خوب جانتا ہے اُسے جو زیادہ سیدھے راستے پر ہے۔''

''شاکلہ'' سے مراد یہاں ہر انسان کی شخصیت کا مخصوص سانچہ ہے' جیسے کسی دھات کو اگر کسی مخصوص شکل میں ڈھالنا مقصود ہو تو پہلے اس کا ایک سانچہ (pattern) تیار کیا جاتا ہے۔ پھر جب دھات کو پگھلا کر اس میں ڈالا جاتا ہے تو وہ دھات اس سانچے کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کے مخصوص سانچے کی تشکیل میں انسان کے موروثی genes اور اس کا خارجی ماحول بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ گویا موروثی عوامل اور ماحولیاتی عوامل کے حاصل ضرب سے انسان کی شخصیت کا جو ہیولیٰ بنتا ہے وہی اس کا شاکلہ ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو اپنی زندگی میں نیکی اور برائی کے لیے جو بھی محنت اور کوشش کرنی ہے وہ اپنے اسی شاکلہ کے اندر رہ کر کرنی ہے۔ گویا کسی انسان کا شاکلہ اس کے دائرۂ عمل کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ وہ نہ تو ان حدود سے تجاوز کر سکتا ہے اور نہ ہی ان سے بڑھ کر عمل کرنے کا وہ مکلف ہے۔ جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے: One cannot grow out of his skin یعنی کسی نے موٹا ہونے کی جتنی بھی کوشش کرنی ہے اپنی کھال کے اندر رہ کر ہی کرنی ہے' وہ اپنی کھال سے باہر بہر حال نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ ہر انسان اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس نے کس انسان کو کس طرح کا شاکلہ دے رکھا ہے اور وہ ہر انسان سے اس کے شاکلہ کی مناسبت سے ہی حساب لے گا۔ (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو بیان القرآن' جلد اول' سورۃ البقرۃ' تشریح آیت ۲۸۶۔)

تاریخ نسلِ انسانی کے سب سے بڑے فتنے کا ذکر

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿ؑ۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَیُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ (الکھف)

آیت ۱ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ ''کُل حمد وثنا اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے بندے پر کتاب''

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق اور نسبت ہے اسے یہاں لفظ ''عبد'' سے نمایاں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾ ''اور اس میں اُس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔''

آیت ۲ ﴿قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ﴾ ''(یہ کتاب) بالکل سیدھی ہے' تاکہ وہ خبردار کرے ایک بہت بڑی آفت سے اُس کی طرف سے''

﴿وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ②﴾ ''اور (تاکہ) وہ بشارت دے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہوں کہ ان کے لیے ہوگا بہت اچھا بدلہ۔''

یعنی نبی اکرم ﷺ پر نزول قرآن کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپؐ لوگوں کو ایک بہت بڑی آفت کے بارے میں خبردار کردیں۔ یہاں لفظ ''بَاْسًا'' بہت اہم ہے۔ یہ لفظ واحد ہو تو اس کا مطلب جنگ ہوتا ہے اور جب بطور جمع آئے تو اس کے معنی سختی' مصیبت' بھوک' تکلیف وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ (آیت البر) میں یہ لفظ بطور واحد بھی آیا ہے اور بطور جمع بھی: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں ''الْبَاْسَآء'' کے معنی فقر وتنگدستی اور مصائب و تکالیف کے ہیں جبکہ ''حِیْنَ الْبَاْسِ'' سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

آیت زیر نظر میں ''بَاْسًا شَدِیْدًا'' سے ایک بہت بڑی آفت بھی مراد ہوسکتی ہے اور بہت شدید قسم کی جنگ بھی۔ آفت کے معنی میں اس لفظ کا اشارہ اس دجالی فتنہ کی طرف ہے جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال کے فتنے سے خبردار نہ کیا ہو۔ یہ فتنہ ایک مؤمن کے لیے سخت ترین امتحان ہوگا اور پوری انسانی تاریخ میں اس فتنے سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے۔

دوسری طرف اس لفظ (بَاْسًا شَدِیْدًا) کو اگر خاص طور پر جنگ کے معنی میں لیا جائے تو اس سے ''الْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی'' مراد ہے اور اس کا تعلق بھی فتنہ دجال ہی سے ہے۔ کتب احادیث (کتاب الفتن' کتاب آثار القیامة' کتاب الملاحم وغیرہ) میں اس خوفناک جنگ کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ عیسائی روایات میں اس جنگ کو ''ہرمجدون'' (Armageddon) کا نام دیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے اور آپؑ کے ہاتھوں دجال کے قتل کے بعد اس فتنہ یا جنگ کا خاتمہ ہوگا۔

بہت سی احادیث میں ہمیں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ دجالی فتنہ کے ساتھ سورۃ الکہف کی ایک خاص مناسبت ہے اور اس فتنہ کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس سورۃ کے ساتھ ذہنی اور قلبی تعلق قائم کرنا بہت مفید ہے۔ اس مقصد کے لیے احادیث میں جمعہ کے روز سورۃ الکہف کی تلاوت کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے' اور اگر پوری سورت کی تلاوت نہ کی جاسکے تو کم از کم اس کی ابتدائی اور آخری آیات کی تلاوت کرنا بھی مفید

بتایا گیا ہے۔

یہاں پر دجالی فتنہ کی حقیقت کے بارے میں کچھ وضاحت بھی ضروری ہے۔ ''دجل'' کے لفظی معنی دھوکہ اور فریب کے ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق ''دجال'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت بڑا دھوکے باز ہو اور جس نے دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ اور فریب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ اس لیے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کو بھی دجال کہا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جن تیس دجالوں کی پیدائش کی خبر دی ہے ان سے جھوٹے نبی ہی مراد ہیں۔

دجالیت کے اس عمومی مفہوم کو مدّنظر رکھا جائے تو آج کے دور میں مادہ پرستی بھی ایک بہت بڑا دجالی فتنہ ہے۔ آج لوگوں کے اذہان وقلوب' نظریات وافکار اور اخلاق واقدار پر مادیت کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ آج کا انسان مسبب الاسباب (اللہ تعالیٰ) کے بجائے مادی اسباب پر توکّل کرتا ہے۔ آخرت کی زندگی پر پڑے ہوئے دنیا اور اس کی مادیت کے پردے سے دھوکا کھا کر آج کے انسان نے دُنیوی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھ لیا ہے' لہٰذا اس کی تمام تر دوڑ دھوپ اسی زندگی کے لیے ہے' اور یوں وہ عملی طور پر مادّہ پرستی کے دجالی فتنے میں گرفتار ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ دجال اور دجالی فتنے کا ایک خصوصی مفہوم بھی ہے۔ اس مفہوم میں اس سے مراد ایک مخصوص فتنہ ہے جو قربِ قیامت کے زمانے میں ایک خاص شخصیت کی وجہ سے ظہور پذیر ہو گا۔ اس بارے میں کتب احادیث میں بڑی تفصیلات موجود ہیں' لیکن بعض روایات میں کچھ پیچیدگیاں بھی ہیں اور تضادات بھی۔ ان کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ علمی سطح پر غور وفکر کی ضرورت ہے' کیونکہ ظاہری طور پر نظر آنے والے تضادات میں مطابقت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا اہل علم کا کام ہے۔ بہرحال یہاں ان تفاصیل کا ذکر اور ان پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ اس موضوع کے بارے میں یہاں صرف اس قدر جان لینا ہی کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربِ قیامت کے زمانے میں دجال کے ظاہر ہونے اور ایک بہت بڑا فتنہ اٹھانے کے بارے میں خبریں دی ہیں۔ جو حضرات اس حوالے سے تفصیلی معلومات چاہتے ہوں وہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''تفسیر سورۃ الکھف'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ''دنیا کی حقیقت'' کے عنوان سے میری ایک تقریر کی ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے۔

اصحابِ کہف کون تھے؟

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَہۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ ۙ کَانُوۡا مِنۡ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾ اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٔۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾ (الکھف)

آیت ۹ ﴿اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَہۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ ۙ کَانُوۡا مِنۡ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾﴾ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم (تختی) والے اصحاب ہماری بہت عجیب نشانیوں میں سے تھے؟''

آیت ۱۰ ﴿اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٔۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾﴾ ''جبکہ ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور انہوں نے کہا: اے ہمارے ربّ! تو ہمیں عطا فرما اپنے پاس سے رحمت اور آسان فرمادے ہمارے لیے ہمارے معاملات میں عافیت کا راستہ۔''

کہف کے معنی غار کے ہیں اور رقیم سے مراد وہ تختی ہے جس پر اصحابِ کہف کے حالات لکھ کرا سے غار کے دہانے پر لگا دیا گیا تھا۔ اس نسبت سے انہیں اصحاب الکہف بھی کہا جاتا ہے اور اصحاب الرقیم بھی۔ مراد یہ ہے کہ تم لوگ شاید اصحابِ کہف کے واقعہ کو ایک بہت غیر معمولی واقعہ اور ہماری ایک بڑی عجیب نشانی سمجھتے ہو، مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری تخلیق اور صناعی میں تو اس سے بھی بڑے بڑے عجائبات موجود ہیں۔

اس قصے کے بارے میں اب تک جو ٹھوس معلومات ہمارے سامنے آئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے: حضرت مسیح علیہ السلام کی فلسطین میں بعثت کے وقت بظاہر یہاں ایک یہودی بادشاہ کی حکمرانی تھی مگر اس بادشاہ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اور عملی طور پر یہ پورا علاقہ رومن ایمپائر ہی کا حصہ تھا۔ رومی حکمران مذہباً بُت پرست تھے جبکہ فلسطین کے مقامی باشندے اہلِ کتاب (یہودی) تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفعِ سماوی کا واقعہ ۳۰ اور ۳۳ عیسوی کے لگ بھگ پیش آیا۔ اس کے بعد یہودیوں کی ایک بغاوت کے جواب میں رومی جنرل ٹائیٹس نے ۷۰ عیسوی میں یروشلم پر حملہ کر کے اس شہر کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا، یہودیوں کا قتل عام ہوا اور جو یہودی قتل ہونے سے بچ گئے، انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ مقامی عیسائیوں کو اگرچہ علاقے سے بے دخل تو نہ کیا گیا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار اور موحد ہونے کی وجہ سے انہیں رومیوں کی طرف سے اکثر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اسی حوالے سے رومی بادشاہ دقیانوس (Decius) کے دربار میں چند راسخ العقیدہ موحد نوجوانوں کی پیشی ہوئی۔ بادشاہ کی طرف سے ان نوجوانوں پر واضح کیا گیا کہ وہ اپنے عقائد کو چھوڑ کر بُت پرستی اختیار کر لیں ورنہ انہیں سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں اس فیصلے کے لیے مناسب مہلت دی گئی۔ اسی مہلت کے دوران انہوں نے شہر سے نکل کر کسی غار میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ لوگ غار میں پناہ گزیں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان پر ایسی نیند طاری کر دی کہ وہ تقریباً تین سو سال تک سوئے رہے (سورۃ البقرۃ، آیت ۲۵۹ میں بھی اسی نوعیت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے) اور ان کی نیند کے دوران ان کی کروٹیں بدلنے کا بھی باقاعدہ اہتمام رہا۔ جس غار میں اصحابِ کہف سو رہے تھے وہ ایسی جگہ پر واقع تھی جہاں لوگوں کا آنا جانا بالکل نہیں تھا۔ اس غار کا دہانہ شمال کی جانب تھا جس کی وجہ سے اس کے اندر روشنی منعکس ہو کر تو آتی تھی، لیکن براہِ راست روشنی یا دھوپ نہیں آتی تھی۔

بعدازاں قسطنطین (Constantine) نامی فرمانروا نے عیسائیت قبول کر لی اور اس کی وجہ سے پوری رومن ایمپائر بھی عیسائی ہوگئی۔ پھر ۴۰۰ عیسوی کے لگ بھگ Theodosius کے عہدِ حکومت میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو جگایا۔ جاگنے کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو چاندی کا ایک سکہ دے کر کھانا لینے کے لیے

شہر بھیجا اور ساتھ ہدایت کی کہ وہ محتاط رہے' ایسا نہ ہو کہ ان کے غار میں چھپنے کی خبر بادشاہ تک پہنچ جائے۔ (وہ اپنی نیند کو معمول کی نیند سمجھ رہے تھے اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تین سو سال تک سوتے رہے تھے۔) بہرحال کھانا لانے کے لیے جانے والا ان کا ساتھی اپنی تین سو سال پرانی وضع قطع اور کرنسی کی وجہ سے پکڑا گیا اور یوں ان کے بارے میں تمام معلومات لوگوں تک پہنچ گئیں۔ جب لوگوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے عیسائی آبادی کی طرف سے ان کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ اس کے بعد وہ لوگ غار میں پھر سے سو گئے یا اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری کر دی۔ ان لوگوں کی طبعی موت کے بعد غار کے دہانے کو بند کر دیا گیا اور ایک تختی پر ان لوگوں کا احوال لکھ کر اسے اس جگہ پر نصب کر دیا گیا۔ اصحابِ کہف کا یہ قصہ گبن کی کتاب The Decline and fall of Roman Empire میں بھی Seven Sleepers کے عنوان سے موجود ہے۔ اس قصے کا ذکر چونکہ رومن لٹریچر میں تھا اور یہودی اِن تمام تفصیلات سے آگاہ تھے' اس لیے انہوں نے یہ سوال حضور اکرم ﷺ سے امتحاناً پوچھ بھیجا تھا۔

''اِن شاءَ اللّٰہ'' کہنے کا حکم

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ (الکھف)

آیت ۲۳ ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾﴾ ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کر دوں گا۔''

اہلِ مکہ نے یہودِ مدینہ کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ سے مختلف سوالات پوچھے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو ان سوالات کے جوابات کل دوں گا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے سہواً ''ان شاء اللّٰہ'' نہیں فرمایا۔ اس کے بعد کئی روز تک وحی نہ آئی۔ یہ صورت حال آپؐ کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ مخالفین خوشی میں تالیاں پیٹ رہے ہوں گے' آپؐ کو ناکامی کے طعنے دے رہے ہوں گے اور آپؐ کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو کیسی کیسی سخت آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے: ع ''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

عام لوگ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کیسی کیسی لایعنی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی پکڑ نہیں ہوتی' اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اہم نہیں ہوتے' مگر یہاں ایک انتہائی مقرب ہستی سے سہواً ایک کلمہ ادا ہونے سے رہ گیا تو باوجود اس کے کہ معاملہ بے حد حساس تھا' وحی روک لی گئی۔ بالآخر کئی روز کے بعد جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام سوالات کے جوابات بھی لے کر آئے اور ساتھ یہ ہدایت بھی کہ کبھی کسی چیز کے بارے میں یوں نہ کہیں کہ میں کل یہ کروں گا۔

آیت ۲۴ ﴿اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ﴾ ”مگر یہ کہ اللہ چاہے!“

یعنی مستقبل کے بارے میں جب بھی کوئی بات کریں تو ”ان شاءَ اللّٰه“ ضرور کہیں کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں یوں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ خصوصی فضل ہے کہ انہیں اپنی معاشرتی زندگی میں روز مرہ کے معمولات کے لیے ایسے کلمات سکھائے گئے ہیں جن میں توحید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کوئی خوبصورت چیز دیکھی جس سے آپ کا دل خوش ہوا' آپ نے کہا: سُبْحَانَ اللّٰه ! گویا آپ نے اقرار کیا کہ یہ اس چیز کا کمال نہیں اور نہ ہی یہ چیز بذاتِ خود لائق تعریف ہے بلکہ تعریف تو اُس اللہ کی ہے جس نے یہ خوبصورت چیز بنائی۔ آپ کی کوئی تکلیف دور ہوئی تو منہ سے نکلا: اَلْحَمْدُ لِلّٰه ! یعنی جو بھی مشکل آسان ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کی مدد' اُس کی مہربانی اور اُس کے حکم سے ہوئی' لہٰذا شکر بھی اُسی کا ادا کیا جائے گا۔ آپ اپنے گھر میں داخل ہوئے' اہل وعیال کو خوش وخرم پایا' آپ نے کہا: مَاشَاءَ اللّٰه ! کہ اس میں میرا یا کسی اور کا کوئی کمال نہیں' یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت سے ہے۔ اسی طرح مستقبل میں کسی کام کے کرنے کے بارے میں اظہار کیا تو ساتھ اِن شاءَ اللّٰه کہا۔ یعنی میرا ارادہ تو یوں ہے مگر صرف میرے ارادے سے کیا ہوتا ہے' حقیقت میں یہ کام تبھی ہوگا اور میں اسے تبھی کر پاؤں گا جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ گویا یہ ایسے کلمات ہیں جن کے ذریعے قدم قدم پر اور بات بات میں ہمیں توحید کا سبق یاد دلایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم' اُس کے حکم' اُس کے اختیار واقتدار' اُس کی قدرت' اُس کی مشیت کے مطلق اور فائق ہونے کے اقرار کی ترغیب دی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ان میں سے زیادہ تر کلمات (اَلْحَمْدُ لِلّٰه' اِنْ شَاءَ اللّٰه' مَاشَاءَ اللّٰه) اس سورت میں موجود ہیں۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ ”اور اپنے رب کو یاد کر لیا کیجیے جب آپ بھول جائیں“

اگر کسی وقت بھول جائیں تو یاد آنے پر دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا دھیان لگا لیجیے۔ (اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ موقع پر ان شاء اللہ کہنا بھول گئے ہیں تو جیسے ہی آپ کو یاد آئے تو فوراً ان شاء اللہ کہہ دیں۔)

﴿وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾﴾ ”اور کہیے: ہوسکتا ہے کہ میرا رب میری راہنمائی کر دے اس سے بہتر بھلائی کی طرف۔“

یعنی کسی بھی کام کے لیے کوشش کرتے ہوئے انسان کو ”تفویض الامر الی اللہ“ کی کیفیت میں رہنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا' ورنہ ہوسکتا ہے کہ میرا رب میرے لیے اس سے بھی بہتر کسی کام کے لیے اسباب پیدا فرما دے۔ گویا انسان اپنے تمام معاملات ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سپرد کیے رکھے:

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم وبیش را!

داعیانِ حق کے لیے ایک قیمتی نصیحت

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَکَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (الکھف)

﴿وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ﴾ ’’اور اپنے آپ کو روکے رکھیے اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح و شام‘‘

یعنی اے نبی ﷺ! آپ کے ارد گرد جمع ہونے والے یہ بلال حبشی، عبداللہ بن اُمّ مکتوم، عمار بن یاسر اور خُباب رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اگرچہ مفلس اور نادار ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ بہت اہم ہیں۔ لہٰذا آپؐ ان لوگوں کی رفاقت اور معیت پر مطمئن رہیے۔

﴿یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ﴾ ’’وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں، (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپؐ دُنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش چاہتے ہیں!‘‘

ان غلاموں اور بے آسرا لوگوں سے آپ کی توجہ ہٹ کر کہیں مکہ کے سرداروں اور اُمراء کی طرف مبذول نہ ہونے پائے، جس سے لوگوں کو یہ گمان ہو کہ آپؐ بھی دنیا کی زیب و زینت ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ لہٰذا ولید بن مغیرہ بظاہر کتنا ہی با اثر اور صاحبِ ثروت سہی، آپ عبداللہؓ بن اُمّ مکتوم کو نظر انداز کر کے اُسے ہرگز اہمیت نہ دیں۔ واضح رہے کہ ترجمہ کرنے کے اعتبار سے یہ آیت قرآن حکیم کی مشکل آیات میں سے ہے۔ یہاں الفاظ کے عین مطابق ترجمہ ممکن نہیں۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کی یہ شان ہرگز نہ تھی کہ آپ ﷺ کی نظریں غرباء سے ہٹ کر اُمراء کی طرف اُٹھتیں۔ چنانچہ ان الفاظ سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ دراصل آپؐ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ آپؐ دعوت و تبلیغ کی غرض سے بھی ان امراء کی طرف ترجیحی انداز میں التفات نہ فرمائیں جس سے کسی کو مغالطہ ہو کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں دُنیوی مال و اسباب کی بھی کچھ وقعت اور اہمیت ہے۔ سورۃ الحجر میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ ’’آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اس مال و متاع کی طرف جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو دے رکھا ہے اور آپؐ ان (امراء) کے بارے میں فکر مند نہ ہوں اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے بازو جھکا کر رکھیں!‘‘

دراصل دعوت کے حوالے سے یہ ایک نازک اور حساس معاملہ ہے۔ معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگوں کا بہرحال اپنا ایک حلقہ اثر ہوتا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی اہلِ حق کی صف میں شامل ہوتا ہے تو وہ اکیلا بہت سے افراد کے برابر شمار ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے کئی دوسرے لوگ خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں جبکہ پہلے سے

موجود لوگوں کے لیے بھی ایسے شخص کی شمولیت تقویت اور اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اے اللہ! تو عمرؓ بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کو ضرور میری جھولی میں ڈال دے! آپ ﷺ کا خیال تھا کہ ایسی بااثر شخصیات میں سے کسی کا ایمان لانا اسلام کے لیے یقیناً باعثِ تقویت ہوگا اور اس کی رفاقت سے ان کمزور مسلمانوں کو سہارا ملے گا جن پر قافیہ حیات تنگ ہوا جا رہا تھا۔ اور پھر واقعتاً ایسا ہوا بھی کہ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے ایمان لانے کے بعد مکہ میں کمزور مسلمانوں پر قریش کے ظلم و تعدی میں کافی حد تک کمی آ گئی۔

بہرحال اس سلسلے میں معروضی حقائق کسی بھی داعی کو اس طرف راغب کرتے ہیں کہ معاشرے کے متموّل طبقوں اور اربابِ اختیار و اقتدار تک پیغامِ حق ترجیحی بنیادوں پر پہنچایا جائے اور انہیں اپنی تحریک میں شامل کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائے جائیں۔ مگر دوسری طرف اس حکمت عملی سے تحریک کے نادار اور عام ارکان کو یہ تاثر ملنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں کم حیثیت سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے اور اس طرح اُن کی حوصلہ شکنی ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کوئی داعیٔ حق اثر و رسوخ کے حامل افراد کی طرف ترجیحی انداز میں متوجہ ہوگا تو عوام میں اُس کی ذات اور اُس کی تحریک کے بارے میں یہ تاثر ابھرنے کا اندیشہ ہوگا کہ یہ لوگ بھی امراء اور اربابِ اختیار سے مرعوب ہیں اور ان کے ہاں بھی دُنیوی ٹھاٹھ باٹھ ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لیے دولت مند اور اثر و رسوخ کے حامل افراد تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں مذکورہ بالا دو عوامل کے منفی اثرات سے بچنا بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کو اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ آپؐ اس سلسلے میں احتیاط سے کام لیں، کہیں لوگ یہ تاثر نہ لے لیں کہ محمد (ﷺ) کے ہاں بھی دولت مند لوگوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸﴾ ''اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔''

کُفّارِ مکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مداہنت پر مصر تھے اور وہ آپؐ کے ساتھ ''کچھ دو اور کچھ لو'' کی بنیاد پر مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں سردارانِ قریش کی طرف سے آپؐ پر شدید دباؤ تھا۔ اس پس منظر میں یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل اور محروم کر دیا ہے تو آپؐ ایسے لوگوں کی باتوں کی طرف دھیان بھی مت دیجیے!

خبردار! یہ بھی شرک ہے!

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝۳۲ (الکھف)

﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ بیان کیجیے ان کے لیے دو اشخاص کی مثال''

﴿جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ﴾ ''اُن میں سے ایک کو ہم نے دیے تھے دو باغ انگوروں کے اور اُن دونوں کو گھیر دیا تھا ہم نے کھجوروں کے درختوں کے ساتھ''

انگوروں کی بیلوں کے گرداگرد کھجوروں کے درختوں کی باڑ تھی تاکہ نازک بیلیں آندھی' طوفان وغیرہ سے محفوظ رہیں۔

﴿وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾﴾ ''اور ہم نے ان دونوں (باغوں) کے درمیان کھیتی کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔''

بنیادی طور پر وہ انگوروں کے باغات تھے۔ ان کے اطراف میں کھجوروں کے درخت تھے' جن کی دوہری افادیت تھی۔ ان درختوں سے کھجوریں بھی حاصل ہوتی تھیں اور وہ انگوروں کی بیلوں کے لیے حفاظتی باڑ کا کام بھی دیتے تھے۔ درمیان میں کچھ زمین کاشت کاری کے لیے بھی تھی' جس سے اناج وغیرہ حاصل ہوتا تھا۔ گویا ہر لحاظ سے وہ مثالی باغات تھے۔

یہ سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع کی ابتدائی آیت ہے۔ اس رکوع میں دو اشخاص کے باہمی مکالمے کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور بہت سی دوسری دُنیوی نعمتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ شخص اپنی خوشحالی میں اس قدر مگن ہوا کہ اس کی نگاہ اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر مادی وسائل پر ہی جم کر رہ گئی اور انہی اسباب و وسائل کو وہ اپنے توکّل اور بھروسے کا مرکز بنا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا جو دُنیوی لحاظ سے خوشحال تو نہیں تھا مگر اُسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی۔ اُس نے اُس دولت مند شخص کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے مگر تم اُسے بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔ دولت مند شخص نے تکبر میں آکر کہا کہ مجھے تو یہ ساری نعمتیں اس لیے ملی ہیں کہ میں اللہ کا چہیتا ہوں جبکہ میرے مقابلے میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ کے اس بندے نے اسے پھر سمجھایا کہ دیکھو اپنے دُنیوی مال و اسباب پر اس طرح مت اِتراؤ' کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو تمہارے یہ سارے ٹھاٹھ باٹھ پل بھر میں ختم کر کے رکھ دے۔ بہرحال ان تمام نصیحتوں کا اُس شخص پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ دُنیوی اَسباب کے نشے نے اس کو اس قدر اندھا کر رکھا تھا کہ اسے حقیقی مسبّب الاسباب کی قدرت کا کچھ اندازہ ہی نہ رہا۔ بالآخر اُس کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا اور وہ اپنے رویے پر کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔ اپنی بربادی کے بعد جب اس شخص کی آنکھیں کھلیں تو تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس دولت مند شخص کا وہ فقرہ خاص طور پر یہاں قابلِ غور ہے جو اپنی بربادی کے بعد پچھتاتے ہوئے اس کی زبان سے نکلا تھا کہ ''کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ شرک نہ کیا ہوتا!'' دیکھا جائے تو اس سارے واقعے میں کسی ظاہری شرک کا ارتکاب نظر نہیں آتا۔ کسی دیوی یا دیوتا کی پوجا پاٹ کا بھی کوئی حوالہ یہاں نہیں آیا' اللہ کے

سوا کسی دوسرے معبود کا بھی ذکر نہیں ہوا' تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا اقدام تھا جس پر وہ شخص پچھتایا کہ کاش میں نے اپنے رب سے شرک نہ کیا ہوتا! اس پہلو سے اگر اس سارے واقعے کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں جس شرک کا ذکر ہوا ہے وہ ''مادہ پرستی'' کا شرک ہے۔ اس شخص نے دراصل اپنے مادی اسباب و وسائل کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ جو بھروسا اور توکل اُسے حقیقی مسبّب الاسباب پر کرنا چاہیے تھا وہ بھروسا اور توکل اُس نے اپنے مادی وسائل پر کر لیا تھا اور اس طرح ان مادی وسائل کو اس نے معبود کا درجہ دے دیا تھا۔ یہی رویہ اور یہی سوچ مادہ پرستی ہے اور یہی دراصل موجودہ دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔

موجودہ دور ستارہ پرستی اور بُت پرستی کا دور نہیں۔ آج کا انسان ستاروں کی اصل حقیقت جان لینے اور چاند پر قدم رکھ لینے کے بعد ان کی پوجا بھلا کیونکر کرے گا؟ چنانچہ آج کے دور میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انسان نے جو معبود بنائے ہیں ان میں مادہ پرستی اور وطن پرستی سب سے اہم ہیں۔ آج دولت کو معبود کا درجہ دے دیا گیا ہے اور مادی وسائل اور ذرائع کو مسبب الاسباب سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ موجودہ دور کا بہت خطرناک شرک ہے اور اس سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بہت باریک بینی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ذوالقرنین کون تھا؟

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ۭ (الکہف)

''اور یہ لوگ آپؐ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ کہیے کہ ابھی میں آپ لوگوں کو اس کا حال بتاتا ہوں۔''

یہودِ مدینہ نے قریشِ مکہ کے ذریعے سے حضور ﷺ سے جو سوالات پوچھ بھیجے تھے ان میں سے ایک سوال ذوالقرنین کے بارے میں بھی تھا۔ سورۃ الکہف کے گیارہویں رکوع میں ان کے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔ اس جواب کا آغاز اس آیت سے ہو رہا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک اکثر مفسّرین ذوالقرنین سے ناواقف تھے۔ چنانچہ تیرہ سو سال تک عام طور پر سکندرِ اعظم ہی کو ذوالقرنین سمجھا جاتا رہا۔ اسؔ کی وجہ یہ تھی کہ قرآن حکیم میں ذوالقرنین کی فتوحات کا ذکر جس انداز میں ہوا ہے یہ انداز سکندرِ اعظم کی فتوحات سے ملتا جلتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوالقرنین کی سیرت کا وہ نقشہ جو قرآن نے پیش کیا ہے اس کی سکندرِ اعظم کی زندگی کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔

بہرحال جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ذوالقرنین قدیم ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس کا لقب تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایران کے علاقے میں دو الگ الگ خود مختار مملکتیں قائم تھیں۔ ایک کا نام پارس تھا جس سے ''فارس'' کا لفظ بنا ہے اور دوسرے کا نام ''مادا'' تھا۔ کیخورس یا سائرس نے ان دونوں مملکتوں کو ملا کر ایک ملک بنا دیا اور یوں سلطنتِ ایران کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ دو مملکتوں کے فرمانروا ہونے کی علامت کے طور پر اس نے اپنے تاج میں دو سینگ لگا رکھے تھے اور اس طرح اس کا لقب ذوالقرنین (دو سینگوں والا) پڑ گیا۔

ذوالقرنین کے بارے میں جدید تحقیق کو اہلِ علم کے حلقے میں متعارف کرانے کا سہرا مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں اس موضوع پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قدیم ایران کا بادشاہ کیخورس یا سائرس ہی ذوالقرنین تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تحقیق کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایک کھدائی کے دوران دستیاب ہوئی تھیں۔ اس کھدائی کے دوران اس عظیم فاتح بادشاہ کا ایک مجسمہ بھی دریافت ہوا تھا اور مقبرہ بھی۔ اس کھدائی سے ملنے والی معلومات کی بنیاد پر رضا شاہ پہلوی نے اُس کی اڑھائی ہزار سالہ برسی منانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ دریافت شدہ مجسمے کے سر پر جو تاج تھا اس میں دو سینگ بھی موجود تھے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایران کا یہی بادشاہ (کیخورس یا سائرس) تھا جو تاریخ میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں نے خصوصی طور پر یہ سوال کیوں پوچھا تھا اور ذوالقرنین کی شخصیت میں ان کی اس دلچسپی کا سبب کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ملتا ہے۔ جب ۵۸۷ قبل مسیح کے لگ بھگ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کر کے یروشلم کو تباہ کیا تو اس شہر کی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا گیا اور زندہ بچ جانے والوں کو وہ اپنی فوج کے ساتھ بابل (Babilonia) لے گیا' جہاں یہ لوگ ڈیڑھ سو سال تک اسیری کی حالت میں رہے۔

جب ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس (آئندہ سطور میں انہیں ''ذوالقرنین'' ہی لکھا جائے گا) نے ایران کو متحد کرنے کے بعد اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو سب سے پہلے اس نے عراق کو فتح کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ نقشے کو ذہن میں رکھا جائے تو فلسطین' اسرائیل' شرق اردن اور لبنان کے ممالک پر مشتمل پورے علاقے کو اُس زمانے میں شامِ عرب یا شام اور اس سے مشرق میں واقع علاقے کو عراقِ عرب یا عراق کہا جاتا تھا' جبکہ عراق کے مزید مشرق میں ایران واقع تھا۔ عراق پر قبضہ کرنے کے بعد ذوالقرنین نے بابل میں اسیر یہودیوں کو آزاد کر دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے ملک واپس جا کر اپنے تباہ شدہ شہر یروشلم کو دوبارہ آباد کر لیں۔ چنانچہ حضرت عزیرؑ کی قیادت میں یہودیوں کا قافلہ بابل سے واپس یروشلم آیا۔ انہوں نے اپنے اس شہر کو پھر سے آباد کیا اور ہیکلِ سلیمانی کو بھی از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس پس منظر میں یہودی ذوالقرنین کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور اسی سبب سے ان کے بارے میں انہوں نے حضورﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا۔

ذوالقرنین کی فتوحات کے سلسلے میں تین مہمات کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ان مہمات میں ایران سے مغرب میں بحیرۂ روم (Mediterranian) تک پورے علاقے کی تسخیر' مشرق میں بلوچستان اور مکران تک لشکر کشی اور شمال میں بحیرۂ خزر (Caspian Sea) اور بحیرۂ اسود (Black Sea) کے درمیانی پہاڑی علاقے کی فتوحات شامل ہیں۔ ذوالقرنین کا یہ سلسلۂ فتوحات حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت کی فتوحات کے سلسلے سے مشابہ ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بھی جزیرہ نمائے عرب سے مختلف سمتوں میں تین لشکروں

نے پیش قدمی کی تھی‘ ایک لشکر شام اور پھر مصر گیا تھا‘ دوسرے لشکر نے عراق کے بعد ایران کو فتح کیا تھا‘ جبکہ تیسرا لشکر شمال میں کوہ قاف (Caucasus) تک جا پہنچا تھا۔

قدیم روایات میں ذوالقرنین کے بارے میں کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہیں کہ ابتدائی عمر میں وہ ایک چھوٹی سی مملکت کے شہزادے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ کچھ لوگ ان کی جان کے درپے ہوگئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور کچھ عرصہ صحرا میں روپوش رہے۔ اسی عرصے کے دوران ان تک کسی نبی کی تعلیمات پہنچیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زرتشت ہی اللہ کے نبی ہوں اور انہی کی تعلیمات سے انہوں نے استفادہ کیا ہو۔ بہرحال قرآن حکیم نے ذوالقرنین کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک نیک اور صالح بندۂ مومن کا کردار ہے اور اس کردار کی خصوصیات تاریخی اعتبار سے اس زمانے کے کسی اور فاتح حکمران پر منطبق نہیں ہوتیں۔

ذوالقرنین کی مہمات کے حوالے سے سورۃ الکہف کے اس رکوع میں قومِ یاجوج ماجوج اور اس دیوار کا ذکر بھی آیا ہے جو ذوالقرنین نے اپنی سلطنت کے شمالی علاقوں کے عوام کو یاجوج ماجوج کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کی تھی۔

یہ یاجوج ماجوج کون ہیں؟ ان کے بارے میں جاننے کے لیے نسل انسانی کی قدیم تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ قدیم روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی آپؑ کے تین بیٹوں سام‘ حام اور یافث سے چلی تھی۔ ان میں سے سامی نسل تو بہت معروف ہے۔ قومِ عاد‘ قومِ ثمود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سامی نسل سے تھے۔ حضرت یافث کی اولاد کے لوگ وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے شمال کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ان کی نسل بڑھتے بڑھتے شمالی ایشیا اور یورپ کے علاقوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشرق میں چین اور ہند چینی کی yellow races‘ مغرب میں روس اور سکنڈے نیوین ممالک کی اقوام‘ مغربی یورپ کے Anglo Saxons‘ مشرقی یورپ میں خصوصی طور پر شمالی علاقوں اور صحرائے گوبی کے علاقوں کی تمام آبادی حضرت یافث کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ تورات میں حضرت یافث کے بہت سے بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں Mosc, Tobal, Gog & Magog وغیرہ قابل ذکر ہیں (ممکن ہے روس کا شہر ماسکو‘ حضرت یافث کے بیٹے ماسک نے آباد کیا ہو)۔ اسی طرح Baltic Sea اور Baltic States کا نام غالباً Tobal کے نام پر ہے۔ بہرحال یورپ کی اینگلوسیکسن اقوام اور تمام Nordic Races یاجوج ماجوج ہی کی نسل سے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غیر متمدّن اور وحشی لوگ تھے جن کا پیشہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ وہ اپنے ملحقہ علاقوں پر حملہ آور ہوتے‘ قتل و غارت کا بازار گرم کرتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ ان کی اس غارت گری کی جھلک موجودہ دنیا نے بھی دیکھی جب Anglo Saxons نے ایک سیلاب کی طرح یورپ سے نکل کر دیکھتے ہی دیکھتے پورے ایشیا اور افریقہ کو نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ بعدازاں مختلف عوامل کی بنا پر انہیں ان

علاقوں سے بظاہر پسپا تو ہونا پڑا مگر حقیقت میں دنیا کے بہت سے ممالک پر بالواسطہ اب بھی ان کا قبضہ ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے ان کی اسی بالواسطہ حکمرانی کو مضبوط کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

قربِ قیامت میں ان قوموں کی دنیا پر ایک اور یلغار ہونے والی ہے۔ اس کی تفصیلات احادیث اور روایات میں اس طرح آئی ہیں کہ قیامت سے قبل دنیا ایک بہت ہولناک جنگ کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ اس جنگ کو احادیث میں ''اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی'' جبکہ بائبل میں Armageddon کا نام دیا گیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ اس جنگ کا مرکزی میدان بنے گا۔ اس جنگ میں ایک طرف عیسائی دنیا اور تمام یورپی اقوام ہوں گی اور دوسری طرف مسلمان ہوں گے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک عظیم لیڈر امام مہدی کی صورت میں عطا کرے گا۔ امام مہدی عرب میں پیدا ہوں گے اور وہ مجدد ہوں گے۔ پھر کسی مرحلے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ خراسان کے علاقے سے مسلمان افواج امام مہدی کی مدد کو جائیں گی۔ پھر اس جنگ کا خاتمہ اس طرح ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کر دیں گے' یہودیوں کا صفایا ہو جائے گا اور تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے۔ یوں اسلام کو عروج ملے گا اور دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ (اللہ تعالیٰ مسلمانانِ پاکستان کو توفیق دے کہ اس سے پہلے وہ یہاں نظامِ خلافت قائم کر لیں اور ہمسایہ علاقہ خراسان سے جو فوجیں امام مہدی کی مدد کے لیے روانہ ہوں ان میں ہمارے لوگ بھی شامل ہوں۔)

جب وہ ہولناک جنگ اپنے انجام کو پہنچ جائے گی تو اس کے بعد ان علاقوں کے لوگوں کو یاجوج ماجوج کی یلغار کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں یہ لوگ چین اور ہندچینی وغیرہ علاقوں کی طرف سے حملہ آور ہوں گے۔ یہ لوگ Armageddon میں حصہ نہیں لیں گے بلکہ اس کے بعد اس علاقے پر یلغار کر کے تباہی مچائیں گے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۶ میں اُن کی اس یلغار کا ذکر قربِ قیامت کے واقعات کے حوالے سے آیا ہے۔

سب سے بڑا گھاٹا کھانے والے بدقسمت انسان

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۝ (الکہف)

آیت ۱۰۳ ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝﴾ ''آپ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟''

یہ مضمون سورۃ الکہف کا عمود ہے۔ اس مضمون کے سائبان کا ایک کھونٹا سورت کے آغاز میں جبکہ دوسرا کھونٹا یہاں ان آیات کی صورت میں نصب ہے۔ ابتدائی آیات میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ دنیا کی زیب وزینت

اور رونقوں پر مشتمل یہ خوبصورت محفل سجائی ہی انسانوں کی آزمائش کے لیے گئی ہے۔ اس کے ذریعے سے انسانوں کے رویوں کی پرکھ پڑتال کرنا اور ان کی جدوجہد کی غرض وغایت کو جانچنا مقصود ہے: ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ⑦﴾ ''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار تا کہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں''۔ اب یہاں آیت زیرِ نظر میں اُن لوگوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو اپنے اعمال' اپنی محنت و مشقت' بھاگ دوڑ اور سعی وجہد میں سب سے زیادہ گھاٹا کھانے والے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر دنیا کی زیب وزینت ہی میں کھو گئے ہیں۔

جہاں تک محنت اور مشقت کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کرتا ہے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((کُلُّ النَّاسِ یَغۡدُوۡ فَبَائِعٌ نَفۡسَہٗ، فَمُعۡتِقُھَا اَوۡ مُوۡبِقُھَا)) (صحیح مسلم) ''ہر انسان جب صبح کرتا ہے تو خود کو بیچنا شروع کرتا ہے' پھر یا تو وہ اسے آزاد کرا لیتا ہے یا (گناہوں سے) ہلاک کر دیتا ہے''۔ چنانچہ اس دنیا میں ہر کوئی اپنے آپ کو بیچتا ہے۔ کوئی اپنی طاقت اور قوت بیچتا ہے' کوئی اپنی ذہانت اور علمی استعداد بیچتا ہے اور کوئی اپنا وقت اور ہنر بیچتا ہے۔ گویا یہ دنیا محنت' عمل اور کوشش کی دوڑ کا میدان ہے اور ہر انسان اپنے مفاد کے لیے بقدرِ ہمت اس دوڑ میں شامل ہے۔ مگر بدقسمتی سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی پوری کوشش اور کمر توڑ محنت کے باوجود گھاٹے میں رہتے ہیں۔ انہیں خود کو بیچنے کے اس عمل میں کچھ بھی نفع نہیں ملتا بلکہ نقصان ہی نقصان اور خسارا ہی خسارا اٹھانا پڑتا ہے۔ ان آیات میں انہی لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

آیت ۱۰۴ ﴿اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی وجہد دنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی''

یہ دراصل وہ لوگ ہیں جنہیں آخرت مطلوب ہی نہیں' ان کی ساری تگ ودو اور سوچ بچار صرف دنیا کمانے کے لیے ہے۔ آخرت کے لیے انہوں نے نہ تو کبھی کوئی منصوبہ بندی کی ہے اور نہ ہی کوئی محنت۔ بس برائے نام اور موروثی مسلمانی کا بھرم رکھنے کے لیے کبھی کوئی نیک کام کر لیا' کبھی نماز بھی پڑھ لی اور کبھی روزہ بھی رکھ لیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اصل میں اُن سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس بارے میں انہوں نے کبھی سنجیدگی سے سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ایسے لوگوں کو ان کی محنت کا صلہ حسبِ مشیتِ الٰہی دنیا ہی میں مل جاتا ہے' جبکہ آخرت میں ان کے لیے سوائے جہنم کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اس مضمون کا ذروۂ سنام سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیات ہیں: ﴿مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَہٗ جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلٰىہَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ⑱ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَہَا سَعۡیَہَا وَہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُہُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ⑲﴾ ''جو کوئی طلب گار بنتا ہے جلدی والی (دنیا) کا تو ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں' جس کے لیے چاہتے ہیں' پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم' وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ' دھتکارا ہوا۔ اور جو کوئی آخرت کا طلبگار ہو' اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو وہی لوگ ہوں گے جن کی

کوشش کی قدر کی جائے گی۔''

چنانچہ نجاتِ اخروی کا امیدوار بننے کے لیے ہر بندۂ مسلمان کو واضح طور پر اپنا راستہ متعین کرنا ہوگا کہ وہ دنیا کا خریدار ہے یا آخرت کا طلب گار؟ جہاں تک دُنیا میں رہتے ہوئے ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک و بد سب کی پوری ہو رہی ہیں: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''ہم سب کو مدد پہنچائے جا رہے ہیں' ان کو بھی اور ان کو بھی' آپؐ کے رب کی عطا سے' اور آپؐ کے رب کی عطا رکی ہوئی نہیں ہے''۔ لہٰذا انسان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنا چاہیے۔ اُس نے انسان کو دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو وہ اس کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرے گا۔ اگر وہ اس پر توکل کرے گا تو: ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ﴾ (الطلاق: ۳) ''وہ اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا''۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ فکرِ دنیا سے بے نیاز ہو کر آخرت کو اپنا مطلوب و مقصود بنائے' اور ان لوگوں کے راستے پر نہ چلے جنہوں نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے' جن کی ساری محنت اور تگ و دو دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی ہے:

﴿وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

ایسے لوگ اپنے کاروبار کی ترقی' جائیدادوں میں اضافے اور دیگر مادی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ان کی محنتیں روز بروز نتیجہ خیز اور کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔

آیت ۱۰۵ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیات اور اُس کی ملاقات کا''

ایسے لوگ بے شک اقرار کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو اور قرآن کو مانتے ہیں' لیکن اگر حقیقتاً وہ آخرت کو بھلا کر دن رات دنیا سمیٹنے ہی میں مصروف ہیں تو اپنے عمل سے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور آخرت میں اس سے ہونے والی ملاقات کا انکار کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو یہ ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ﴾ (العنکبوت: ۶۴) ''یقیناً آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے''۔ لیکن طالبانِ دنیا کا عمل اللہ تعالیٰ کی اس بات کی تصدیق کرنے کے بجائے اس کو جھٹلاتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات کو اور اس کے سامنے روزِ محشر کی حاضری کو عملی طور پر جھٹلا دیا ہے۔

﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾﴾ ''تو برباد ہو گئے ان کے اعمال اور ہم قائم نہیں کریں گے ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن۔''

قیامت کے دن ایسے لوگوں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ اگر انہوں نے اپنے دل کی تسلی اور ضمیر کی خوشی کے لیے بھلائی کے کچھ کام کیے بھی ہوں گے تو ایسی نیکیاں جو ایمان اور یقین سے خالی ہوں گی ان کی اللہ

تعالیٰ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہوگی ۔ چنانچہ ان کی ایسی تمام نیکیاں ضائع کر دی جائیں گی اور میزان میں ان کا وزن کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی ۔ اس بھیانک انجام کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی آرائش وزیبائش میں گم ہو کر انسان کو نہ اللہ کا خیال رہتا ہے اور نہ آخرت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے ۔

آیت ۱۰۶ ﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ۝۱۰۶﴾ ’’ان کا بدلہ جہنم ہے بسبب اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوںؑ کا مذاق اڑایا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے رسولوں کے فرمودات کے مطابق تو اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دُنیوی زندگی کی کچھ اہمیت نہیں‘ مگر ان طالبانِ دنیا نے سمجھ رکھا تھا کہ اصل کامیابی اسی دُنیوی زندگی کی ہی کامیابی ہے ۔ چنانچہ اسی کامیابی کے حصول کے لیے انہوں نے محنت اور کوشش کی اور اسی زندگی کو سنوارنے کے لیے وہ خود کو ہلکان کرتے رہے ۔ آخرت کو انہوں نے نہ تو لائق اعتناء سمجھا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی سنجیدہ تگ و دو کی ۔ آخرت کا خیال کبھی آیا بھی تو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ ہم نے فلاں فلاں بھلائی کے کام بھی تو کیے ہیں اور پھر ہم حضور ﷺ کے اُمتی بھی تو ہیں ۔ آپؐ ہماری شفاعت فرمائیں گے اور ہم کامیاب و کامران ہو کر جنت میں پہنچ جائیں گے ۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ دراصل یہودیوں کے عقیدے سے ملتا جلتا ہے ۔ وہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹوں کی مانند ہیں‘ اس کے لاڈلے اور چہیتے ہیں ۔

ان آیات کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ یہاں کفار سے مراد اصطلاحی کفار نہیں‘ بلکہ ایسے لوگ ہیں جو قانونی طور پر تو مسلمان ہی ہیں‘ مگر اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کو پس پشت ڈال کر سرتاپا دنیا کے طالب بنے بیٹھے ہیں ۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مذکورہ مفہوم میں ہر وہ شخص جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کا طالب ہے وہ ان آیات کا مصداق ہے‘ بظاہر چاہے وہ مسلمان ہو‘ مسلمانوں کا لیڈر ہو‘ مذہبی پیشوا ہو یا کوئی بہت بڑا عالم ہو ۔ اسی مضمون کو کسی بزرگ نے ’’جو دم غافل سو دم کافر‘‘ کے الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ چنانچہ آخرت کی نجات کے سلسلے میں یہ بات طے کرنا انتہائی ضروری ہے کہ بنیادی طور پر انسان طالب دنیا ہے یا طالب آخرت !

سورۃ الکہف کے آخری رکوع کی ان آیات کا اس سورت کی ابتدائی آیات کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور دجالی فتنے سے حفاظت کے لیے ان آیات کی تلاوت کی خصوصی اہمیت ہے‘ چنانچہ حدیث میں ان آیات کی تلاوت کو فتنہ دجال سے حفاظت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے ۔ اس لیے بہتر ہے کہ ابتدائی دس آیات اور آخری نو (۹) آیات کو حفظ کر لیا جائے اور کثرت سے ان کی تلاوت کی جائے ۔ اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو جمعہ کے روز پوری سورۃ الکہف کی تلاوت کو بھی معمول بنایا جائے ۔

صِدّیق نبیؑ اور رسول نبیؑ

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ۝ (مریم)

''اور تذکرہ کیجیے اس کتاب میں ابراہیمؑ کا۔ یقیناً وہ صِدّیق نبی تھے۔''

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور اسی سورت (سورۂ مریم) کی آیت ۵۶ میں حضرت ادریس علیہ السلام کو ''صِدِّيقًا نَّبِيًّا'' فرمایا گیا ہے' جبکہ سورۂ مریم کی آیات ۵۱ اور ۵۴ میں بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ''رَسُولًا نَّبِيًّا'' کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ گویا یہ دو الگ الگ تراکیب ہیں اور ظاہر ہے ان میں سے ہر ترکیب کا اپنا الگ مفہوم ہے۔ میرے علم کی حد تک ان الفاظ یا تراکیب کی طرف کسی اہلِ علم نے توجہ نہیں کی' بلکہ مجھے اس وقت سخت حیرت ہوئی جب میں نے ایک معروف عالمِ دین اور مفسرِ قرآن سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ یعنی کیا واقعی قرآن میں دو انبیاء کے بارے میں ''صِدِّيقًا نَّبِيًّا'' اور دو کے بارے میں ''رَسُولًا نَّبِيًّا'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں؟ وہ خود قرآن کی مکمل تفسیر لکھ چکے تھے مگر اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ یہ نکتہ' جس حد تک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر منکشف فرمایا ہے' اس حد تک میں دوسروں تک پہنچا دوں۔

ان دو تراکیب کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو سورۃ الفاتحہ کی یہ آیات مدنظر رہنی چاہئیں جن میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا''۔ اور پھر سورۃ النساء کی اس آیت پر غور ضروری ہے جس میں ان لوگوں کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ ''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاء کرام' صِدّیقین' شہداء اور صالحین' اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے''۔ اس آیت میں ان لوگوں کے چار درجات بیان ہوئے ہیں جو ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' (جن پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوا) کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں سب سے اوپر انبیاء کا درجہ ہے' پھر صِدّیقین کا' پھر شہداء کا' جبکہ نیچے base line پر صالحین ہیں' یعنی نیک دل' مخلص مسلمان جو صادق القول اور صادق الایمان ہیں۔ اگر نیچے سے اوپر کی طرف ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جائے تو base line پر پہلا درجہ مؤمنین صالحین کا ہے۔ اگر کوئی اس درجہ سے ترقی کرے گا تو اس کے لیے درجہ شہادت ہے اور پھر اس سے اوپر درجہ صدیقیت۔ اس لحاظ سے درجہ صدیقیت گویا کسی بھی انسان کے لیے روحانی ترقی کے مدارج میں بلند ترین درجہ ہے' کیونکہ اس کے اوپر نبوت کا درجہ ہے' جو اکتسابی نہیں' سراسر وہبی ہے اور اب نبوت کا دروازہ نوعِ انسانی کے لیے مستقل طور پر بند ہو چکا ہے۔

صدیقین اور شہداء کے فرق کو سائیکالوجی کی دو جدید اصطلاحات کے ذریعے اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف مزاجوں پر پیدا فرمایا ہے۔ مزاج اور رویے کے اعتبار سے جدید سائیکالوجی انسانوں کو

بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جو لوگ مجلس پسند ہوں' تنہائی سے گھبراتے ہوں' ہر وقت سیر سپاٹے کرنے' لوگوں سے ملنے جلنے اور خوش گپیوں میں خوش رہتے ہوں' انہیں بیروں بین (exroverts) کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس تنہائی پسند' اپنے خیالوں میں مگن رہنے اور محفلوں سے حتی المقدور اجتناب کرنے والے لوگ دروں بین (introverts) کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری کیفیت بھی ممکن ہے جو ان دو رویوں کے خوبصورت توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ جن کی شخصیات میں مذکورہ دونوں رویے توازن کے ساتھ موجود ہوں وہ ambiverts کہلاتے ہیں' لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے کہ ایک شخص میں دونوں رویے توازن کے ساتھ موجود ہوں۔ اس لیے ambiverts قسم کے لوگ عملاً بہت ہی کم ہوتے ہیں اور عمومی طور پر دنیا میں مزاج کے اعتبار سے مندرجہ بالا دو اقسام کے لوگ ہی پائے جاتے ہیں۔

دروں بین (introverts) قسم کے لوگ غور و فکر کی اپنی عادت کے باعث فطرت کے حقائق کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ کائنات کے بارے میں سوچ بچار کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی آفاقی آیات اُن سے ہم کلام ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں اہم حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم کی مدد سے (علم وحی کی راہنمائی کے بغیر بھی) اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ خود ہی آخرت کی ضرورت اور حقیقت کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور اس نتیجے پر بھی پہنچ جاتے ہیں کہ بندگی صرف اللہ ہی کی کرنی چاہیے۔ لیکن اللہ کی بندگی کا طریقہ کیا ہو؟ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے راہنمائی کی التجا کرتے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سورۃ الفاتحہ میں مذکور دعا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵﴾ گویا ایسے لوگوں کی فطرت کی پکار ہے۔ یہ لوگ دراصل صدیقین ہوتے ہیں اور ان کی شان یہ ہے کہ جونہی کوئی الہامی دعوت ان تک پہنچتی ہے وہ اسے اس انداز میں لپک کر قبول کرتے ہیں گویا مدت سے اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے جس کے سامنے بھی ایمان کی دعوت پیش کی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے۔ یعنی آپؓ نے ایک لمحے کے لیے بھی توقف نہیں کیا اور اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت پر ایسے لبیک کہا جیسے وہ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

البتہ بیروں بین (extroverts) قسم کے لوگ چونکہ خود کو کھیل کود' سیر و شکار' میل ملاقات وغیرہ میں مصروف رکھتے ہیں' اس لیے اُن کا طبعی میلان غور و فکر کی طرف نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ کسی الہامی دعوت کو سمجھنے میں ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں' اور جب وہ کسی ایسے معاملے کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اکثر جذباتی انداز میں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی نظریے یا دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو عام طور پر بہت زیادہ متحرک اور فعال ثابت ہوتے ہیں اور یوں مسابقت میں بظاہر introverts سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کی دعوت کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جہاں ایک لمحے کے توقف کے بغیر قبول کر لیا وہاں حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کو اس

طرف متوجہ ہونے میں چھ سال لگ گئے۔ حضرت عمرؓ تو بنو عدی میں سے تھے اور آپؐ کی حضورﷺ کے ساتھ بظاہر زیادہ قربت نہیں تھی، مگر حضرت حمزہؓ تو آپؐ کے سگے چچا اور دودھ شریک (رضاعی) بھائی تھے۔ وہ بچپن میں آپؐ کے ساتھ کھیلے تھے اور آپؐ سے بہت محبت بھی کرتے تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود چھ سال تک آپؓ نے حضورﷺ کی دعوت کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا اور جب ایمان لائے تو حادثاتی اور جذباتی انداز میں لائے۔

ایک روز آپؓ شکار سے واپس آئے تو لونڈی نے حضورﷺ سے ابوجہل کی گستاخی کے بارے میں خبر دی۔ بس یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ گھر جانے کے بجائے سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے۔ جاتے ہی اس کے سر پر کمان دے ماری اور اسے للکارا کہ آج سے میں بھی ایمان لے آیا ہوں، تم میرا مقابلہ کر سکتے ہو تو آؤ میدان میں! ایسے ہی حضرت عمرؓ بھی جذباتی انداز میں ایمان لائے۔ گھر سے محمدٌ رسول اللہﷺ کو (معاذ اللہ!) قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں جذبات کی رو میں بہن اور بہنوئی سے بھی جا اُلجھے۔ بہن کی غیر معمولی استقامت دیکھی تو سوچنے پر مجبور ہوئے اور جب سنجیدگی سے غور کیا تو یکدم دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ پھر کیا تھا؟ وہی شمشیر برہنہ جو قتل کے ارادے سے لے کر نکلے تھے، گردن میں لٹکائے غلاموں کی طرح درِ نبوت پر حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ بہر حال اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دروں بین (introverts) قسم کے لوگ ''صِدّیقین'' اور بیروں بین (extroverts) مزاج کے افراد ''شہداء'' ہوتے ہیں۔

انسانی مزاج کا یہ فرق ظاہر ہے انبیاء کی شخصیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ انبیاء کا مزاج صدیقین سے مناسبت رکھتا ہے اور کچھ کا شہداء سے۔ جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار کے بہت شوقین تھے اور اسی شوق میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دو مرتبہ آپؑ سے ملنے کے لیے مکہ گئے، مگر آپؑ کے گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے دونوں مرتبہ باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزاج بھی جلالی تھا۔ آپؑ نے مصر میں ایک آدمی کو مُکا رسید کیا تو اس کی جان ہی نکل گئی ـــــ انسانی مزاج کی اس تشریح کے اعتبار سے میرا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کی شخصیات ''صِدّیقیت'' کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں، اس لیے وہ ''صدیق نبی'' قرار پائے، جبکہ حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی شخصیات شہداء جیسی تھیں، چنانچہ وہ ''رسول نبی'' کہلائے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی مدِنظر رہنا چاہیے کہ رسالت اور شہادت کے الفاظ کی آپس میں خصوصی مناسبت ہے۔ ہر رسول کو اپنی قوم کی طرف شاہد بنا کر بھیجا گیا۔ کارِ رسالت یعنی دعوت و تبلیغ اور اتمامِ حجت میں عمل کا پہلو غالب ہے۔ حضورﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾﴾ ''اے نبی! بلاشبہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا''۔ اسی طرح سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿فَكَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ﴿۴۱﴾﴾

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم لائیں گے ہر اُمت میں سے ایک گواہ اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو ہم لائیں گے ان پر گواہ''۔اس ساری وضاحت کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ سورۂ مریم کی مذکورہ آیات میں شہداء کا مزاج رکھنے والے انبیاء کو ''رَسُولًا نَّبِیًّا'' اور صدیقیت کے مزاج کے حامل انبیاء کو ''صِدِّیقًا نَّبِیًّا'' کے لقب سے یاد فرمایا گیا ہے۔

حق کے مقابلے میں بالآخر ہزیمت اٹھانا باطل کا مقدر ہے

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ۝١٨ (الانبیاء)

''بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' تو جبھی وہ نابود ہو جاتا ہے۔اور تمہارے لیے تباہی ہے اس کی وجہ سے جو تم لوگ بیان کر رہے ہو۔''

یہ تاریخِ انسانی کا قرآنی فلسفہ ہے۔دوسری طرف ایک نظریہ اسپنگر کا بھی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ قوموں کی زندگی ایک فرد کی زندگی سے مشابہ ہے۔یعنی جس طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' بچپن گزارتا ہے' جوانی کو پہنچتا ہے' بوڑھا ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے' ایسے ہی دنیا میں قومیں اور ان کی تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں' ترقی کرتی ہیں' بامِ عروج پر پہنچتی ہیں اور پھر اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کے باعث زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔اس ضمن میں کارل مارکس نے جو Dialectical Materialism کا نظریہ (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو' سورۃ الرعد' آیت ۱۷ کی تشریح) پیش کیا ہے' وہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔

بہر حال آیت زیر نظر کے مطابق دنیا میں حق و باطل کی جو کشمکش جاری ہے اس میں ایک طرف ابلیس' اس کی نسل اور اس کے ایجنٹ ہیں' جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے نیک بندے' انبیاء و رسل' صدیقین' شہداء اور مؤمنین صادقین ہیں۔قرآن کے اس فلسفہ کو اقبالؔ نے اس طرح بیان کیا ہے:؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

مشیتِ الٰہی سے کبھی کبھی یہ کشمکش دھماکہ خیز ہو کر باقاعدہ ایک معرکے کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ طالبانِ حق کی مدد کرتا ہے اور اُن کی طاقت کے ذریعے باطل کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

حق و باطل کا ایسا ہی ایک بہت خوفناک معرکہ قربِ قیامت کے زمانے میں ہونے والا ہے۔یہ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ہوگا جس کو عیسائی روایات میں Armageddon جبکہ احادیث میں ''المَلحَمةُ العُظمٰی'' کا نام دیا گیا ہے۔علامہ اقبال نے مستقبل کے اس معرکے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

یہاں علامہ اقبال نے لفظ ''تہذیب'' کے ذریعے اسی مخصوص ذہنیت اور سوچ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے تحت فرعون نے اپنے عوام کو ''طَرِیۡقَتِکُمُ الۡمُثۡلٰی'' کے نام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت تمہارے مثالی تہذیب وتمدن کو ایک بڑا خطرہ درپیش ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کو جب بھی منظور ہوتا ہے کوئی تحریک یا کوئی جمعیت حق کی علمبردار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور باطل اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ایسی ہی قوم یا جماعت اللہ کے دست قدرت کی وہ تلوار ہے جس سے وہ باطل کا قلع قمع کرتا ہے: ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

یاجوج اور ماجوج کی یلغار کا ذکر

حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَ مَاۡجُوۡجُ وَ هُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ (الانبیاء)

''یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج' اور وہ ہر اونچائی کے اوپر سے پھسلتے ہوئے چلے آئیں گے۔''

قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر اس آیت کے علاوہ سورۃ الکہف کی آیت ۹۹ میں بھی آیا ہے۔ سورۃ الکہف کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ یاجوج اور ماجوج کی یلغار سے بچاؤ کے لیے ذوالقرنین کی تعمیر شدہ دیوار سے متعلق بہت واضح معلومات اب دنیا کے سامنے آ چکی ہیں۔ دنیا کے نقشے میں ''دربند'' وہ جگہ ہے جہاں پر وہ دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ دیوار اب وہاں بالفعل تو قائم نہیں' مگر اس کے واضح آثار اس جگہ پر موجود ہیں۔ ان آثار سے دیوار کی dimensions کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

آیت زیر نظر سے واضح ہوتا ہے کہ قُربِ قیامت کے زمانے میں یاجوج اور ماجوج کا سیلاب ایک بار پھر آنے والا ہے۔ اس سلسلے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران یورپی اقوام کی یلغار (colonization) بھی اس آیت کا مصداق ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے پورے ایشیا اور افریقہ پر بتدریج قبضہ جما لیا تھا۔ یعنی ایک ہی وقت میں فرانسیسی' ولندیزی اور برطانوی اقوام نے ملایا' انڈونیشیا' ہندوستان سمیت پورے ایشیا اور افریقہ کو غلام بنا لیا تھا۔ یہ تمام لوگ سکنڈے نیوین ممالک سے اتری ہوئی اقوام کی نسل سے تھے' جن کو Nordic Races کہتے ہیں اور یورپ کے White Anglo Saxons لوگ بھی انہی کی اولاد سے ہیں۔ دراصل یہی وہ اقوام ہیں جو مختلف ادوار میں مہذب دنیا پر حملہ آور ہو کر ظلم وستم اور

لوٹ مار کا بازار گرم کرتی رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے اس شعر میں یورپی اقوام کے اس نوآبادیاتی استعمار (colonization) کو یاجوج اور ماجوج کے تسلّط سے تعبیر کیا ہے:۔

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ یَنۡسِلُوۡن!

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بظاہران اقوام کی افواج کو ان مقبوضہ ممالک سے نکلنا پڑا' لیکن بالواسطہ طور پر وہ اپنے کٹھ پتلی اداروں اور افراد کے ذریعے ان ممالک پر مسلسل اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ورلڈ بینک' آئی ایم ایف اور بہت سے دیگر ملٹی نیشنل ادارے ان کے آلۂ کار ہیں۔

احادیث میں قربِ قیامت کے زمانے کے حالات و واقعات کی جو تفصیل ملتی ہے اس کے مطابق قیامت سے قبل ایک دفعہ پھر دنیا پر یاجوج اور ماجوج کی یلغار ہوگی۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ قربِ قیامت کے زمانے میں ایک بہت خوفناک جنگ (احادیث میں اس کا نام المَلحَمۃ العُظمٰی' جبکہ عیسائی روایات میں Armageddon بتایا گیا ہے) ہوگی جس میں یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے مقابل ہوں گے۔ فلسطین' شام اور مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ بنیادی طور پر میدانِ جنگ بنے گا' جس کی وجہ سے اس علاقے میں بہت بڑی تباہی پھیلے گی۔ اسی زمانے میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول اور امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ امام مہدی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ اس سے پہلے خراسان اور مشرقی ممالک میں اسلامی حکومت قائم ہوچکی ہوگی اور ان علاقوں سے مسلمان افواج مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے جائیں گی۔ اس جنگ میں بالآخر فتح مسلمانوں کی ہوگی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائید ہوگی' جس کی وجہ سے یہودیوں کے خلاف مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ آپؑ کی آنکھوں میں ایک خاص تاثیر (آج کی لیزر ٹیکنالوجی سے بھی زیادہ مؤثر) ہوگی' جس کی وجہ سے آپؑ کی نگاہ پڑتے ہی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ پھر آپؑ دجال (جو مسیح ہونے کا جھوٹا دعوے دار ہوگا) کو قتل کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دجال بھاگنے کی کوشش میں ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس کو مقامِ لُدّ پر جالیں گے اور قتل کر دیں گے۔ (واضح رہے کہ آج Lydda اسرائیل کا سب سے بڑا ایئربیس ہے۔)

ان سب واقعات کے بعد یاجوج اور ماجوج کے سیلاب کی شکل میں ایک دفعہ پھر دنیا پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔ آیت زیرِ نظر میں یاجوج اور ماجوج کی یلغار کے راستوں (routs) کے لیے لفظ ''حَدَب'' استعمال ہوا ہے' جس کے معنی اونچائی کے ہیں۔ مندرجہ بالا آراء کے مطابق جن اقوام پر یاجوج اور ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے ان سب کے علاقے ہمالیہ اور وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلوں کے شمال میں واقع ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ ان پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے جنوبی علاقوں پر یلغار کریں اور یوں ''مِنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ'' کے الفاظ کی عملی تعبیر کا نقشہ دنیا کے سامنے آجائے۔

وقوعِ قیامت کے حالات کی ایک جھلک

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (الانبیاء)

آیت ۱۰۳ ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ ''وہ بڑی گھبراہٹ انہیں پریشان نہیں کرے گی''

قیامت کی صورت حال بہت ہی بھیانک ہوگی۔ سورۃ الحج کے آغاز میں قیامت کی ہولناک کیفیت کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①﴾ ''اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ قیامت کا زلزلہ یقیناً بہت بڑی چیز ہے''۔ البتہ آیت زیرنظر میں یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو اس سے کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہوگی۔

''فزع اکبر'' سے مراد یہاں صرف قیامت کے دن کی سختیاں ہی نہیں بلکہ اس لفظ میں زمانۂ قربِ قیامت کی سختیوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس صورتِ حال کا ذکر احادیث میں کافی تفصیل سے ملتا ہے۔ اِن تفصیلات کے مطابق قربِ قیامت کے زمانہ میں مسلمانوں کو عیسائیوں اور یہودیوں کے خلاف ایک بہت خوفناک جنگ لڑنا ہوگی۔ اس جنگ کے کئی مراحل ہوں گے۔ مسلمانوں کو اس میں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا' لیکن اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد مسلمانوں کے شامل حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مدد ظاہری اور مادی اسباب کی صورت میں بھی سامنے آئے گی۔ انہی اسباب میں سے ایک سبب سرزمین عرب میں ایک مجدد امام مہدی کا ظہور بھی ہوگا۔ پھر جب حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا تو مسلمان حضرت مسیحؑ اور امام مہدی کی قیادت میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اتحاد کا مقابلہ کریں گے۔ اس سے پہلے خراسان اور افغانستان کے علاقوں میں (میرے اندازے کے مطابق اس میں پاکستان کا علاقہ بھی شامل ہوگا) اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہوگی اور اس حکومت کی طرف سے مذکورہ جنگ میں مسلمانوں کی مدد کے لیے افواج بھیجی جائیں گی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد آزمائش کا آخری مرحلہ یاجوج اور ماجوج کی یلغار کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اس کے بعد اسلام کا غلبہ ہوگا اور پوری دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو جائے گی' جو لگ بھگ چالیس سال (مختلف روایات میں مختلف مدت مذکور ہے) تک رہے گی۔ یہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت کی تاریخ کا پانچواں دور ہوگا' جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ

يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا، فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ (مسند احمد)

''دورِ نبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دور ہوگا' پھر وہ دور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کر دے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔''

اس حدیث کی رو سے پہلا دور دورِ نبوت' دوسرا دور دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' تیسرا دور ظالم ملوکیت کا دور' چوتھا غلامی والی ملوکیت کا دور' جبکہ پانچواں اور آخری دور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ہے۔ اس خلافت کی خبر آپ ﷺ نے اس حدیث میں بھی دی ہے جس کے راوی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا)) (صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ ذُلِّ ذَلِيْلٍ — اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) — قُلْتُ: ''فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' (مسند احمد)

''روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں — (یعنی) یا تو لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔ میں (راوی) نے کہا: ''تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔''

بہر حال قرآن حکیم میں موجود ''بین السطور'' اشاروں اور احادیث میں وارد صریح پیشین گوئیوں کے مطابق قیامت سے پہلے ان واقعات کا رونما ہونا طے ہے' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کے اس سلسلے کا آغاز کب ہوگا۔

اس کے بعد قیامت کا مرحلہ ہوگا' لیکن قیامِ قیامت سے قبل ایک خوشگوار ہوا چلے گی جس سے تمام اہلِ ایمان پر موت طاری ہو جائے گی۔ اس مرحلے کے بعد صرف فساق و فجار ہی دنیا میں باقی رہ جائیں گے اور انہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰی شِرَارِ النَّاسِ)) (صحیح مسلم)

''قیامت صرف شریر لوگوں پر ہی آئے گی۔''

''اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ'' اور ''زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ'' کی سختیوں کا سامنا بھی انہی لوگوں کو کرنا ہوگا' جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو قیامت سے پہلے سکون و اطمینان کی موت دے کر اس دن کی سختیوں اور ہولناکیوں سے بچا لے گا۔

﴿وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۱۰۳﴾ ''اور فرشتے ان سے ملاقاتیں کریں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) یہ ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔''

آج کے دن آپ لوگوں کو انعامات سے نوازا جائے گا' آپ لوگوں کی قدر افزائی ہوگی' خلعتیں پہنائی جائیں گی اور اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی ہوگی۔

آیت ۱۰۴ ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ﴾ ''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے لپیٹا جاتا ہے کاغذوں کا طومار۔''

یہاں پر ''السَّمٰوٰت'' (جمع) کے بجائے صرف لفظ السَّمَاۗء (واحد) استعمال ہوا ہے' جس سے اس رائے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ یہ صرف آسمانِ دنیا کے لپیٹے جانے کی خبر ہے اور یہ کہ قیامت کے زلزلے کا عظیم واقعہ: ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱﴾ (الحج) صرف ہمارے نظامِ شمسی کے اندر ہی وقوع پذیر ہوگا اور اسی نظام کے اندر موجود کُرّے آپس میں ٹکرائیں گے: ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾ (القیامہ) اور یوں یہ پورا نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔

﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ﴾ ''جیسے ہم نے پہلی مرتبہ ابتدا کی تھی (ویسے ہی) ہم اس کا اعادہ کریں گے۔''

﴿وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۱۰۴﴾ ''یہ وعدہ ہمارے ذمہ ہے۔ ہم یہ ضرور کر کے رہیں گے۔''

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے Theory of the Expanding Universe کو بھی مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ اس نظریہ (theory) کے مطابق یہ کائنات مسلسل وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔ اس میں موجود ہر کہکشاں مسلسل چکر لگا رہی ہے اور یوں ہر کہکشاں کا دائرہ ہر لحظہ پھیلتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے آیت زیر نظر کے الفاظ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے لیے کائنات کے پھیلنے کے اس عمل کو الٹا دیا جائے گا' اور اس طرح یہ پھر سے اسی حالت میں آ جائے گی جہاں سے اس کے پھیلنے کے عمل کا آغاز ہوا تھا۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے گھڑی کے ''فنر'' کی مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے' جس کا دائرہ اپنے نقطۂ ارتکاز کے گرد

مسلسل پھیلتا رہتا ہے' لیکن جب اس میں چابی بھری جاتی ہے تو یہ پھر سے اسی نقطۂ ارتکاز کے گرد لپٹ کر اپنی پہلی حالت پر واپس آ جاتا ہے۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ: تمام جہانوں کے لیے رحمت

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۝ (الانبیاء)

''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔''

یعنی آپ کی بعثت صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے عملی طور پر غلبے کے بعد آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا ہوتا' مگر آپ ﷺ تو تمام اہلِ عالم کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ کی بعثت کا مقصد قرآن حکیم میں تین مقامات (التوبہ:۳۳' الفتح:۲۸ اور الصف:۹) پر ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ذات ہے جس نے اپنے رسولؐ کو بھیجا الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر''۔ گویا آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد تب پورا ہو گا جب دین اسلام کُل روئے زمین پر غالب ہو جائے گا۔ اسی مضمون کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

نورِ توحید کا اتمام یعنی اسلام کا بطور دین کُلّی غلبہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تو حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں دین اسلام کے اس اقتدار کو مزید وسعت دینے کا سلسلہ بڑی شد و مد سے شروع ہوا مگر دورِ عثمانی میں ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے سازش کے ذریعے عالمِ اسلام میں ''الفتنۃ الکبریٰ'' کھڑا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے اور پھر مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے نتیجے میں ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے ہلاک ہو گئے۔ اس فتنہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ نہ صرف غلبہ اسلام کی مزید تصدیر و توسیع کا عمل رک گیا' بلکہ بعض علاقوں سے مسلمانوں کو پسپائی بھی اختیار کرنا پڑی۔ حضور ﷺ کی بعثت چونکہ تا قیامِ قیامت کُل روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ''اِظہار دین الحق'' (دین حق کا غلبہ) ہے' اس لیے یہ دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک آپ ﷺ کی بعثت کا یہ مقصد بتمام و کمال پورا نہ ہو اور دین اسلام کُل عالمِ انسانی پر غالب نہ ہو جائے۔ اس کا صغریٰ و کبریٰ قرآن حکیم سے ثابت ہے اور اس کی تفصیلات کُتبِ احادیث میں موجود ہیں۔

انبیاءورسلؑ کی شخصیات کے ذاتی یا نجی پہلو کا معاملہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(الحج)

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپؐ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی' مگر یہ کہ جب اُس نے خود کوئی خیال باندھا تو شیطان نے اُس کے خیال میں خلل اندازی کی۔''

لفظ ''تمنا'' اردو میں بھی مستعمل ہے۔لغوی اعتبار سے اس مادہ میں آرزو اور خواہش کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک عام آدمی سوچتا ہے' خواہش کرتا ہے اور مختلف امور میں منصوبہ بندی کرتا ہے اسی طرح نبیؑ اور رسولؑ بھی سوچتا ہے اور منصوبہ بندی کرتا ہے۔مثلاً جناب ابوطالب کی وفات کے بعد جب ابولہب بنو ہاشم کا سردار بن گیا اور اس کی ذاتی دشمنی کے باعث آپ ﷺ کو اپنے قبیلے کی پشت پناہی حاصل نہ رہی تو آپؐ نے سوچا کہ اب کیا کروں؟ (ع ''کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں!'') چنانچہ ان حالات میں آپ ﷺ نے طائف کے سفر کا منصوبہ بنایا' لیکن وہاں سے کوئی مثبت جواب نہ ملا اور آپؐ کو بظاہر ناکام لوٹنا پڑا۔ بلکہ حضرت عائشہ ؓ کی روایت کے مطابق طائف سے واپسی کا دن آپ ﷺ کی زندگی کا سخت ترین دن (یومِ اُحد سے بھی زیادہ سخت) ثابت ہوا۔ بہرحال آپ ﷺ نے منصوبہ بندی بھی کی اور اس کے مطابق کوشش بھی کی۔ یہ الگ بات تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ سعادت اہلِ طائف کے بجائے اہلِ یثرب کی قسمت میں لکھی گئی تھی۔آیت زیر مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نبی اپنی منصوبہ بندی کرتا ہے تو شیطان اپنی طرف سے اس کے خیال میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ڈالتا ہے۔

عصمتِ انبیاء کے بارے میں تمام اہلِ ایمان چونکہ بہت حساس ہیں اس لیے آیت زیر مطالعہ کے الفاظ سے جو مفہوم بظاہر سامنے آتا ہے وہ گویا ہر مسلمان کے حلق میں پھنس جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر و تشریح میں بہت سی دوراز کار تاویلات بھی لائی گئی ہیں۔ بہرحال میرے خیال میں یہ بالکل سیدھا سادہ مسئلہ ہے اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی رسول یا نبی کی شخصیت' خواہشات اور تعلیمات کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک پہلو تو وہ ہے جو براہِ راست وحی الٰہی کے تابع ہے۔اس پہلو سے متعلق معاملات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے سے براہِ راست واضح ہدایات ملتی رہتی ہیں۔ان ہدایات یا احکام میں کسی خطا یا غلطی کا کوئی امکان نہیں اور نہ ہی اس میں شیطان یا شیطانی قوتیں کسی قسم کی دراندازی کر سکتی ہیں۔

دوسری طرف نبیؑ کی شخصیت کا ایک ذاتی اور نجی پہلو بھی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نبیؑ کی کوئی ذاتی شخصیت

یا سوچ ہوتی ہی نہیں، بلکہ بہت سے معاملات میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو ایک حکم دے دیا جاتا ہے اور اس حکم پر عمل کرنے کے بارے میں نبیؐ خود سوچتا ہے، خود منصوبہ بندی کرتا ہے اور خود فیصلہ کرتا ہے۔ مثلاً حضور ﷺ کو ایک حکم دے دیا گیا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴿۲۱۴﴾﴾ (الشعراء) کہ آپ ﷺ تبلیغ شروع کیجیے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک ضیافت کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے بنو ہاشم کے تمام مردوں کو مدعو کیا اور سب کو کھانا کھلایا۔ آپ ﷺ نے ان تک اپنا دعوتی پیغام پہنچانے کے لیے یہی طریقہ مناسب خیال کیا۔ گویا ایسے کسی حکم پر عمل کے لیے جزئیات کی منصوبہ بندی کرنے کا تعلق نبیؐ کے ذاتی اجتہاد سے ہے۔ چنانچہ ان تدبیری معاملات کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو براہِ راست وحی کی ہدایت کا ہوتا ہے۔

اس فرق کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کی بہت سی عملی مثالیں بھی ہمیں سیرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک جگہ کی تخصیص فرما کر حکم دیا کہ لشکر کا کیمپ اس جگہ پر لگایا جائے۔ اس پر کچھ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر اس جگہ کے انتخاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص حکم ہے تو سرِ تسلیم خم ہے! لیکن اگر یہ آپ کی رائے ہے تو ہمیں بھی اپنی رائے پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپؐ نے نہ صرف انہیں رائے دینے کی اجازت دی بلکہ ان کی رائے کو قبول بھی فرمایا اور لگے لگائے کیمپ کو اکھاڑ کر ان کی تجویز کردہ جگہ پر لگانے کا حکم دیا۔ یہ چونکہ حضور ﷺ کی ذاتی تدبیر تھی اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس میں اختلاف کی گنجائش محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے عملی تجربات کی روشنی میں رائے دی۔ دوسری طرف اگر یہ فیصلہ وحی کی روشنی میں کیا گیا ہوتا تو کیمپ کے اکھاڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح ''تابیرِ نخل'' کے معاملے کی مثال بھی بہت واضح ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہاں پر کھجور کے درختوں کو بار آور کرنے کے لیے زیرہ پوشی کا مصنوعی طریقہ (artificial pollination) اختیار کیا جاتا تھا، یعنی نر درخت کے پھولوں کو مادہ درخت کے پھولوں پر جھاڑا جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کو یہ عمل کرتے دیکھا تو فرمایا کہ اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو! آپ ﷺ کے ایسا فرمانے پر لوگوں نے اس سال وہ عمل نہ کیا تو اس کے نتیجے میں فصل واضح طور پر کم ہوئی۔ اس پر ان لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اس سال ہم نے تابیرِ نخل کے مروّجہ طریقے پر عمل نہیں کیا تو ہماری فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) (صحیح مسلم) یعنی آپ لوگ اپنے دُنیوی امور کے بارے میں مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ محدثین عظام پر اپنی خصوصی رحمتیں، برکتیں اور نعمتیں نازل فرمائے۔ ان لوگوں کی محنتوں اور کوششوں سے حضور ﷺ کی احادیث محفوظ ہوئیں اور پھر ہم تک پہنچ کر ہماری راہنمائی کا ذریعہ بنیں۔) حضور ﷺ کے اس فرمان کا مقصد اور مفہوم یہی ہے کہ دُنیوی معاملات کے مختلف شعبوں میں تم لوگوں کو ایسے تجربات حاصل ہیں جو مجھے حاصل نہیں اور میں تم لوگوں کو ان معاملات میں تعلیم دینے

کے لیے مبعوث بھی نہیں ہوا۔ میں تم لوگوں کو زراعت کے اصول سکھانے کے لیے نہیں آیا۔ میں تو تم لوگوں کو ہدایت دینے کے لیے آیا ہوں اور یہی میری رسالت کا بنیادی مقصد اور موضوع ہے۔ چنانچہ رسالت سے متعلق امور میں آپ لوگوں کے لیے میرا اتباع لازمی ہے‘ لیکن دنیوی معاملات تم لوگ اپنے تجرباتی علم کی بنیاد پر ہی انجام دیا کرو۔ اگر دیکھا جائے تو اہلِ مدینہ کا تابیرِ نخل سے متعلق مذکورہ عمل سائنسی اصولوں پر مبنی تھا۔ سائنس کی بنیاد تجربات پر رکھی گئی ہے اور سائنسی علوم کا ارتقاء (development) بھی تجربات کے ذریعے سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ فرما کر حضور ﷺ نے تجرباتی یا سائنسی علوم کی گویا حوصلہ افزائی فرمائی کہ اپنے دُنیوی معاملات کو تم لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہو اور یہ کہ ان امور کو تم لوگ اپنے تجرباتی علم کی بنیاد پر ہی انجام دیا کرو۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبیؑ یا رسولؑ کی وہ تعلیمات اور وہ ہدایات جو براہِ راست وحی الٰہی کے تابع ہوں‘ ان میں نہ تو کسی قسم کی خطا کا امکان ہے اور نہ ہی ان کے اندر شیطانی قوتوں کی دراندازی کا کوئی احتمال ہے‘ لیکن عام دنیوی امور اور ان کی جزئیات کے بارے میں فیصلے کرتے ہوئے جہاں ایک نبی یا رسول اپنے ذاتی اجتہاد سے کام لے رہا ہو وہاں پر کسی خطا یا شیطانی خلل اندازی کا امکان موجود رہتا ہے۔ میری یہ توجیہہ ’’موضح القرآن‘‘ میں بیان کردہ شاہ عبدالقادرؒ کی رائے کے قریب ترین ہے‘ لہٰذا مجھے اس پر پورا اطمینان ہے۔

﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ﴾ ’’تو اللہ منسوخ کر دیتا ہے اسے جو کچھ شیطان نے ڈالا ہوتا ہے‘ پھر اللہ اپنے فیصلوں کو پختہ کر دیتا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ ’’اور اللہ سب کچھ جاننے والا‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

دعوتِ توحید اور فلسفۂ دین کے حوالے سے قرآن حکیم کا ایک اہم مقام

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ۚ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (الحج)

آیت ۷۳ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ﴾ ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے' پس اسے ذرا توجہ سے سنو!''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ ''یقیناً (تمہارے وہ معبود) جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو ایک مکھی بھی تخلیق نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔''

چونکہ قرآن حکیم کے مخاطبِ اوّل مکہ کے بُت پرست تھے اس لیے انہیں شعور دلانے کے لیے یہاں ان کے بتوں کی مثال دی گئی ہے کہ خانہ کعبہ میں سجائے گئے تمہارے یہ تین سو ساٹھ بت مل کر بھی کوشش کر لیں تب بھی ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے۔ یہ وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے بتوں کی بے بسی ظاہر کرنے کے لیے اپنایا تھا۔ آپؑ نے بتوں کو توڑ کر ان کے پجاریوں کو اپنے گریبانوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ ''اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو یہ اس سے وہ چیز چھڑا نہیں سکتے۔''

یعنی مکھی کو تخلیق کرنا تو بہت دور کی بات ہے' یہ تو اپنے اوپر سے مکھی کو اڑا بھی نہیں سکتے۔ اگر کوئی مکھی ان کے سامنے پڑے ہوئے حلووں مانڈوں میں سے کچھ لے اڑے تو تمہارے یہ خدا اس سے وہ چیز واپس بھی نہیں لے سکتے۔

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ ''کس قدر کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!''

اس مضمون پر یہ جملہ اس قدر جامع ہے کہ قرآن مجید کے نظریہ توحید کا عملی لُبِ لُباب ان تین الفاظ میں سما گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر باشعور انسان کا ایک نصب العین' آئیڈیل یا آدرش ہوتا ہے' جس کے حصول کے لیے وہ دن رات بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت اور اس کا آئیڈیل آپس میں ایک دوسرے کی پہچان کے لیے معیار اور کسوٹی فراہم کرتے ہیں۔ کسی انسان کا معیار اس کے آئیڈیل سے پہچانا جاتا ہے اور کسی آئیڈیل کا معیار اس کے چاہنے والے کے معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ اگر کسی انسان کا آئیڈیل گھٹیا ہے تو لازماً وہ انسان خود بھی اسی سطح پر ہوگا اور اگر کسی کا آئیڈیل اعلیٰ ہوگا تو وہ خود بھی اعلیٰ شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس اصول پر ان لوگوں کے ذہنوں کے معیار اور سوچوں کی سطح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو پتھر کے بتوں کو اپنے معبود سمجھ کر ان کے آگے جھکتے ہیں۔ جس طالب کا مطلوب اور آئیڈیل ایک ایسا بے جان مجسمہ ہے جو اپنے اوپر سے ایک مکھی تک کو نہیں اڑا سکتا' اس کی اپنی شخصیت کا کیا حال ہوگا: ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!''

یہ مضمون ذرا مختلف انداز میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۵ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے

مدِّمقابل کچھ معبود بنا کر ان سے ایسے محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس توحید کا سبق تو یہ ہے: لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ! لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ! لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ! یعنی انسان کا محبوب و مقصود و مطلوب صرف اور صرف اللہ ہے۔ باقی کوئی شے مطلوب و مقصود نہیں ہے' باقی سب ذرائع ہیں۔ ظاہر ہے انسان کو زندہ رہنے کے لیے اور اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں توحید کا تقاضا یہی ہے کہ ان سب چیزوں کو ذرائع کے طور پر استعمال ضرور کریں مگر انہیں اپنا مطلوب و مقصود نہ بنائیں۔ نہ کھیتی کو' نہ دکان کو' نہ کسی ہنر کو' نہ کسی پیشے کو' نہ کسی رشتہ دار' اور نہ اولاد کو! یہ ہے توحید کا لُبِّ لُباب!

جو شخص توحید کے اس تصور تک نہیں پہنچ سکتا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اس انداز میں حاصل نہیں کر سکتا' اس کے ذہن کی پستی اسے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر طرح طرح کی چیزوں کی پرستش کرنا سکھاتی ہے اور پھر اسی ڈگر پر چلتے ہوئے کوئی وطن پرست ٹھہرتا ہے تو کوئی قوم پرست قرار پاتا ہے۔ کوئی دولت کی دیوی کا پجاری بن جاتا ہے تو کوئی اپنے نفس کو معبود بنا کر اپنے ہی حریم ذات کے گرد طواف کرنے میں مست رہتا ہے ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!''

آیت ۷۴ ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ط﴾ ''انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کا حق تھا۔''

ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کماحقہٗ معرفت حاصل نہ کر سکے' انہیں جلال و جمالِ الٰہی کی کوئی جھلک بھی نصیب نہ ہو سکی اور یوں وہ دنیا اور اس کی چیزوں کو اصل مطلوب و مقصود سمجھ کر اس عروسِ ہزار داماد کے عاشق بن بیٹھے!

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت طاقت والا' سب پر غالب ہے۔''

آیت ۷۵ ﴿اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط﴾ ''اللہ چُن لیتا ہے اپنے پیغامبر فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ ﴿۷۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔''

یہاں رسالت کے دونوں واسطوں (یعنی رسولِ ملک اور رسولِ بشر) کا ذکر کر دیا گیا۔ چنانچہ فرشتوں میں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو چنا گیا اور انسانوں میں سے حضرت محمد ﷺ کو۔ اور یوں رسولِ ملک کے ذریعے رسولِ بشر تک پیغام پہنچایا گیا تا کہ وہ اپنے ابنائے نوع تک اسے پہنچا دیں۔

آیت ۷۶ ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ط﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔''

﴿وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾﴾ ''اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹا دیے جائیں گے۔''

اس آیت میں آخرت کا ذکر بھی آ گیا اور یوں اس دعوتِ عمومی میں امورِ ثلاثہ یعنی توحید' رسالت اور آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔ یاد رہے کہ اس دعوت میں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ (آیت ۷۳) کے الفاظ سے نوعِ انسانی کے

تمام افراد کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اب دوسرے مرحلے کی دعوت ان خصوصی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے اس پہلی دعوت پر لبیک کہا کہ ہم ایک اللہ کو معبود مانتے ہیں‘ محمد ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہیں‘ بعث بعد الموت پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اِنَّـا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ کے فلسفے پر بھی ایمان رکھتے ہیں‘ وہ لوگ اہل ایمان قرار پائے۔ اب اگلے مرحلے میں انہی لوگوں کو عمل کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس اندازِ دعوت میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اس میں فعل امر کا استعمال کیا گیا ہے‘ یعنی اس دعوت کا انداز حکمیہ ہے۔ پہلی دعوت میں فعل امر کا استعمال صرف مثال سنانے کی حد تک ہوا تھا: ﴿فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ ؕ﴾ کہ یہ مثال جو بیان کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! لیکن جو لوگ اس دعوت کو مان کر اسلام کے دائرہ میں آ گئے ہیں انہیں اب باقاعدہ حکم دیا جا رہا ہے:

آیت ۷۷ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ﴾ ”اے ایمان کے دعوے دارو! جھک جاؤ اور سربسجود ہو جاؤ اور اپنے رب کی بندگی کرو“

یہاں صرف اصطلاحی رکوع اور سجدہ ہی مراد نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دینے کا حکم ہے۔ اسی طرح ”عبادت“ کے حکم میں بھی ”مکمل بندگی“ کا مفہوم پنہاں ہے۔

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

﴿وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ﴾ ”اور نیک کام کرو“

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ وَاعۡبُدُوۡا (بندگی کرو!) کے حکم میں تو گویا سب کچھ آ گیا۔ اب اس کے بعد مزید نیک کام کون سے ہیں؟ دراصل ”فعل خیر“ سے یہاں مراد خدمتِ خلق ہے۔ اس حکم سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدمتِ خلق میں لگا دو! اور خدمتِ خلق صرف بھوکے کو کھانا کھلانے تک ہی محدود نہیں بلکہ سب سے بڑی خدمتِ خلق یہ ہے کہ لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس حکم میں یہ بھی شامل ہے کہ اے اللہ کے بندو! ایمان وعمل کے جو حقائق تم پر منکشف ہو گئے ہیں ان سے دوسرے لوگوں کو بھی روشناس کراؤ‘ تاکہ وہ جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔

﴿لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾ ”تاکہ تم فلاح پاؤ!“

سیاق وسباق کے اعتبار سے یہ بہت اہم بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ایمان کے دعوے دارو! کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ایمان کا اقرار کر لیا تو بس اب فلاح ہی فلاح ہے۔ بس کلمہ پڑھ لیا اور کامیابی ہو گئی۔ نہیں‘ ایسا نہیں ہے! ع ”یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے!“ تم لوگوں نے اس شہادت گاہ میں قدم رکھا ہے تو اب اس کے تقاضے بھی پورے کرو۔ اگر تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ بس ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور اب بیٹھے بٹھائے ہمیں جنت مل جائے گی تو یہ تمہارا اپنا خیال ہے‘ تمہاری اپنی دل خوش کن تمنا (wishful thinking) ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۱۱) ”یہ ان کی تمنائیں ہیں۔“

امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ سورۃ الحج کی اس آیت کی تلاوت پر سجدۂ تلاوت کرنا چاہیے' جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ آیتِ سجدہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ آیاتِ سجدہ پر سجدۂ تلاوت کرنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے۔

آیت ۷۸ ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اُس کے لیے جہاد کا حق ہے۔''

﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ ''اُس نے تمہیں چُن لیا ہے''

اب نبوت کا سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے۔ آئندہ جبرائیلؑ کسی کے پاس وحی لے کر نہیں آئیں گے۔ انہوں نے جو وحی پہنچانی تھی' پہنچا دی ہے اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ نے تم لوگوں پر واضح کر دیے ہیں۔ اب ان احکام کو' اس دعوت کو تمام نوعِ انسانی تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تمام انسانوں میں سے تمہیں چُن لیا گیا ہے' اس عظیم الشان مشن کے لیے تمہارا سلیکشن ہو گیا ہے۔ چنانچہ تم اپنے اس سلیکشن پر اور اپنے نصیب پر فخر کرو اور اس کام میں ہمہ تن لگ جاؤ۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ﴾ ''اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ﴾ ''تمہارے جدِامجد ابراہیمؑ کی ملّت۔''

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ﴾ ''اُسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے''

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو ''مسلم'' کا خطاب دیا ہے اور تمہارے جدامجد ابراہیم علیہ السلام نے بھی تمہارا یہی نام رکھا تھا۔ ملاحظہ ہوں سورۃ البقرۃ' آیت ۱۲۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے یہ الفاظ: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠﴾ ''پروردگار! ہمیں بھی اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا کر رکھیو اور ہماری اولاد سے بھی ایک اُمتِ مسلمہ اٹھائیو!''

﴿مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا﴾ ''اس سے پہلے بھی (تمہارا یہی نام تھا) اور اس (کتاب) میں بھی ہے''

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ ''تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں آیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے' تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو''۔ ان دو جملوں میں صرف یہ فرق ہے کہ وہاں پہلے امت کا ذکر ہے اور پھر رسول کا' جبکہ یہاں پہلے رسول اور بعد میں امت کا ذکر ہے۔ پس اے اہلِ ایمان! اس ذمہ داری کو اچھی طرح سے سمجھ لو اور اب بسم اللہ کرو' قدم آگے بڑھاؤ اور دیکھو تمہارا سب سے پہلا قدم کون سا اٹھنا چاہیے:

﴿فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ؕ﴾ ’’پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔‘‘

﴿ہُوَ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ ﴿۷۸﴾﴾ ’’وہ تمہارا مولیٰ ہے‘ تو کیا ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور کیا ہی اچھا ہے مددگار!‘‘

’’مولیٰ‘‘ کے مفہوم میں آقا‘ حمایتی‘ پشت پناہ‘ ملجا و ماویٰ اور مرجع کے معانی شامل ہیں‘ چنانچہ اللہ تمہارا حمایتی اور پشت پناہ ہے‘ لہٰذا تم اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔

اس رکوع کے مضامین بہت اہم ہیں‘ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کے اہم نکات ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کر لیے جائیں۔

۱۔ اس رکوع میں پہلا سبق توحید سے متعلق ہے اور اس کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ ایک انسان کا مطلوبِ حقیقی‘ محبوبِ حقیقی اور مقصودِ اصلی صرف اور صرف اللہ ہی ہو۔

۲۔ اس کے بعد دوسرا نکتہ رسالت سے متعلق ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک رسالت کا سلسلہ صرف دو واسطوں پر مشتمل تھا‘ یعنی رسولِ ملک اور رسولِ بشر۔ لیکن اب دورِ محمدی ﷺ میں ایک تیسرے واسطے کا اضافہ کیا گیا ہے اور اُمت مسلمہ کو بھی ایک مستقل کڑی کے طور پر رسالت کے سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) میں منسلک کر دیا گیا ہے۔ اس ذمہ داری کے لیے امت مسلمہ کے انتخاب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس رکوع (آیت ۷۸) میں (ہُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ) کے الفاظ سے کیا ہے‘ جبکہ قبل ازیں آیت ۷۵ میں رسولِ ملک اور رسولِ بشر کے لیے ’’اِصۡطِفَاء‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے: ﴿اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾۔ اِصۡطِفَاء اور اِجۡتِبَاء دونوں الفاظ معنی کے اعتبار سے آپس میں ملتے جلتے ہیں اور خود حضور ﷺ کے لیے (محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ) بھی مستعمل ہیں۔

۳۔ اس رکوع کا تیسرا مضمون ’’شہادت علی الناس‘‘ کے بارے میں ہے۔ اس ضمن میں اس رکوع کی آخری آیت (آیت ۷۸) کے الفاظ کی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ کے الفاظ سے بہت قریبی مشابہت ہے‘ بلکہ دونوں مقامات پر الفاظ ایک جیسے ہیں‘ صرف ترتیب کا فرق ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ کے الفاظ یہ ہیں: ﴿لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ﴾ جبکہ یہاں الفاظ کی ترتیب یوں ہے: ﴿لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ﴾۔ اس اعتبار سے اُمتِ مسلمہ پر شہادت علی الناس اور پیغامِ رسالت کی دعوت و تبلیغ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے‘ جس کے بارے میں قیامت کے دن بہت سخت جواب دہی ہو گی۔ اس جواب دہی کے بارے میں سورۃ الاعراف کی یہ آیت بہت واضح ہے: ﴿فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۶﴾﴾ ’’پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔‘‘ چنانچہ وہاں اُمتِ مسلمہ

سے بحیثیتِ مجموعی جواب طلبی ہوگی کہ تم لوگوں نے اپنی اس ذمہ داری کو کس حد تک نبھایا تھا؟ یعنی جو دین تم لوگوں تک آخری نبی حضرت محمدﷺ کے ذریعے پہنچا تھا' کیا تم لوگوں نے اسے پوری نوع انسانی تک پہنچا دیا تھا؟ اور اگر یہ ذمہ داری اُمت نے کماحقہ پوری نہیں کی ہوگی تو پوری امت بحیثیتِ مجموعی مجرم قرار پائے گی۔ آج چونکہ اُمت مسلمہ مجموعی طور پر اپنی اس ذمہ داری کا حق ادا نہیں کر رہی ہے اس لیے اپنے اسی جرم کی پاداش میں اجتماعی طور پر ذلیل وخوار ہو رہی ہے۔

دنیا کی ذلت وخواری کی یہی سزا اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ان کے اجتماعی جرائم کی پاداش میں مل چکی ہے' جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔'' اس لیے کہ اجتماعی جرائم کی سزا قوموں کو دنیا میں ہی دے دی جاتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ اجتماعی طور پر تو اس سلسلے میں قصوروار ہے ہی' مگر واضح رہے کہ اُخروی محاسبے کے دوران ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں بھی جواب دہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے لیے ہم میں سے ہر شخص کو فکرمند ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے اس فرض کو کس حد تک نبھار ہا ہے اور قیامت کے دن اس نے اس سلسلے میں کیا جواب دینا ہے۔ کیا وہ اپنی دنیا کی زندگی میں صرف دولت کمانے اور جائیدادیں بنانے کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے چکر میں پڑا رہا یا اُس نے دعوتِ قرآن اور تبلیغ دین کے فریضہ کو ادا کرنے کی بھی کوشش کی اور اپنی دولت' صلاحیتوں اور جان کی قربانیوں کے ذریعے استطاعت بھر اس کام میں بھی اپنا حصہ ڈالا؟

لفظ ''فلاح'' کے مفہوم کی وضاحت

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ (المؤمنون)

''کام نکال لے گئے اہلِ ایمان۔''

یہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کا ہے۔ مگر خود حضرت شیخ الہندؒ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ''موضح القرآن'' یعنی شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی اختیار کیا ہے اور اس میں کہیں کہیں زبان کی تبدیلیوں کے علاوہ کوئی اور تبدیلی نہیں کی۔ گویا بنیادی طور پر اس آیت کا یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے اور میرے نزدیک لفظ فَلَحَ کی اصل روح کے قریب ترین ہے۔ لفظ ''فَلاح'' کا ترجمہ بالعموم ''کامیابی'' سے کیا جاتا ہے' لیکن اس کے مفہوم کو درست انداز میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس لفظ کے حقیقی اور لغوی معنی کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس مادہ کے لغوی معنی ہیں: ''پھاڑنا''۔ اسی معنی میں کسان کو عربی میں ''فَلّاح'' کہا جاتا ہے' اس لیے کہ وہ اپنے ہل کی نوک سے زمین کو پھاڑتا ہے۔ عربی کی ایک کہاوت ہے: اِنَّ الحَدِیدَ بِالحَدِیدِ یُفلَحُ یعنی لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ گویا فَلَح کا مفہوم فَلَق کے قریب تر ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۵ میں لفظ ''فلق'' پھاڑنے کے مفہوم میں آیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ ''یقیناً اللہ

تعالیٰ گٹھلیوں اور بیجوں کو پھاڑنے والا ہے''۔ اس سے اگلی آیت میں یہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے نمودِ صبح کے حوالے سے استعمال ہوا ہے: ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ﴾ یعنی وہ تاریکی کا پردہ چاک کر کے صبح کو نمودار کرنے والا ہے۔ چونکہ فلح اور فلق دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں اور دونوں کے معنی پھاڑنا ہے اس لیے آیت زیر مطالعہ میں فلح کا مفہوم سمجھنے کے لیے ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی﴾ کے جملے کے حوالے سے گٹھلی کے پھٹنے اور اس کے اندر سے کونپلیں برآمد ہونے کے عمل کو ذہن میں رکھیں۔

جس طرح ایک گٹھلی کے اندر پورا پودا بالقوّہ (potentially) موجود ہے' اسی طرح انسان کے اندر بھی اس کی انا یا روح اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اور جس طرح گٹھلی کے پھٹنے (فلق) سے دو کونپلیں برآمد ہوتی ہیں اور پھر ان سے پورا درخت بنتا ہے اسی طرح جب انسانی وجود کے اندر موجود مادیت کے پردے چاک (فلح) ہوتے ہیں تو اس کی انا یا روح بے نقاب ہوتی ہے اور اس کی نشو ونما سے اس کی معنوی شخصیت ترقی پاتی ہے۔ انسان کی اسی انا یا روح کو اقبال نے خودی کا نام دیا ہے اور اس کو اُجاگر (develop) کرنے کے تصور پر فلسفہ خودی کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے خصوصی طور پر آئیڈیل یا آدرش کے فلسفہ کے حوالے سے (اس ضمن میں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ کی تشریح بھی مدنظر رہے) اپنی معرکۃ الآراء کتاب The Idealogy of the Future میں علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی بہت اچھی تعبیر کی ہے۔

انسان بظاہر ایک مادی وجود کا نام ہے۔ اس وجود میں ہڈیاں ہیں' گوشت ہے اور دیگر اعضاء ہیں' لیکن اس مادی وجود کے اندر اس کی انا اور روح بھی ہے جو اس کی اصل شخصیت ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ' میرا پاؤں' میری آنکھ' میری ٹانگ' میرا سر' میرا جسم! لیکن اس ''میرا'' اور ''میری'' کی تکرار میں ''میں'' کہاں ہے اور کون ہے؟ یہ ''میں'' دراصل انسان کی انا یا روح ہے۔ یعنی انسان کو حیوانوں کے مقابلے میں صرف عقل وشعور کی دولت سے ہی نہیں نوازا گیا بلکہ اسے روحِ ربانی کی نورانیت بھی عطا کی گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نشنیدی؟ در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

انسان کی روح اس کے جسم کے مادی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ گویا یہ ایک مخفی خزانہ ہے جسے کھود کر نکالنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خزانے کو کام میں لانا ہے تو ''فَلاح'' کے عمل سے مادیت کے پردوں کو چاک کرنا ہوگا۔ آیت زیر نظر میں قَدْ اَفْلَحَ کے الفاظ دراصل اسی مفہوم میں آئے ہیں کہ مؤمنین صادقین نے اپنی روحوں پر پڑے ہوئے مادیت کے پردوں کو چاک کر کے اصل خزانے یعنی روح کو بے نقاب کرنے اور اس کی نشو ونما (develop) کرنے کا مشکل کام کر دکھایا ہے' جبکہ عام انسان کی تمام تر توجہ اپنے حیوانی وجود پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ نہ وہ اپنی روح کی خبر لیتا ہے اور نہ ہی اس کی غذا اور نشو ونما کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے انسان کی روح سسک سسک کر مر جاتی ہے اور اس کا جسم اس کی روح کا مقبرہ بن جاتا ہے۔ بظاہر ایسے شخص کا شمار زندہ انسانوں میں ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ مردہ ہوتا ہے۔ مثلاً ابوجہل زندہ ہوتے ہوئے بھی

مردہ تھا۔ اسی لیے نہ تو وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو پہچان سکا اور نہ آپؐ کی دعوت کو سن سکا۔ اس کے برعکس ایک بندۂ مؤمن ہے جو حقیقت میں زندہ ہے' اس لیے کہ اس کی روح زندہ ہے۔ جیسے کہ سورۃ النحل کی آیت ۹۷ میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ﴾ ''تو ہم ضرور اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی''۔ چنانچہ جو شخص بھی اپنی خودی کے ارتقاء (development of self) اور اپنے کردار کی تعمیر (development of character) کا مشکل کارنامہ سرانجام دے پائے گا وہی حقیقت میں کامیاب قرار پائے گا اور وہی آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے قَدْ اَفْلَحَ کے الفاظ کا مصداق ٹھہرے گا۔ واضح رہے کہ یہ کامیابی ہر انسان کی پہنچ میں ہے' کیونکہ روح کی دولت تو ہر انسان کو عطا ہوئی ہے۔ ہندی شاعر بھیک کے بقول: ع ''بھیکا بھوکا کوئی نہیں' سب کی گدڑی لال!'' یعنی بھوکا یا نادار کوئی بھی نہیں ہے' ہر انسان کی گٹھڑی میں لعل موجود ہے' بس اس گٹھڑی کی گرہ کھول کر اس ''لعل'' یا دولت کو دریافت کرنے اور اسے کام میں لانے کا فن اسے آنا چاہیے۔ یہی نکتہ اس خوبصورت فارسی شعر میں ایک دوسرے انداز میں پیش کیا گیا ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

یعنی تمہیں سیر گلستاں کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں' بلکہ تمہارے اندر بھی ایک مہکتا ہوا چمن موجود ہے' تم اپنے دل کے دروازے سے داخل ہو کر اس چمن کی سیر سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔

اسی حقیقت کو سورۃ الذاریات میں اس طرح واضح کیا گیا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱﴾ کہ خود تمہارے اندر معرفت کا سامان موجود ہے مگر تم لوگ اس سے غافل ہو۔ اس حوالے سے اپنشد کا ایک جملہ بہت اہم ہے جس کا انگریزی ترجمہ اس طرح ہے:

> *"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths which encompass his real self."*

یعنی انسان اپنی جہالت کے باعث ان مادی غلافوں ہی کو اپنی ذات سمجھ بیٹھتا ہے جو اس کی ذات (انا یا روح) کے گرداگرد لپٹے ہوئے ہیں' اور یوں وہ نہ خود کو پہچان پاتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت اسے حاصل ہوتی ہے — چنانچہ اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی معرفت ضروری ہے' جیسے کہ صوفیاء کا ماننا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔ دوسرے لفظوں میں اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ جو اپنی ''انا'' (self) سے غافل رہا وہ معرفت الٰہی سے بھی محروم رہا۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ کا یہ جملہ اس نکتے کو مزید واضح کرتا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا''۔ چنانچہ لفظ فلح کا یہ مفہوم ذہن میں رکھ کر اس آیت کا مطالعہ کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی شخصیت اور ذات کے مادی غلافوں کو پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت اور روح کو اُجاگر کرنے اور اس کے ذریعے سے عرفانِ ذات اور پھر معرفتِ الٰہی تک پہنچنے جیسے مشکل مراحل' اہلِ ایمان کامیابی سے طے کر لیتے ہیں۔

رحمِ مادر میں بچے کی تخلیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝ (المؤمنون)

آیت ۱۲ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝﴾ ''ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔''

یہاں پر لفظ سُلٰلَة بہت اہم ہے۔ تلوار کو نیام سے باہر کھینچنے کے عمل کو 'سَلَّ یَسُلُّ' جبکہ نیام سے باہر نکلی ہوئی ننگی تلوار کو 'مَسْلُوْل' کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی نسبت سے کسی بھی چیز کا اصل جوہر جو اس میں سے کشید کیا گیا ہو 'سُلَالَة' کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی کے جوہر سے تخلیق کیا گیا' اور پھر پوری نسل انسانی چونکہ ان کی اولاد تھی اس لیے اپنی تخلیق کے حوالے سے ہر انسان کو گویا اسی مادۂ تخلیق یعنی مٹی سے نسبت ٹھہری۔ لیکن میرے نزدیک اس کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ مرد کے جسم میں بننے والا نطفہ دراصل مٹی سے کشید کیا ہوا جوہر ہے۔ اس لیے کہ انسان کو خوراک تو مٹی ہی سے حاصل ہوتی ہے' چاہے وہ معدنیات اور نباتات کی شکل میں اسے براہِ راست زمین سے ملے یا نباتات پر پلنے والے جانوروں سے حاصل ہو۔ اس خوراک کی صورت میں گارے اور مٹی کے جوہر کشید ہو کر انسانی جسم میں جاتے ہیں اور اس سے وہ نطفہ بنتا ہے جس سے بالآخر بچے کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝﴾ ''پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔''

محفوظ ٹھکانے سے مراد رحم (uterus) ہے' جس کی دیوار بہت مضبوط ہوتی ہے۔ نطفہ رحم مادر میں پہنچتا ہے اور بیضۂ اُنثٰی کے ساتھ مل کر fertilized ovum رحم کی دیوار کے اندر دفن (embed) ہو جاتا ہے' جیسے بیج زمین کے اندر دفن ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ''پھر ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل دے دی''

عَلَقَہ کا ترجمہ عام طور پر 'جما ہوا خون' ہوتا آیا ہے جو کہ درست نہیں۔ لغوی اعتبار سے عربی مادہ علق (ع ل ق) سے معلق' تعلق' متعلق' علاقہ وغیرہ الفاظ تو مشتق ہیں' لیکن اس لفظ کا جمے ہوئے خون کے مفہوم و معانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ دراصل جس زمانے میں یہ تراجم ہوئے ہیں اس وقت نہ تو dissection کا کوئی تصور تھا اور نہ ہی ابھی مائیکروسکوپ ایجاد ہوئی تھی' لہٰذا علم الجنین کے بارے میں تمام تر معلومات کی بنیاد ظاہری مشاہدے پر تھی۔ اور چونکہ ابتدائی ایام کا حمل گرنے کی صورت میں رحم سے بظاہر خون کے لوتھڑے ہی برآمد

ہوتے تھے' اس لیے اس سے یہی سمجھا گیا کہ رحم مادر میں انسانی تخلیق کی ابتدائی شکل جمے ہوئے خون کے لوتھڑے کی سی ہوتی ہے۔ آج جب ہم جنینیات (Embryology) کے بارے میں جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں لفظ ''عَـلَـقَـــہ'' پر غور کرتے ہیں تو اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جدید سائنسی معلومات کے مطابق fertilized ovum ابتدائی مرحلے میں رحم کی دیوار کے اندر جما ہوا (embeded) ہوتا ہے' جبکہ اگلے مرحلے میں وہ اس سے اُبھر کر' bulge out کر کے دیوار کے ساتھ جونک کی طرح معلق ہو جاتا ہے' اور یہی دراصل ''عَلَقَه'' ہے۔

﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ ''پھر علقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا''

پھر اگلے مرحلے میں یہ ''عَلَقَہ'' گوشت کے ایک نیم چبائے ہوئے لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے' بلکہ ڈاکٹر کیتھ ایل مور (موصوف دورِ حاضر میں علم الجنین پر سند کا درجہ رکھتے ہیں) کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس جملے کی وضاحت کے لیے کچے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا اور واقعتاً اسے دانتوں سے چبا کر دکھایا کہ دانتوں کے نشان پڑ جانے سے اس گوشت کے ٹکڑے کی جو شکل بنی ہے بعینہٖ وہی شکل اس مرحلے میں ''مُضغة'' کی ہوتی ہے۔

﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ﴾ ''پس ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا''

اس کے بعد لفظ ''ثُمَّ'' کے ساتھ چوتھے اور آخری دور کا ذکر ہے:

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ﴾ ''پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔''

آیت کے اس جملے میں معانی کا ایک جہان آباد ہے' مگر اسے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ عام لوگ قرآن حکیم کی ایسی بہت سی آیات کو پڑھتے ہوئے بے خبری سے یوں آگے گزر جاتے ہیں جیسے ان میں کوئی خاص بات نہ ہو' مگر جس پر حقیقت منکشف ہوتی ہے اسے کلام اللہ کے ایک ایک حرف کے اندر قیامت مضمر دکھائی دیتی ہے۔ کتنے ہی مفسرین ہیں جو سورۃ الحدید کی تیسری آیت ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ کی تفسیر کیے بغیر آگے گزر گئے ہیں' لیکن امام رازیؒ جب اسے پڑھتے ہیں تو ان کی نظر کسی اور ہی جہان کا نظارہ کرتی ہے' اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيْقٌ مُهِيْبٌ (جان لو کہ یہ مقام بہت مشکل' بہت گہرا اور بہت پر ہیبت ہے!) بہرحال آیئے! اب اِن آیات کو پھر سے پڑھیے اور تخلیق کے مراحل میں ''فَ'' اور ''ثُمَّ'' کے نازک فرق کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ غور کیجیے! یہاں ''ثُمَّ'' کا وقفہ ایک پورے دور کو ظاہر کرتا ہے' جبکہ تخلیقی عمل کے اندرونی مراحل کے بیان کو ''فَ'' سے الگ کیا گیا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ⑫﴾ یعنی مٹی کے جوہر سے نطفے کی تخلیق ایک مکمل دور ہے۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ⑬﴾ یہ دوسرا دور ہے۔ یعنی نطفے کا قرارِ مکین میں پہنچ کر ایک بیج کی حیثیت سے دفن

ہو جانا۔﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ یہ تیسرے دور کا ذکر ہے اور اس دور کے اندر تین مراحل ہیں اور ہر مرحلے کے ذکر کے ساتھ حرف ''فَ'' آیا ہے:﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾۔اس کے بعد ''ثُمَّ'' کے ساتھ چوتھے اور آخری دور کا ذکر ہے:﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ ''پھر ہم نے اسے ایک اور دوسری مخلوق بنا کھڑا کیا''۔یعنی اب یہ ایک بالکل نئی مخلوق ہے۔

یہاں ''بالکل نئی مخلوق'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفصیل اس حدیث میں ملتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ......)) (متفق علیه)

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں' اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں' اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے.....''

یعنی چالیس دن تک نطفہ' پھر چالیس دن تک علقہ اور اس کے بعد چالیس دن تک مُضغہ' ایک سو بیس دن (چار ماہ) میں مذکورہ تین مراحل مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں۔وہ کولڈ سٹوریج (عالمِ ارواح) سے اس کی روح کو لا کر اس مادی جسم کے ساتھ ملا دیتا ہے اور یوں ایک نئی مخلوق وجود میں آ جاتی ہے۔یعنی اب تک تو وہ ایک حیوانی جسم تھا' لیکن اس روح کے پھونکے جانے کے بعد وہ انسان بن گیا۔البتہ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں بھی لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ ایک سو بیس دن کے بعد اس جسم میں جان ڈال دی جاتی ہے۔یعنی روح کو ''جان'' (life) سمجھا گیا ہے۔گویا چار ماہ تک تخلیقی مراحل سے گزرتا ہوا یہ وجود بے جان تھا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی یا جان تو اس میں پہلے دن سے ہی موجود تھی۔حتیٰ کہ باپ کے نطفے کا خلیہ (spermatozoon) اور ماں کا بیضہ (ovum) بھی اپنی اپنی جگہ پر زندہ وجود ہیں اور ان دونوں کے اختلاط سے وجود میں آنے والا جفتہ (zygote) بھی۔بہرحال ایک سو بیس دن کے بعد اس جسدِ حیوانی میں ''روح'' پھونکی جاتی ہے' جو ایک نورانی چیز ہے اور وہی اسے حیوان سے انسان بناتی ہے۔اور اسی تبدیلی یا تخلیقی مرحلے کو آیت زیرِ نظر میں ''خَلْقًا اٰخَرَ'' (ایک نئی تخلیق) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''پس بڑا بابرکت ہے اللہ' تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔''

خبردار! تم نے لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا ہے

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ (المؤمنون)

آیت ۱۱۵ ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ’’کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟‘‘

ان آیات سے پہلے اس سورت میں اہلِ جہنم کا ذکر ہوا ہے۔ اس سیاق و سباق میں اس آیت کا ترجمہ صیغہ ماضی میں ہوگا اور اس مفہوم میں اس کے مخاطب وہی جہنمی لوگ ہوں گے جن کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اور اگر اسے گزشتہ سلسلہ کلام سے علیحدہ پڑھا جائے تو اس کا ترجمہ صیغہ حال میں کیا جائے گا اور پھر اس کا مخاطب ہر پڑھنے سننے والا اور دنیا کے ہر زمانے کا ہر انسان ہوگا کہ اے لوگو! کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد اور بیکار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہمارے پاس واپس آ کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب نہیں دینا ہے؟

عقلی اور منطقی طور پر یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آخرت کے تصور کے بغیر انسانی تخلیق بالکل بے مقصد ہے۔ اگر انسان عام حیوانات جیسا حیوان ہوتا تو پھر واقعی حیات بعد الممات اور آخرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حیوانات کے برعکس انسان کے اندر فطری طور پر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی تمیز (moral sense) پیدا کی گئی ہے۔ اس اخلاقی حس کے نتیجے میں انسانی سطح پر جو اخلاقی اقدار (moral values) وجود میں آئی ہیں وہ کسی قوم، کسی علاقے یا زمانے تک محدود نہیں، بلکہ مستقل (permanent) اور آفاقی (universal) ہیں۔ چنانچہ ’’گندم از گندم بروید جوز جو‘‘ (گندم سے گندم اُگتی ہے اور جو سے جو) کے اصول کے مطابق اچھائی کا نتیجہ اچھا نکلنا چاہیے اور برائی کا برا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ لازمی طور پر ایسا نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ صورت حال منطقی طور پر تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا وجود میں آئے، جہاں ہر انسان کی موجودہ زندگی کے ایک ایک فعل اور ایک ایک عمل کا احتساب کر کے مصدقہ آفاقی اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا اہتمام ہو۔ یہی نکتہ ہے جسے قرآن مجید مختلف مواقع پر ایمان بالآخرت کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ بہرحال ایک ذی شعور انسان بالآخر اس منطقی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ (آل عمران) ’’اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے!‘‘

آیت ۱۱۶ ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ﴾ ’’تو بہت بلند و بالا ہے اللہ، جو حقیقی بادشاہ ہے۔‘‘

اللہ اس کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے۔ وہ کُلّی اختیارات کا مالک ہے اور اس کی یہ حیثیت بھی سزا و جزا کے نظام کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں جو اپنے غداروں اور باغیوں کو سزا نہ دے اور وفاداروں کو انعام و اکرام اور خلعتوں سے نہ نوازے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ بادشاہِ حقیقی اپنے جاں نثاروں کی قدر افزائی نہ کرے، ان کی قربانیوں کا انہیں کوئی صلہ نہ دے اور اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو سزا نہ دے؟

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ بہت عزت والے عرش کا مالک ہے۔''

انسانی معاشرتی زندگی سے متعلق چند اہم احکام

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ ذٰ لِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ۞ وَقُلْ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ يَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اٰبَآئِهِنَّ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُـعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ ؕ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۞ (النور)

آیت ۳۰ ﴿قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) مؤمنین سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔''

﴿ذٰ لِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ۞﴾ ''یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ یقیناً اللہ باخبر ہے اُس سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿وَقُلْ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ يَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ﴾ ''اور مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں''

﴿وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا﴾ ''اور وہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں' سوائے اس کے جو اس میں سے ازخود ظاہر ہو جائے''

﴿وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ﴾ ''اور چاہیے کہ وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں''

یعنی خواتین اپنے معمول کے لباس کے اوپر اپنی اوڑھنیوں کو اس طرح لپیٹے رکھیں کہ ان کے گریبان اور سینے ڈھکے رہیں۔ لفظ خُمُر جمع ہے' اس کا واحد خِمار ہے اور اس کے معنی اوڑھنی (دوپٹہ) کے ہیں۔ سورۃ الاحزاب' آیت ۵۹ میں خواتین کے لباس کے حوالے سے جَلَابِیب کا لفظ آیا ہے' جس کا واحد جِلباب ہے۔ ہمارے ہاں ''جلباب'' کا مترادف لفظ چادر ہے۔ چنانچہ یوں سمجھئے کہ دوپٹہ اور چادر دونوں ہی عورت کے لباس کا لازمی حصہ ہیں۔ عرب تمدن میں اسلام سے پہلے اگرچہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ رائج نہیں تھا مگر چادر اور

اوڑھنی اس دور میں بھی عورت کے لباس کا لازمی حصہ تھیں۔ اوڑھنی تو خواتین ہر وقت اوڑھے رہتی تھیں (گھر کے اندر رہتے ہوئے بھی) جبکہ گھر سے باہر نکلنا ہوتا تو چادر اوڑھ کر نکلتی تھیں۔ البتہ وہ اوڑھنی اس انداز سے لیتی تھیں کہ گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ اس آیت میں حکم دیا گیا کہ مؤمن عورتیں اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں تاکہ ان کے گریبان اور سینے اچھی طرح ڈھکے رہیں۔

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں چادر نہ صرف عورتوں بلکہ مَردوں کے لباس کا بھی لازمی حصہ تھی۔ چادر مرد کی عزت کی علامت سمجھی جاتی اور چادر کے معیار سے کسی شخص کے مقام و مرتبے کا تعین بھی ہوتا تھا۔ معمولی چادر والے شخص کو ایک عام آدمی جبکہ قیمتی دوشالہ اوڑھنے والے کو معزز اور اہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کسی کے کاندھے سے اس کی چادر کا کھینچنا یا گھسیٹنا اس کو بے عزت و بے توقیر کرنے کی علامت تھی۔ چادر کا یہی تصور اس حدیث قدسی میں بھی ملتا ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ)) (سنن ابی داوٗد) ''تکبر میری چادر ہے''۔ یعنی جو شخص تکبر کرتا ہے وہ گویا میری چادر گھسیٹ رہا ہے۔

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ﴾ ''اور وہ نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو''

آگے اس حکم سے استثناء کے طور پر مردوں کی ایک طویل فہرست دی جا رہی ہے جن کے سامنے عورت بغیر حجاب، کھلے چہرے کے ساتھ آ سکتی ہے۔ مقامِ غور ہے کہ اگر عورت کے چہرے کا پردہ لازمی نہیں ہے تو محرم مردوں کی یہ طویل فہرست بیان فرمانا (معاذ اللہ!) کیا ایک بے مقصد مشق (excercise in futility) ہے؟ چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں عورت کے چہرے کا پردہ لازمی ہے اور اس حکم سے جن لوگوں کو استثناء حاصل ہے وہ یہ ہیں:

﴿اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ﴾ ''(وہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں کسی پر) سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپوں کے''

باپ کے مفہوم میں چچا، ماموں، دادا اور نانا بھی شامل ہیں۔

﴿اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ﴾ ''یا اپنے شوہروں کے باپوں کے، یا اپنے بیٹوں کے، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے''

یعنی شوہر کا وہ بیٹا جو اس کی دوسری بیوی سے ہے وہ بھی نا محرم نہیں ہے، اس کا شمار بھی محرم رشتے داروں میں ہو گا۔

﴿اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ﴾ ''یا اپنے بھائیوں کے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں (بھتیجوں) کے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں (بھانجوں) کے''

﴿اَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ ''یا اپنی (جان پہچان کی) عورتوں کے''

یعنی عام عورتیں بھی نامحرم تصور کی جائیں گی۔ البتہ اپنے میل جول اور جان پہچان کی عورتیں اس استثنائی فہرست میں شامل ہیں۔

﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ﴾ ''یا اُن کے جن کے مالک ہیں ان کے داہنے ہاتھ''

یعنی غلام اور لونڈیاں۔ لیکن اکثر اہلِ سُنّت علماء کے نزدیک یہ حکم صرف لونڈیوں کے لیے ہے اور غلام اس میں شامل نہیں ہیں۔

﴿اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ ''یا ایسے زیر دست مَردوں کے جو اس طرح کی غرض نہیں رکھتے''

یعنی ایسے زیردست لوگ جو صرف خدمت گار ہوں اور اپنی عمر یا زیردستی ومحکومی کی بنا پر خواتین خانہ کے متعلق کوئی بُری نیت دل میں نہ لا سکیں۔ اس شرط پر پورا اترنے والے مرد بھی اس استثنائی فہرست میں شمار ہوں گے۔ مثلاً ایسے خاندانی ملازمین جو کئی پشتوں سے گھریلو خدمت پر مامور ہوں۔ پہلے باپ ملازم تھا' پھر اس کا بیٹا بھی اسی گھر میں پلا بڑھا اور بچپن سے ہی گھر کی خواتین کی خدمت میں رہا۔ ایسے لڑکے یا مرد سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ گھر کی خواتین کے بارے میں برا خیال ذہن میں لائے گا۔

﴿اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪﴾ ''یا اُن لڑکوں کے جو عورتوں کے مخفی معاملات سے ابھی ناواقف ہیں''

یعنی وہ نابالغ لڑکے جن میں عورتوں کے لیے فطری رغبت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔

یہ ان محرم لوگوں کی فہرست ہے جن کے سامنے عورت بغیر حجاب کے آ سکتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں مزید ذہن نشین کر لیجیے:

پہلی یہ کہ اس آیت میں اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (سوائے اس کے جو اس میں سے از خود ظاہر ہو جائے) کے الفاظ سے بعض لوگ چہرہ مراد لیتے ہیں' جو بالبداہت بالکل غلط ہے۔ سورۃ الاحزاب میں وارد احکامِ حجاب اور احادیثِ نبویہ ﷺ کی رو سے عورت کے لیے چہرے کا پردہ لازمی ہے۔ عہدِ نبویؐ میں حکم حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں۔ چنانچہ میرے نزدیک ان قرآنی الفاظ سے مراد نسوانی جسم کی ساخت یا اس کی ایسی کوئی کیفیت ہے جسے عورت چھپانا چاہے بھی تو نہیں چھپا سکتی۔ مثلاً کسی خاتون نے برقعہ پہن رکھا ہے' چہرے کے پردے کا اہتمام بھی کیا ہے مگر اس کے لمبے قد کی کشش یا متناسب جسم کی خوبصورتی اس سب کچھ کے باوجود بھی اپنی جگہ موجود ہے' جو بہرحال چھپائے نہیں چھپ سکتی۔

دوسری اہم بات یہاں یہ لائقِ توجہ ہے کہ مذکورہ محرموں کے سامنے عورت کو صرف چہرے کے پردے کے بغیر آنے کی اجازت ہے۔ ستر کے کسی حصے کو ان کے سامنے بھی کھولنے کی اسے اجازت نہیں (اس میں صرف اس کے خاوند کو استثناء حاصل ہے)۔ واضح رہے کہ عورت کے چہرے' پہنچوں سے آگے ہاتھوں اور ٹخنوں سے نیچے

پیروں کے سوا اس کا تمام جسم اس کے ستر میں شامل ہے۔ چنانچہ کسی عورت کو کھلے بالوں کے ساتھ یا مذکورہ تین اعضاء کے علاوہ جسم کے کسی حصے کو کھلا چھوڑ کر اپنے والد‘ بھائی یا بیٹے کے سامنے بھی آنے کی اجازت نہیں۔

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ﴾ ”اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ ان کی اس زینت میں سے کچھ ظاہر ہو جائے جسے وہ چھپاتی ہیں۔“

عورت کی چال ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے چادر یا برقعے کے باوجود اس کے بناؤ سنگھار‘ زیورات وغیرہ میں سے کسی قسم کی زینت کے اظہار کا امکان ہو۔

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ”اور اے اہلِ ایمان! تم سب کے سب مل کر اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

نورِ ایمان کی مثال

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ (النور)

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ”اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔“

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ﴾ ”اُس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق“

نور سے مراد یہاں نورِ ایمان ہے‘ یعنی اللہ پر ایمان کے نور کی مثال ایک طاق کی سی ہے:

﴿فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ﴾ ”اس (طاق) میں ایک روشن چراغ ہے‘ وہ چراغ شیشے (کے فانوس) میں ہے۔“

وہ چراغ شیشے کے فانوس میں رکھا گیا ہے‘ جیسے پچھلے زمانے میں چراغ عام طور پر شیشے کی چمنیوں میں رکھے جاتے تھے۔

﴿اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ ”اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کی مانند ہے“

اس مثال میں انسانی سینے کو طاق اور دل کو چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ انسانی پسلیوں کا ڈھانچہ‘ جسے ہم سینہ کہتے ہیں‘ یہ نیچے سے چوڑا اور اوپر سے تنگ ہونے کی وجہ سے پرانے زمانے کے طاق سے مشابہت رکھتا ہے۔ ڈایافرام (diaphragm) جو نچلے دھڑ کے اندرونی حصے (abdominal cavity) کو سینے کے اندرونی حصے (chest cavity) سے علیحدہ کرتا ہے‘ اس طاق کا گویا فرش ہے جس کے اوپر یہ چراغ یعنی دل رکھا گیا ہے۔ یہ دل ایک بندۂ مؤمن کا دل ہے جو نورِ ایمان سے جگمگا رہا ہے۔ یہ نورِ ایمان مجموعہ ہے نورِ فطرت

(جو اس کی روح کے اندر پہلے سے موجود تھا) اور نورِ وحی کا۔

﴿يُّوقَدُ مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيۡتُوۡنَةٍ لَّا شَرۡقِيَّةٍ وَّلَا غَرۡبِيَّةٍ ۙ﴾ ''وہ (چراغ) جلایا جاتا ہے زیتون کے ایک مبارک درخت سے، جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی''

کسی درخت پر جس سمت سے دھوپ پڑتی ہو، اسی سمت کے حوالے سے وہ شرقی یا غربی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی درخت کسی اوٹ میں ہو یا درختوں کے جھنڈ کے اندر ہو تو اس پر صرف ایک سمت سے ہی دھوپ پڑ سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ایسا درخت یا شرقی ہوگا یا غربی۔ لیکن یہاں ایک مثالی درخت کی مثال دی جارہی ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ وہ نہ تو کسی اوٹ میں ہے اور نہ ہی درختوں کے جھنڈ میں، بلکہ وہ کھلے میدان میں بالکل یکہ و تنہا کھڑا ہے اور پورے دن کی دھوپ مسلسل اس پر پڑتی ہے۔ اس مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ زیتون کا وہ درخت جس پر زیادہ سے زیادہ دھوپ پڑتی ہو اور مشرق و مغرب دونوں سمتوں سے پڑتی ہو، اس کے پھلوں کا روغن بہت صاف، شفاف اور اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔

﴿يَّكَادُ زَيۡتُهَا يُضِيۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ﴾ ''قریب ہے کہ اُس کا روغن (خود بخود) روشن ہو جائے، چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو۔''

گویا وہ آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہے۔

﴿نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ ؕ﴾ ''روشنی پر روشنی!''

یعنی جب اسے آگ دکھائی جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے اور نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ خوبصورت مثال ایمان کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں ہے اور میں نے مختلف مواقع پر اس مثال کی وضاحت بہت تفصیل سے کی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت یا اس پر ایمان، کی کیفیت پیدائشی طور پر موجود ہے، مگر دنیا میں رہتے ہوئے یہ معرفت ماحول اور حالات کے منفی اثرات کے باعث عام طور پر غفلت اور مادیت کے پردوں میں چھپ کر شعور سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ البتہ کچھ لوگ اس حد تک سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اُن کے اندر معرفتِ خداوندی خارجی حالات کے تمام تر منفی اثرات کے باوجود بھی مسلسل اجاگر اور فعال رہتی ہے۔

فطری معرفت کی اس روشنی کے بعد انسانی ہدایت کا دوسرا بڑا ذریعہ یا منبع وحی الٰہی ہے۔ وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی ہدایت بنیادی طور پر انسانی فطرت کے اندر پہلے سے موجود غیر فعال اور خوابیدہ (dormant) ایمان اور معرفتِ خداوندی کو بیدار اور فعال (activate) کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ جب وحی کا پیغام لوگوں تک پہنچتا ہے تو اس پر ہر انسان کا ردِّعمل اس کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی فطرت میں تکدر ہے تو وہ وحی کے اس پیغام کی طرف فوری طور پر متوجہ نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کی فطرت کی کثافت کو دور کرنے اور اس کے اندر فطری طور پر موجود معرفتِ خداوندی کو غفلت کے پردوں سے نکال کر شعور

کی سطح پر لانے کے لیے وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایک سلیم الفطرت انسان وحی کے پیغام کو پہچاننے میں ذرہ بھر تامل و تاخیر نہیں کرتا۔ فطری معرفت اس کے اندر چونکہ پہلے سے شعوری سطح پر موجود ہوتی ہے اس لیے نورِ وحی جونہی اس کے سامنے آتا ہے اس کے دل کا آئینہ جگمگا اٹھتا ہے اور وہ فوراً اس پیغام کی تصدیق کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ پیغامِ وحی کی فوری تصدیق کی وجہ سے ''صِدِّیقین'' کہلاتے ہیں۔ اس حوالے سے نبی مکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی مدِنظر رہنا چاہیے کہ: ''میں نے جس کسی کو بھی ایمان کی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف یا تردّد ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے' جنہوں نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا''۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ میں جن خوش نصیب لوگوں کو: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ کا خطاب ملا' یہ دراصل وہی لوگ تھے جن کی فطرت کے آئینے غیر معمولی طور پر شفاف تھے۔ دوسری طرف اسی ماحول میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی فطرت کے تکدر کو دور کرنے کے لیے اضافی وقت اور محنت کی ضرورت پڑی۔ ایسے لوگ بعد میں اپنی اپنی طبیعت کی کیفیت اور استطاعت کے مطابق ''سابقون الاولون'' کی پیروی کرنے والوں کی صف میں شامل ہوتے رہے۔ ان لوگوں کا ذکر اسی آیت میں ﴿وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

آیت زیر مطالعہ میں دی گئی مثال کو سمجھنے کے لیے تیل کی مختلف اقسام کے فرق کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ پرانے زمانے میں تیل کے دیے جلائے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ان میں سرسوں کا تیل جلایا جاتا تھا۔ یہ تیل زیادہ کثیف ہونے کی وجہ سے دیا سلائی دکھانے پر بھی آگ نہیں پکڑ سکتا۔ چنانچہ اسے کپڑے یا روئی کے فتیلے (بتی) کی مدد سے جلایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں پٹرول بھی ایک تیل ہے جو جلنے کے لیے ہر وقت بیتاب رہتا ہے اور چھوٹی سی چنگاری بھی اگر اس کے قریب آ جائے تو بھڑک اٹھتا ہے۔ جلنے کے اعتبار سے جس طرح ''کڑوے تیل'' اور پٹرول میں فرق ہے اسی نوعیت کا فرق انسانی طبائع میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ مثال میں اعلیٰ قسم کے زیتون سے حاصل شدہ انتہائی شفاف تیل گویا ''صدیقین'' کی فطرتِ سلیم ہے جو وحی الٰہی کے نور سے مستفیض ہونے اور ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْر'' کی کیفیت کو پانے کے لیے ہر وقت بے تاب و بے چین رہتی ہے۔ گویا انسانی روح ایک نورانی یا ملکوتی چیز ہے۔ اس ملکوتی روح سے جب وحی یا قرآن حکیم کے نور کا اتصال ہوتا ہے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اسی کیفیت سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے' جس سے بندۂ مؤمن کا دل منور ہوتا ہے۔

﴿یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''اور اللہ یہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں (کی راہنمائی) کے لیے' جبکہ اللہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یہ مثال لوگوں کو سمجھانے کے لیے بیان کی گئی ہے' کیونکہ انسانی ذہن ایسے لطیف حقائق کو براہِ راست نہیں سمجھ سکتا۔

اہلِ ایمان کے لیے خلافت اور غلبۂ دین کی بشارت

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (النور)

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ”اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں“

اس آیت کو ”آیتِ استخلاف“ کا نام دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ وعدہ محض موروثی اور نام کے مسلمانوں کے لیے نہیں ہے‘ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی کُلی تعمیل کو اپنا شعار بنانے اور اس کے راستے میں جان و مال کی قربانی دینے کے لیے سنجیدہ نہ ہوں‘ بلکہ یہ وعدہ تو اُن مؤمنینِ صادقین کے لیے ہے جو ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کریں۔ یعنی جو ایمانِ حقیقی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے ہوں۔

﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ”کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا‘ جیسے اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی۔“

یعنی اے اُمتِ محمدؐ! اگر تم لوگ ایمانِ حقیقی اور اعمالِ صالحہ کی دو شرائط پوری کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں زمین میں اسی طرح غلبہ اور اقتدار عطا کرے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے حضرت طالوت‘ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کو خلافت عطا کی تھی یا حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو مکابی سلطنت کی صورت میں اقتدار عطا کیا تھا۔ اس آیت میں خلافت کے وعدے کو تین مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ تاکیدی وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لازماً مسلمانوں کو بھی خلافت عطا فرمائے گا جیسے اس نے سابقہ امت کے اہلِ ایمان کو خلافت عطا کی تھی۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ ”اور وہ ضرور ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جو اُن کے لیے اُس نے پسند کیا ہے“

اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ دین کو لازماً غالب کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں مسلمانوں کی خلافت ہوگی وہاں لازماً اللہ کے دین کا غلبہ ہوگا اور اگر کسی حکومت میں اللہ کا دین غالب ہوگا تو وہ لازماً مسلمانوں ہی کی خلافت ہوگی۔ گویا بنیادی طور پر تو یہ ایک ہی بات ہے‘ لیکن صرف خلافت کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے پہلی بات کو یہاں دوسرے انداز میں دہرایا گیا ہے۔ البتہ یہاں اس دین کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں باقاعدہ نام لے کر بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے

لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا ہے' اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیتِ دین کے''۔ بہر حال دوسری بات یہاں یہ بتائی گئی کہ خلافت ملے گی تو اس کے نتیجے کے طور پر اللہ کا دین لازماً غالب ہوگا۔ اور تیسری بات:

﴿وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ﴾ ''اور وہ ان کی (موجودہ) خوف کی حالت کے بعد اس کو لازماً امن سے بدل دے گا۔''

یہ اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ہجرت کے فوراً بعد کے زمانے میں مسلمانوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں مدینہ کے اندر مسلسل ایمرجنسی کی سی حالت تھی۔ فلاں قبیلے کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے! فلاں قبیلہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے! کل قریش مکہ کی طرف سے ایک خوفناک سازش کی خبر پہنچی تھی! آج ابو عامر راہب کے ایک شیطانی منصوبے کی اطلاع آن پہنچی ہے! غرض ہجرت کے بعد پانچ سال تک مسلمان مسلسل ایک خوف کی کیفیت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔ اس صورت حال میں انہیں خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اب خوف کی وہ کیفیت امن سے بدلنے والی ہے۔

ان تینوں وعدوں کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہاں یہ لائقِ توجہ ہے کہ یہاں بار بار حروفِ تاکید استعمال ہوئے ہیں۔ تینوں افعال میں مضارع سے پہلے لام مفتوح اور بعد میں ''ن'' مشدّد آیا ہے' گویا تینوں وعدے نہایت تاکیدی وعدے ہیں۔

﴿یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ﴾ ''وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

میرے نزدیک یہ حکم مستقبل سے متعلق ہے۔ یعنی جب میرا دین غالب آ جائے گا تو پھر مسلمان خالص میری بندگی کریں گے اور کسی قسم کا شرک گوارا نہیں کریں گے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم نہیں ہوگی تو معاشرہ شرک سے کُلی طور پر پاک نہیں ہو سکے گا۔ جیسے ہم پاکستان کے مسلمان شہری آج قومی اور اجتماعی اعتبار سے کفر و شرک کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج اگر ہم سب انفرادی طور پر اپنے ذاتی عقائد بالکل درست بھی کر لیں اور اپنے آپ کو تمام مشرکانہ اوہام سے پاک کر کے عقیدۂ توحید کو راسخ بھی کر لیں تو بھی ہم خود کو شرک سے کُلی طور پر پاک کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یعنی جب تک ملک میں اللہ کا قانون نافذ اور اللہ کا دین عملی طور پر غالب نہیں ہو جاتا اور جب تک ملک میں دوسرے قوانین کے بجائے اللہ کے قانون کی بالادستی قائم نہیں ہو جاتی اُس وقت تک اس ملک کے شہری ہونے کے اعتبار سے ہم کفر اور شرک کی اجتماعیت میں برابر کے شریک رہیں گے۔ چنانچہ کسی ملک یا علاقے میں عملاً توحید کی تکمیل اُس وقت ہوگی جب اللہ کے اس فرمان کے مطابق دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے گا: ﴿وَیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ۚ﴾ (الانفال: ۳۹)۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ ''اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دین کے غلبے کے ماحول میں بھی جو شخص کفر کرے گا تو اس کے اندر گویا خیر کا مادہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ باطل کے غلبے میں کسی شخص کا ایمان لانا' اس پر قائم رہنا اور اس کے مطابق عمل کرنا انتہائی مشکل ہے' لیکن جب دین غالب ہو جائے اور ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں تو اس کے بعد صرف وہی شخص دین سے دور رہے گا جس کی فطرت ہی بنیادی طور پر مسخ ہو چکی ہے۔

ان دو مفاہیم کے علاوہ میرے نزدیک اس فقرے کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور اس مفہوم کے مطابق ''بَعْدَ ذٰلِكَ'' کے الفاظ کا تعلق مذکورہ تین وعدوں سے ہے' کہ جب اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ لازماً تمہیں خلافت سے نوازے گا' وہ لازماً تمہارے دین کو غالب کرے گا اور وہ لازماً تمہارے خوف کی کیفیت کو امن سے بدل دے گا تو اس کے بعد بھی جو شخص کمر ہمت نہ باندھے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اُٹھ کھڑا نہ ہو تو اسے گویا ہمارے وعدوں پر یقین نہیں اور وہ عملی طور پر ہمارے ان احکام سے کفر کا مرتکب ہو رہا ہے!

یہ آیت ۶ ہجری میں نازل ہوئی اور اس کے نزول کے فوراً بعد ہی اس کے مصداق کا ظہور شروع ہو گیا۔ ۷ ہجری میں صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا جسے خود اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لیے ''فتح مبین'' قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ①﴾ (الفتح)۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۷ ہجری میں ہی خیبر فتح ہوا' جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کثرت سے مالِ غنیمت عطا کیا۔ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا۔ ۹ ہجری کو حج کے موقع پر mopping up operation کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے مطابق آئندہ کے لیے مسجد حرام کے اندر مشرکین کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جزیرہ نمائے عرب کے تمام مشرکین کو میعادی معاہدوں کی صورت میں اختتامِ معاہدہ تک اور عمومی طور پر چار ماہ کی مہلت دے دی گئی' اور اس کے ساتھ ہی واضح حکم دے دیا گیا کہ اس مدتِ مہلت میں اگر وہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو سب کے سب قتل کر دیے جائیں گے۔ یوں ۱۰ ہجری تک جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین غالب ہو گیا' اللہ کی حکومت قائم ہو گئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے خلیفہ بن گئے۔

حضور ﷺ کے بعد خلافتِ راشدہ قائم ہوئی اور پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ حالات میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا جو مسلسل جاری ہے۔ اس سیاق وسباق میں (حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی مسند احمد میں منقول) حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بہت اہم ہے: ((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ)) ''تمہارے درمیان نبوت موجود رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ وہ رہے''۔ یعنی جب تک اللہ چاہے گا میں بنفسِ نفیس تمہارے درمیان موجود رہوں گا۔ ((ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا)) ''پھر اللہ اس کو اٹھا لے گا جب اسے اٹھانا چاہے گا''۔ یعنی جب اللہ چاہے گا میرا انتقال ہو جائے گا اور یوں یہ دور ختم ہو جائے گا۔ ((ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً

عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّۃِ)) ''پھر خلافت ہوگی نبوت کے نقشِ قدم پر''۔ یعنی میرے قائم کردہ نظام کے مطابق خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے ذریعے یہ نظام ایک بال کے فرق کے بغیر جوں کا توں قائم رہے گا۔ ((فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ)) ''پھر یہ دور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے''۔ ((ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا)) ''پھر اس دَور کو بھی اللہ اٹھالے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ ((ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا)) ''پھر کاٹ کھانے والی ظالم ملوکیت ہوگی''۔ ((فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ)) ''پس یہ دور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا''۔ ((ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا)) ''پھر اس کو بھی اللہ اٹھالے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ ((ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً)) ''پھر غلامی کی ملوکیت کا دور آئے گا''۔ یہ چوتھا دور دراصل ہمارا دور ہے۔ تیسرے دور کی ملوکیت میں سب کے سب حکمران (بنواُمیہ' بنوعباس اور ترک بادشاہ) مسلمان تھے۔ ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی مگر سب کلمہ گو تھے' جبکہ چوتھے دور کی ملوکیت میں مختلف مسلمان ممالک غیر مسلموں کے غلام ہو گئے۔ کہیں مسلمان تاجِ برطانیہ کی رعایا بن گئے' کہیں ولندیزیوں کے تسلّط میں آ گئے اور کہیں فرانسیسیوں کے غلام بن گئے۔ اس طرح پورا عالمِ اسلام غیر مسلموں کے زیرِ تسلّط آ گیا۔

اکیسویں صدی کا موجودہ دورِ عالمِ اسلام کے لیے ''مُلْكًا جَبْرِيًّا'' کا ہی تسلسل ہے۔ اگرچہ مسلم ممالک پر سے غیر ملکی قبضہ بظاہر ختم ہو چکا ہے اور ان ممالک پر قابض اقوام کی براہِ راست حکومتوں کی بساط لپیٹ دی گئی ہے لیکن عملی طور پر یہ تمام ممالک اب بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ استعماری قوتیں آج بھی ریموٹ کنٹرول اقتدار کے ذریعے ان ممالک کے معاملات سنبھالے ہوئے ہیں۔ ورلڈ بینک' آئی ایم ایف' اور دوسرے بہت سے ادارے ان کے مہروں کے طور پر کام کر رہے ہیں اور یوں وہ اپنے مالیاتی استعمار کو اب بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ چوتھا دور بھی ختم ہو جائے گا: ((ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا)) ''پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا جب اٹھانا چاہے گا''۔ اور پھر اُمت کو ایک بہت بڑی خوشخبری دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ''اس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور آئے گا''۔ یہ خوشخبری سنانے کے بعد راوی کہتے ہیں: ثُمَّ سَكَتَ ''پھر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے''۔ آپؐ شاید اس لیے خاموش ہو گئے کہ اس کے بعد دنیا کے خاتمے کا معاملہ تھا۔

اس کے علاوہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی (صحیح مسلم میں وارد) ایک حدیث میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام تمام روئے ارضی کے لیے ہو گا۔ حضرت ثوبانؓ (حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ)) ''اللہ نے میرے لیے تمام زمین کو لپیٹ دیا''۔ ((فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا)) ''تو میں نے اس کے سارے مشرق اور مغرب دیکھ لیے''۔ ((وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا)) ''اور میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوگی جو مجھے دکھائے گئے''۔

اسی طرح (مسند احمد میں وارد) حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا: ''روئے ارضی پر کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر اور کوئی کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ ایسا نہیں رہے گا جس میں دینِ اسلام داخل نہ ہو جائے، خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں''۔ یعنی یا تو وہ گھر والا اسلام قبول کر کے اعزاز حاصل کر لے گا یا پھر اسے ذلت کے ساتھ اسلام کی بالادستی قبول کرنا پڑے گی۔ دین کے غلبے کی صورت میں غیر مسلم رعایا کے لیے یہ وہ اصول ہے جو سورۃ التوبہ میں اس طرح بیان ہوا: ﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ یعنی وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

آنے والے اس دور کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ان فرمودات کے ساتھ ساتھ اس معاملے کو منطقی طور پر یوں بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں تین مقامات (التوبہ: ۳۳، الفتح: ۲۸ اور الصف: ۹) پر واضح الفاظ میں اعلان فرمادیا گیا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں پانچ مرتبہ حضور ﷺ کی بعثت کے بارے میں یہ بھی واضح فرمادیا گیا ہے کہ آپ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس مضمون میں سورۂ سبا کی یہ آیت بہت واضح اور نمایاں ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''ہم نے آپ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگوں کا اس کا ادراک نہیں ہے''۔ سورۃ الانبیاء میں یہی مضمون ایک نئی شان سے اس طرح آیا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''ہم نے تو آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے''۔ ان دونوں آیات کا مشترک مفہوم یہی ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد تب پورا ہوگا جب پورے عالمِ انسانیت پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ چنانچہ قیامت سے پہلے تمام روئے ارضی پر دینِ حق کا غلبہ ایک طے شدہ امر ہے۔

جماعتی نظم و ضبط کے ضمن میں اہم ہدایات

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِھِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمُ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۳﴾ (النور)

آیت ۶۲ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ ''مومن تو صرف وہی ہیں جو ایمان

لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر''

﴿وَإِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ط﴾ ''اور جب وہ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں رسولؐ کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہاں سے جاتے نہیں جب تک کہ اُنؐ سے اجازت نہ لے لیں۔''

نبی مکرم ﷺ کے بعد یہی حکم آپؐ کے جانشینوں اور اسلامی نظم جماعت کے اُمراء کے لیے ہے۔ اس حکم کے تحت کسی جماعت کے تمام ارکان کو ایک نظم (discipline) کا پابند کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نظم وضبط اس جماعت کے اندر نہیں ہوگا تو کسی کام یا مہم پر جاتے ہوئے کوئی شخص اِدھر کھسک جائے گا' کوئی اُدھر چلا جائے گا۔ ایسی صورت حال میں کوئی بھی اجتماعی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت لازمی قرار دے دیا گیا کہ کسی مجبوری یا عذر وغیرہ کی صورت میں اگر کوئی رخصت چاہتا ہو تو موقع پر موجود امیر سے باقاعدہ اجازت لے کر جائے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج﴾ ''یقیناً جو لوگ آپؐ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر۔''

﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ ''پھر جب وہ آپؐ سے اجازت مانگیں اپنے کسی عذر کی وجہ سے تو آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیجیے''

یہاں اسلامی نظم جماعت کے لیے یہ اصول دے دیا گیا کہ اجتماعی معاملات میں رخصت دینے کا اختیار امیر کے پاس ہے۔ چنانچہ امیر یا کمانڈر اپنے مشن کی ضرورت اور درپیش صورت حال کو دیکھتے ہوئے اگر مناسب سمجھے تو رخصت مانگنے والے کو اجازت دے دے اور اگر مناسب نہ سمجھے تو اجازت نہ دے۔ چنانچہ کوئی بھی ماتحت یا مامور شخص اجازت مانگنے کے بعد رخصت کو اپنا لازمی استحقاق نہ سمجھے۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ط﴾ ''اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کیجیے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

اس لیے کہ وہ اجتماعی کام جس کے لیے حضور ﷺ اہل ایمان کی جماعت کو ساتھ لے کر نکلے ہیں' آپؐ کا ذاتی کام نہیں بلکہ دین کا کام ہے۔ اب اگر اس دین کے کام سے کوئی شخص رخصت طلب کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ذاتی کام کو دین کے کام پر ترجیح دی ہے اور ذاتی کام کے مقابلے میں دین کے کام کو کم اہم سمجھا ہے۔ بظاہر یہ ایک بہت سنجیدہ معاملہ اور نازک صورت حال ہے' اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں۔

یہ مضمون سورۃ التوبہ میں بھی آیا ہے' لیکن وہاں اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اس فرق کو یوں سمجھئے کہ سورۃ النور ۶ ہجری میں نازل ہوئی تھی' جبکہ سورۃ التوبہ ۹ ہجری میں۔ اسلامی تحریک لحہ بہ لحہ اپنے ہدف کی طرف آگے بڑھ رہی تھی۔ حالات بتدریج تبدیل ہو رہے تھے اور حالات کے بدلنے سے تقاضے بھی بدلتے رہتے

تھے۔ چنانچہ یہاں (٦ ہجری) فرمایا جارہا ہے کہ جو لوگ آپؐ سے باقاعدہ اجازت طلب کرتے ہیں وہ واقعی ایمان والے ہیں‘ جبکہ تین سال بعد سورۃ التوبہ‘ آیت ۴۴ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا گیا کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اجازت لیتے ہی نہیں۔ دراصل وہ ایمرجنسی کا موقع تھا اور اس موقع پر غزوۂ تبوک کے لیے نکلنا ہر مسلمان کے لیے لازم کردیا گیا تھا۔ ایسے موقع پر کسی شخص کا رخصت طلب کرنا ہی اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص منافق ہے۔ چنانچہ وہاں (سورۃ التوبہ میں) رخصت دینے سے منع فرمایا گیا: ﴿عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَہُمۡ﴾ (آیت ۴۳) ”اللہ آپؐ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپؐ کو معاف فرمادیا) آپؐ نے ایسے لوگوں کو کیوں اجازت دے دی؟“ اگر آپؐ اجازت نہ بھی دیتے تو یہ لوگ پھر بھی نہ جاتے‘ لیکن اس سے ان کے نفاق کا پردہ تو چاک ہو جاتا! اس کے برعکس یہاں آیت زیر مطالعہ میں حضورﷺ کو اختیار دیا جارہا ہے کہ آپؐ جسے چاہیں رخصت دے دیں۔

اس مضمون کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو ایسے مواقع پر کسی اسلامی جماعت کے افراد کے درمیان ہمیں تین سطحوں پر درجہ بندی ہوتی نظر آتی ہے۔ پہلا درجہ ان ارکان کا ہے جو اپنے آپ کو دین کے کام کے لیے ہمہ تن وقف کر چکے ہیں۔ ان کے لیے دنیا کا کوئی کام اس کام سے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا کسی درپیش مہم سے ان کے رخصت لینے کا کوئی موقع و محل ہے ہی نہیں۔ اس سے نچلا درجہ ان ارکان کا ہے جو ایسے مواقع پر کسی ذاتی مجبوری اور ضرورت کے تحت باقاعدہ اجازت کے بعد رخصت لیتے ہیں‘ جبکہ اس سے نچلے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اجازت کے بغیر ہی کھسک جاتے ہیں۔ گویا ان کا دین کے اس کام سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس درجہ بندی میں اوپر والے زینے کے اعتبار سے اگرچہ درمیان والا زینہ کم تر درجے میں ہے‘ لیکن نچلے زینے کے مقابلے میں بہرحال وہ بھی بہتر ہے۔

یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ اسلامی جماعتوں کے اجتماعات کے موقع پر بعض رفقاء نہ تو اجتماع میں شامل ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے نظم سے باقاعدہ رخصت لیتے ہیں۔ نہ وہ پہلے بتاتے ہیں نہ ہی بعد میں معذرت کرتے ہیں۔ گویا انہیں کوئی احساس ہی نہیں‘ نہ نظم کی پابندی کا اور نہ اپنی ذمہ داری کا۔ ان کے مقابلے میں وہ رفقاء یقیناً بہتر ہیں جو اپنا عذر پیش کر کے اپنے امیر سے باقاعدہ رخصت لیتے ہیں۔ لیکن ان سب درجات میں سب سے اونچا درجہ بہرحال یہی ہے کہ دین کے کام کے مقابلے میں دنیا کے کسی کام کو ترجیح نہ دی جائے۔ اس درجے پر فائز لوگوں کے ذاتی کام اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کو پسِ پشت ڈال کر اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے نکلتے ہیں تو ان کے کاموں کو اللہ تعالیٰ خود سنوارتا ہے۔

آیت ۶۳ ﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ﴾ ”تم لوگ رسولؐ کے بلانے کو ایسے نہ سمجھو جیسے تمہارا آپس میں ایک دوسرے کو بلانا۔“

یعنی رسول اللہ ﷺ کا بلاوا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ کسی دوسرے شخص کے بلانے پر تم نہ جاؤ تو کوئی

بڑی بات نہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے بلانے پر تم لبیک نہ کہو تو اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ اب ایک بلانا یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو اس کے کسی دوست نے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کجا اور ایک عام آدمی کی دعوت کجا! — اسی طرح ایک بلانا اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے بلانا ہے کہ ایک طرف رسول اللہ ﷺ لوگوں کو بلا رہے ہیں کہ آؤ اللہ کی راہ میں میرے ساتھ چلو اور دوسری طرف کوئی عام شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لیے بلا رہا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے بلانے اور ایک عام آدمی کے بلانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

''دُعَآءَ الرَّسُوْلِ'' کا ایک مفہوم ''رسولؐ کو پکارنا'' بھی ہے۔ یعنی جیسے تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو، رسول اللہ ﷺ کو تم ایسے مخاطب نہیں کر سکتے۔ آپؐ کے ادب اور احترام کے بارے میں سورۃ الحجرات میں بہت واضح ہدایات دی گئی ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ آپؐ سے اونچی آواز میں بات کرو جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو، کہیں تمہارے سارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔''

﴿قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ﴾ ''اللہ خوب جانتا ہے تم میں سے ان لوگوں کو جو ایک دوسرے کی اوٹ لے کر کھسک جاتے ہیں۔''

یہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کی نیت میں پہلے سے ہی فتور ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ یوں ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی مہم کے لیے نکلے تو یہ بھی نکل پڑے۔ پھر جب دیکھا کہ ان کا نام جانے والوں میں شامل ہو چکا ہے تو اس کے بعد آنکھ بچا کر چپکے سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک گئے۔ یا اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی اجتماع میں شریک ہوئے، وہاں اچانک کسی مہم کے لیے کچھ رضا کاروں کی ضرورت پڑ گئی تو اب اس سے پہلے کہ رضا کاروں کے نام پوچھنے کا مرحلہ آتا، یہ آنکھ بچا کر وہاں سے کھسک گئے۔

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۶۳﴾ ''تو جو لوگ رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آزمائش آ جائے یا ان کو کوئی دردناک عذاب آ پکڑے۔''

اخلاص و ایمان کے بغیر کیے گئے اعمال کا انجام

وَقَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝۲۳ (الفرقان)

''اور ہم آگے بڑھیں گے ان کے ہر عمل کی طرف جو انہوں نے کیا ہوگا اور کر دیں گے اسے اُڑتا ہوا غبار۔''

یہ بہت عبرتناک منظر کی تصویر ہے۔ یہ دراصل ایسی نیکیوں کا ذکر ہے جن کی بنیاد ایمانِ حقیقی پر نہیں رکھی گئی تھی۔ آخرت میں ایسے اعمال کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی فضول اور قابلِ حقارت چیز کی سی ہوگی جسے کوئی دیکھتے ہی فٹ بال کی طرح ٹھوکر مار کر ہوا میں اُچھال دے۔ یہ ان دنیا پرست اور ریاکار لوگوں کے انجام کا نقشہ ہے جو ظاہری نیکیوں کے انبار لے کر میدانِ محشر میں آئیں گے۔ دنیا میں انہوں نے خیراتیں بانٹی تھیں، یتیم خانے کھولے تھے، ہسپتال بنائے تھے، مسجدیں تعمیر کرائی تھیں، مدارس کی سرپرستی کی تھی، حج اور عمرے کیے تھے، مگر ان اعمال کو سرانجام دیتے ہوئے اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کے اجر و ثواب کو کہیں بھی مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ کہیں عزت و شہرت حاصل کرنے کا جذبہ نیکی کا محرک بنا تھا تو کہیں پارسائی و پرہیزگاری کا سکہ جمانے کی خواہش نے عبادات کا معمول اپنایا تھا۔ کبھی الیکشن جیتنے کی منصوبہ بندی نے خدمتِ خلق کا لبادہ اوڑھا تھا تو کبھی کاروباری ساکھ کو بہتر بنانے کے لالچ نے متقیانہ روپ دھارا تھا۔ غرض ہر نیکی کے پیچھے کوئی نہ کوئی دُنیوی مفاد کارفرما تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو علیمٌ بذاتِ الصدور ہے، اس کے نزدیک ایسی کسی نیکی کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں۔ چنانچہ ایسے بدقسمت لوگوں کی نیکیوں کے انبار اور اعمالِ صالحہ کے پہاڑ جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے تو انہیں گرد و غبار کے ذرّات کی طرح تحلیل کر دیا جائے گا۔

یہ مضمون قرآن حکیم میں یہاں تیسری بار آیا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ایک تمثیل کے ذریعے ایسے اعمال کی بے بضاعتی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑱﴾ ''مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کے ساتھ (ایسی ہے) کہ ان کے اعمال ہوں راکھ کی مانند، جس پر زوردار ہوا چلے آندھی کے دن۔ انہیں کچھ قدرت نہیں ہوگی ان (اعمال) میں سے کسی پر بھی جو انہوں نے کمائے ہوں گے۔ یہی تو ہے دور کی گمراہی''۔ پھر سورۃ النور میں بغیر ایمان کی نیکیوں کی حقیقت ایک دوسری تمثیل میں یوں واضح کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ㊴﴾ ''اور جو کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب کسی چٹیل میدان میں، پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آیا تو اس نے اسے کچھ نہ پایا، البتہ اس نے اس کے پاس اللہ کو پایا، تو اُس نے پورا پورا چکا دیا اسے اس کا حساب۔ اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

حقوقِ قرآن کے حوالے سے لرزا دینے والی آیت

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ㉚ (الفرقان)

''اور رسولؐ نے کہا (یا رسول کہے گا): اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز بنا دیا۔''

تاویلِ خاص کے مطابق حضورﷺ کی یہ شکایت قریش مکہ کے بارے میں ہے کہ اے میرے پروردگار! میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچانے اور انہیں قرآن سنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے' لیکن یہ لوگ کسی طرح اسے سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں' جبکہ اس آیت کی تاویلِ عام یہ ہے کہ حضورﷺ کی یہ شکایت قیامت کے دن اپنی امت کے ان افراد کے خلاف ہوگی جو اس ''مہجوری'' کے مصداق ہیں' کہ اے اللہ! میری قوم کے ان لوگوں نے قرآن کو لائقِ التفات ہی نہ سمجھا۔ علامہ اقبال کے اس مصرعے میں اسی آیت کی تلمیح پائی جاتی ہے: ع ''خوار از مہجوریٔ قرآں شدی'' کہ اے مسلمان آج تو اگر ذلیل و خوار ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ تو نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

اس ضمن میں ایک بہت اہم اور قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ قریشِ مکہ نے تو اپنی خاص ضد اور ڈھٹائی میں قرآن حکیم کو اس موقف کے تحت ترک کیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے ہی نہیں اور محمد (ﷺ) نے خود اپنی طرف سے اسے گھڑ لیا ہے۔ لیکن آج اگر کوئی شخص کہے کہ میں قرآن حکیم پر ایمان رکھتا ہوں اور اسے اللہ کا کلام مانتا ہوں' مگر عملی طور پر اس کا رویہ ایسا ہو کہ وہ قرآن حکیم کو لائقِ اعتناء نہ سمجھے' نہ اسے پڑھنا سیکھے' نہ کبھی اس کے پیغام کو جاننے کی کوشش کرے تو گویا اس کے حال یا عمل نے اس کے ایمان کے دعوے کی تکذیب کر دی۔ چنانچہ اس آیت کے حاشیے (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے' تاہم قرآن حکیم کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اُس پر عمل نہ کرنا' اُس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اُس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔''

مقامِ غور ہے کہ آج اگر ہم اپنی دنیا سنوارنے کے لیے انگریزی زبان میں تو مہارت حاصل کر لیں' لیکن قرآن حکیم کا مفہوم سمجھنے کے لیے عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہ کریں' تو قرآن حکیم پر ہمارے ایمان کے دعوے اور اس کو اللہ کا کلام ماننے کی عملی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ چنانچہ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن حکیم کے حقوق کے بارے میں آگاہی حاصل کرے' اس سلسلے میں عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان تقاضوں پر عمل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہے۔ اس موضوع پر میرا ایک نہایت جامع کتابچہ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' دستیاب ہے۔ اس کا انگلش' عربی' فارسی' سندھی اور ملایا زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ قرآن حکیم کے حقوق کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کتابچے کا مطالعہ' ان شاء اللہ' بہت مفید ثابت ہوگا۔

نفس پرستی —— شرک کی ایک انتہائی مہلک قسم

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۞ (الفرقان)

''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ تو (اے نبیﷺ!) کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟''

اس آیت میں شرک کی ایک بہت اہم قسم کا ذکر آیا ہے۔ اس اعتبار سے اس پر بہت باریک بینی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل شرک صرف ''یا علی مدد!'' کا نعرہ لگانے یا قبر پرستی تک ہی محدود نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے کسی واضح حکم کے مقابلے میں خواہشِ نفس پر عمل پیرا ہونا بھی شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ انسان کو اس کا نفس ہر وقت دنیا سمیٹنے اور زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کرنے کے حسین خواب دکھاتا رہتا ہے۔ وہ حرام کو اپنانے کے لیے پُرکشش توجیہات پیش کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آج کے بینک کا سود حرام نہیں ہے' پرانے دور میں تو سود کو اس لیے حرام کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے سے غرباء کا استحصال ہوتا تھا' آج کے بینکنگ نظام پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا' آج تو بینک کی معاونت کے بغیر کوئی کاروبار چل ہی نہیں سکتا' اس لیے بینک کے تعاون سے فلاں کاروبار کرنے میں کوئی حرج نہیں' وغیرہ وغیرہ —— بہرحال اگر کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر اپنے نفس کی بات مان لی تو گویا وہ اپنے نفس کا بندہ بن گیا۔ اب اس کا نفس ہی اس کا ''مطاع'' ہے اور ظاہر ہے جو کوئی بھی کسی کا اصل مطاع ہو گا وہی اس کا معبود ہو گا۔

عبادت دراصل مکمل غلامی کا نام ہے۔ جس طرح ایک غلام اپنے آقا کا ہر حکم ماننے کا پابند ہے اسی طرح ایک بندے (عبد) پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے معبود کی مکمل فرمانبرداری کرے اور اس کے کسی بھی حکم سے سرتابی نہ کرے۔ عبادت کا یہ مفہوم سورۃ المؤمنون میں درج فرعون کے اس جملے سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے: ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ کہ ان دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام) کی قوم ہماری غلام اور اطاعت شعار ہے۔ اب اگر کوئی شخص زبان سے توحید پرستی کا دعویٰ کرے' لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کے وظیفے کرے اور چلّے کاٹے' لیکن عملاً اطاعت اور فرمانبرداری اپنے نفس کی کرے تو حقیقت میں وہ توحید پرست نہیں بلکہ نفس پرست ہے اور اس کا نفس ہی اصل میں اس کا معبود ہے۔

واٹر سائیکل —— اللہ تعالیٰ کی ایک بصیرت افروز نشانی

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ (الفرقان)

آیت ۴۸ ﴿وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ﴾ ''اور وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اپنی رحمت کے آگے آگے بشارت بنا کر۔''

بادلوں کے آگے آگے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے گویا بارانِ رحمت کی نوید سناتے جاتے ہیں۔

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا۔''

بارش کا پانی پاک بھی ہے اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ جب یہ پانی برستا ہے تو سب سے پہلے فضا

کی آلودگی کو صاف کرتا ہے۔ پھر زمین کی بہت سی آلودگیوں کو سمندر میں بہا لے جاتا ہے۔ سمندر کے پانی سے بخارات کی صورت میں بالکل صاف اور ہر آلودگی سے پاک پانی پھر سے فضا میں پہنچ کر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ (cycle) چلتا رہتا ہے۔

آیت ۴۹ ﴿لِّنُحۡـِۧیَ بِهٖ بَلۡدَةً مَّیۡتًا وَّنُسۡقِیَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیۡرًا﴾ ۴۹ ''تاکہ ہم زندہ کریں اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو اور اس سے ہم سیراب کرتے ہیں اپنی مخلوق میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔''

جہاں یہ پانی بہت سی آلودگیوں کو صاف کرتا ہے وہاں یہ جانوروں اور انسانوں کے پینے کے کام بھی آتا ہے۔ میڈیکل سائنس کی نظر سے دیکھا جائے تو انسانی یا حیوانی جسم کے اندر استعمال ہو کر پانی کہیں ختم (consume) نہیں ہو جاتا بلکہ یہاں بھی وہ جسم کے اندرونی نظام کو چلانے اور اس کی صفائی کرنے کا کام کرتا ہے۔ پانی کے ذریعے سے ہی کسی جاندار جسم کے اندر خون کی گردش (circulation) ممکن ہوتی ہے اور metabolism کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فاضل اور نقصان دہ فضلات کا معدے' گردوں' پھیپھڑوں وغیرہ سے اخراج ممکن ہوتا ہے۔

آیت ۵۰ ﴿وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ بَیۡنَهُمۡ لِیَذَّكَّرُوۡا﴾ ''اور اس کو ہم نے گردش میں رکھا ہوا ہے ان کے مابین تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں''

سمندر کے بخارات سے بادلوں کا بننا' اربوں ٹن پانی کا ہواؤں کے دوش پر ہزاروں میل کے فاصلے طے کر کے مختلف علاقوں میں بارش برسانا' ان بارشوں سے ندی نالوں اور دریاؤں کے سلسلوں کا جنم لینا' انسانی آبادیوں سے میلوں کی بلندیوں پر گلیشیرز کی صورت میں پانی کے کبھی نہ ختم ہونے والے ذخائر (over head tanks) کا وجود میں آنا' پھر گلیشیرز کا پگھل پگھل کر ایک تسلسل کے ساتھ زمین پر موجود ہر طرح کی زندگی کی سیرابی کا ذریعہ بننا' اور اس سب کچھ کے بعد فالتو پانی کا پھر سے سمندر میں پہنچ جانا! یہ ہے پانی کی گردش (water cycle) کا عظیم الشان نظام جو قدرت کے بڑے بڑے عجائبات میں سے ہے اور زبانِ حال سے انسانی عقل و شعور کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ اس کے خالق کو پہچانے اور اس پر ایمان لائے۔

﴿فَاَبٰۤی اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا﴾ ۵۰ ''لیکن اکثر لوگ کفرانِ نعمت ہی کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی ایسی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اکثر لوگ ناشکری ہی پر اڑے رہتے ہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار کرنے سے انکاری ہیں۔

عذابِ قبر کے بارے میں ایک واضح قرآنی اشارہ

یُضٰعَفۡ لَهُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَیَخۡلُدۡ فِیۡهٖ مُهَانًا ۶۹ (الفرقان)

''قیامت کے دن اُس کا عذاب دوگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس میں رہے گا ہمیشہ ذلیل ہو کر۔''

یہ آیت اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے قیامت کے دن سے پہلے کا عذاب ثابت ہوتا ہے۔ منکرینِ حدیث عذابِ قبر کو نہیں مانتے۔ ان کا اصرار ہے کہ قرآن مجید میں عذابِ قبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اگرچہ قرآن حکیم میں صراحتاً عذابِ قبر کا ذکر نہیں ہے، لیکن بعض آیات سے واضح طور پر برزخی زندگی کا عذاب ثابت ہوتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے مجرمین عذاب جھیل رہے ہوں گے، جسے قیامت کے دن ان کے لیے دوگنا کر دیا جائے گا۔ بہرحال احادیث میں عذابِ قبر کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات ملتی ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ۔ اور یہ کہ قبر میں یا تو جنت کی ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے جہاں سے ٹھنڈی ہوا اور خوشبو آتی ہے، یا پھر دوزخ کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس سے آگ کی لپٹ اور لو آتی ہے۔

عبادالرحمٰن کی ایک اہم دعا

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ (الفرقان)

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما''

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو ''عبادالرحمٰن'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے اور ان کے کردار کی خصوصیات گنوانے کے ساتھ ساتھ ان کی دعاؤں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ان کی ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! جس راستے پر ہم چل رہے ہیں، ہمارے اہل وعیال کو بھی اسی راستے پر چلنے والا بنا دے تاکہ ان کی طرف سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک تو اسی میں ہوگی کہ ان کے گھر والے بھی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بنیں اور اس کی بندگی کے راستے کو اختیار کریں۔ اس کے برعکس اگر گھر کا سربراہ اللہ تعالیٰ کے دین پر چلنے والا ہو اور اس کے اہل وعیال کی ترجیحات کچھ اور ہوں تو گھر کے اندر کشیدگی اور کش مکش کا ماحول پیدا ہو جائے گا جو ان میں سے کسی کے لیے بھی باعث سکون نہیں ہوگا۔

﴿وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝﴾ ''اور ہمیں متقیوں کا امام بنا!''

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''عبادالرحمٰن'' امامت اور پیشوائی کے لیے بے قرار ہیں، بلکہ اس دعا کو اس حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے اور اس کے بیوی بچے اس کے تابع اور پیروکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ گھر

کے سربراہ کی دعا اور خواہش ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اہل وعیال کو بھی متقی بنا دے۔ اس امامت کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ میدانِ حشر میں ہر انسان کے اہل وعیال اور اس کی نسل کے لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوں گے۔ عباد الرحمٰن کی یہ دعا اس لحاظ سے بھی برمحل ہے کہ اے اللہ! میدانِ حشر میں ہم جن لوگوں کے سربراہ یا لیڈر بنیں ان کو بھی نیک اور پرہیز گار بنا دے' تاکہ وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ جنت میں داخل ہو کر ہماری خوشی اور طمانیت کا باعث بنیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والی نسلوں کے لوگ جہنم کے مستحق ٹھہریں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) (متفق علیه) کہ تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی سی ہے اور تم میں سے ہر کوئی اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہوگا۔ اس لحاظ سے ہر آدمی کے اہل وعیال اس کی رعیت ہیں اور اپنی اس رعیت کے بارے میں وہ مسئول ہوگا۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے لیے اسے ہر وقت کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے اور دعا بھی۔

''قارون'' ——— ایک رویّے' ایک کردار کا نام

إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ إِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِى الْقُوَّةِ ۚ إِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ إِنَّمَآ أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ ۖ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (القصص)

آیت ۷۶ ﴿إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى﴾ ''یقیناً قارون موسیٰؑ کی قوم ہی سے تھا''

تورات میں اس شخص کا نام Qaurah لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے تلفّظ کے اختلاف کی وجہ سے یہ فرق پیدا ہوا ہو۔ بہرحال اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ یہاں قارون نامی شخص کے حوالے سے جس کردار اور رویے کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض ایک فرد کا نام نہیں بلکہ یہ کردار ایک پورے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک ایسا طبقہ جو کسی محکوم قوم کے اندر حکمرانوں کے ہاتھوں جنم لیتا ہے اور ان کے سائے میں نشو ونما پاتا ہے۔ دراصل کسی بھی ملک میں فاتح اور غاصب حکمرانوں کا طرزِ حکمرانی ظلم و ناانصافی سے عبارت ہوتا ہے۔ ایسے نظام میں عزت و شرافت کے نئے معیار جنم لیتے ہیں۔ سورۃ النمل کی آیت ۳۴ میں ملکہ سبا کی زبانی غاصب بادشاہوں کے کردار پر اس طرح تبصرہ کیا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْمُلُوْكَ إِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً أَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا أَعِزَّةَ أَهْلِهَآ أَذِلَّةً ۚ﴾ ''بلاشبہ جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کر دیتے ہیں' اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔''

غاصب حکمران ہمیشہ خوف اور لالچ کے ذریعے عوام کے اندر سے اپنے حمایتی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے

ماحول میں محکوم قوم کے گھٹیا اور بے غیرت قسم کے لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے اپنے آقاؤں سے مراعات حاصل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے سورۃ النمل کی مذکورہ آیت کے مطالعے کے دوران برصغیر پاک و ہند کے غیر ملکی حکمرانوں کی مثال زیر بحث آ چکی ہے۔ برصغیر میں انگریزوں نے بھی اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے مقامی لوگوں میں سے ایک ایسا ہی طبقہ پیدا کیا تھا۔ ان لوگوں کو جاگیریں دی گئیں' بڑے بڑے ٹھیکے الاٹ کیے گئے' خطابات سے نوازا گیا' اعلیٰ مناصب پر بٹھایا گیا اور یوں ان کی غیرتوں اور وفاداریوں کو خرید کر ان کو خود ان ہی کی قوم کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اسی طرح فرعون کی عملداری میں بنی اسرائیل کے اندر بھی ایک ایسا ضمیر فروش طبقہ پیدا ہو چکا تھا اور قارون اسی طبقے کا ایک ''معزز فرد'' تھا۔ یہ شخص نہ صرف بنی اسرائیل میں سے تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی چچا زاد تھا۔ فرعون کے دربار میں اس شخص کو خاص امتیازی مقام حاصل تھا۔ اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اس نے اس قدر دولت اکٹھی کر رکھی تھی کہ اس اعتبار سے اس کا نام ضرب المثل کا درجہ رکھتا تھا۔ بدقسمتی سے آج ہمارے ہاں کے بعض سیاسی کردار بھی دولت سمیٹنے کے لحاظ سے اسی طرح علامتی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

﴿فَبَغٰى عَلَيۡهِمۡ﴾ ''لیکن اُس نے ان کے خلاف سرکشی کی''

قارون نے اپنی قوم سے غداری کی اور فرعون کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی قوم کے خلاف ظلم و زیادتی پر مبنی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔

﴿وَاٰتَيۡنٰهُ مِنَ الۡكُنُوۡزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوۡٓاُ بِالۡعُصۡبَةِ اُولِى الۡقُوَّةِ﴾ ''اور اُس کو ہم نے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی چابیاں ایک طاقتور جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔''

اس سے اگر آج کل کی چابیوں کا تصور ذہن میں رکھیں تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کو یوں سمجھیں کہ پرانے زمانے میں آج کل کی طرز کے تالے تو نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا پھاٹک نما دروازوں کو بند کرنے کے لیے بڑی بڑی لکڑیوں یا دھات کے ''اڑنگوں'' کو مخصوص طریقے سے ان کے اندر پھنسانے کا انتظام کیا جاتا ہوگا اور ان ہی کو ان دروازوں کی چابیاں کہا جاتا ہوگا۔ بہرحال اس جملے کا عمومی مفہوم یہی ہے کہ اس شخص کے پاس بے انتہا دولت تھی۔

﴿اِذۡ قَالَ لَهٗ قَوۡمُهٗ لَا تَفۡرَحۡ﴾ ''جب اس سے کہا اس کی قوم کے لوگوں نے کہ اِتراؤ مت''

ظاہر ہے ہر معاشرے میں کچھ بھلے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع میں دو اشخاص کا واقعہ آیا ہے۔ ان میں سے ایک شخص درویش صفت اور عارف باللہ تھا جبکہ دوسرا مال مست تھا جو اپنی دولت کے گھمنڈ میں اللہ تعالیٰ کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔ بہرحال کچھ بھلے لوگوں نے قارون کو نصیحت کی کہ تم اپنی دولت پر اترایا نہ کرو۔ یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ ان آیات میں دولت مند لوگوں کے لیے پانچ انتہائی مفید نصیحتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن لوگوں کے پاس بہت سی دولت جمع ہو گئی ہو انہیں ان نصیحتوں کو پیش نظر رکھنا

چاہیے۔ان میں سے پہلی نصیحت تو یہی ہے کہ اپنی دولت پر اتراؤ نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾﴾ ''یقیناً اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس کے بعد دوسری نصیحت:

آیت ۷۷ ﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ﴾ ''اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس سے دارِ آخرت حاصل کرنے کی کوشش کرو''

یہ دولت اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہے' اسے زیادہ سے زیادہ اس کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے توشۂ آخرت جمع کرنے کی کوشش کرو۔اس ضمن میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے یہ الفاظ بھی مدنظر رہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اوران کے مال بھی' اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ ''اور مت بھولو تم دنیا سے اپنا حصہ''

کسی دولت مند شخص کے لیے یہ تیسری نصیحت ہے کہ جو دولت اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھی ہے اس میں سے اپنی ذات پر بھی خرچ کرو۔اس سے یوں لگتا ہے جیسے قارون بہت کنجوس تھا۔اسے بس دولت جمع کرنے ہی کی فکر تھی' دولت کو خرچ کرنے سے وہ گھبراتا تھا' حتیٰ کہ اپنی ذاتی ضروریات کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔اس سلسلے میں سورۃ الاعراف' آیت ۳۲ کے ان الفاظ میں ایسے لوگوں کے لیے بہت واضح راہنمائی موجود ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیں کہ کس نے حرام کی ہے وہ زینت جو اللہ نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لیے؟ اور (کس نے حرام کی ہیں) پاکیزہ چیزیں کھانے کی؟'' یعنی ایک خوشحال آدمی کو اچھا کھانے اور اچھا پہننے سے کس نے منع کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رہبانیت اختیار کرنے کا حکم تو نہیں دیا' بلکہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ اعتدال کی روش کو پسند فرماتے ہیں۔چنانچہ سورۃ الفرقان کی آیت ۶۷ میں ''عباد الرحمٰن'' کے اوصاف میں سے ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی گئی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾﴾ ''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں' بلکہ ان کا خرچ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے''۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں اس حکم کے ذریعے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑے بغیر اپنے وسائل میں سے اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات پر خرچ کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں چوتھی نصیحت یہ کی گئی ہے:

﴿وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ ''اور لوگوں کے ساتھ احسان کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے''

اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت دی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر بہت بڑا احسان ہے۔لہٰذا تمہیں چاہیے کہ تم بھی

لوگوں پر احسان کرو اور اپنے بیگانے کی تفریق و تخصیص کیے بغیر غریبوں' مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کو اپنا شعار بناؤ۔ اس حوالے سے سورۃ المعارج میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾﴾ ''اور وہ لوگ جن کے اموال میں ایک مقررہ حصہ ہے' سائلوں اور ناداروں کا''۔ اور اب پانچویں نصیحت:

﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾﴾ ''اور زمین میں فساد مت مچاؤ' یقیناً اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اپنے سیاق و سباق کے حوالے سے یہ بہت اہم ہدایت ہے۔ وہ کون سا فساد تھا جس میں قارون ملوث تھا؟ یہ سمجھنے کے لیے مصر کے اس ماحول کا تصور کریں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام دن رات ہمہ تن کارِ نبوت اور فرائض رسالت کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ اُس معاشرے کے کچھ لوگ تو آپؑ کا ساتھ دے رہے تھے اور اس کام میں آپؑ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش میں تھے' جبکہ کچھ دوسرے لوگ آپؑ کی راہ میں روڑے اٹکانے اور آپؑ کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے سازشوں میں مصروف تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ اس معاشرے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے جو خیر پیدا کرنا چاہتا تھا' قارون اور اس کے گروہ کے لوگ مختلف حربوں سے اس خیر کا راستہ روکنے کی کوشش میں مصروف تھے' اور یہی وہ ''فساد فی الارض'' ہے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے۔

اس حوالے سے اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے مدنی دور کا جائزہ لیں تو مدینہ کے منافقین بھی آپؐ کے مشن کے خلاف اسی طرح کی منفی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل تھے۔ ان کی مفسدانہ سازشوں کا ذکر سورۃ البقرۃ میں اس طرح کیا گیا ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت مچاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! بلاشبہ وہی ہیں فساد کرنے والے' لیکن وہ شعور نہیں رکھتے''۔ چنانچہ کسی دینی جماعت یا تحریک کی اصلاحی اور انقلابی کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا اور ایسی جماعت کے نظم کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرنا گویا ''فساد فی الارض'' کے زمرے میں آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مفسد لوگ پسند نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا ہدایات کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ انہیں ایک مرتبہ پھر سے دہرا لیا جائے:

(۱) ﴿لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾﴾

''(اپنی دولت پر) اتراؤ مت' یقیناً اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

(۲) ﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ﴾

''اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس سے دارِ آخرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

(۳) ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾

''اور تم دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو''

(۴) ﴿وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ﴾

''اور لوگوں کے ساتھ احسان کرو' جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے''

(۵) ﴿وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝۷۷﴾

''اور زمین میں فساد مت مچاؤ' یقیناً اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۷۸ ﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ‌ؕ﴾ ''اُس نے کہا کہ مجھے تو یہ سب کچھ ملا ہے اُس علم کی بنیاد پر جو میرے پاس ہے۔''

یعنی تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ دولت مجھے ایسے ہی مل گئی ہے؟ یہ تو میں نے اپنی ذہانت' سمجھ بوجھ' محنت اور اعلیٰ منصوبہ بندی کی وجہ سے کمائی ہے۔ واضح رہے کہ یہ خالص مادہ پرستانہ سوچ ہے اور ہر زر پرست شخص جو عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے فضل کا منکر ہے ہمیشہ اسی سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے کاروبار کی سب کامیابیاں میرے علم اور تجربے کی بنیاد پر ہیں۔ میں نے مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا بروقت اندازہ لگا کر جو فلاں فیصلہ کیا تھا اور فلاں سودا کیا تھا اس کی وجہ سے مجھے یہ اتنی بڑی کامیابی ملی ہے۔

﴿اَوَلَمۡ يَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَهۡلَكَ مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُ قُوَّةً وَّاَكۡثَرُ جَمۡعًا‌ؕ﴾ ''کیا اُسے معلوم نہیں کہ اللہ اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکا ہے جو طاقت اور مال و اسباب کی فراوانی میں اس سے کہیں بڑھ کر تھیں!''

﴿وَلَا يُسۡـئَلُ عَنۡ ذُنُوۡبِهِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝۷۸﴾ ''اور (اللہ کے ہاں) مجرم لوگوں سے ان کی خطاؤں کے بارے میں پوچھا بھی نہیں جاتا۔''

اللہ تعالیٰ ان کے حساب کتاب کی جزئیات تک سے باخبر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اعمال نامہ کی ایک ایک تفصیل اس کے سامنے ہے۔ اسے کسی تفتیش یا تحقیق کی ضرورت نہیں۔ یہی بات سورۃ الرحمٰن میں یوں بیان ہوئی ہے: ﴿فَيَوۡمَـئِذٍ لَّا يُسۡـئَلُ عَنۡ ذَنۡۢبِهٖۤ اِنۡسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝۳۹﴾ ''پھر اس دن نہیں پوچھا جائے گا کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں''۔ اس لیے کہ اللہ کے حضور پیشی کے وقت ہر فرد کی مکمل کارگزاری اس کی پیشانی پر نقش ہوگی: ﴿يُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِيۡمٰهُمۡ فَيُؤۡخَذُ بِالنَّوَاصِىۡ وَالۡاَقۡدَامِ ۝۴۱﴾ (الرحمٰن) ''مجرم اپنے چہروں سے ہی پہچان لیے جائیں گے' تو انہیں دبوچ لیا جائے گا سر کے بالوں اور پیروں سے''۔ اس طریقے سے ان میں سے ایک ایک کو پکڑ کر جہنم کی طرف اچھال دیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک خاص بشارت

اِنَّ الَّذِىۡ فَرَضَ عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ‌ؕ قُلْ رَّبِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰى وَمَنۡ هُوَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝۸۵ (القصص)

''(اے نبیﷺ!) یقیناً جس نے آپ پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے' وہ آپ کو پہنچا کے رہے گا ایک بہت اچھی لوٹنے کی جگہ۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون ہے جو کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔''

یہاں پر ﴿فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ کے حوالے سے سورۃ النمل کی آیت ۹۲ کے یہ الفاظ بھی مدِنظر رہنے چاہئیں: ﴿وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ﴾ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم لوگوں کو قرآن سناتا رہوں۔ قرآن ہی کے ذریعے سے انذار' تبشیر اور تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہوں اور اسی کی مدد سے تمہارے نفسانی اور روحانی امراض کی شفا کے لیے کوشاں رہوں۔ گویا سورۃ النمل کی مذکورہ آیت میں قرآن پڑھ کر سنانے کے جس حکم کا ذکر ہے اسی کی تعبیر یہاں آیت زیر مطالعہ میں ﴿فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی قرآن حکیم کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے فرض کر دی ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۷ میں آپؐ کی اس ذمہ داری کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۭ﴾ ''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔''

رسول اللہﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ بھاری ذمہ داری اپنی امت کو منتقل کر دی اور اس سلسلے میں حکم دیا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''پس جو حاضر ہے وہ اُس تک پہنچا دے جو حاضر نہیں ہے''۔ گویا یہ آپﷺ کا حکم ہے کہ آپؐ کا ہر امتی اپنی استطاعت کے مطابق تبلیغ دین کا یہ فریضہ لازماً ادا کرے۔ اس حکم کے ذریعے آپﷺ نے اپنے ''فریضۂ رسالت'' کا سلسلہ تا قیامِ قیامت دراز فرما دیا۔ چنانچہ آپؐ کے اُمتی ہونے کے ناتے سے اب یہ ذمہ داری ہم میں سے ہر ایک پر عائد ہوتی ہے۔ میں نے اپنے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں اس ذمہ داری کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ذمہ داری کے پانچ پہلو ہیں' یا یوں سمجھیے کہ قرآن حکیم کے یہ پانچ بنیادی حقوق ہیں جو ہم میں سے فرداً فرداً سب کے ذمہ ہیں: (۱) قرآن حکیم پر ایمان لانا' جیسا کہ اس پر ایمان لانے کا حق ہے۔ (۲) قرآن حکیم کی تلاوت کرنا' جیسا کہ اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے۔ (۳) قرآن حکیم کو سمجھنا' جیسا کہ اسے سمجھنے کا حق ہے۔ (۴) قرآن حکیم پر عمل کرنا' جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اور (۵) قرآن حکیم کی تبلیغ کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا' جیسا کہ اس کا حق ہے۔

آیت زیر مطالعہ میں اسی ذمہ داری کے حوالے سے رسول اللہﷺ کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ اے نبیﷺ! جس اللہ نے آپ پر قرآن کی یہ بھاری ذمہ داری ڈالی ہے وہ یقیناً آپ کو لوٹائے گا لوٹنے کی بہت اچھی جگہ پر۔ مَعَاد اسم ظرف ہے عَادَ يَعُوْدُ سے' یعنی لوٹنے کی جگہ۔ اس سے مراد آخرت بھی لی جاتی ہے (اسی لیے ایمان بالآخرت کو ''ایمان بالمعاد'' بھی کہا جاتا ہے۔) لیکن اس آیت کے حوالے سے ایک رائے یہ ہے کہ یہاں

''مَـ عَـ ـاد'' سے مراد ''مکہ'' ہے اور ان الفاظ میں گویا ہجرت کے موقع پر حضور ﷺ کو خوشخبری سنائی گئی تھی کہ عنقریب اللہ تعالیٰ آپؐ کو مکہ کی طرف لوٹا دے گا۔ اس سلسلے میں جو روایات ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سفرِ ہجرت کے دوران جب آپؐ غارِ ثور میں تین راتیں گزارنے کے بعد مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو چونکہ تعاقب کا اندیشہ تھا اس لیے آپؐ نے احتیاطاً ایک ایسا غیر معروف پہاڑی راستہ اختیار فرمایا جو آگے جا کر مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستے سے مل جاتا تھا۔ چنانچہ آپؐ چلتے چلتے جب اس معروف راستے پر پہنچے تو وہاں آپؐ کے لیے بڑی جذباتی اور رقت آمیز صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ آپؐ راستوں کے ملاپ کی جگہ (T) پر کھڑے تھے۔ دائیں طرف کا راستہ مدینہ کو جاتا تھا جبکہ بائیں جانب مکہ تھا۔ اس وقت مکہ اور خانہ کعبہ کی جدائی کے غم میں آپؐ کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ چنانچہ آپؐ کی اس کیفیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اطمینان کے لیے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپؐ دل گرفتہ نہ ہوں، ہم آپ ﷺ کو ضرور مکہ واپس لے کر آئیں گے۔ اگرچہ اب تو آپؐ وہاں سے مجبور ہو کر نکلے ہیں لیکن عنقریب ہم آپؐ کو ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل کرنے والے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق ایسی ہی کیفیت آپؐ پر مکہ سے روانگی کے وقت بھی طاری ہوئی تھی اور آپؐ نے کعبہ سے لپٹ کر فرمایا تھا: اے کعبۃ اللہ! مجھے تجھ سے بہت محبت ہے، مگر میں کیا کروں، یہاں کے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

بہرحال میرے نزدیک اس آیت کا اصل مفہوم یہی ہے کہ یہاں ''مَـعَـاد'' سے مراد آخرت اور جنت ہے۔ جیسا کہ سورۃ الضحیٰ میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) یقیناً آخرت آپ کے لیے اس دنیا کی زندگی سے بہتر ہوگی''۔ اس معنی میں یہاں پر لفظ ''مَعاد'' بطور اسم نکرہ گویا ''تفخیمِ شان'' کے لیے آیا ہے، یعنی لوٹنے کی وہ جگہ بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ ہوگی۔ اس مفہوم کی مزید وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں بھی ملتی ہے: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹﴾ ''اُمید ہے کہ آپ کا رب آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا''۔ آیت زیرِ مطالعہ میں اسی ''مقامِ محمود'' کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس مقام (معاد) کی شان کیسی ہوگی؟ کسی انسان کے لیے اس کا تصور بھی محال ہے۔

علمبردارانِ حق کی خصوصی توجہ کے لیے!

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ
اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِيۡ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا ؕ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِيۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِي الصّٰلِحِيۡنَ ۝ (العنکبوت)

یہ سورۃ العنکبوت کی ابتدائی آیات ہیں۔ اس سورت کے بارے میں تعین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سن ۵ نبویؐ میں نازل ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب مکہ میں مسلمانوں پر مشرکین کا ظلم وستم بہت بڑھ چکا تھا۔ اس سے پہلے تین سال تک تو مخالفین نے حضور ﷺ کی دعوت کے اثرات کے بارے میں کوئی سنجیدہ ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا' بلکہ اس دعوت کو وہ اپنے زعم میں چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران وہ لوگ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے رہے' آپ کو شاعر اور جادوگر کہتے رہے اور یوں آپ کی تضحیک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے ہتھکنڈوں سے آپ کی قوتِ ارادی دم توڑ دے گی' آپ بددل ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ جائیں گے اور اس طرح یہ تحریک ختم ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام حربوں کے باوجود حضور ﷺ کی دعوت کا دائرہ تھا کہ روز بروز پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ اور سردارانِ قریش کے لیے اس ضمن میں یہ بات خصوصی طور پر تشویش ناک تھی کہ آپ کی دعوت سے متاثر ہونے والوں میں زیادہ تعداد غلاموں اور اونچے گھرانوں کے نوجوانوں کی تھی۔ چنانچہ جب سردارانِ قریش کے کئی غلام یکے بعد دیگرے ایمان لے آئے اور دوسری طرف حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جیسے نوجوان بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تو مشرکین کو اس دعوت کے تدارک اور سدِّباب کے لیے سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ اس ضمن میں انہوں نے جو اہم فیصلہ کیا وہ یہی تھا کہ ایسے تمام لوگوں کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے اور جسمانی ایذاء وتشدد کے ذریعے انہیں نیا دین چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔

جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ نوجوان اہلِ ایمان بھی اپنے اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں کسی حد تک تشدد کا نشانہ بنے' لیکن غلاموں اور بے آسرا لوگوں پر تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ غلاموں کی حیثیت اُس معاشرے میں ڈھور ڈنگروں کی سی تھی۔ جیسے آپ نے ایک بکری خریدی اور اسے اپنے کھونٹے سے باندھ لیا۔ جب تک چاہا اس سے فائدہ اٹھایا اور جب چاہا اسے ذبح کر لیا۔ اسی طرح کوئی آقا اپنے غلام کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے' اسے مارے' پیٹے یا جان سے مار ڈالے' اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت بلال' حضرت ابوفکیہہ اور حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کے ساتھ ان کے آقاؤں نے ظلم وستم کے ایسے ایسے طریقے آزمائے کہ ان کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

غلاموں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی اس خوفناک اور بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنے جو قریشی نہیں تھے اور کسی کے حلیف بن کر مکہ میں رہ رہے تھے۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ آپؓ کا تعلق یمن سے تھا۔ آپؓ نے یمن کے عیسائیوں سے نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کا چرچا سن رکھا تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ کو خواب میں اشارہ بھی ملا تھا کہ مکہ میں آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ کی

صحبت سے فیض یاب ہونے کے شوق میں آپؓ یمن کو چھوڑ کر مکہ چلے آئے اور ابوجہل کے چچا کی پناہ حاصل کرلی۔ ابوجہل کا چچا شریف آدمی تھا' اُس نے نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ اپنی لونڈی سُمیہ سے ان کا نکاح بھی کردیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو ایک بیٹا بھی عطا کیا۔ جب ابوجہل کا چچا فوت ہوگیا تو یہ خاندان ابوجہل کی پناہ میں آگیا۔ حضور ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو حضرت یاسرؓ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سُمیہ اور آپ کا بیٹا عمار (رضی اللہ عنہم) تینوں حضور ﷺ پر ایمان لے آئے۔ جب قریش نے اہل ایمان پر تشدد کرنے کی حکمت عملی اپنائی تو اس چھوٹے سے خاندان پر ابوجہل نے تشدد کی انتہا کردی۔ اس کے نتیجے میں حضرت یاسر اور حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہما تو شہید ہوگئے جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کلماتِ کفر کہہ کر اپنی جان بچائی' جس کا انہیں زندگی بھر افسوس رہا۔ (سورۃ النحل کی آیت ۱۰۶ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر کسی کو کلمہ کفر پر مجبور کردیا جائے لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن رہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔)

اسی طرح حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ پر جو قیامت گزری وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ آپؓ غریب خاندان سے تھے اور پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے۔ ایک دن ان ہی کی بھٹی میں سے دہکتے ہوئے کوئلے لے کر انہیں زمین پر بچھایا گیا اور ان کی قمیص اتروا کر پشت کے بل کوئلوں پر لٹادیا گیا' تاوقتیکہ آپؓ کے جسم کی چربی سے وہ کوئلے ٹھنڈے ہوئے۔

حضرت خبابؓ بن الارت فرماتے ہیں کہ جب صورتِ حال ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تو ایک دن ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ اس وقت خانہ کعبہ کی دیوار کے سائے میں اپنی چادر کا تکیہ لیے استراحت فرمارہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: حضور! آپؐ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتے؟ مشرکین کے تشدد کی بڑھتی ہوئی کارروائیاں اب ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہیں۔ حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں کہ ہماری یہ بات حضور ﷺ کو ناگوار گزری۔ آپؐ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اللہ کی قسم' تم جلدی مچا رہے ہو' ابھی تم پر وہ حالات تو آئے ہی نہیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ انہیں آدھا زمین میں دبا کر آروں سے چیر ڈالا گیا' وہ زندہ آگ میں جلا دیے گئے اور انہوں نے ایسے حالات پر صبر کیا۔ تمہیں بھی بہرحال صبر کرنا ہے۔ اللہ کی قسم! وہ وقت ضرور آئے گا جب ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہیں ہوگا۔

یہ اس پس منظر کی ایک جھلک ہے جس میں اس سورت کا نزول ہوا۔ اس کی ابتدائی آیات میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ مذکورہ واقعہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان آیات کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی تحریک اپنے کارکنوں کی قربانیوں کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ جب بھی کسی معاشرے میں کوئی انقلابی تحریک اپنی جڑیں مضبوط کرتی دکھائی دیتی ہے تو پرانے نظام کے محافظوں کو اپنے مفادات خطرے میں پڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی کسی بھی تحریک کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمانے پر تیار

ہو جاتے ہیں۔ اس مشکل مرحلے میں انقلابی تحریک اپنے کارکنوں سے قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ جب مکہ میں حضور ﷺ کی دعوت کا چرچا ہوا اور لوگ اس طرف متوجہ ہونے لگے تو مشرکینِ مکہ نظامِ کہنہ کے پاسبانوں کی حیثیت سے اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ اس کے بعد مکہ کی گلیوں میں ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہرحال تاریخ گواہ ہے کہ اس جاں گداز صورت حال میں اہلِ ایمان نے غیر معمولی جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

اس سیاق و سباق میں سورت کی ابتدائی آیات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان آیات میں مکہ کے مذکورہ خوفناک حالات کے حوالے سے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے منطقی جوابات بھی فراہم کیے گئے ہیں' لہولہان جسموں کے لیے سہارے کا سامان بھی مہیا کیا گیا ہے اور زخم خوردہ دلوں پر مرہم رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قیامت تک کے لیے ہر انقلابی دینی تحریک اور غلبۂ دین کی جدوجہد کے کارکنوں کے لیے راہنما اصول بھی وضع فرما دیے گئے ہیں۔ اس مضمون کے اعتبار سے سورۃ العنکبوت کا ابتدائی رکوع گویا پورے قرآن میں ''ذروۂ سنام'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ [یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بحیثیتِ مجموعی قرآن کا ذروۂ سنام تو سورۃ البقرۃ ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ)) (سنن الترمذی) ''ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے۔'']

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ①﴾ ''الف' لام' میم۔''

آیت ۲ ﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ②﴾ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟''

تمہیدی کلمات میں بیان کی گئی حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی روایت کا مضمون ذہن میں رکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذکورہ شکایت کا جواب ہے۔ اس میں خفگی کا بالکل وہی انداز پایا جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی شکایت کے جواب میں اختیار فرمایا تھا۔ اہل ایمان کا ذکر عمومی انداز میں (''النَّاس'' کے لفظ سے) فرمانا بھی گویا عتاب اور ناراضی ہی کا ایک انداز ہے۔ بہرحال دین کے راستے میں تحریکی و انقلابی جدوجہد کے حوالے سے یہ بہت اہم مضمون ہے جس کی مزید وضاحت مدنی سورتوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں یہی مضمون مزید واضح انداز میں یوں بیان ہوا ہے: ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تم پر وہ حالات و واقعات تو وارد ہوئے ہی نہیں جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں مسلط کر دی گئی تھیں' اور وہ ہلا مارے گئے تھے' یہاں تک کہ (وقت کا) رسولؑ اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد! آگاہ رہو اللہ کی مدد قریب ہی ہے''۔ اس کے بعد سورۂ آل

عمران میں یہی بات ایک دوسرے انداز میں فرمائی گئی ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو ظاہر کیا ہی نہیں کہ تم میں سے کون واقعتاً (اللہ کی راہ میں) جہاد کرنے والے اور صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں''۔ اور پھر سورۃ التوبہ میں اس مضمون کی مزید وضاحت کی گئی ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾﴾ ''کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے' حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو ظاہر کیا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جو واقعی جہاد کرنے والے ہیں' اور جو نہیں رکھتے اللہ' اُس کے رسول اور اہل ایمان کے علاوہ کسی کے ساتھ دلی رازداری کا کوئی تعلق' اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

مندرجہ بالا چاروں آیات میں یہ مضمون جس انداز میں بیان ہوا ہے اس کی مثال ایک خوبصورت پودے اور اس پر کھلنے والے خوبصورت پھول کی سی ہے۔ زیر مطالعہ مکی آیت اس پودے کی گویا جڑ ہے جبکہ مذکورہ بالا تینوں مدنی آیات اس پر کھلنے والے پھول کی تین پتیاں ہیں۔ ان تینوں آیات (البقرۃ:۲۱۴' آل عمران:۱۴۲ اور التوبۃ:۱۶) میں یہ عجیب مماثلت قابل توجہ ہے کہ نہ صرف ان آیات کے الفاظ میں مشابہت پائی جاتی ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت کے نمبر شمار کا حاصل جمع ۷ ہے۔

آیت ۳ ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''ہم نے تو ان کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے تھے''

ہم ان سے پہلے بھی ایمان کے ہر دعویدار کو آزماتے رہے ہیں اور آزمائش کے بغیر ہم کسی کے ایمان کو تسلیم نہیں کرتے۔

﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٣﴾﴾ ''پس اللہ ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو سچے ہیں اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں۔''

اگرچہ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ''اللہ جان کر رہے گا'' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے اور وہ انسانوں کی نیتوں اور دلوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے' اس لیے یہاں اللہ کے ''جان لینے'' کا مفہوم دراصل یہی ہے کہ اللہ ظاہر کر دے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے! وہ ممیز کر دے گا کہ کون منافق ہے اور کون سچا مؤمن! کون ضعیف الایمان ہے اور کون قوی الایمان! کون سچا جاں نثار ہے اور کون محض دودھ پینے والا مجنوں ہے!

یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ گزشتہ دو آیات میں اگر خفگی کا اظہار ہے تو اگلی دو آیات میں اہلِ ایمان کی دلجوئی کا سامان بھی ہے۔ گویا ترہیب اور ترغیب ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کو ایک وقت میں ڈانٹ پلاتا ہے لیکن پھر اس کے بعد تھپکی دے کر اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔

اس نکتے کو اس حدیث کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان) کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اور خصوصاً اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اس محبت اور شفقت کی جھلک اگلی آیت میں صاف نظر آ رہی ہے:

آیت ۴ ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝۴﴾ ''کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے جو بُرائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ کر نکل جائیں گے؟ بہت ہی بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''

اس جملے کی روح کو سمجھنے کے لیے مکہ مکرمہ کے ماحول اور اُس میں اہل ایمان کی دل دہلا دینے والی مظلومیت کے مناظر ایک دفعہ پھر اپنے تصور میں لایئے' جہاں ابوجہل کو کھلی چھوٹ تھی کہ وہ حضرت یاسر اور حضرت سُمیہ ؓ کو جس طرح چاہے بربریت کا نشانہ بنائے۔ اُمیہ بن خلف مالک و مختار تھا حضرت بلال ؓ کی قسمت کا کہ ان کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ انہیں مار پیٹ کر لہولہان کر دے اور گرم ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دے یا گلے میں رسی ڈال کر مردہ جانوروں کی طرح مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتا پھرے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو آیت زیرِ مطالعہ کے الفاظ کا مفہوم یوں ہوگا کہ کیا بربریت کا یہ بازار گرم کرنے والے درندوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟ کیا ابوجہل اور اُمیہ بن خلف کو خوش فہمی ہے کہ وہ ہماری گرفت سے بچ جائیں گے؟ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہوگا! انہیں اس سب کچھ کا حساب دینا ہوگا۔ وہ وقت دور نہیں جب بہت جلد یہ پانسہ پلٹ جائے گا اور انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ چنانچہ چند ہی سال بعد غزوۂ بدر میں کفر اور ظلم کے بڑے بڑے علم برداروں کا حساب چکا دیا گیا۔ میدانِ بدر میں ہی اُمیہ بن خلف کو بھی مکافاتِ عمل کے بے رحم شکنجے میں جکڑ کر حضرت بلالؓ کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ اُس وقت اگرچہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کوشش بھی کی کہ وہ اُمیہ کو قتل ہونے سے بچا لیں اور اسے قیدی بنا لیں لیکن حضرت بلالؓ نے اسے جہنم رسید کر کے ہی چھوڑا: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ۝۱۲﴾ (البروج) ''بلاشبہ آپ کے رب کی گرفت بہت سخت ہے!''

دراصل مکہ میں بارہ سال تک ایک خاص حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو ہاتھ باندھے رکھنے' ہر طرح کا ظلم برداشت کرنے اور استطاعت کے باوجود بھی بدلہ نہ لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا تحریک کے اس مرحلے میں انہیں ظلم سہنے اور سختی سے سخت حالات میں عزم و استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تربیت کے عمل سے گزارا جا رہا تھا۔ اور ان خطوط پر مکمل تربیت اور تیاری سے قبل انہیں عملی طور پر تصادم کا میدان گرم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکمت عملی دراصل تحریکی و انقلابی جدوجہد کے فلسفے کا ایک اہم اور لازمی اصول ہے۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی   اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

بعد میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق سورۃ الحج کی آیت ۳۹ کے اس حکم کے تحت اہلِ ایمان کے بندھے

ہوئے ہاتھ کھول دیے گئے: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا﴾ ’’اب اجازت دی جارہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے‘ اس لیے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔‘‘

آیت ۵ ﴿مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ﴾ ’’جو کوئی بھی اللہ کی ملاقات کا امیدوار ہے تو (اسے یقین رکھنا چاہیے کہ) یقیناً اللہ کا معیّن کردہ وقت آ کر رہے گا۔‘‘

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر ایک بندۂ مؤمن دنیا میں اپنا تَن مَن دھن اُس کی راہ میں کھپا دے گا تو اُس کی اس قربانی کا صلہ اسے آخرت کی نعمتوں کی صورت میں دیا جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بہر حال ادھار کا وعدہ ہے۔ دوسری طرف دنیا کے ظاہری معاملات کو دیکھتے ہوئے انسان ’’نو نقد نہ تیرہ ادھار‘‘ کے اصول پر زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہے۔ انسان کی اسی کمزوری سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے دل میں وسوسے ڈال کر اس کے یقین کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے یہاں حضرت بلال‘ حضرت ابوفکیہہ اور حضرت خباب جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کی قائم کردہ مثالوں کی قیامت تک کے لیے پیروی کرنے والے جاں نثاروں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اے شمع توحید کے پروانو! شیطان تمہارے دلوں میں کسی قسم کا وسوسہ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے‘ تم اطمینان رکھو! تمہارے ساتھ کیے گئے اللہ کے تمام وعدے ضرور پورے ہوں گے اور آخرت کا وہ دن ضرور آ کر رہے گا جس دن تمہاری تمام قربانیوں کا بھرپور صلہ تمہیں دیا جائے گا۔

﴿وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۵﴾ ’’اور وہ سب کچھ سننے والا‘ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘

وہ تمہارے حالات سے بخوبی آگاہ ہے‘ تمہاری کوئی تکلیف اور کوئی قربانی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ — اب اگلی آیت میں پھر سرزنش کا انداز ہے:

آیت ۶ ﴿وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ ۭ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝۶﴾ ’’اور جو کوئی بھی جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے (ہی فائدے کے) لیے جہاد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔‘‘

دیکھو! تم میں سے جو کوئی اللہ کی راہ میں جدوجہد کر رہا ہے‘ اس کے لیے تکلیفیں اٹھا رہا ہے اور ایثار کر رہا ہے تو یہ سب کچھ وہ اپنے لیے کر رہا ہے‘ اس کا فائدہ بھی اسی کو ملنے والا ہے۔ وہ اپنے ان اعمال کا اللہ پر احسان نہ دھرے۔ اللہ کو ان چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بہت بلند اور بے نیاز ہے۔ سورۃ الحجرات میں اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ۚ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۱۷﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم لوگ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت دھرو‘ بلکہ یہ تو تم پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی‘ اگر تم (اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہو۔‘‘

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

یعنی تم بادشاہ پر احسان مت دھرو کہ تم اس کی خدمت کر رہے ہو' بلکہ تم اس سلسلے میں بادشاہ کا احسان پہچانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع فراہم کیا ہے۔

نوٹ کیجیے ان آیات کے مندرجات انسانی دل و دماغ کے احساسات وخیالات سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں — اب اگلی آیت میں پھر دلجوئی کا انداز ہے۔ گویا ان آیات میں ترہیب کا رنگ بھی ہے اور ترغیب کا انداز بھی اور یہ دونوں مضامین پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ آغاز سرزنش سے ہوا تھا' پھر دلجوئی فرمائی گئی' اس کے بعد پھر سرزنش اور اب پھر دلجوئی:

آیت ۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم لازماً دور کر دیں گے اُن سے اُن کی برائیاں''

جو لوگ ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں گے اور اس راستے میں آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے ہم ان کے دامن پر سے گناہوں کے چھوٹے موٹے داغ دھبے دور کر دیں گے۔

﴿وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑦﴾ ''اور ہم لازماً اُن کو بہترین بدلہ دیں گے ان کے اعمال کا۔''

زیر مطالعہ مضمون کی اہمیت کا اندازہ اس پہلو سے بھی لگائیں کہ ان آیات میں لام مفتوح اور نون مشدد کی بہت تکرار ہے۔ یعنی جا بجا انتہائی تاکید کا انداز اختیار کیا گیا ہے' بلکہ آیت ۳ میں تاکید کا یہ صیغہ دو مرتبہ آیا ہے: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③﴾ جبکہ زیر مطالعہ آیت میں بھی دونوں باتوں میں تاکید کا وہی انداز پایا جاتا ہے۔

آیت ۸ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ﴾ ''اور ہم نے ہدایت کی ہے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی۔''

مکہ کے مذکورہ حالات میں اسلام قبول کرنے والے بہت سے نوجوانوں کے لیے اپنے والدین کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بھی ایک بہت سنجیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک طرف قرآن حکیم کی یہ ہدایت تھی کہ انسان اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرے اور ان کی نافرمانی نہ کرے۔ دوسری طرف ایمان لانے والے بہت سے نوجوان عملی طور پر اپنے والدین سے بغاوت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ چنانچہ ایسے تمام نوجوان اخلاقی اور جذباتی طور پر شدید دباؤ کا شکار تھے۔ مشرک والدین کا ان سے تقاضا تھا کہ تم ہماری اولاد ہو' ہم نے پال پوس کر تمہیں بڑا کیا ہے' لہٰذا تم پر لازم ہے کہ ہمارا حکم مانو اور محمد (ﷺ) سے تعلق توڑ کر اپنے مذہب پر واپس آ جاؤ۔ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔ آپؓ کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ نے انہیں بہت ناز ونعم سے پالا تھا۔ آپؓ بہت سلیم الفطرت اور شریف النفس نوجوان تھے اور اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپؓ

کے ایمان لانے پر آپؓ کی والدہ نے ''مَرن بَرت'' رکھ لیا اور قسم کھالی کہ اگر اس کا بیٹا اپنے والد کے دین پر واپس نہ آیا تو وہ بھوکی پیاسی رہ کر خود کو ہلاک کر لے گی۔ تصور کریں کہ ماں بھوک اور پیاس سے مر رہی ہے اور بیٹا اس کی اس حالت کو بے چارگی سے دیکھ رہا ہے۔ ایک فرمانبردار بیٹے کے لیے یہ کس قدر سخت امتحان تھا! چنانچہ ان حالات میں یہ سوال بہت اہم تھا کہ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے نوجوان ایسی صورت حال میں کیا کریں؟ ایک طرف والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ قرآن میں متعدد مقامات پر (البقرۃ:۸۳‘ النساء:۳۶‘ الانعام:۱۵۱‘ بنی اسرائیل:۲۳‘ لقمان:۱۴) اللہ تعالیٰ نے اپنے حق عبادت کا ذکر کرنے کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔ دوسری طرف مشرک والدین کا یہ اصرار کہ ان کی اولاد اُن کی فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر واپس ان کے دین پر آ جائے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اس نازک مسئلہ کے بارے میں راہنمائی فرمائی گئی ہے:

﴿وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ؕ﴾ ''اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شریک ٹھہراؤ ایسی چیزوں کو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت مانو۔''

﴿اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۸﴾ ''میری ہی طرف تمہیں لوٹ کر آنا ہے‘ پھر میں تمہیں بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

نوٹ کیجیے یہاں ''جہاد'' کا لفظ مشرک والدین کی اس ''کوشش'' کے لیے استعمال ہوا ہے جو وہ اپنی اولاد کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کر سکتے تھے۔ گویا یہاں یہ لفظ اپنے خالص لغوی معنی (جِدّ وجُہد کرنا‘ کوشش کرنا) میں آیا ہے۔

اس آیت میں بہت واضح انداز میں اولاد کے لیے والدین کی فرمانبرداری کی ''حد'' (limit) بتا دی گئی ہے کہ والدین کے حقوق بہر حال اللہ کے حقوق کے بعد ہیں۔ یعنی اللہ کا حق‘ اُس کا حکم اور اُس کے دین کا تقاضا ہر صورت میں والدین کے حقوق اور ان کی مرضی پر فائق رہے گا۔ لہٰذا کسی نوجوان کے والدین اگر اسے کفر و شرک پر مجبور کر رہے ہوں تو وہ ان کا یہ مطالبہ مت مانے۔ البتہ اس صورت میں بھی نہ تو وہ ان کے ساتھ بدتمیزی کرے اور نہ ہی سینہ تان کر جواب دے‘ بلکہ ادب سے انہیں سمجھائے کہ ان کا یہ حکم ماننا اس کے لیے ممکن نہیں‘ اس لیے اس کی درخواست ہے کہ وہ اس کے لیے اس پر دباؤ نہ ڈالیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے مشرک والد کے ساتھ مکالمہ (سورۂ مریم‘ آیات ۴۲ تا ۴۵) اس حکمتِ عملی کی بہترین مثال ہے۔ اس مکالمے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ اپنے والد کو بار بار یٰۤاَبَتِ‘ یٰۤاَبَتِ (ابا جان! ابا جان!) کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ والدین کے حقوق کے حوالے سے یہ مضمون سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَـنُدۡخِلَـنَّهُمۡ فِى الصّٰلِحِيۡنَ ۝۹﴾ ''اور وہ لوگ جو

ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم انہیں لازماً داخل کریں گے صالحین میں۔‘‘

نیک اہلِ ایمان کو صالحین کے گروہ میں شامل کرنے کا یہ وعدہ دنیا کے لیے بھی ہے اور آخرت کے لیے بھی۔ اس مژدۂ جانفزا کے مفہوم کو بھی مکہ کے مذکورہ حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے‘ جہاں اہلِ ایمان اپنے پیاروں سے کٹ رہے تھے‘ والدین اپنے جگر گوشوں کو چھوڑنے پر مجبور تھے‘ اولاد والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہو رہی تھی اور بھائی بھائیوں سے جدا ہو رہے تھے۔ جیسے سردارِ قریش عتبہ بن ربیعہ کے بڑے بیٹے حذیفہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے جبکہ چھوٹا بیٹا ولید کافر ہی رہا۔ (عتبہ اور اس کا بیٹا ولید غزوۂ بدر میں سب سے پہلے مارے جانے والوں میں سے تھے۔) اگر انسانی سطح پر دیکھا جائے تو حضرت حذیفہؓ کے لیے یہ بہت کڑا امتحان تھا۔ بہرحال جو صحابہؓ اس آزمائش اور امتحان سے دوچار ہوئے انہوں نے غیر معمولی حوصلے اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن آخر تھے تو وہ انسان‘ اندر سے ان کے دل زخمی تھے اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آیت زیرِ نظر کو اس سیاق و سباق میں پڑھا جائے تو اس کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے میرے جاں نثار بندو! اگر تم لوگ مجھ پر اور میرے رسول ﷺ پر ایمان لا کر اپنے والدین‘ بھائی بہنوں اور عزیز رشتہ داروں سے کٹ چکے ہو تو رنجیدہ مت ہونا۔ دوسری طرف ہم نے تمہارے لیے نبی رحمت ﷺ اور اہل ایمان کے گروہ کی صورت میں نئی محبتوں اور لازوال رفاقتوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں تمہارے لیے ایک نئی برادری تشکیل پا رہی ہے جس کی بنیاد ایک مضبوط نظریے پر رکھی گئی ہے۔ اب تم لوگ اس نئی برادری کے رکن بن کر ہمارے برگزیدہ بندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہو‘ جہاں رحمۃ للعالمین ﷺ آپ لوگوں کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے منتظر ہیں اور جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت تم لوگوں پر اپنی محبت و شفقت کے جذبات نچھاور کرنے کو بے قرار ہیں —— اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کو بھی بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے (الحجر: ۸۸ اور الشعراء: ۲۱۵) کہ مؤمنین کے لیے آپؐ اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھیے اور ان کے ساتھ محبت و رأفت کا معاملہ کیجیے۔

دوسری طرف صالحین کے گروہ میں شمولیت کی اس خوشخبری کا تعلق آخرت سے بھی ہے‘ جس کا واضح تر اظہار سورۃ النساء کی اس آیت میں نظر آتا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾ ’’اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور اُس کے رسولؐ کی تو ایسے لوگوں کو معیت حاصل ہوگی ان لوگوں کی جن پر اللہ کا انعام ہوا‘ یعنی انبیاء کرام‘ صِدِّیقین‘ شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!‘‘

قبولِ حق کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ (العنکبوت)

﴿وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ ''اور ابراہیمؑ نے کہا کہ تم لوگوں نے اللہ کے سوا جو بُت بنا رکھے ہیں یہ تو بس دنیا کی زندگی میں تمہاری آپس کی محبت کی وجہ سے ہے۔''

یہ بہت اہم بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ میں تمہیں متنبہ کر چکا ہوں کہ تم لوگ جن بُتوں کو پوجتے ہو ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ میرے سمجھانے پر تم لوگ یہ نکتہ سمجھ بھی چکے ہو' اس سلسلے میں حق تم لوگوں پر پوری طرح منکشف بھی ہو چکا ہے اور تمہارے دل اس بارے میں حق کی گواہی بھی دے چکے ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی تم لوگ اگر بتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو اور گمراہی کا راستہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو' تو اس کی اصل وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم لوگ آپس کے تعلقات' آپس کی دوستیاں اور رشتہ داریاں نبھا رہے ہو۔ دراصل یہ وہ بنیادی عامل (factor) ہے جو ہر سطح پر لوگوں کے لیے حق کو قبول کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ ایک معقول اور باشعور شخص کی تان بھی اکثر یہیں پر آکر ٹوٹتی ہے کہ جی ہاں بات تو درست ہے' دل کو بھی لگتی ہے' مگر کیا کریں مجبوری ہے! دوسری طرف برادری ہے' رشتہ داریاں ہیں' دوستیاں ہیں اور کاروبار کی شراکت داریاں ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے چھوڑ دیں؟ سب سے ناتا کیسے توڑ لیں؟ زندہ رہنے کے لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ انسان بھلا اکیلا کیسے زندگی گزار سکتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

یہ عصبیت ہر جگہ اور ہر دور میں اپنا رنگ دکھاتی ہے' حتیٰ کہ خالص دینی بنیادوں پر اٹھنے والی تحریکیں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سب کچھ یکدم نہیں ہو جاتا بلکہ منفی عصبیت کے خطرناک جراثیم آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کسی تحریک کی صفوں میں داخل ہوتے ہیں۔ فرض کریں کہ آغاز میں ایک تحریک کا نظریہ بالکل خلوص پر مبنی تھا۔ اس کے کارکنوں کی وابستگی بھی خالصتاً حق شناسی کی بنیاد پر تھی اور ان میں جِدّوجُہد کا جذبہ بھی قابلِ رشک تھا'' مگر پھر کسی موڑ پر کہیں کوئی غلطی ہوئی اور تحریک کسی غلط رخ پر مڑ گئی۔ عموماً ایسی غلطیوں کے نتائج فوری طور پر سامنے نہیں آتے' بلکہ کچھ عرصے تک تو کارکنوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی تحریک غلط موڑ مڑ چکی ہے۔ لیکن جب اس غلطی کے نتائج واضح طور پر سامنے آنے لگتے ہیں اور کارکنوں کو معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو اس کے باوجود بھی ان کی اکثریت اس تحریک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ایسی صورت حال میں وہ لوگ محض ''عصبیت'' کی وجہ سے اس تحریک کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ غور سے جائزہ لیا جائے تو اس ضمن میں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کسی بھی جماعت یا تنظیم کے اندر' خواہ وہ خالص دینی بنیادوں پر ہی کیوں نہ اٹھی ہو' کچھ دیر کے بعد شخصی تعلقات' باہمی رشتہ داریاں اور مشترکہ مادی مفادات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گویا ''جماعتی عصبیت'' کے علاوہ چھوٹی چھوٹی دوسری عصبیتیں بھی اس حلقے کے اندر فعال ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ہر ایسی جماعت ایک فرقہ بن جاتی ہے۔

اس نکتے کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ اب نبوت ختم ہو گئی ہے اور قیامت تک دنیا میں کوئی اور نبی نہیں

آئے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے زمانے تک اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تین چیزوں کا اہتمام فرمایا ہے:

(۱) قرآن حکیم کی حفاظت کی ذمہ داری کا اہتمام۔ جبکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی الہامی کتاب کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی گئی۔

(۲) ہر صدی میں ایک مجدّد اٹھانے کا اہتمام۔ یہ مجدّد دین کے بنیادی حقائق کو تازہ کیا کرے گا اور اپنے دور کے لوگوں کو دین کی ان حقیقی تعلیمات کی طرف متوجہ کیا کرے گا جنہیں وہ بھول چکے ہوں گے۔

(۳) اس چیز کا اہتمام کہ ہر دور میں ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ اَوْ خَالَفَهُمْ ......))
(صحیح مسلم) ''میری اُمت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی۔ جو لوگ ان کو چھوڑ جائیں گے یا ان کی مخالفت کریں گے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے......''

اب عملی طور پر کیا ہوتا ہے؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مجدد پیدا ہوا' اس نے مختلف پہلوؤں سے جدوجہد کی' دینی تعلیمات کی تطہیر کر کے اصل حقائق لوگوں پر واضح کر دیے۔ حالات اور زمانے کی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق دین کے مطالبات کی تشریح کر کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ کچھ لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہوئے۔ اعوان و انصار نے اپنا اپنا کردار ادا کیا اور ایک مضبوط جماعت قائم ہو گئی۔ ایسی کسی بھی جماعت کے ہراول دستے کے کارکن چونکہ علیٰ وجہ البصیرت اس میں شامل ہوتے ہیں اس لیے ان کی نظریاتی وابستگی خالص اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جماعت میں عصبیت کا عنصر داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب اس کے بہت سے کارکنوں کی نظریاتی وابستگی کمزور ہوتے ہوتے برائے نام رہ جاتی ہے' لیکن وہ لوگ صرف اس لیے اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کا تعلق اس جماعت سے تھا۔ پھر تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے اس عصبیت کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اتنے عرصے میں جماعت کے اندر مضبوط شخصی تعلقات پروان چڑھ چکے ہوتے ہیں' رشتہ داریاں بن چکی ہوتی ہیں' کاروباری شراکت داریاں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہوتی ہیں اور یوں یہ جماعت ایک معاشرتی حلقے یا فرقے کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اب اس کے کارکن محض اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے اپنے مفادات کے تحت اس جماعت یا فرقے کے ساتھ خود کو وابستہ کیے رکھتے ہیں۔

تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہر جماعت میں اس خرابی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی حقیقت اور دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے: ((خَيْرُ اُمَّتِي قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ))(متفق علیہ) ''میری اُمت میں سب سے بہتر میرا دور ہے' پھر اس کے بعد والوں کا' پھر اس کے بعد والوں کا''۔ یعنی حضور ﷺ نے خیر کے حوالے سے درجہ بدرجہ تین نسلوں کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ کا یہ فرمان اتنی

بڑی حقیقت ہے کہ تین نسلوں کے بعد خود آپ ﷺ کی قائم کردہ جماعت کو بھی زوال آ گیا۔ اور جب حضور ﷺ کی قائم کردہ جماعت بھی اس فطری عمل کے مطابق زوال کا شکار ہوگئی تو کوئی دوسری جماعت کیونکر اس کمزوری سے مبرا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ تیسری نسل (ایک صدی) کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر کسی مجدد کو اٹھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور وہ از سرِ نو انہی بنیادوں پر جِدّوجُہد کا آغاز کرتا ہے۔ اسی طرح یہ عمل وقوع قیامت تک تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔

چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ کے حوالے سے ہر دور کے مخلص مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حق شناسی کے سلسلے میں خود کو ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر رکھ کر پوری دیانت داری سے جائزہ لیتا رہے کہ اس کے دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی سربلندی کا کام کس کے حوالے کیا ہے اور وہ کون سی جماعت یا شخصیت ہے جو درست انداز میں اس راہ میں جدوجہد کر رہی ہے۔ پھر جب وہ اس سلسلے میں کسی واضح اور ٹھوس نتیجے پر پہنچ جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے تعلقات و مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس شخصیت یا اس جماعت کا ساتھ دے جس کی جدوجہد کا رخ اس کی سمجھ اور معلومات کے مطابق درست ہو۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ''پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے''

﴿وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٥﴾ ''اور تم سب کا ٹھکانا آگ ہوگی اور (اس دن وہاں) تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

تمہاری یہ دوستیاں بس دنیا تک ہی محدود ہیں اور تمہارے یہ گٹھ جوڑ صرف یہیں پر تمہارے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ کل قیامت کے دن تمہارے یہ دوست اور رشتہ دار تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ اپنے انجام کو دیکھتے ہوئے تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار ٹھہراؤ گے اور باہم ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجو گے۔ اس مشکل گھڑی میں تمہارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

خبردار! اصل زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے!

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝٦٤ (العنکبوت)

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ﴾ ''اور یہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں۔''

دیکھو مسلمانو! یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل کی مانند ہے۔ اس کی حیثیت تمہارے ایک سٹیج ڈرامے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح کسی ڈرامے کا بادشاہ حقیقی بادشاہ نہیں اور سٹیج پر فقیر کا کردار ادا کرنے والا شخص سچ مچ کا

فقیر نہیں‘ اسی طرح تمہاری اس زندگی کے تمام کردار بھی حقیقی نہیں۔ حقیقی کردار تو اس سٹیج سے باہر جا کر (موت کے بعد) سامنے آئیں گے۔ عین ممکن ہے یہاں کے شہنشاہ کو وہاں مجرم کی حیثیت میں اٹھایا جائے اور جو شخص یہاں زندگی بھر لوگوں کا معتوب و مغضوب رہا وہاں اسے خلعتِ فاخرہ سے نوازا جائے۔ چنانچہ تم خاطر جمع رکھو! نہ تو یہاں کا عیش اصل عیش ہے اور نہ اس زندگی کے مصائب حقیقی مصائب ہیں۔ یہ سب کچھ وقتی‘ عارضی اور فانی ہے۔

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ”اور آخرت کا گھر ہی یقیناً اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!“

اس مضمون کا مفہوم اپنے دل میں اُتارنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم آخری جملے کو اپنے اوپر طاری کر کے یوں کہیں: کاش کہ ہمیں معلوم ہوتا! یہاں ہمیں یہ اہم نکتہ بھی ذہن نشین کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ بعث بعد الموت کا صرف مان لینا کافی نہیں ہے‘ بلکہ اس کے بارے میں ایسے پختہ یقین کی ضرورت ہے جس کے تحت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ حقیقت واقعی جاگزیں ہو جائے کہ اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ آخرت کی زندگی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے میں نے اکثر مواقع پر ایک کتاب کی تشبیہ بیان کی ہے‘ جس کے آغاز میں ایک دیباچہ اور آخر میں ایک ضمیمہ ہوتا ہے۔ عام طور پر ہم دنیا دار یہی سمجھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی اصل کتاب ہے جبکہ آخرت کی زندگی اس کتاب کا ضمیمہ ہے‘ جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس ضمن میں اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی محض ایک دیباچہ ہے اس کتاب کا جو موت کے بعد کھلنے والی ہے‘ بلکہ اگر نسبت تناسب کے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ تشبیہ بھی درست قرار نہیں پاتی۔ درحقیقت دنیا کی زندگی محدود ہے جبکہ آخرت کی زندگی لامحدود ہے اور حق یہ ہے کہ محدود اور لامحدود میں باہم کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال ہمیں اپنے محدود ذہن کو سمجھانے کے لیے اس مثال کا سہارا لینے میں کوئی حرج نہیں۔

سود لینے سے مال بڑھتا نہیں اور زکوٰۃ دینے سے کم نہیں ہوتا

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ (الروم)

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ ”اور جو کچھ تم دیتے ہو سود پر تا کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں تو اللہ کے ہاں اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی۔“

اس آیت کا حوالہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ کی تشریح کے ضمن میں بھی آیا ہے۔ دراصل اپنے مستقبل کے لیے بچت کرنا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ پھر ہر شخص نہ صرف اپنی بچت کو سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے‘ بلکہ اس کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بچائی ہوئی رقم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی بھی رہے۔ قرآن حکیم اس بچت کو ”العَفو“ یعنی قدرِ زائد (surplus value) قرار دے کر اسے انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں اللہ تعالیٰ کے بینک میں جمع کرانے کی ترغیب دیتا ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) ”اور

(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ (وہ سب خرچ کردو) جو ضرورت سے زائد ہے!''

انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں ایسے مال سے محتاجوں اور ناداروں کی مدد بھی کی جاسکتی ہے اور اسے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے بھی کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کا کمتر درجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرضِ حسنہ کی شکل میں وقتی طور پر کسی ضرورت مند کی مدد کردی جائے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کے راستے میں خرچ کیا ہوا مال اس کے ہاں محفوظ بھی رہے گا اور بڑھتا بھی رہے گا۔ یعنی آخرت میں اس کا اجر کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا۔

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹﴾ ''اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو (اور اس سے) اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی لوگ ہیں جو (اللہ کے ہاں اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔''

دنیا میں جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات و خیرات کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہے ہیں انہیں آخرت میں اس کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا کر دیا جائے گا' بلکہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے اسے اور بھی زیادہ بڑھا دے گا۔ ایسے لوگوں کو آخرت میں اجر موعود کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہوگی۔

اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ اور سود کا تقابل کر کے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کسی شخص کی بچت کا بہترین مصرف ہے۔ اس میں منافع (اجر و ثواب) بہت زیادہ بھی ہے اور دائمی بھی۔ دوسری طرف سود پر رقم دینا کسی بچت کا بدترین مصرف ہے' جس میں ایک شخص بغیر کوئی محنت کیے اور بغیر کوئی خطرہ مول لیے ایک طے شدہ رقم باقاعدگی سے حاصل کرتا رہتا ہے جبکہ اس کی اصل رقم بھی محفوظ رہتی ہے۔ اس کے بارے میں یہاں فرمایا گیا کہ سود کی شکل میں سرمائے میں بظاہر جو اضافہ ہوتا نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ صدقات اور سود کے تقابل کے حوالے سے دراصل یہاں دو متضاد ذہنیتوں کا تقابل بھی سامنے آتا ہے۔ ایک اس شخص کی ذہنیت ہے جو اپنے مال سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا متمنی ہے' جبکہ دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا کیے بغیر ہر قیمت پر اپنے سرمائے میں اضافہ چاہتا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیں کہ ایک ایسا شخص جس کے پاس سرمایہ ہے مگر وہ خود محنت یا تجارت وغیرہ نہیں کرسکتا اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے سرمائے میں اضافہ ہوتا رہے اس کے لیے شریعت اسلامی میں مضاربت کا طریقہ موجود ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی رقم کسی دوسرے شخص کو کاروبار وغیرہ کے لیے دے اور اس سے منافع وغیرہ کی شرائط طے کرلے۔ اب اگر اس کاروبار میں منافع ہوگا تو سرمایہ فراہم کرنے والا شخص اس میں سے شرائط کے مطابق اپنے حصے کا حق دار ہوگا' لیکن نقصان کی صورت میں تمام نقصان اسے خود ہی برداشت کرنا ہوگا۔ عامل (محنت کرنے والا) اس نقصان میں حصہ دار نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں مزید تفصیل کے لیے فقہ کی

کُتب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

انسان نے بحر و بر میں فساد برپا کر دیا ہے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾ (الروم)

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ ''بحر و بر میں فساد رونما چکا ہے لوگوں کے اعمال کے سبب''

یہ آیت جس شان سے آج دنیا کے اُفق پر نمایاں ہوئی ہے شاید اپنے نزول کے وقت اس کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ آج سے پندرہ سو سال پہلے نہ تو دنیا کی وسعت کے بارے میں لوگوں کو صحیح اندازہ تھا اور نہ ہی ''فساد'' کی اقسام کا وہ تنوّع سامنے آیا تھا جس کا نظارہ آج کی دنیا کر رہی ہے۔ آج پوری دنیا میں جس جس نوعیت کے فسادات رونما ہو رہے ہیں ان کی تفصیلات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ آج چونکہ پوری دنیا سمٹ کر ''گلوبل ولیج'' کی صورت اختیار کر چکی ہے اس لیے دنیا کے کسی بھی گوشے میں رونما ہونے والے ''فساد'' کے اثرات ہر انسان کو بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں آج اس آیت کا مفہوم واضح تر ہو کر دنیا کے سامنے آیا ہے۔

﴿لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا﴾ ''تاکہ وہ انہیں مزہ چکھائے ان کے بعض اعمال کا''

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے کہ وہ انسانوں کے سب اعمال کی سزا دنیا میں نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہوتو روئے زمین پر کوئی انسان بھی زندہ نہ بچے: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (فاطر: ٤٥) ''اور اگر اللہ گرفت کرے لوگوں کی ان کے اعمال کے سبب تو اس (زمین) کی پشت پر کسی جاندار کو نہ چھوڑے، لیکن وہ ڈھیل دیتا رہتا ہے ان کو ایک مقررہ مدت تک''۔ اس اصول کے تحت اگرچہ اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی کی حد تک انسانوں کی زیادہ تر نافرمانیوں کو نظر انداز کر کے ان کی سزا کو مؤخر کرتا رہتا ہے لیکن بعض گناہوں یا جرائم کی گرفت وہ دنیا میں بھی کرتا ہے اور اس گرفت کا مقصد یہ ہوتا ہے:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾﴾ ''تاکہ وہ لوٹ آئیں۔''

کہ شاید اس سے کچھ لوگوں کو ہوش آجائے اور وہ توبہ کر کے اپنی روش تبدیل کر لیں۔ آج دنیا بھر کے مسلمان جس ذلت و خواری کو اپنا مقدر سمجھے بیٹھے ہیں شاید ایسی کسی گرفت سے انہیں بھی غور کرنے کی توفیق مل جائے کہ: ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں! (غالب)

شاید ایسی کسی ٹھوکر سے وہ جاگ جائیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر غور و خوض کرنے کی فرصت میسر آجائے: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾﴾ (آل عمران) ''اور تم لوگ ہی سربلند ہو گے اگر تم (حقیقی) مؤمن ہو گے''۔ اور اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ ان کے تمام مسائل کا سبب دراصل ایمانِ

حقیقی کا فقدان ہے۔ شاید اس طرح انہیں قرآن حکیم سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا بھی موقع مل جائے اور قرآن حکیم انہیں ان کی ذلت وخواری کی وجہ بتادے کہ تم اس حالت تک پہنچنے کے ذمہ دار خود ہو۔ تم لوگوں نے اپنے دین کے حصے بخرے کر دیے ہیں‘ تم دین کے صرف ان احکام پر عمل کرتے ہو جو تمہیں پسند ہیں اور جو احکام تمہاری نجی اور معاشرتی زندگی کے معمول سے مطابقت نہیں رکھتے انہیں تم نظرانداز کر دیتے ہو: ﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ‌ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ) ”تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور دوسرے کو نہیں مانتے؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے سوائے دنیا کی زندگی کی ذلت ورسوائی کے‘ اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف‘ اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو“۔ چنانچہ موجودہ حالات کے تناظر میں ہم میں سے ہر ایک کو اس معاملے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ کسی بڑے عذاب سے پہلے جو مہلت ہمیں دستیاب ہے اس سے ہم فائدہ اٹھالیں اور توبہ کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں۔

لہو ولعب کی محفلیں سجانے والوں کا انجام

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ‌ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ‌ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۶﴾ (لقمان)

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کھیل تماشے کی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ گمراہ کریں (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے بغیر علم کے‘ اور اس کو ہنسی بنالیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔“

اس آیت میں خصوصی طور پر نضر بن حارث کے کردار کی طرف اشارہ ہے جو رؤسائے قریش میں سے تھا۔ دراصل نزولِ قرآن کے وقت عرب کے معاشرہ میں شعر وشاعری کا بہت چرچا تھا۔ ان کے عوام تک میں شعر کا ذوق پایا جاتا تھا اور اچھی شاعری اور اچھے شاعروں کی ہر کوئی قدر کرتا تھا۔ ایسے ماحول میں قرآن کریم جیسے کلام نے گویا اچانک کھلبلی مچادی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس کلام کے گرویدہ ہونے لگے تھے‘ اس کی فصاحت و بلاغت انہیں مسحور کیے دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو شخص قرآن حکیم کو ایک بار سن لیتا وہ اسے بار بار سننا چاہتا۔ یہ صورتِ حال مشرکین کے لیے بہت تشویش ناک تھی۔ وہ ہر قیمت پر لوگوں کو اس کلام سے دور رکھنا چاہتے تھے اور دن رات اس کی اس ”قوتِ تسخیر“ کا توڑ ڈھونڈنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ نضر بن حارث نے اپنے فہم کے مطابق اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ وہ شام سے ناچ گانے والی ایک خوبصورت لونڈی خرید لایا اور اس کی مدد سے مکہ میں اس نے راتوں کو ناچ گانے کی محفلیں منعقد کرانا شروع کر دیں۔ بظاہر یہ ترکیب بہت کامیاب اور مؤثر تھی کہ لوگ ساری ساری رات ناچ گانے سے لطف اندوز ہوں‘ اس کے بعد دن کے بیشتر اوقات میں وہ سوتے

رہیں اور اس طرح انہیں قرآن سننے یا اپنے اور اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی کبھی فرصت ہی میسر نہ آئے۔

یہاں ضمنی طور پر اس صورت حال کا تقابل آج کے اپنے معاشرے سے بھی کر لیجیے۔ مکہ میں تو ایک نضر بن حارث تھا جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا' لیکن آج ہمارے ہاں سپورٹس میچز' میوزیکل کنسرٹس (concerts) اور بے ہودہ فلموں کی صورت میں لہو ولعب اور فحاشی و عریانی کا سیلاب بلا گھر گھر میں داخل ہو چکا ہے جو پورے معاشرے کو اپنی رو میں بہائے چلا جا رہا ہے۔ فحاشی و عریانی کے تعفّن کا یہ زہر ہمارے نوجوانوں کی رگوں میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ بحیثیت مجموعی ان کے قلوب و اذہان میں موت یا آخرت کی فکر سے متعلق کوئی ترجیح کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ ان میں سے کسی کو (اِلاّ ماشاء اللہ) اب یہ سوچنے کی فرصت ہی میسر نہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس طرف جا رہا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد و مآل کیا ہے؟ اس کے ملک کے حالات کس رُخ پر جا رہے ہیں اور اس ملک کا مستقبل کیا ہے؟ اس سب کچھ کے مقابلے میں ذہن اقبال کے ابلیس کی سوچ تو گویا بالکل ہی بے ضرر تھی جس نے بقولِ اقبال مسلمان کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے کارندوں کو یہ سبق پڑھایا تھا:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

گویا اُس دور میں ابلیس کو معلوم تھا کہ مسلمان کسی قیمت پر بھی ''عریاں الحاد'' کے جال میں پھنسنے والا نہیں۔ اس لیے وہ کھل کر سامنے آنے کی بجائے ''مزاجِ خانقاہی'' کا سہارا لے کر مسلمانوں کو ''شرعِ پیغمبر'' سے برگشتہ کرنے کا سوچتا تھا۔ مگر آج صورت حال یکسر مختلف ہے۔ آج ابلیس کی ''جدوجہد'' کی کرامت سے ''نوجوان مسلم'' اس قدر ''جدت پسند'' ہو چکا ہے کہ فحاشی و عریانی کے مظاہر کو وہ جدید فیشن اور نئی ترقی کا حصہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میڈیا کے سٹیج پر ابلیسیت کوئی بہروپ بدلنے کا تکلف کیے بغیر اپنی اصل شکل میں برہنہ محوِ رقص ہے اور ہماری نئی نسل کے نوجوان بغیر کسی تردد کے اپنی تمام ترجیحات کو بالائے طاق رکھ کر اس تماشہ کو دیکھنے میں رات دن مگن ہیں۔ گویا یہی ان کی زندگی ہے اور یہی اس زندگی کا مقصد و مآل!

حضرت لقمان کے نصائح

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ
فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ڼ اِنَّ
الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ
وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ
تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ
سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑮ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ

تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمٰوٰتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا
اللّٰهُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿١٦﴾ يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٧﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا
تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾ (لقمان)

سورۂ لقمان کی ان آیات میں بنیادی طور پر حضرت لقمان کی نصیحتیں نقل ہوئی ہیں۔ ان نصیحتوں میں اس قدر جامعیت ہے کہ انسان کی نجاتِ اُخروی کے لوازمات کا ایک مکمل خاکہ ان کے اندر موجود ہے۔ حضرت لقمان نہ تو خود نبی تھے اور نہ ہی کسی نبی کے پیروکار تھے' بلکہ وہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان تھے۔ ان کے حوالے سے جو بہت اہم نکتہ یہاں پر واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے اور اگر ماحول کے منفی اثرات کے باعث اس کی فطرت مسخ نہ ہوگئی ہو تو وحی یا کسی نبی کی راہنمائی کے بغیر بھی کائنات کے کچھ حقائق تک اُس کی رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی عقل سلیم کے ذریعے بڑی آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق ایک ہے' اس کی تخلیق میں اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔ وہ ایسی ہستی ہے جو تمام صفاتِ کمال سے بتمام وکمال متصف ہے۔ اُسی نے اس کائنات کی تدبیر کی ہے اور وہی اس کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔

اسی طرح ایک سلیم الفطرت انسان عقلی طور پر یہ حقیقت بھی سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی کا ہونا بھی ناگزیر ہے' اور یہ کہ جس خالق نے انسانوں کو پیدا کیا ہے وہ ان کا محاسبہ بھی کرے گا۔ ہر انسان کو اس دنیا میں اپنے کیے کی سزا یا جزا کے لیے اپنے خالق کے حضور ضرور حاضر ہونا پڑے گا۔ ان حقائق کے ادراک کو ''ایمان'' تو نہیں کہا جا سکتا' لیکن معرفت یا حکمت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ''ایمان'' تو نبی کی دعوت کی تصدیق کا نام ہے' جس تک انسان خود بخود عقلی طور پر رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ معرفت اور حکمت کے یہ دو مقامات (وجودِ باری تعالیٰ کا ادراک اور آخرت کا شعور) ایسے ہیں جن تک انسان اپنی عقل سلیم کی مدد سے بھی پہنچ سکتا ہے' بشرطیکہ اس کی فطرت پر غفلت اور مادیت کے پردے نہ پڑ چکے ہوں۔

ایک سلیم الفطرت انسان کو اس مقامِ معرفت پر پہنچ کر آگے بڑھنے کے لیے کسی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اب تک اُس نے عقل کی مدد سے اپنے خالق کو پہچان تو لیا ہے لیکن اس کے خالق کا اس سے تقاضا کیا ہے' اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر وہ مدد کے لیے پکارتا ہے۔ انسان کی فطرتِ سلیمہ کی اس پکار کو اللہ تعالیٰ نے الفاظ کا جامہ عطا کر کے ایک خوبصورت دعا کی صورت میں محفوظ فرما دیا ہے۔ یہ وہی دعا ہے جو ہم ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک عام آدمی کی دعا نہیں ہے'

بلکہ یہ اُس انسان کی فطرت کی پکار ہے جو اپنی سلامتیٔ طبع' سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر چکا ہے۔ اس معرفت کے بعد اس کی روح گویا بے اختیار پکار اٹھتی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ یعنی اُس نے اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات اور ربّ العالمین کے طور پر پہچان لیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾ ہستی کے طور پر بھی جان چکا ہے۔ اس کے بعد وہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③﴾ کی منطق کا قائل بھی ہو چکا ہے اور اپنی عقل سلیم ہی کی مدد سے اسے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④﴾ کا فلسفہ بھی سمجھ میں آ چکا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہیں جانتا۔ اسے اس حقیقت کا ادراک تو ہو گیا ہے کہ اسے اپنے رب ہی کی بندگی کرنی چاہیے اور اسی کی مرضی پر چلنا چاہیے' مگر اس کی بندگی کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کی مرضی ہے کیا؟ اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ چنانچہ یہاں وہ اُسی ذات کی طرف رجوع کرتا ہے جس کی معرفت سے اس کا سینہ منور ہوا ہے اور اُس سے راہنمائی کی درخواست کرتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۥ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾ ''(اے ہمارے ربّ!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

حضرت لقمان ایک ایسی ہی سلیم الفطرت شخصیت تھے جو وحی یا کسی نبی کی راہنمائی کے بغیر کائنات کے مذکورہ حقائق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ حبشی النسل تھے اور پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے۔ ان کا تعلق مصر اور سوڈان کے سرحدی علاقے نوبیا (Noobia) سے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکمت و ذہانت اور سلامتیٔ فطرت کی مدد سے نہ صرف انہیں توحید کی معرفت حاصل ہوئی بلکہ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ انسانی اعمال ضائع ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اس رکوع میں حضرت لقمان کی ان نصیحتوں کا ذکر ہے جو انہوں نے انتقال کے وقت اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ گویا یہ باتیں ان کی عمر بھر کی سوچ کا لُبِ لُباب ہیں۔ چونکہ وہ کسی نبی کے پیروکار نہیں تھے اور نہ ہی وحی کی تعلیمات ان تک پہنچی تھیں اس لیے ان کی نصیحتوں میں نہ تو کسی رسول کا تذکرہ ہے اور نہ ہی ان حقائق کا ذکر ہے جن کا علم صرف وحی کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

عرب کے لوگ حضرت لقمان کی شخصیت سے خوب واقف تھے۔ وہ نہ صرف انہیں ایک دانشور حکیم کے طور پر جانتے تھے بلکہ ان کے اقوال کو اپنے اشعار اور خطبات میں نقل (quote) بھی کیا کرتے تھے۔ اس پس منظر میں حضرت لقمان کے اقوال و نصائح کو قرآن میں نقل (quote) کر کے اللہ تعالیٰ نے گویا مشرکینِ عرب کو یاد دلایا کہ دیکھو! لقمان جیسا دانشور حکیم بھی اپنی سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فکر کے باعث اسی اصول اور اسی نکتے تک پہنچا تھا جس کی دعوت آج تم لوگوں کو محمد (ﷺ) دے رہے ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ ''اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی تھی''

﴿اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ﴾ ''کہ اللہ کا شکر ادا کرو!''

انسان کی حکمت و دانائی اور اس کی فطرت کے ''سلیم'' ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ جو کوئی بھی اس کے

ساتھ بھلائی کرے اُس کے لیے اس کے دل میں بھلائی اور احسان مندی کے جذبات پیدا ہوں اور پھر وہ مناسب طریقے سے ان جذبات کا اظہار بھی کرے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو چکی ہو تو وہ اپنے محسن اعظم اور منعم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور ہر لحہ اور ہر مقام پر ضرور کلمۂ شکر بجالائے گا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے اظہار کے لیے بہترین کلمۂ شکر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' ہے' جو قرآن مجید کا کلمۂ آغاز بھی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾ ''اور جو کوئی بھی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی بھلے کے لیے۔''

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫﴾ ''اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ﴾ ''اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے سے جبکہ وہ اسے نصیحت کر رہا تھا''

یہاں سے ان نصیحتوں کا آغاز ہوتا ہے جن میں حضرت لقمان اپنے بیٹے سے مخاطب ہیں۔ اگرچہ یہاں پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا' لیکن انہوں نے یہ نصیحتیں اپنے انتقال کے وقت کی تھیں۔ ہر شخص فطری طور پر چاہتا ہے کہ وہ اپنی موت سے پہلے اپنی اولاد کو اپنے ورثے کے بارے میں ضروری ہدایات دے جائے۔ جیسے عام طور پر بڑے بڑے کارخانہ دار اور دولت مند لوگ اپنے کاروبار' اثاثہ جات اور لین دین کے معاملات سے متعلق وصیت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت لقمان جیسے حکیم انسان نے بھی ضروری سمجھا کہ اپنی عمر بھر کی فکر و دانائی کا نچوڑ اور لُبِ لُباب موت سے پہلے اپنے بیٹے کو منتقل کر دیں۔

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬﴾ ''اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

لغوی اعتبار سے لفظ ''ظلم'' کا مفہوم ناانصافی اور حق تلفی ہے۔ ''ظلم'' کی تعریف یوں کی جاتی ہے: وَضْعُ الشَّیْئِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ یعنی کسی چیز کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی دوسری جگہ پر رکھ دینا۔ ظلم کی اس تعریف پر غور کریں تو یہ نکتہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہاں شرک کو ''ظلم عظیم'' کیوں کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا خالق ہے اور کائنات کی ہر چیز اُس کی مخلوق ہے۔ وہ اپنی صفات میں یکتا اور تنہا ہے۔ اب اگر کوئی انسان ان صفات کے اعتبار سے مخلوق میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے برابر کر دے یا اللہ تعالیٰ کو کسی اعتبار سے گرا کر مخلوق کی صف میں لا کھڑا کرے تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا؟

حضرت لقمانؑ کی اس اہم نصیحت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی طرف سے ایک نصیحت کا اضافہ کیا ہے جو والدین کے حقوق سے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت لقمان نے کسرِ نفسی کے باعث خود اپنے حق سے متعلق بیٹے کو نصیحت کرنا مناسب نہ سمجھا ہو' چنانچہ اس کمی کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرما دیا۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم میں یہ پانچواں

مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقِ توحید کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے پہلے البقرۃ: ۸۳‘ النساء: ۳۶‘ الانعام: ۱۵۱‘ اور بنی اسرائیل: ۲۳ میں اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہوا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ﴾ ’’اور ہم نے وصیت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں۔‘‘

یعنی والدین کے بارے میں حسنِ سلوک کی تاکیدی ہدایت کی۔ پھر والدین میں سے بھی والدہ کے حق کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا‘ کیونکہ بچوں کی پیدائش اور پرورش کے سلسلے میں زیادہ مشقت اور تکلیف والدہ ہی کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ﴾ ’’اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر‘‘

﴿وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ﴾ ’’اور اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں‘‘

پہلے نو ماہ تک بچہ ماں کے پیٹ میں رہ کر جونک کی طرح اس کا خون چوستا رہا اور پھر پیدائش کے بعد دو سال تک مسلسل اس کے جسم کی توانائیاں دودھ کی شکل میں نچوڑتا رہا۔

﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ﴾ ’’کہ تم شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا!‘‘

﴿إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾﴾ ’’اور میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا۔‘‘

اب اللہ تعالیٰ اور والدین کے حقوق میں توازن کے سلسلے میں جو وضاحت اگلی آیت میں آ رہی ہے وہ قبل ازیں سورۃ العنکبوت کی آیت ۸ میں بھی آ چکی ہے۔ اس سے ان دونوں سورتوں کے مضامین میں مشابہت اور مناسبت کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔

آیت ۱۵ ﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ﴾ ’’اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شریک کرو اُس چیز کو جس کا تمہارے پاس کوئی علم نہیں تو ان کا کہنا مت ماننا‘‘

یہاں والدین کے اپنی اولاد کو شرک پر مجبور کرنے کے حوالے سے ’’جہاد‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے‘ جس کے معنی انتہائی کوشش کے ہیں۔ چنانچہ اس لفظ میں والدین کی طرف سے اپنا موقف منوانے کے لیے لڑنے جھگڑنے اور ہر طرح سے دباؤ ڈالنے کا مفہوم موجود ہے۔ البتہ یہاں بہت واضح انداز میں بتا دیا گیا ہے کہ والدین کے تمام تر تقدس اور احترام کے باوجود انہیں اپنی حدود سے تجاوز کرنے اور اللہ تعالیٰ کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی۔ یعنی اگر والدین اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے پر مجبور کرنے لگیں تو اولاد ان کے اس حکم کی تعمیل کسی قیمت پر نہ کرے۔ اس حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ حکم صرف بت پرستی کی ممانعت تک محدود نہیں بلکہ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ کے الفاظ میں ہر قسم کے شرک کی مطلق

ممانعت ہے‘ بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر والدین اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کو توڑنے کا کہہ رہے ہوں تو گویا وہ شرک ہی کا حکم دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی دوسرے کو مطاع ماننا گویا اسے معبود بنا لینے کے مترادف ہے۔ جیسے اگر کوئی شخص اپنے نفس کے اُکسانے پر حرام میں منہ مارتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر اپنے نفس کی بات مانتا ہے تو گویا اس نے حرام دولت کو اور اپنے نفس کو معبود کا درجہ دے دیا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ الفرقان کی یہ آیت بہت واضح ہے: ﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِ وَکِیۡلًا ﴿۴۳﴾﴾ (الفرقان) ’’کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے! تو (اے نبی ﷺ!) کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟‘‘

دراصل شرک جیسے حساس مسئلے کو بہت زیادہ احتیاط اور اہتمام کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شرک کا محدود مفہوم سامنے رکھ کر اس کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ الحمد للہ! اس موضوع پر میں نے تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کے موضوع پر میری چھ گھنٹوں کی تقاریر کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ان تقاریر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان تقاریر کو اسی موضوع کے تحت کتابی صورت میں شائع بھی کیا جاچکا ہے۔

﴿وَصَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا ۫﴾ ’’اور دنیا میں ان کے ساتھ رہو بہتر انداز میں‘‘

ملاحظہ کیجیے اللہ تعالیٰ کے احکام کے اندر کس قدر خوبصورت توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف والدین کے حقوق ادا کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے‘ جبکہ دوسری طرف ان کے حقوق کی حد بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ اگر والدین کافر یا مشرک ہیں تو ان کے تمام حقوق ہی ساقط ہو جائیں‘ بلکہ ایسی صورت میں بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ یعنی اگر والدین مشرک ہیں تو بھی ان کی خدمت کرو‘ ان کی ضروریات کا خیال رکھو اور ان کے مؤدّب بن کر رہو۔ البتہ اگر وہ شرک پر مجبور کریں یا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کا یہ مطالبہ نہ مانا جائے اور اس حوالے سے بھی انکار کرتے ہوئے ان کے ساتھ بدتمیزی نہ کی جائے۔

﴿وَّاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ﴾ ’’اور پیروی کرو اُس شخص کی جو میری طرف رخ کر چکا ہے‘‘

قرآن مجید میں جہاں بھی والدین کے حقوق کی بات ہوئی ہے وہاں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے جبکہ ان کی اطاعت کرنے کا حکم کہیں بھی نہیں دیا گیا۔ بہرحال اگر والدین کی اطاعت ہوگی بھی تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہی ہوگی۔ البتہ جہاں تک اتباع اور پیروی کا تعلق ہے تو وہ صرف اسی شخص کی جائز ہے جو ہر طرف سے منہ موڑ کر کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں آچکا ہو۔ جب تک نبوت کا تسلسل قائم تھا تو یہ بات انبیاء کرام علیہم السلام پر صادق آتی تھی۔ اب ختمِ نبوت کے بعد اُمت میں سے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حضور ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے لوگوں کو دین کی طرف بلائے‘ اس آیت کی رو سے اس کا اتباع کرنا اور اس کا ساتھ دینا ضروری ہے۔

﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے' پھر میں تمہیں جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

آخر کار تم سب نے میرے پاس ہی آنا ہے' والدین کو بھی میرے حضور حاضر ہونا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ ان میں سے جس نے جو کیا ہوگا' وہ سب کچھ اسے دکھا دیا جائے گا۔

اب اگلی آیت میں حضرت لقمان کی دوسری نصیحت کا ذکر ہے۔ ان کی پہلی نصیحت آیت ۱۳ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد دو آیات میں والدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿یٰبُنَیَّ اِنَّہَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ﴾ ''اے میرے بچے! اگر وہ (کوئی اچھا یا بُرا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو''

اپنی جسامت کے اعتبار سے رائی کا دانہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ مراد اس سے بہت ہی چھوٹی یا حقیر چیز ہے۔ قرآن مجید میں کسی چھوٹی یا حقیر چیز کا ذکر کرنے کے لیے حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ (رائی کے دانے) کے علاوہ بالعموم فَتِیۡلًا یعنی کھجور کی گٹھلی کے ساتھ لگے ہوئے دھاگے (النساء:۴۹) اور نَقِیۡرًا یعنی کھجور کی گٹھلی کے گڑھے (النساء:۱۲۴) جیسے الفاظ بھی آتے ہیں' لیکن رائی کا دانہ اپنی جسامت میں ان سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔

﴿فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَۃٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِہَا اللّٰہُ ؕ﴾ ''پھر وہ ہو کسی چٹان میں یا آسمانوں میں یا زمین کے اندر' اُسے اللہ لے آئے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت باریک بین' ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔''

انسان اشرف المخلوقات ہے' اس کے اعمال چاہے اچھے ہوں یا برے وہ بھی انسان ہی کی طرح اہم ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ انسانی اعمال کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ انسان کا کوئی بھی عمل' چاہے وہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں وقوع پذیر ہوا ہو' خلاء کی پہنائیوں میں یا زمین کے پیٹ کی تاریکیوں میں سرانجام دیا گیا ہو' وہ اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا۔ یہی مضمون سورۃ الزلزال میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ﴿۷﴾ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿۸﴾﴾ ''تو جو کوئی کرے گا ذرّہ برابر بھلائی وہ اسے دیکھ لے گا' اور جو کوئی کرے گا ذرّہ برابر برائی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔''

نوٹ کیجیے! حضرت لقمان نے اپنی وصیت میں شرک اور انسانی اعمال کے لازمی نتائج کے بعد بعث بعد الموت یا جنت و دوزخ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ معلومات صرف وحی یا نبوت کی تعلیمات کے ذرائع سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت لقمان نہ تو خود نبی تھے اور نہ ہی ان تک کسی نبی کی تعلیمات پہنچی تھیں۔ اس لیے ان کی نصیحتوں میں صرف وہی باتیں پائی جاتی ہیں جن تک کوئی صاحبِ حکمت شخص غور و خوض کے ذریعے پہنچ سکتا ہے —— اب ان کی تیسری نصیحت ملاحظہ ہو:

آیت ۱۷ ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ﴾ ''اے میرے بچے! نماز قائم کرو''

نماز اللہ تعالیٰ کے ذکر کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ نماز کی اقامت یا پابندی سے مقصود بنیادی طور پر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کی کیفیت کو ہر وقت مستحضر رکھا جائے' ورنہ انسان کا نفس اسے غلط راستے پر ڈال دے گا اور شیطان اسے ورغلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۵ میں نماز کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ یہ غلط کاموں سے روکتی ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ﴾ ''تلاوت کرتے رہا کریں اُس کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف کتاب میں سے اور نماز قائم کریں' یقیناً نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے''۔ چنانچہ حضرت لقمان کی اس نصیحت کا مفہوم یہ ہے کہ بیٹا! اللہ تعالیٰ کو محض پہچان لینا ہی کافی نہیں بلکہ اسے ہر وقت یاد رکھنا بھی ضروری ہے' ورنہ انسان کا سیدھے راستے سے بھٹکنے کا اندیشہ ہر وقت رہے گا۔ اب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت لقمان کے ہاں نماز کی کیا صورت تھی مگر مراد اس سے یہی ہے کہ انسان کو اپنے شب و روز میں کوئی ایسا معمول ضرور اپنانا چاہیے جس سے اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھا جائے۔

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو''

یہ حضرت لقمان کی چوتھی نصیحت ہے۔ دراصل یہ انسان کی انسانیت' اس کی شرافت اور مروّت کا ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کی بھلائی کے لیے حسبِ استطاعت کوشاں رہے۔ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت جو کوئی انسان سرانجام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ معاشرے میں رہتے ہوئے بھلائی کا پرچار کرے اور برائیوں سے لوگوں کو روکے۔

﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ﴾ ''اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!''

یہ گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عمل کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ حق ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے' اپنے اعمال اور رویے پر تنقید کسی کو بھی پسند نہیں۔ چنانچہ جب آپ حق کی بات کریں گے' لوگوں کے غلط طرزِ عمل پر تنقید کریں گے' کسی کو بُرائی سے رک جانے کی نصیحت کریں گے' تو لوگ آپ کو برا بھلا بھی کہیں گے اور آپ پر کیچڑ بھی اچھالنے کی کوشش کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ آپ کی جان کے درپے بھی ہو جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علم بلند کر کے حق کا راستہ اپنانا ہے تو پھر آپ کو صبر کرنا بھی سیکھنا ہوگا اور مشکل سے مشکل حالات میں استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا ہوگا۔

﴿اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾ ''یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

غور کریں تو حضرت لقمان کی ان چار نصیحتوں میں وہی چار باتیں ایک دوسرے انداز میں بیان ہوئی ہیں جن کا ذکر سورۃ العصر میں آیا ہے۔ سورۃ العصر میں یہ باتیں یوں بیان ہوئی ہیں: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے' انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ سورۃ العصر میں مذکور ان

چار نکات یعنی ایمان‘ اعمالِ صالحہ‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا اگر حضرت لقمان کی نصائح کے مندرجات سے تقابل کریں تو ’’ایمان‘‘ کی جگہ حضرت لقمان نے توحید کا ذکر کیا ہے‘ اعمالِ صالحہ میں سے نماز اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر ہے۔ تواصی بالحق کی جگہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصیحت کی ہے‘ جبکہ ’’صبر‘‘ کا ذکر دونوں جگہ پر ہی موجود ہے۔ گویا دونوں مقامات پر استعمال ہونے والی اصطلاحات اگرچہ مختلف ہیں لیکن مضمون ایک ہی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ ’’اور اپنے گالوں کو پھلا کر مت رکھو لوگوں کے سامنے‘‘

یعنی لوگوں کے ساتھ بے رخی اور غرور و تکبر کی روش مت اختیار کرو۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ﴾ ’’اور زمین میں اکڑ کر مت چلو۔‘‘

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾﴾ ’’یقیناً اللہ ہر شیخی خورے‘ تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

لفظی اعتبار سے مُخْتَال کا تعلق خیل (گھوڑے) سے ہے۔ گھوڑے کی چال میں ایک خاص تمکنت اور غرور کا انداز پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب انسان اپنی چال کے انداز میں گھوڑے کے سے غرور و تمکنت کا مظاہرہ کرتا ہے تو گویا وہ مُخْتَال بن جاتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾﴾ ’’اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو تم نہ تو زمین کو پھاڑ سکو گے اور نہ ہی پہنچ سکو گے پہاڑوں تک اونچائی میں‘‘ —— اور اب اگلی نصیحت:

آیت ۱۹ ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ ’’اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو‘‘

یہ میانہ روی (اقتصاد) صرف ظاہری چال ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی مجموعی ’’چال‘‘ میں بھی مطلوب ہے۔ خصوصی طور پر قرآن حکیم میں معیشت کی میانہ روی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ الفرقان میں بندۂ مومن کی پختہ (mature) اور متوازن شخصیت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾﴾ ’’اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ (ان کا معاملہ) اس کے بین بین معتدل ہوتا ہے۔‘‘

﴿وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ﴾ ’’اور اپنی آواز کو پست رکھو۔‘‘

خصوصی طور پر کسی بحث و تمحیص کے دوران اونچی آواز میں چیخنے کے بجائے ٹھوس دلیل کے ساتھ پروقار انداز میں گفتگو کرو۔ کیونکہ عام طور پر بحث کرتے ہوئے آدمی اونچی آواز میں چیخ چیخ کر اس وقت بولتا ہے جب اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو۔ گویا وہ آواز کے زور سے اپنی دلیل کی کمی پوری کرنا چاہتا ہے۔

﴿إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾﴾ ’’یقیناً سب سے ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔‘‘

خواہ مخواہ بلند آواز سے بولنے میں انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اس میں اگر کوئی بڑائی ہوتی تو اس کا سب

سے زیادہ مستحق گدھا قرار پاتا جس کی آواز غیر معمولی طور پر بلند اور زوردار ہوتی ہے‘ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ گدھے کی آواز سب آوازوں سے زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک معقول انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ گدھے کی طرح چِلّا چِلّا کر گفتگو کرے‘ بلکہ بات چیت میں انسان کا بہتر طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ تحمل سے گفتگو کرے اور گفتگو میں وزن پیدا کرنے کے لیے علمی و عقلی دلیل کا سہارا لے۔

پانچ چیزوں کے خصوصی حوالے سے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کا بیان

إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾

(لقمان)

﴿إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ﴾ ’’یقیناً اللہ ہی ہے جس کے پاس ہے قیامت کا علم۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔ عام طور پر ہم ’’قیامت‘‘ اور ’’السّاعة‘‘ کے الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور انہیں باہم مترادف الفاظ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ ان دونوں میں سے ہر لفظ کا اپنا الگ مفہوم ہے۔ ’’السّاعة‘‘ کے معنی مخصوص گھڑی کے ہیں اور قرآنی اصطلاح کے مطابق ’’السّاعة‘‘ وہ معین گھڑی ہے جب پوری زمین زلزلے سے جھنجھوڑ ڈالی جائے گی‘ اجرامِ سماویہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ مثلاً سورۃ القارعہ میں ’’السّاعة‘‘ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿الْقَارِعَةُ ﴿١﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٣﴾ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ﴿٤﴾ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ﴿٥﴾﴾ ’’وہ کھڑکھڑانے والی! کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی؟ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی! جب لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔ اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی۔‘‘

اسی طرح لفظ ’’قیامت‘‘ کا جائزہ لیں تو اس کے لغوی معنی قیام کرنے اور کھڑے ہونے کے ہیں اور اس سے وہ وقت یا وہ دن مراد ہے جب تمام لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہوں گے۔

﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ﴾ ’’اور وہی بارش برساتا ہے۔‘‘

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ﴾ ’’اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔‘‘

﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ﴾ ’’اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کل وہ کیا کمائی کرے گی۔‘‘

﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ﴾ ’’اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کس زمین میں اُس کی موت واقع ہو گی۔‘‘

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾﴾ ’’یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا‘ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک آدمی ساری عمر ایک جگہ مقیم رہا' مگر کبھی اچانک وہ کسی دوسرے ملک گیا اور وہاں اس کی موت واقع ہوگئی' جبکہ اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اُسے موت اس دیارِ غیر میں آئے گی۔

اس آیت کے حوالے سے بعض لوگ خواہ مخواہ اشکال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اس کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پہلا نکتہ یہ لائق توجہ ہے کہ جن پانچ چیزوں کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے ان میں سے پہلی اور آخری دو یعنی کُل تین چیزیں ایسی ہیں جن کے ذکر میں ''حصر'' کا اسلوب ہے' یعنی ان میں دوٹوک نفی (categorical denial) موجود ہے کہ ان چیزوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ تین چیزیں ہیں: (۱) عِلْمُ السَّاعة' (۲) اس چیز کا علم کہ کل کوئی کیا کرے گا' اور (۳) کسی کو اپنی موت کی جگہ کا علم ہونا۔ جبکہ باقی دو چیزوں (دوسری اور تیسری) کے ذکر میں ''حصر'' کا اسلوب نہیں ہے۔ یعنی ان کا ذکر کرتے ہوئے کسی دوسرے کے علم کی نفی نہیں کی گئی' بلکہ بارش کے حوالے سے تو یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر ہوا ہے' نہ کہ اُس کے علم کا' کہ اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے۔ اس سلسلے کے دوسرے فرمان (وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ) میں بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر ہے کہ وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں کے اندر ہے' اور یہاں بھی ''حصر'' کا اسلوب نہیں ہے۔ یعنی کسی دوسرے کے علم کی یہاں بھی نفی نہیں کی گئی۔ چنانچہ قرآن حکیم کے ان الفاظ میں نہ تو کوئی اشکال ہے اور نہ ہی کسی اعتراض کی کوئی گنجائش موجود ہے۔

البتہ بعض لوگ اس حدیث پر اعتراض کرتے ہیں جو اس آیت کی وضاحت میں وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ ''حدیث جبریل'' میں مذکور ہے کہ نو وارد شخص (جو دراصل حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے) نے رسول اللہ ﷺ سے ایمان' اسلام اور احسان کے بارے میں سوالات کرنے کے بعد دریافت کیا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَتَى السَّاعَةُ؟ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! قیامت کب آئے گی؟'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ!)) ''جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا!'' —— اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی چند علامات بیان فرمائیں اور پھر ارشاد فرمایا: ((فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ)) ''پانچ چیزوں کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ لقمان کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾﴾

اس حدیث کے حوالے سے عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آج کل ماں کے پیٹ کے اندر بچے کی جنس کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے' لہٰذا یہ دعویٰ درست نہیں کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ کیونکہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ اب تک انسان اس کے صرف ایک پہلو یعنی بچے کی جنس (لڑکا یا لڑکی) کے بارے میں ہی معلوم کر سکا ہے' جبکہ اس کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ مثلاً ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ بچہ کن صلاحیتوں کا مالک ہوگا؟ ذہین وفطین ہوگا یا کند ذہن' نیکوکار

ہوگا یا بدکار۔ اسی طرح بارش کے بارے میں محکمہ موسمیات کی پیشین گوئیوں کی حقیقت بھی ظن وتخمین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس توجیہہ کی موجودگی میں حدیث کے الفاظ پر بھی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

دعوتِ دین کے حوالے سے ائمہ بنی اسرائیل کے طرزِ عمل کی تعریف

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ)

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ﴾ ''اور ہم نے ان میں سے ایسے امام اُٹھائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے' جب کہ انہوں نے صبر کی روش اختیار کی۔''

یعنی بنی اسرائیل کے ائمہ اور پیشواؤں کو تورات کی تعلیمات لوگوں تک پہنچانے کے لیے صبر کی روش پر کاربند رہنا پڑتا تھا۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ کتاب اللہ کی تعلیمات کو سیکھنے اور پھر لوگوں تک پہنچانے کے لیے وقت درکار ہے جو انسانی سطح پر بذاتِ خود ایک بہت بڑی قربانی ہے۔ دولت اور عیش وعشرت کے حصول کی حرص ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر کوئی شخص اپنا بیشتر وقت دنیا اور اس کی آسائشوں کے حصول کے لیے صرف کردے گا تو اُس کے شب وروز میں دعوت وتبلیغ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کے لیے وقت کہاں سے آئے گا؟ چنانچہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے کے لیے کمربستہ ہونا ہے تو صبر واستقامت کا دامن تھام کر اسے لازمی طور پر دنیا کی بہت سی آسائشوں کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس راستے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے بھی صبر درکار ہے۔ کتاب اللہ کی تعلیم وتبلیغ کے حوالے سے یہ دونوں فرائض گویا بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب بھی کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن کر نکلے گا تو لوگ اس کی مخالفت کریں گے' اس راہ میں اسے گالیاں بھی سننا پڑیں گی' جسمانی وذہنی اذیتوں کا سامنا بھی کرنا ہوگا اور مال و جان کے نقصانات بھی برداشت کرنا پڑیں گے۔ بہرحال اس راستے پر جس پہلو سے بھی کوئی جدوجہد کرے گا' اسے قدم قدم پر ایسے سنگ ہائے میل سے سابقہ پڑے گا جو صبر واستقامت اور ایثار وقناعت کے رنگارنگ مطالبات سے عبارت ہوں گے۔

آج قرآن حکیم کی تبلیغ وترویج کے میدان میں یہ آیت ہمارے لیے نشانِ منزل بن سکتی ہے۔ جس انداز میں یہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے 'ائمہ' کی تعریف فرمائی ہے اس کے لطیف احساس سے ہمارے دلوں میں ترغیب وتشویق کے جذبات کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنی چاہئیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بنی اسرائیل کے ان 'ائمہ' کے کردار اور خوش نصیبی سے متعلق اپنے دلوں میں رشک پیدا کریں اور پھر اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں کہ وہ ہمیں بھی اس کام کے لیے چُن لے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ یہ ''رتبہ بلند'' محض دعاؤں اور تمناؤں کے سہارے نہیں ملا کرتا۔ اس کے لیے ہمیں صبر واستقامت اور ایثار وقناعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترجیحی بنیادوں پر عملی کوشش کرنا ہوگی۔ اپنی بہت سی خواہشات کو قربان کرنا ہوگا' اپنے معیارِ زندگی (living standard) کو کم سے کم سطح پر رکھنا ہوگا اور یوں اپنے تبلیغی بھائیوں کے بقول ''تفریغ الاوقات'' (دینی جدوجہد کے لیے وقت

نکالنا) کو ممکن بنانا ہوگا۔

اس سلسلے میں ہم میں سے ہر ایک کو سنجیدہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے ایک دفعہ اپنا بیشتر وقت پیسہ کمانے اور معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوششوں میں صرف کرنے کی روش کو اپنا لیا تو یوں سمجھیں کہ ہم نے خود کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والے چکر میں ڈال لیا۔ یعنی خود کو ایک نام نہاد معیارِ زندگی کے ''سراب'' کو پا لینے اور پھر اس کو برقرار رکھنے کی خواہشات کا اسیر بنا لیا۔ اگر خدانخواستہ ہم نے اپنی زندگی اسی ''دنیاداری'' میں گزار دی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ایک خاص ''معیارِ زندگی'' کو اپنے معبود کا درجہ دے کر گویا ساری عمر اسی کی پوجا میں گزار دی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے قرآن حکیم کا دامن مضبوطی سے تھام لیں' اپنی زندگی کے لیے راہنمائی صرف اور صرف قرآن حکیم سے حاصل کرنے کا تہیہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کے لیے ہمارے سامنے' ان شاء اللہ' اسباب کے نت نئے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسجودِ ملائک بنایا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نقطۂ عروج (climax) ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جب یہ عزمِ صمیم کا زادِ سفر لے کر کسی راہ پر چل پڑتا ہے تو مشکلات اس سے کنی کترانے لگتی ہیں اور منزلیں خود آگے بڑھ کر اس کے قدم چومتی ہیں۔

﴿وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔''

بنی اسرائیل کے ائمہ جو کتاب کی تعلیم و تبلیغ میں مصروف تھے وہ صبر کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات پر پختہ یقین بھی رکھتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنا' اُس کے وعدوں کو من وعن سچ ماننا اور اس پر توکّل کرنا راہِ حق کی جدوجہد کی لازمی شرائط ہیں۔

اُسوۂ حسنہ سے متعلق آیت کے سیاق وسباق کی اہمیت

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (الاحزاب)

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے''

بظاہر ہمارے ہاں اس آیت کی تفہیم و تعلیم بہت عام ہے۔ سیرت کا کوئی سیمینار ہو' میلاد کی کوئی محفل ہو یا حضور اکرم ﷺ کی شان میں کسی واعظِ رنگین بیان کا وعظ ہو' اس آیت کی تلاوت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی سیرت و کردار کا نمونہ اپنانے کی جو صورت آج ہم مسلمانوں کے ہاں عموماً دیکھنے میں آتی ہے اس کا تصور بلاشبہ بہت محدود نوعیت کا ہے اور جن سنتوں کا تذکرہ عام طور پر ہمارے ہاں کیا جاتا ہے وہ محض روزمرہ کے معمولات کی سنتیں ہیں' جیسے مسواک کی سنت یا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں اندر رکھنے اور باہر نکلتے ہوئے بایاں پاؤں باہر رکھنے کی سنت۔ یقیناً ان سنتوں کو اپنانے کا بھی ہمیں اہتمام کرنا چاہیے اور ہمارے لیے

حضورﷺ کی ہر سنت یقیناً منبع خیر و برکت ہے، لیکن اس آیت کے سیاق و سباق کو مدِنظر رکھ کر غور کریں تو یہ نکتہ بہت آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا کہ یہاں جس اُسوہ کا ذکر ہوا ہے وہ طاقت کے نشے میں بدمست باطل کے سامنے بے سروسامانی کے عالم میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈٹ جانے کا اُسوہ ہے۔ اور اُسوۂ رسولﷺ کا یہی وہ پہلو ہے جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

دراصل اس آیت میں خصوصی طور پر حضورﷺ کے اس کردار کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جس کا نظارہ چشمِ فلک نے غزوۂ خندق کے مختلف مراحل کے دوران کیا۔ اس دوران اگر کسی مرحلے پر فاقوں سے مجبور صحابہؓ نے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں پر پتھر بندھے ہوئے دکھائے تو حضورﷺ نے بھی اپنی قمیص اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اُس وقت اگر صحابہؓ خندق کی کھدائی میں لگے ہوئے تھے تو ان کے درمیان حضورﷺ خود بھی بڑے بڑے پتھر اپنے کندھوں پر اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینکنے میں مصروف تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی سنگلاخ چٹان صحابہؓ کی ضربوں سے ٹوٹ نہ سکی اور حضورﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے بنفسِ نفیس اپنے ہاتھوں سے ضربیں لگا کر اسے پاش پاش کیا۔ اس مشکل گھڑی میں ایسا نہیں تھا کہ حضورﷺ کے لیے پُرآسائش خیمہ نصب کر دیا گیا ہو، آپؐ اس میں محوِ استراحت ہوں، خُدّام مورچھل لیے آپؐ کی خدمت کو موجود ہوں اور باقی لوگ خندق کھودنے میں لگے ہوئے ہوں۔

حضورﷺ کے اُسوہ اور آپؐ کی سنت کو عملی طور پر اپنائے جانے کے معاملے کو سمجھانے کے لیے عام طور پر میں معاشیات کی دو اصطلاحات macro economics اور micro economics کی مثال دیا کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح macro economics کا تعلق بہت بڑی سطح کے معاشی منصوبوں یا کسی ملک کے معاشی نظام کے مجموعی خدوخال سے ہے اور چھوٹے پیمانے پر معمول کی معاشی سرگرمیوں کے مطالعے کے لیے micro economics کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اسی طرح اگر ہم macro sunnah اور micro sunnah کی اصطلاحات استعمال کریں اور اس حوالے سے اپنا اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ آج ہماری اکثریت ''مائیکرو سنت'' سے تو خوب واقف ہے، اکثر لوگ روزمرہ معمول کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر اس بنا پر دوسروں کے ساتھ جھگڑے بھی مول لیتے ہیں، لیکن ''میکرو سنت'' کی اہمیت و ضرورت کا کسی کو ادراک ہے اور نہ ہی اس کی تعمیل کی کوئی فکر (اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ)۔ مثلاً حضورﷺ کی سب سے بڑی (macro) سنت تو یہ ہے کہ وحی کے آغاز یعنی اپنی چالیس سال کی عمر کے بعد آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی معاشی جدوجہد کے لیے صرف نہیں کیا اور نہ ہی اپنی زندگی میں آپؐ نے کوئی جائیداد بنائی۔ بعثت سے پہلے آپؐ ایک خوشحال اور کامیاب تاجر تھے، لیکن سورۃ المدثر کی ان آیات کے نزول کے بعد آپؐ کی زندگی یکسر بدل گئی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾ ''اے چادر اوڑھنے والے! اُٹھیے اور (لوگوں کو) خبردار

کیجیے' اور اپنے رب کی تکبیر کیجیے''۔ اس حکم کی تعمیل میں گویا آپؐ نے اپنی ہر مصروفیت کو ترک کر دیا' ہر قسم کی معاشی جدّوجُہد سے پہلو تہی اختیار فرمائی' اور اپنی پوری قوت وتوانائی' تمام تر اوقات اور تمام تر تگ ودو کا رخ دعوتِ حق' اقامتِ دین اور تکبیرِ رب کی طرف پھیر دیا۔ یہ وہ ''میکرو سنت'' ہے جس سے نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خالی نظر نہیں آتا۔

آج اس درجے میں نہ سہی مگر اس میکرو سنت کے رنگ کی کچھ نہ کچھ جھلک تو بحیثیت مسلمان ہماری زندگیوں میں نظر آنی چاہیے' اور اس رنگ کے ساتھ ساتھ مائیکرو قسم کی سنتوں کا بھی اہتمام کیا جائے تو وہ یقیناً نورٌ علیٰ نور والی کیفیت ہوگی۔ لیکن اگر ہم اپنی ساری توانائیاں صرف چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اہتمام میں ہی صرف کرتے رہیں' برش کے بجائے مسواک کا استعمال کر کے سو شہیدوں کے برابر ثواب کی امید بھی رکھیں اور اتباعِ سنت کے اشتہار کے طور پر ہر وقت مسواک اپنی جیب میں بھی لیے پھریں' لیکن اپنی زندگیوں کا عمومی رخ متعین کرنے میں ''میکرو سنت'' کا بالکل بھی لحاظ نہ کریں تو ہمیں خود فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارا یہ طرزِ عمل اُسوۂ رسول ﷺ سے کس قدر مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے!

﴿لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ ''(یہ اُسوہ ہے) ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ سے ملاقات اور آخرت کی امید رکھتا ہو''

﴿وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾ ''اور کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہو۔''

یعنی حضور ﷺ کا اسوہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو ان تین شرائط کو پورا کرے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا متمنی ہو' یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہو۔ دوسری شرط یہ کہ وہ شخص یومِ آخرت کی بھی امید رکھتا ہو' یعنی بعث بعد الموت پر اس کا پختہ یقین ہو۔ اور تیسری شرط یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتا ہو۔ گویا ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کے حوالے سے ان شرائط کے فلسفے کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲ اور آیت ۱۸۵ کی روشنی میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں قرآن حکیم کو هُدًى لِّلنَّاسِ (تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت) قرار دیا گیا ہے۔ لیکن آیت ۲ میں اس ہدایت سے استفادہ کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی شرط سے مشروط کر دیا گیا ہے کہ قرآن حکیم سے صرف وہی لوگ ہدایت حاصل کر سکتے ہیں جو تقویٰ کی روش پر کاربند ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ کا اُسوہ تو اپنی جگہ کامل واکمل اور منبعِ رشد وہدایت ہے' لیکن اس سے استفادہ صرف وہی لوگ کر سکیں گے جو مذکورہ تین شرائط پر پورا اترتے ہوں۔

مقامِ رسالت اور رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ (الاحزاب)

آیت ۴۵ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾﴾ ”اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔“

اس آیت کے الفاظ نبوت اور رسالت کے درمیان ربط و تعلق کو بھی واضح کر رہے ہیں۔ نبوت اور رسالت کے تعلق یا فرق کو کسی شخص کے کسی محکمے کے لیے منتخب ہونے اور پھر اس محکمے کے اندر کسی مخصوص منصب پر اس کے ”تقرر“ کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ مثلاً جو لوگ مقابلے کے امتحان میں کامیاب قرار پاتے ہیں وہ سی ایس پی کیڈر (cadre) کے لیے منتخب ہو جاتے ہیں' لیکن محض اس کیڈر میں منتخب ہو جانے سے ان میں سے کسی کو نہ تو کوئی اختیار ملتا ہے اور نہ ہی کسی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تاہم جب ان میں سے کسی کا کسی منصب یا عہدے پر تقرر کر دیا جاتا ہے' مثلاً کسی جگہ ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے تعینات کر دیا جاتا ہے' تو اس منصب کے اختیارات بھی اسے حاصل ہو جاتے ہیں اور اس سے متعلقہ ذمہ داریاں بھی اس کے کندھوں پر آ جاتی ہیں۔ اس مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ نبوت ایک ”کیڈر“ ہے' جبکہ رسالت ایک خصوصی ”تقرر“۔ یعنی نسلِ انسانی میں سے جو لوگ نبوت کے لیے منتخب ہوئے وہ سب انبیاء قرار پائے' لیکن جب ان میں سے کسی نبی کو کسی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا تو انہیں رسالت مل گئی اور اس ”تقرر“ کے بعد وہ رسول بن گئے۔

اسی اصول کے تحت حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ آپؐ کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے ساتھ ہوا' جبکہ آپؐ کی رسالت کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ کو باقاعدہ تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پہلی وحی ان آیات پر مشتمل تھی: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾﴾ (العلق) ”پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اُس نے پیدا کیا انسان کو اس جونک کی طرح کی چیز سے جو رحمِ مادر میں چمٹ گئی تھی۔ پڑھیے اور آپؐ کا رب بہت کریم ہے۔ وہ ذات جس نے (علم) سکھایا قلم کے ذریعے۔ اُس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

ان پانچ آیات کے اندر نہ تو آپؐ کو تبلیغ کا کوئی حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی اور ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس لیے بجا طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وحی کے ذریعے صرف آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا' جبکہ آپؐ کی رسالت کا آغاز اس وحی سے ہوا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾﴾ (المدثر) ”اے چادر میں لپٹنے والے! اٹھئے اور خبردار کیجیے' اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے“۔ ان آیات میں گویا آپؐ کو لوگوں تک پیغام پہنچانے کا واضح حکم دے کر باقاعدہ ”رسالت“ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ چنانچہ زیر مطالعہ آیت میں حضور ﷺ کو ”نبی“ کی حیثیت سے مخاطب کر کے منصبِ رسالت عطا کرنے کے ذکر (یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ) سے جہاں نبوت اور رسالت کا فرق واضح ہو جاتا ہے وہاں اس نکتے کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ پہلے آپؐ کو نبوت عطا ہوئی اور بعد میں رسالت۔

اس آیت میں رسالت کے حوالے سے حضور ﷺ کی جن تین ذمہ داریوں (شہادت علی النّاس' تبشیر اور

انذار) کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وضاحت قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں بھی ملتی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں آپؐ کی ''شہادت'' کی ذمہ داری کے حوالے سے یوں فرمایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی یہ مضمون ان ہی الفاظ میں آیا ہے' البتہ الفاظ کی ترتیب ذرا مختلف ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تا کہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ اسی طرح تبشیر اور انذار کے حوالے سے بھی قرآن میں بہت سی آیات آئی ہیں' صیغہ واحد میں بھی اور جمع کے صیغہ میں بھی۔

آیت ۴۶ ﴿وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾﴾ ''اور اللہ کی طرف بلانے والا اُس کے حکم سے اور ایک روشن چراغ بنا کر۔''

یہاں پر بِـاِذْنِـهٖ کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے کے لیے ''مامور من اللہ'' ہو کر آتا ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کا جو بندہ بھی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے وہ داعی الی اللہ ہے' لیکن ایک عام داعی اور ایک رسول کی دعوت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق اس مثال سے سمجھئے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ یہ گویا اصولِ شہریت ہے اور عام طور پر گلی محلے میں ایک دوسرے کو اس کی تلقین بھی کی جاتی ہے' اجتماعی طور پر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ماحول صاف رہے اور آلودگی نہ پھیلے' اور اس کوشش کے اثرات معاشرے کے اندر کسی نہ کسی حد تک نظر بھی آتے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا مقابلہ یا موازنہ اس محکمے کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا جسے حکومت کی طرف سے خصوصی اختیارات کے ساتھ حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری سونپی گئی ہو' اس محکمے کے چھوٹے بڑے کارندے اسی کام پر مامور ہوں اور اسی کام کی تنخواہ لیتے ہوں۔ اسی طرح سے ملک کے دفاع کی مثال لی جا سکتی ہے۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق خود کو دفاعِ وطن کے لیے تیار رکھے' لیکن اس فرض کی ادائیگی کے لیے جب باقاعدہ ایک فوج تیار کی جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے زیر مطالعہ آیت میں بِـاِذْنِـهٖ کے لفظ سے رسالت کے فرضِ منصبی کی اہمیت کو خصوصی طور پر اجاگر کیا گیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) آپ کوئی عام داعی نہیں ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کام کے لیے خصوصی طور پر مامور کر کے بھیجا ہے۔

مسلمان خواتین کے لیے پردے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ (الاحزاب)

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ''اے نبی (ﷺ)! اپنی بیویوں' اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان خواتین سے کہہ دیں کہ''

﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ﴾ ''وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں۔''

اس حکم کے متوازی یہاں سورۃ النور کی آیت ۳۱ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۪﴾ ''اور وہ ڈالے رکھیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر''۔ سورۃ النور کے مطالعے کے دوران اس آیت کے حوالے سے یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ اسلام سے قبل بھی عرب خواتین کے ہاں اوڑھنی اور چادر کے استعمال کا رواج تھا۔ اس حوالے سے ان کے ہاں ''اوڑھنی'' تو گویا لباس کا مستقل جزو تھی جسے خواتین گھر کے اندر بھی اوڑھے رکھتی تھیں (جیسے کہ ہمارے ہاں بھی اکثر عورتیں دوپٹہ یا اوڑھنی ہر وقت اوڑھے رکھتی ہیں) جبکہ خاندانی شریف خواتین گھر سے باہر نکلتے ہوئے ایک بڑی سی چادر اوڑھ لیتی تھیں۔ جتنے اونچے خاندان سے کسی خاتون کا تعلق ہوتا اسی قدر زیادہ احتیاط سے وہ چادر اوڑھنے کا اہتمام کرتی تھی۔ البتہ عرب خواتین کے ہاں قبل از اسلام چہرہ ڈھانپنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت خواتین کے چادر اوڑھنے کے مروجہ طریقہ پر یہ اضافہ کیا گیا کہ خواتین گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے چہروں پر بھی ڈال لیا کریں' یعنی گھونگھٹ لٹکا لیا کریں۔ اسی حکم کی بنا پر مسلمان خواتین کے ہاں نقاب کرنے کا تصور پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ آج بھی ہمارے دیہات میں خواتین گھر سے باہر چادر سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر پختون کلچر میں زیادہ تر خواتین نقاب کا اہتمام کرتی ہیں یا بڑی سی چادر اس طرح لپیٹ لیتی ہیں کہ بس ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔ ایران کے دیہاتی ماحول میں بھی اس کا رواج دیکھا گیا ہے' البتہ ایرانی شہروں میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ وہاں اصولی طور پر گویا طے کر لیا گیا ہے کہ پردے کے حکم میں چہرہ شامل نہیں ہے' حالانکہ یہ بات قرآن کی رو سے غلط ہے۔

چہرے کے پردے کے حوالے سے اس سورت (الاحزاب) کی آیت ۵۳ میں ﴿فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ﴾ کے الفاظ خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں کہ پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی پابندی کا آخر مقصد کیا ہے۔ کیا خدانخواستہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن گھر کے اندر اوڑھنی کے بغیر ہوا کرتی تھیں؟ اور اگر ایسا نہیں تھا تو پھر غیر محرم مَردوں کو اس قدر اہتمام کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کرنے کا حکم آخر کیوں دیا گیا ہے؟ بہرحال بلاتعصب غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس حکم کے ذریعے دراصل چہرے کے پردے کا اہتمام کیا گیا ہے تا کہ کسی غیر محرم مرد کی نظر ان کے چہرے پر نہ پڑے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت آیت زیر مطالعہ میں فرمایا گیا کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر اُن کا ایک حصہ یا ان کا پلّو اپنے چہروں پر ڈال لیا کریں' جسے عرفِ عام میں گھونگھٹ لٹکانا کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ''جَلَابِیْب'' کا لفظ آیا ہے جو ''جِلباب'' کی جمع ہے اور جِلباب کے معنی بڑی چادر کے ہیں۔ اس کے مقابل سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں لفظ خُمُر استعمال ہوا ہے' جس کا واحد خِمار ہے اور اس سے چھوٹی اوڑھنی مراد ہے' جسے خواتین

عموماً گھر کے اندر ہر وقت اوڑھے رکھتی ہیں۔ ''جلباب'' کی تشریح اہل لغت نے یوں کی ہے: ''ھو الرداء فوق الخمار'' یعنی جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوڑھنی کے اوپر لی جاتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ﴾ ''یہ اس سے نزدیک تر ہے کہ وہ پہچان لی جائیں تو انہیں کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔''

تاکہ دیکھنے والے خود بخود پہچان لیں کہ چادر میں لپٹی کوئی خاندانی شریف خاتون جا رہی ہے۔ عرب کے اس ماحول میں لونڈیاں چونکہ بغیر چادر کے کھلے عام پھرتی تھیں' اس لیے اہل ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوں' بلکہ اپنے چہروں پر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق یا منافق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۹﴾ ''اور اللہ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

امانتِ خداوندی کا خاص امین — بندۂ خاکی نہاد

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (الاحزاب)

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ﴾ ''ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر''

﴿فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ ''تو ان سب نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے''

﴿وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝۷۲﴾ ''اور انسان نے اسے اٹھالیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا نادان تھا۔''

یعنی انسان نے ایک بھاری ذمہ داری قبول کر کے دراصل اپنے اوپر ظلم کیا اور بڑی نادانی کا ثبوت دیا۔ مذکورہ امانت کے بارے میں بہت سی آراء ہیں اور ہر رائے کے بارے میں مفسرین نے اپنے اپنے دلائل بھی دیے ہیں۔ یہاں ان تمام آراء کا ذکر کرنا اور ایک ایک کے بارے میں دلائل کا جائزہ لینا تو ممکن نہیں' البتہ اس حوالے سے میں اپنی رائے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کے بارے میں میرا دل پوری طرح مطمئن ہے۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کی امانت سے مراد یہاں وہ ''روح'' ہے جو انسان کے حیوانی وجود میں اللہ تعالیٰ نے بطور خاص پھونک رکھی ہے۔ انسان کا مادی وجود تو عالمِ خلق کی چیز ہے' جبکہ ''روح'' کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ (عالمِ خلق اور عالمِ امر کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ الاعراف' تشریح آیت ۵۴)۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر کی اس ''امانت'' کو عالمِ خلق کے مادی اور حیوانی وجود کے اندر رکھتے ہوئے اسے خاص اپنی طرف منسوب

فرمایا ہے: ﴿وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِيۡ﴾ (الحجر:۲۹ اور ص: ۷۲)۔ چنانچہ اسی روح کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک ٹھہرا' اسی کے باعث اسے خلافت کا اعزاز ملا اور اسی کی وجہ سے انسان کا سینہ "مہبطِ وحی" بنا۔

وحی کا تعلق چونکہ عالمِ امر سے ہے اور وحی کا حامل فرشتہ بھی عالمِ امر کی مخلوق ہے' اس لحاظ سے انسان اپنے مادی وجود کے ساتھ فرشتے کے ذریعے وحی کو وصول کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا یہ روح ہی ہے جس نے اسے نزولِ وحی کے تجربے کو برداشت کرنے کے قابل بنایا۔ جنات کے اندر چونکہ یہ روح نہیں ہے اس لیے وہ وحی کے حصول (reception) کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جنات کے ہاں کوئی نبی نہیں آیا اور ان کے لیے نبوت کے حوالے سے انسانوں (انبیاء) کی پیروی لازم قرار پائی۔

اس نکتے کو مزید اس طرح سمجھئے کہ یہاں "ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا" کے الفاظ میں انسان کے حیوانی وجود کی اس کمزوری کا ذکر ہوا ہے جو اس کے اندر روح پھونکے جانے سے پہلے پائی جاتی تھی۔ اسی کمزوری کو سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ میں ﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ﴾ اور سورۃ النساء میں ﴿وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا ﴿۲۸﴾﴾ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ کمزوری بہرحال "نفخِ روح" سے پہلے کے انسان میں تھی' لیکن روحِ ربانی کی امانت ودیعت ہو جانے کے بعد اس کا رتبہ اس قدر بلند ہوا کہ وہ مسجودِ ملائک بن گیا۔ انسانی تخلیق کے ان دونوں مراحل کا ذکر سورۃ التین میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ ﴿۵﴾﴾ "یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو بہترین شکل و صورت میں۔ پھر ہم نے اس کو لوٹا دیا نچلوں میں سب سے نیچے"۔ یعنی جب ارواح کی صورت میں انسانوں کو پیدا کیا گیا تو وہ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ کے مرتبے کی مخلوق تھی' مگر جب اسے دنیا میں بھیجا گیا تو یہ اپنے جسدِ حیوانی کی کمزوریوں کے سبب جنات سے بھی نیچے چلا گیا۔

بہرحال میرے نزدیک یہاں جس امانت کا ذکر ہوا ہے وہ انسان کی روح ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جسدِ خاکی میں رکھی گئی ہے' اور یہی وہ امانت ہے جس کی بنا پر اس کا احتساب ہوگا۔ جس انسان نے اس امانت کا حق ادا کیا وہ آخرت میں: ﴿فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ ﴿۸۹﴾﴾ (الواقعہ) سے نوازا جائے گا۔ یعنی اس کے لیے راحت اور خوشبو اور نعمتوں کے باغ کی ضیافت ہوگی۔ اس کے برعکس جو کوئی حیوانی خواہشات و داعیات کا اتباع کرتا رہا اور یوں اس امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا وہ گویا حیوان ہی بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ایسے بدقسمت انسان کو وہاں ﴿فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۹۳﴾ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ﴿۹۴﴾﴾ (الواقعہ) جیسے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یعنی آخرت میں کھولتے پانی کی مہمانی اور جہنم کے عذاب کی زندگی اس کی منتظر ہوگی۔ (اعاذنا اللّٰہ من ذالک!)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے

قَالَ يٰۤاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ﴿۷۵﴾ (ص)

”اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اُس کو سجدہ کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ کیا تو نے تکبر کیا یا تو عالی مرتبہ لوگوں میں سے ہے؟“

اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کا اپنے دونوں ہاتھوں سے نسبت دینا بہت اہم اور قابل غور ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعارے کے طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ جیسے سورۂ یٰسٓ کی آیت ۷۱ میں فرمایا گیا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں (اَیۡدِیۡنَا) سے ان کے لیے چوپائے بنائے ہیں، لیکن آیت زیر مطالعہ میں ”دونوں ہاتھوں“ کا ذکر خصوصی اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس سے دو عالم یعنی عالَمِ خلق اور عالَمِ امر مراد ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے آدم یعنی انسان میں جمع کر دیا ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ﴾ یعنی خلق اور امر کے دونوں عالم اُسی کے ہیں، ان دونوں پر اسی کا تسلط اور اسی کی حکومت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی کچھ مخلوق تو ایسی ہے جس کا تعلق صرف عالَمِ امر سے ہے۔ مثلاً فرشتے جو حیوانی جسم یا حیوانی خواہشات نہیں رکھتے اور نر یا مادہ کی تفریق سے بھی منزّہ ومبرا ہیں۔ دوسری طرف جنّات اور تمام ارضی حیوانات ہیں جو عالَمِ خلق کی مخلوق ہیں، ان میں ”روح“ نہیں پائی جاتی۔ اس لحاظ سے انسان گویا اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جس کا تعلق ان دونوں عالم سے ہے۔ اس کا حیوانی جسم مٹی سے بنا ہے، اس لحاظ سے یہ ”عالَمِ خلق“ کی مخلوق ہے، جبکہ اس کے جسم میں پھونکی گئی روح ”عالَمِ امر“ کی امانت ہے۔ جیسا کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾﴾ ”یقیناً ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر تو انہوں نے انکار کر دیا اس کو اٹھانے سے اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اسے اٹھالیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے۔“

چنانچہ تخلیقِ آدم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں کا ذکر گویا استعارہ ہے اس کی تخلیق میں عالَمِ خلق اور عالَمِ امر کو جمع کرنے کا۔ اس کے علاوہ بعض اہلِ علم نے انسان کو دونوں ہاتھوں سے بنائے جانے کا یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خصوصی اہتمام سے بنایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس لحاظ سے یہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کا نقطۂ عروج (climax) ہے۔

خبردار! اللہ تعالیٰ کو جزوی یا مشترکہ اطاعت قبول نہیں!

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ (الزمر)

”(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ کہہ دیجیے مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اللہ کی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔“

یہ مضمون اس سورت (سورۃ الزمر) کا عمود ہے اور اس میں بار بار آیا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس حوالے سے بنیادی طور پر یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ ہر چیز کی

طرح عبادت کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت کا ظاہر اس کی رسومات ہیں۔ ''رسم'' کسی شے کی ظاہری شکل کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً لکھائی میں جو حروف اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی ظاہری اشکال کو''رسم'' (رسم الخط) کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کا موجودہ رسم الخط ''رسمِ عثمانی'' کہلاتا ہے۔ چنانچہ نماز میں کھڑے ہونا' اللہ کی حمد و تسبیح کرنا' رکوع و سجدہ کرنا مراسمِ عبادت ہیں۔ اسی طرح بعض مذاہب میں اپنے معبود کے سامنے مؤدب کھڑے ہونا' سلیوٹ کرنا اور ہاتھ جوڑنا وغیرہ ان کی عبادت کے مراسم ہیں۔ تو مراسمِ عبودیت کی حیثیت عبادت کے ظاہر کی ہے جبکہ عبادت کی اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

جہاں تک عبادت کی ''اصل حقیقت'' کا تعلق ہے تو یہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک اس کا جسد ہے اور ایک اس کی روح۔ اصل عبادت کا جسد ''اطاعت'' ہے' لیکن عبادت کے حوالے سے اطاعت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ''عبادت'' کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ عبادت کا لفظ ''عبد'' سے مشتق ہے اور عبد کے معنی غلام کے ہیں۔ عبد یا غلام اپنے آقا کی ہمہ تن اور ہمہ وقت اطاعت (غلامی) کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں یہ لفظ دو مرتبہ غلامی اور کُلّی اطاعت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں فرعون کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ کہ ان کی قوم تو ہماری غلام ہے۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمے کا حوالہ بھی آیا ہے جس میں آپؑ نے فرعون کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور یہ احسان جو تو مجھے جتلا رہا ہے (کیا یہ اس کا بدلہ ہے) کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟'' اب ظاہر ہے بنی اسرائیل فرعون یا قبطیوں کی پرستش یا پوجا تو نہیں کرتے تھے' وہ نہ تو ان کی نماز پڑھتے تھے اور نہ ہی انہیں سجدہ کرتے تھے۔ البتہ وہ ان کے غلام تھے اور اس حیثیت میں ان کی ''اطاعت'' کے پابند تھے۔ لہٰذا متذکرہ بالا دونوں آیات میں عبد کا لفظ کلی اطاعت یا غلامی کے مفہوم میں ہی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ کُلّی اطاعت یا غلامی عبادت کا جسد ہے جبکہ اس کی روح ''محبت'' ہے۔ یعنی اگر کسی کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی اطاعت کی جائے تو وہ اس کی عبادت ہوگی' جبکہ جبری اطاعت عبادت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر میں ہم لوگ انگریز کی اطاعت کرتے تھے' لیکن ہماری اس اطاعت کو عبادت نہیں کہا جا سکتا' اس لیے کہ یہ جبری اطاعت تھی۔

امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَیْنِ : غَایَةَ الْحُبِّ مع غایة الذُّلِّ والخُضوع یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: اس کے ساتھ غایت درجے کی محبت اور اس کے سامنے غایت درجے کا تذلّل اور عاجزی کا اظہار۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان حد درجے کی محبت کے ساتھ خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھا دے اور کُلّی طور پر اس کا مطیع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی کُلّی اطاعت کرنا اصل عبادت ہے' جبکہ مراسمِ عبادت کی حیثیت عبادت کے ''ظاہر'' کی ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ اللہ کی اطاعت سے آزاد کسی دوسرے کی مستقل بالذات اطاعت تو شرک ہے ہی، لیکن اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو بھی شریک کر لیا تو ایسی جزوی یا مشترکہ اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں۔ ایسی اطاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعلقہ انسان کے منہ پر دے ماری جائے گی۔ اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ کا یہ حکم بہت واضح ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ ''اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!'' یعنی اللہ تعالیٰ کو کلی اطاعت مطلوب ہے۔ کسی کی پچیس فی صد، پچاس فی صد یا پچھتر فی صد یعنی جزوی اطاعت اسے قبول نہیں۔

وقوعِ قیامت اور عدالتِ الٰہی کے منظر کی ایک جھلک

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (الزمر)

آیت ۶۸ ﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور صور میں پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جو کوئی بھی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں، سوائے ان کے جنہیں اللہ چاہے گا۔''

یہ منظر بہت دہشت ناک ہوگا۔ اس آیت سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فرشتوں کے علاوہ باقی تمام فرشتے بھی صور کی اس آواز سے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ یہ دراصل تین نفخے ہوں گے۔ پہلا نفخہ وہ ہوگا جسے قرآن میں ''السَّاعة'' بھی کہا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں شدید زلزلے، ہلچل اور طوفان کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ سورج اور چاند آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ پھر دوسرا نفخہ ہوگا جس کے نتیجے میں تمام جانداروں پر موت طاری ہو جائے گی۔ اس آیت میں اسی دوسرے نفخہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تیسرا نفخہ ہوگا جس کی کیفیت یوں ہوگی:

﴿ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ ۝﴾ ''پھر اس (صور) میں دوبارہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے۔''

اس تیسرے نفخے کے نتیجے میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ یہ گویا بعث بعد الموت کا نفخہ ہوگا اور اسی کا نام قیامت (کھڑے ہونا) ہے۔

آیت ۶۹ ﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾ ''اور زمین جگمگا اُٹھے گی اپنے رب کے نور سے''

اس وقت کی ایک کیفیت کو سورۃ الفرقان میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ

وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ ''اور جس دن آسمان پھٹ جائے گا بادلوں کی مانند اور فرشتے نازل کیے جائیں گے لگاتار''۔ پھر اللہ تعالیٰ زمین پر نزول فرمائیں گے اور فرشتے صفیں باندھے نیچے اتریں گے' جیسا کہ سورۃ الفجر کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾﴾

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ﴾ ''اور اعمال نامہ لاکر رکھ دیا جائے گا''

لوگوں کے اعمال نامے کا سرِمحشر لا کر رکھے جانے کی صورتِ حال کا نقشہ سورۃ الکہف کی آیت ۴۹ میں یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ﴾ ''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ' چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ وہ لرزاں وترساں ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ اس نے نہ تو کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو' مگر اس کو محفوظ کر کے رکھا ہے''—— اب ملاحظہ ہو اس کے بعد کی کیفیت کا نقشہ:

﴿وَجِاْیْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾ ''اور لائے جائیں گے انبیاء اور شہید''

یہاں ''شہید'' سے مراد اوّلاً تو رسول ہیں کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں پر سب سے پہلے گواہی دیں گے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں حضور ﷺ کی اپنی امت پر گواہی کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ ''تا کہ پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ لیکن یہاں آیت زیر مطالعہ کے اس جملہ میں انبیاء کے ذکر کے بعد شہید کا لفظ خصوصی طور پر اس لیے لایا گیا ہے کہ وہاں ان لوگوں کو بھی گواہ کے طور پر بلایا جائے گا جو انبیاء ورسل علیہم السلام کی طرف سے تبلیغ کرتے رہے ہوں گے۔ جیسے عشرہ مبشرہ میں سے چھ چوٹی کے صحابہ وہ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ کے نتیجے میں ایمان لائے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بہت سے علاقوں اور قبیلوں کی خواہش پر اپنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن اور دین کی تعلیم کے لیے بھیجا۔ ایسے مبلّغ اور معلّم صحابہؓ زیادہ تر اصحاب صُفّہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ ان صحابہؓ نے حضور ﷺ کی طرف سے جن لوگوں کو دعوت دی تھی' قیامت کے دن ان پر وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرے نبی ﷺ نے تیرے دین کا جو پیغام ہم تک پہنچایا تھا ہم نے وہ ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔

پھر حضور ﷺ کے بعد دین کی دعوت وتبلیغ کی یہ ذمہ داری آپ کی امت کی طرف منتقل ہو گئی اور اس لحاظ سے آج ہم سب اس ذمہ داری کے مکلف ہیں۔ چنانچہ ہمیں وہاں بطور گواہ بلایا جائے گا کہ محمدٌ رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے اللہ کا جو دین تم تک وراثتاً پہنچا تھا' کیا تم لوگوں نے اسے آگے نوعِ انسانی تک پہنچا دیا تھا؟ اگر خدانخواستہ ہم یہ گواہی دینے میں ناکام رہے تو ان تمام لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا وبال بھی ہماری گردن پر آئے گا جو ہمارے حلقہ اثر اور دائرہ اختیار میں تھے اور ہم انہیں دعوت نہیں دے سکے تھے۔ لیکن اگر ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق یہ حق ادا کر دیا ہوگا تو ہم اس گواہی سے سرخرو ہوں گے اور وہ لوگ اپنے اعمال کے لیے

اللہ تعالیٰ کے ہاں خود جوابدہ ہوں گے۔ بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کا منظر دکھایا گیا ہے جو سرِ محشر سجائی جائے گی۔ تمام بنی نوعِ انسان کا اعمال نامہ بھی لا کر اس عدالت کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر انبیاء و رُسل علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کو بھی لایا جائے گا۔

﴿وَقُضِیَ بَیۡنَھُمۡ بِالۡحَقِّ وَھُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾﴾ ''اور ان کے مابین فیصلہ کر دیا جائے گا حق کے ساتھ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

آیت ۷۰ ﴿وَوُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَھُوَ اَعۡلَمُ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۰﴾﴾ ''اور پورا پورا دے دیا جائے گا ہر جان کو جو کچھ کہ اس نے عمل کیا ہوگا' اور اللہ خوب جانتا ہے جو عمل یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

اس موضوع سے متعلق قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر جو اشارے ملتے ہیں ان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میدانِ حشر اسی زمین لگایا جائے گا۔ اس کے لیے زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا' جیسا کہ سورۃ الانشقاق کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ﴿۳﴾﴾۔ پھر اسے بالکل ہموار اور چٹیل میدان کی شکل دے دی جائے گی' اس طرح کہ: ﴿لَا تَرٰی فِیۡھَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا ﴿۱۰۷﴾﴾ (طٰہٰ) ''تم نہیں دیکھو گے اس میں کوئی ٹیڑھ اور نہ کوئی ٹیلا''۔ پھر یہیں پر اللہ تعالیٰ کا نزول ہوگا اور یہیں پر فرشتے اتریں گے: ﴿وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾﴾ (الفجر) اور یہیں پر حساب کتاب ہوگا۔ گویا قصۂ زمین برسرِ زمین چکایا جائے گا۔

انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا بیان

﴿قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَاَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَھَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿﴾﴾ (المؤمن)

''وہ فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! تُو نے ہمیں دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا' تو اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی راہ ہے؟''

یعنی اگر ہم اس سے پہلے اتنے مراحل سے گزر آئے ہیں تو اب اس مرحلے سے بھی گزرنے کا کوئی طریقہ تو ہوگا۔ اے پروردگار! ایک دفعہ ہمیں اس عذاب سے جان چھڑانے کا موقع بھی فراہم کر دے۔

تخلیقِ انسانی اور حیاتِ انسانی کی حقیقت کے موضوع پر یہ آیت پورے قرآن حکیم میں ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں متعدد بار آ چکا ہے' البتہ اس قدر واضح انداز میں اور کہیں نہیں آیا۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا' حالانکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمہیں زندہ کیا' پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر زندہ کرے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔ اگرچہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بھی دو احیاء اور دو اموات کا ذکر ہے مگر مختلف مفسرین نے ان الفاظ کی تاویل مختلف انداز میں کی ہے' البتہ آیت زیرِ مطالعہ اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے کسی تعبیر اور تاویل کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ اس آیت کے حوالے سے یہاں حیاتِ انسانی کے مختلف ادوار کو اچھی طرح سے سمجھ لیجیے۔

ہر انسان کی پہلی تخلیق اُس وقت عمل میں آئی جب عالمِ ارواح میں اس کی روح پیدا کی گئی۔ عالمِ ارواح میں ہر انسان کی یہ زندگی پورے شعور کے ساتھ تھی۔ اسی لیے تو وہاں تمام ارواح سے وہ عہد لیا گیا تھا جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ کے الفاظ میں آیا ہے۔ اس عہد کے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی رُوح سے لے کر دنیا کے آخری انسان کی روح تک تمام ارواح حاضر و موجود تھیں۔ عالمِ ارواح میں ارواح کے اس عظیم الشان اجتماع کی کیفیت ایک حدیث میں ''جُنُوْدٌ مُجَنَّدَۃٌ'' (لشکروں کے لشکر) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ عہد لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ ہر انسان کی پہلی موت (اماتۂ اولیٰ) تھی جو عالمِ ارواح میں اس پر وارد ہوئی۔ اس طرح تمام ارواح کو گویا ایک کولڈ سٹوریج میں محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ جو ارواح ابھی تک دنیا میں نہیں آئیں وہ ابھی تک وہاں اسی کیفیت میں ہیں۔

پھر جب عالمِ خلق (ماں کے پیٹ) میں کسی انسان کے جسم کا لوتھڑا تیار ہو جاتا ہے تو اس کی روح کو عالمِ ارواح سے اس لوتھڑے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس جسم میں منتقل ہونے کے بعد جب روح ''آنکھ'' کھولتی ہے تو یہ اس روح کا ''احیائے اوّل'' ہے۔ اس کے بعد وہ انسان ماں کے پیٹ سے دنیا میں وارد ہوتا ہے۔ ایک معین عرصے تک دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد مر جاتا ہے۔ چنانچہ دُنیوی زندگی کی یہ موت اس انسان یا روح کی دوسری موت (اماتۂ ثانیہ) ہے۔ اس موت کے بعد وہ روح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے' جبکہ جسم اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے یعنی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پوری نوعِ انسانی کی ارواح اپنی اپنی باری پر زندہ ہو کر دنیا میں آتی جائیں گی اور یہاں اپنے اپنے جسم کے ساتھ زندگی گزار کر ''دوسری موت'' کے بعد عالمِ برزخ کو سدھارتی جائیں گی۔

اس کے بعد جب قیامت برپا ہو گی تو ہر انسان کی روح کو ایک دفعہ پھر اس کے دنیوی جسم سے ملا کر زندہ کر دیا جائے گا۔ یہ تمام انسانوں کا ''احیائے ثانی'' ہو گا۔ چنانچہ جب میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی تو مجرم لوگ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا۔ عالم ارواح سے دنیا کی زندگی تک اور دنیا کی موت کے بعد قیامت کے اس دن تک کئی ادوار ہم پر گزر چکے' تو اے ہمارے پروردگار! اب ایک دور اور سہی۔ ایک مرتبہ پھر ہم پر کرم فرمایا جائے اور ہمیں ایک موقع اور دے دیا جائے۔ یعنی وہ لوگ اپنی سابقہ زندگی کے مختلف ادوار کو دلیل بنا کر ایک اور دور کی رعایت حاصل کرنے کی درخواست کریں گے۔

ایمان پر استقامت کی اہمیت وفضیلت

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝٣١ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝٣٢
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝٣٣

(حٰمٓ السجدة)

آیت ۳۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ’’بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے‘‘

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا تو آسان ہے مگر اس پر جمے رہنا آسان نہیں ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کو اللہ تعالیٰ پر پوری طرح توکّل ہو‘ وہ ہر حالت میں اس کی رضا پر راضی رہے۔ نہ اپنی کسی حالت کے بارے میں اس کی زبان پر حرفِ شکایت آئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے پر اس کے دل میں ملال پیدا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے اس کا سرِ تسلیم بلا حیل و حجت جھکتا چلا جائے اور وہ اپنے تن من دھن کو ہتھیلی پر رکھے‘ اس کے درِ اطاعت پر ہمہ وقت کمر بستہ کھڑے رہ کر عملی طور پر ثابت کردے کہ: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٦٢﴾ (الانعام) ’’یقیناً میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے‘‘۔ اس استقامت کی اہمیت ایک حدیث سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: ’’یارسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی کوئی بات بتا دیں کہ اس کے بعد کسی اور سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔‘‘ (یعنی مجھے اسلام کی حقیقت ایک جملے میں بتا دیجیے تاکہ میں اسے گرہ میں باندھ لوں۔) جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ’’کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ!‘‘ (مسند احمد) اگر واقعی کوئی شخص غور کرے تو اس استقامت میں اسے قیامت مضمر دکھائی دے گی۔ (واضح رہے کہ استقامت اور قیامت کا سہ حرفی مادہ ایک ہی ہے۔) یہ قیامت ہی تو ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کو نظریاتی طور پر اپنا رب مان لینے کے بعد عملی طور پر ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے اور پھر اپنے ایک ایک عمل سے ثابت کردے کہ میرا پروردگار‘ میرا حاجت روا‘ میرا سہارا‘ میرا مشکل کشا‘ میرے نفع ونقصان کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے۔ دل کا یہ یقین اور عمل کا یہ رنگ گویا چوٹی ہے اس ایمان اور عمل صالح کی جس کا ذکر سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کی پہلی دو شرائط کے طور پر اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

اب ان خوش قسمت لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام ملاحظہ کیجیے جو اپنی دُنیوی زندگی میں ایمان وعمل کی اس چوٹی یعنی استقامت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں:

﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝٣٠﴾

’’ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے کہ آپ لوگ ڈرو نہیں اور غمگین نہ ہو اور خوشیاں مناؤ اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔‘‘

فرشتوں کا نزول ان لوگوں پر کب ہوتا ہے؟ اس حوالے سے یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ موت کے قریب ایسے لوگوں کو خوش آمدید کہنے اور بشارت دینے کے لیے فرشتے نازل ہوتے ہیں‘ لیکن دُنیوی زندگی کے دوران بھی اہل ایمان کی مدد کے لیے فرشتوں کا آنا ثابت ہے۔ جیسے میدانِ بدر میں اہلِ ایمان مجاہدین کی مدد کے لیے فرشتے نازل ہوئے: ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ﴾ (الانفال: ۱۲) ”(یاد کریں) جب آپؐ کا ربّ وحی کر رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں‘ تو تم (جاؤ اور) اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو“۔ چنانچہ مؤمنین صادقین پر ملائکہ کا نزول اثنائے حیات میں بھی ہوتا ہے۔

آیت ۳۱ ﴿نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ”ہم ہیں تمہارے رفیق دُنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔“

ان الفاظ سے یہ مفہوم خود بخود واضح ہو رہا ہے کہ فرشتے حیاتِ دُنیوی کے دوران بھی ان خوش قسمت لوگوں کی ہمت بندھاتے ہیں اور انہیں یہ پیغامِ جانفزا پہنچاتے ہیں۔

﴿وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾ ”اور تمہارے لیے اس (جنت) میں وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارے جی چاہیں گے“

تمہارے جی وہاں جو کچھ چاہیں گے وہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے‘ کیونکہ تمہارے نفسوں کے تقاضوں اور تمہاری خواہشات کو بھی ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری خواہشات کی تسکین کا مکمل سامان وہاں فراہم کریں گے۔

﴿وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ”اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جو تم مانگو گے۔“

تمہارے نفسوں کے تقاضوں کے مطابق تو سب کچھ وہاں پہلے سے ہی مہیا ہو چکا ہوگا‘ البتہ مانگنے اور طلب کرنے کے حوالے سے ہر شخص کا اپنی ذہنی سطح کے مطابق ایک معیار اور مخصوص ذوق ہوتا ہے۔ بچہ اپنی پسند کی کوئی چیز مانگے گا‘ ایک سادہ لوح دیہاتی اپنے معیار کی کوئی چیز طلب کرے گا‘ جبکہ ایک حکیم و فلسفی اپنے ذوق کے مطابق سوال کرے گا۔ غرض جو کوئی جو کچھ بھی مانگے گا وہ سب کچھ اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ﴿۳۲﴾﴾ ”یہ ابتدائی مہمان نوازی ہوگی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔“

جنت کی جن نعمتوں کا ذکر ہمیں قرآن و حدیث میں ملتا ہے ان کا تعلق دراصل اہلِ جنت کی ابتدائی مہمان نوازی (نُزُل) سے ہے۔ جہاں تک ان کی اصل ضیافت کا تعلق ہے اس کی کیفیت ہمارے احاطہ شعور میں نہیں آسکتی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ، وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ......)) (متفق علیہ) ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو

نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا گمان ہی گزرا......'' پھر آپ ﷺ نے سورۃ السجدۃ کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''پس کوئی انسان نہیں جانتا کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے' وہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا۔''

آیت ۳۳ ﴿وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ ''اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف''

جس خوش قسمت شخص کو ایمان کے بعد ''استقامت'' کا مقام حاصل ہو چکا ہو' اسے بھلا اب کس بات کی دھن ہوگی؟ کیا وہ اب بھی مال و دولتِ دنیا کے پیچھے دوڑے گا؟ یا کیا حکومت اور اقتدار کے حصول کی خواہش اب بھی اس کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچے گی؟ نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ اس ''متاعِ غرور'' کو تو وہ ٹھکرا کر بہت آگے نکل آیا ہے۔ مسندِ استقامت پر رونق افروز ہونے کے بعد اب دنیا و مافیہا کے بارے میں اس کی ترجیحات بہت واضح ہو چکی ہیں۔ اب تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں' آج ہیں تو کل نہیں ہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا اور اس کے لوازمات کی بہتات سے مسئولیت بڑھتی ہے اور حسابِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کے دل میں ایک ہی تڑپ ہے اور وہ ہے دعوت الی اللہ کی تڑپ۔ اب اس کی دوڑ دھوپ اور جدوجہد کا اگر کوئی ہدف ہے تو بس یہی کہ میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو راہِ ہدایت پر لے آؤں۔

﴿وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

اعمالِ صالحہ کا مفہوم اگرچہ ''استقامت'' کے اندر بھی پوشیدہ ہے' لیکن یہاں پر اس کا علیحدہ ذکر بھی آ گیا ہے' اس لیے کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک داعی کا اپنا عمل درست نہیں ہوگا تو نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت مؤثر نہیں رہے گی بلکہ وہ دعوت کی بدنامی کا باعث بھی بنے گا۔

قرآن حکیم کی حقانیت پر سائنس کی شہادت

سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ اَوَ لَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۵۳﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

﴿سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ ''عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی''

یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اپنی جانوں اور زمین و آسمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مبرہن انداز میں ان کے سامنے آتی چلی جائیں گی۔

﴿حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ؕ﴾ ’’یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔‘‘

اس آیت میں دراصل معلومات کے اس explosion کی طرف اشارہ ہے جو سائنسی ترقی کے باعث آج کے دور میں ممکن ہوا ہے۔ موجودہ دور سائنس کا دور ہے۔ اس دور کی تاریخ زیادہ سے زیادہ دو سو برس پرانی ہے اور سائنسی ترقی میں یہ برق رفتاری جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اسے شروع ہوئے تو ابھی نصف صدی ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ پچھلی نصف صدی سے سائنسی ترقی کے سبب مسلسل حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں اور آئے روز نت نئی ایجادات سامنے آ رہی ہیں۔ ان سائنسی معلومات کے انکشافات اور حقائق کے بے نقاب ہونے سے بتدریج قرآن حکیم کا حق ہونا ثابت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت اعجازِ قرآن کے جس پہلو نے اہل عرب کو سب سے زیادہ متاثر بلکہ مسحور کیا تھا وہ اس کی فصاحت‘ بلاغت اور ادبیت تھی۔ اس وقت قرآن حکیم نے عرب بھر کے شعراء‘ خطباء اور فصحاء کو چیلنج کیا کہ اگر تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے تو تم اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھاؤ۔ یہ چیلنج انہیں اس میدان میں دیا گیا تھا جس کے شہسوار ہونے پر انہیں خود اپنے اوپر ناز تھا اور جس میدان کے نشیب و فراز کو وہ خوب اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔

نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں چونکہ شاعری اور سخن وری و سخن فہمی کا بہت چرچا تھا اس لیے اس دور میں قرآن نے اپنے اسی ’’اعجاز‘‘ کو نمایاں کیا تھا۔ البتہ آج جبکہ سائنس کا دور ہے تو آج اعجازِ قرآن کے سائنسی پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم نے انسان کو کائنات میں بکھری ہوئی آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی ہے‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس میدان میں چودہ سو سال پہلے کے مشاہدے اور آج کے مشاہدے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے کا انسان کائنات کے عجائبات کو ننگی آنکھ سے دیکھتا تھا جبکہ آج کے انسان کو بہت بڑی بڑی ٹیلی سکوپس‘ الیکٹرانک مائیکروسکوپس اور نہ جانے کون کون سی سہولیات میسر ہیں۔ بہرحال آج خصوصی محنت اور کوشش سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ جن حقائق تک سائنس آج پہنچ پا رہی ہے قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کو چودہ صدیاں پہلے ان سے متعارف کرا دیا تھا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ابھی تک کسی مسلمان اسکالر کو قرآن حکیم اور سائنسی معلومات کا تقابلی مطالعہ (comparative study) کر کے یہ ثابت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ اب تک کے تمام سائنسی انکشافات قرآن حکیم کی فراہم کردہ معلومات کے عین مطابق ہیں۔ حال ہی میں فرانسیسی سرجن ڈاکٹر موریس بوکائی [Maurice Bucaile (1920-1998)] نے ’’بائبل‘ قرآن اور سائنس‘‘ (The Bible, The Quran and Science) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے‘ جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ اب تک جو بھی سائنسی حقائق دنیا کے سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف قرآن حکیم میں دی گئی تفصیلات کے عین مطابق ہیں بلکہ ان سب کے مطالعہ سے قرآن حکیم کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اپنی اسی تحقیق کی بدولت موصوف سرجن کو ایمان

کی دولت بھی نصیب ہوئی۔

قرآن حکیم کی بعض آیات تو اگرچہ آج بھی سائنسی حوالے سے تحقیق طلب ہیں' لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اب تک سامنے آنے والے سائنسی انکشافات کی روشنی میں قرآن حکیم کی متعلقہ آیات وعبارات کے مفاہیم ومطالب مزید نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن حکیم کے بعض الفاظ کے جو معانی پرانے زمانے میں سمجھے گئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے ہیں' اور ان کی جگہ ان الفاظ کے زیادہ واضح اور زیادہ منطقی معانی سامنے آئے ہیں۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہوں: بیان القرآن میں سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ کے لفظ عَلَقَہ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ میں لفظ فُؤاد کے تراجم۔

اسی طرح اجرامِ سماویہ کے بارے میں قرآنی الفاظ ﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ۝﴾ (یٰسٓ) کا وہ مفہوم جو آج کے انسان کو معلوم ہوا ہے وہ پرانے زمانے کے انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا' بلکہ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اجرامِ فلکی اور ان کی گردش سے متعلق مختلف زمانوں میں انسان نے مختلف موقف اختیار کیے۔ کسی زمانے میں انسان سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج حرکت میں ہے۔ پھر اسے یوں لگا جیسے سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ یہاں تک کہ آج کے انسان نے اپنی تحقیق وجستجو سے یہ ثابت کر دیا کہ سچ یہی ہے: ﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ۝﴾ کہ یہ سب ہی اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہے' حتیٰ کہ ہر ایٹم (atom) کے اندر اس کے اجزاء (الیکٹرانز' پروٹانز اور نیوٹرانز) بھی بے تابانہ مسلسل گردش میں ہیں۔ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے: ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں!

موجودہ دور میں اگرچہ مسلمانوں کو قرآن اور سائنس کے حوالے سے خصوصی اہتمام کے ساتھ تحقیق و تدقیق کرنے کی ضرورت ہے' لیکن ایسی کسی تحقیق کے دوران خواہ مخواہ تکلّف کرنے اور زبردستی کھینچ تان کر کے قرآنی الفاظ کے دوراز کار مفاہیم نکالنے کی کوشش میں نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ جہاں پر عقلی اور سائنسی طور پر بات سمجھ میں نہ آئے وہاں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ابھی بات واضح نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ (آل عمران:۷) ۔ایک وقت ضرور آئے گا کہ جو بات آج واضح نہیں ہے وہ واضح ہو جائے گی' اور خارج کی دنیا میں اس حوالے سے جو حقائق بھی منکشف ہوں گے وہ قرآن حکیم کے الفاظ کے عین مطابق ہوں گے' اِن شاء اللہ! البتہ جن سائنسی حقائق کی اب تک قرآن حکیم کے ساتھ مطابقت ثابت ہو چکی ہے انہیں عام کر کے قرآن حکیم کی حقانیت کے سائنٹفک ثبوت کے طور پر لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آیت زیر مطالعہ میں فعل مضارع (سَنُرِيْهِمْ) سے پہلے ''س'' کی وجہ سے اس لفظ کے مفہوم میں خصوصی طور پر مستقبل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مستقبل میں ہم انہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھائیں گے جن سے قرآن حکیم

کی حقانیت واضح ہو جائے گی۔ اس ''مستقبل'' کا احاطہ کرنے کی کوشش میں اگر چشمِ تصور کو جنبش دی جائے تو اس کی حدود نزولِ قرآن کے دَور کی فضاؤں سے لے کر زمانہ قیامت کی دہلیز تک وسعت پذیر نظر آئیں گی۔ آج وقت کی شاہراہ پر قافلہ علم انسانی کی برق رفتاری کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ انسانی تحقیق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ خلاء کی پہنائیوں کے راز اس کے سامنے ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں کو اس کی عمیق نظری کے سامنے اپنی کم مائیگی اور تنگ دامانی کا اعتراف ہے۔ قطب شمالی (Arctic) اور قطب جنوبی (Antarctic) سمیت زمین کا چپہ چپہ ہر پہلو سے نت نئی تحقیق کی زد میں آ چکا ہے۔ غرض سائنسی ترقی کا یہ ''جن'' کہکشاؤں کی بلندیوں سے لے کر تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک معلومات کے خزانے اکٹھے کر کے بنی نوعِ انسان کے قدموں میں ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن الحمدللہ! اس تحقیق کے ذریعے سے اب تک جو حقائق بھی سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب قرآن حکیم کی حقانیت پر گواہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے علم و تحقیق کا یہ قافلہ وقت کی شاہراہ پر اپنا سفر قیامت تک جاری رکھے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس سفر کے دوران ایجاد و دریافت کے میدان میں انسان کو جو کامیابیاں بھی نصیب ہوں گی اور انفس و آفاق کی دنیاؤں کے جو جو راز بھی منکشف ہوں گے وہ سب کے سب بالآخر قرآن حکیم کی حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے چلے جائیں گے۔

﴿اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۵۳﴾﴾ ''کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ کا ربّ ہر چیز پر گواہ ہے!''

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہے' لیکن اس نے قرآن حکیم میں صرف اسی حد تک حقائق کا ذکر کیا ہے جس حد تک انسان انہیں سمجھ سکتا ہے اور اسی انداز میں ان کا ذکر کیا ہے جس انداز میں انسانی فہم و شعور کی رسائی ان تک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ حقائق جن تک آج کے انسان کی تدریجاً رسائی ہوئی ہے اگر وہ آج سے پندرہ سو سال پہلے مِن و عَن بیان کر دیے جاتے تو اس وقت انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔

اقامتِ دین کی جدّوجُہد ——— ایک اہم دینی فریضہ

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ کَبُرَ عَلَی الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَیۡہِ ؕ اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿﴾ وَ مَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ ﴿﴾ فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ

اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۵﴾ (الشوریٰ)

آیت ۱۳ ﴿شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا﴾ ’’(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی‘‘

یہ براہِ راست اُمتِ مُسلمہ سے خطاب ہے۔ مکی سورتوں میں چونکہ عام طور پر اہلِ ایمان کو ’’یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا‘‘ کے الفاظ سے براہِ راست مخاطب نہیں کیا گیا اس لیے یہاں جمع کا یہ صیغہ (شَرَعَ لَکُمۡ) استعمال فرمایا گیا ہے۔ مکی سورتوں میں اس حوالے سے ہمیں دوسرا اسلوب یہ بھی ملتا ہے کہ صیغہ واحد میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے اہلِ ایمان کو پیغام پہنچایا جاتا ہے۔

﴿وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی﴾ ’’اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے‘ اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو‘‘

اس جملے سے ایک اہم نکتہ تو یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرات نوح‘ ابراہیم‘ موسیٰ‘ عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کا‘ یعنی تمام پیغمبروں کا دین ایک ہی ہے۔ یہی مضمون سورۃ الانبیاء میں اس طرح آیا ہے: ﴿اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۹۲﴾﴾ ’’یقیناً یہ تمہاری امت‘ ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں‘ لہٰذا تم لوگ میری ہی بندگی کرو‘‘۔ بہر حال تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کا دین ایک ہی تھا۔ ان کے درمیان اگر کوئی فرق یا اختلاف تھا تو وہ شریعتوں میں تھا۔ دوسری اہم بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ان تمام پیغمبروں کو سونپا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کو اس سلسلے میں جو حکم ملا تھا اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے کہ تم لوگ ارضِ فلسطین کو فتح کرنے کے لیے جہاد کرو۔ ظاہر ہے اس خطہ پر قبضہ کرنے کا مقصد اللہ کے دین کو وہاں بالفعل نافذ کرنا تھا۔ گویا اقامت دین کی جدوجہد ماقبل امتوں پر بھی فرض تھی۔

﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ﴾ ’’کہ قائم کرو دین کو۔‘‘

اس حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ اے مسلمانو! تمہاری طرف سے صرف عقیدۂ توحید کا زبانی اقرار کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس عقیدے کا رنگ اپنے اعمال پر بھی چڑھاؤ‘ اور نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر اپنے معاشرے کی اعلیٰ ترین (ریاستی اور حکومتی) سطح پر بھی اس کی تنفیذ و تعمیل کو یقینی بناؤ۔ واضح رہے کہ مترجمین نے بالعموم ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے: ’’کہ دین کو قائم رکھو!‘‘ یہ بھی درست ہے‘ کیونکہ اقامتِ دین کے حوالے سے کسی معاشرے میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہاں دین قائم ہے یا قائم نہیں ہے۔ چنانچہ اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ اگر دین پہلے قائم ہے تو اسے قائم رکھو اور اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرو۔ مثلاً خیمہ اگر کھڑا ہے تو اسے گرنے سے بچانا ہے اور اگر پہلے سے کھڑا نہیں ہے تو اسے کھڑا (erect) کرنا ہے۔

﴿وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ﴾ ’’اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔‘‘

یعنی تم لوگ اپنے دین کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ایک معاملے میں تو تم اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور کسی دوسرے معاملے میں کسی اور کی خوشنودی کے طالب بن جاؤ۔ اسی رویے اور طریقے کو تفرقہ کہا جاتا ہے جس سے یہاں منع کیا جا رہا ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۱۵۹ کے الفاظ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ......﴾ میں بھی ایسے ہی تفرقے کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ فروعی مسائل میں ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' یہ تفرقہ نہیں ہے۔ مثلاً میں اگر رفع یدین کرتا ہوں اور میرے کئی ساتھی امام ابوحنیفہؒ کے موقف کو زیادہ صحیح سمجھتے ہوئے رفع یدین کے بغیر نماز پڑھتے ہیں تو ایسے اختلاف میں کوئی حرج نہیں' لیکن اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ بنیادی طور پر دین میں تفریق یا تفرقے کا طرزِ عمل نہ اپنایا جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ حنفی' مالکی' شافعی' حنبلی اور سلفی سب کے سب ایک ہی دین یعنی اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اسی طرح مختلف پیغمبروں کی شریعتوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے' مثلاً اب شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے' اس سے پہلے شریعتِ موسویؑ کا دور تھا اور اس سے پہلے مختلف ادوار میں مختلف انبیاء کی شریعتیں رائج رہیں۔ لیکن یہ نکتہ بہرحال واضح رہنا چاہیے کہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کا دین ایک ہی تھا یعنی دین اسلام۔

﴿کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔''

مشرکین کی زندگی تو اسی تفریق و تقسیم پر چل رہی ہے۔ وہ تو اس نظریہ پر عمل پیرا ہیں کہ ''جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو''۔ بدقسمتی سے آج ہمارے ہاں بھی ایسی ہی تقسیم پر دنیا کے معاملات چل رہے ہیں کہ جو حکومت کا حق ہے وہ حکومت کو دو اور جو مولوی کا حق ہے وہ مولوی کو دو۔ اور فرض کریں اگر علماء بھی اس تقسیم پر راضی ہو جائیں کہ چلیں ہمارا کام تو چل ہی رہا ہے تو ایسی صورتِ حال میں دین کی تو گویا نفی ہو جائے گی' کیونکہ دین تو اللہ تعالیٰ کی کُلی اطاعت کا نام ہے۔ چنانچہ جس کسی نے بھی دین میں کسی ایسی تفریق یا تقسیم پر اپنے دل کو مطمئن کر لیا اس کا گویا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہا۔ چنانچہ مشرکین جو اللہ تعالیٰ اور بتوں کے درمیان اپنے ''دین'' کی تقسیم پر مطمئن ہیں' انہیں توحید خالص کی دعوت بری تو لگے گی۔ مشرکین کے اس بغض و عناد کا ذکر سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں اس طرح ہوا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ۙ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ○﴾ ''وہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر' خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے''۔ ظاہر ہے نظامِ توحید کے قیام اور دینِ حق کے غلبے کی صورت میں مشرکین کے دلوں میں کڑھن تو بہت ہوگی' لیکن اللہ تعالیٰ نے تو اپنے رسول ﷺ کو بھیجا ہی اسی لیے ہے کہ وہ اس کے دین کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔

﴿اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ ''اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف (آنے کے لیے) چُن لیتا ہے''

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ عطا ہے کہ کبھی کبھی وہ کسی راہ چلتے مسافر کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ صوفیاء کے ہاں اس حوالے سے ''سالک مجذوب'' اور ''مجذوب سالک'' کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ ''سالک مجذوب'' اللہ تعالیٰ کے وہ مقرب بندے ہیں جو ''سلوک'' کی کئی کٹھن منازل طے کر کے قرب وجذب کے مقام تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔ ''صِدّیقین'' عام طور پر محنت وریاضت کے اسی راستے سے مقامِ قرب تک پہنچتے ہیں۔ ان کے برعکس ''مجذوب سالک'' وہ خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر بلاتمہید اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ایسے لوگ ''مقامِ قرب'' پر فائز ہو جانے کے بعد منازلِ سلوک طے کرتے ہیں اور یہ مقام ومرتبہ اکثر وبیشتر ''شہداء'' کے حصے میں آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا' ورنہ اس ''حسین اتفاق'' سے پہلے نہ تو آپؓ کا مزاج اس ''مقامِ شوق'' سے کچھ مطابقت رکھتا تھا اور نہ ہی آپؓ کے معمولات ومشاغل میں ایسے کسی ''رجحان'' کا رنگ پایا جاتا تھا۔ (صِدّیقین اور شُہداء کے اصطلاحی مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ مریم' آیت ۴۱ کی تشریح۔)

﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳﴾ ''اور وہ اپنی طرف ہدایت اُسے دیتا ہے جو خود رجوع کرتا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ''اور انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا' آپس میں ضدم ضدا کے باعث۔''

عرب میں حضور ﷺ کی دعوتِ اقامتِ دین کے مخاطبین بنیادی طور پر دو گروہ تھے' یعنی مشرکین اور اہلِ کتاب۔ ان میں مشرکین کا تو اس دعوت کو ماننا بہت مشکل تھا اور یہ تلخ حقیقت پچھلی آیت میں واضح بھی کر دی گئی ہے کہ آپؐ کی یہ دعوت مشرکین پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ البتہ اہل کتاب کا اس دعوت پر ایمان لے آنا نسبتاً زیادہ قرینِ قیاس تھا' کیونکہ وہ تورات وانجیل جیسی الہامی کتابوں سے واقف تھے اور وحی' ملائکہ اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن زیر مطالعہ آیت میں حضور ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپؐ اہلِ کتاب سے بھی مثبت ردّعمل کی توقع نہ رکھیں۔ کیونکہ ان دونوں گروہوں کی طرف سے اب تک کی مخالفت کسی لاعلمی کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کا اصل پیغام تو ان تک پہنچ چکا ہے' بات پوری طرح واضح ہو کر ان کے دلوں میں بھی اُتر چکی ہے۔ اس صورت حال میں ان کا انکار اور ان کی مخالفت محض باہمی تعصب اور ضد بازی کی بنا پر ہے' کہ ہم محمد (ﷺ) کے پیروکار بن کر انہیں خود سے بڑا کیونکر تسلیم کر لیں اور اپنے آپ کو انؐ کے سامنے چھوٹا کیسے بنا لیں؟ اہلِ کتاب خود آپس میں بھی ایک دوسرے کی مخالفت اسی تعصب کی بنیاد پر کرتے ہیں' جس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰي شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰي شَيْءٍ ۙ وَّھُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ﴾ (آیت ۱۱۳) ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کسی بنیاد پر نہیں ہیں' حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھ رہے ہیں۔''

عہد نامہ قدیم (Old Testament) یہودیوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ اس کے باوجود ان

کی باہمی مخاصمت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یروشلم کی ''سمت'' پر اگرچہ دونوں گروہوں کا اتفاق ہے' لیکن باہمی عناد کی بنا پر ایک گروہ شرقی حصے کو قبلہ مانتا ہے جبکہ دوسرا غربی حصے کو۔ اس تناظر میں یہاں حضورﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تعصّب کے مرض میں مبتلا ہیں' اس لیے آپؐ ان میں سے کسی گروہ سے کسی مثبت روّیے کی توقع نہ رکھیں' ورنہ آپؐ کو مایوسی ہوگی۔ بلکہ آپؐ ان کی طرف سے انتہائی سخت اور منفی ردّعمل کے لیے خود کو تیار رکھیں۔ اس جملے میں دراصل حضورﷺ کے لیے بین السطور یہ پیغام بھی ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ایک طویل اور جاں گداز عمل ہے' اس لیے آپؐ موافق حالات اور جلد کامیابی کی توقع نہ رکھیں۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ''اور اگر ایک بات آپ کے رب کی طرف سے پہلے سے ایک وقتِ معیّن کے لیے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے مابین (اختلافات کا) فیصلہ چکا دیا جاتا۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ⑭﴾ ''اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایک خلجان آمیز شک میں مبتلا ہیں۔''

یہ نکتہ خاص طور پر بہت اہم اور لائقِ توجہ ہے کہ ''وارثانِ کتاب'' کے اَذہان وقلوب میں ایسے شکوک و شبہات آخر کیوں ڈیرے جما لیتے ہیں؟ دراصل ہوتا یوں تھا کہ شروع شروع میں سب معاملات بالکل ٹھیک چلتے رہتے تھے' مگر چوتھی پانچویں نسل تک آتے آتے معاملات اس وقت بگڑنے لگتے تھے جب نوجوان اپنے علماء کو باہم دست وگریباں ہوتے دیکھتے اور ان کے دامنِ حیات کو متاعِ عمل سے خالی پاتے۔ ایسی صورتِ حال سے بیزار ہو کر علماء کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ''کتاب'' سے بھی بدظن ہونے لگتے۔ یہ نوجوان خود تو کتاب کے علوم و معارف تک رسائی حاصل کرنے کی زحمت نہ اٹھاتے' لیکن اس مفروضے کو اپنے دلوں میں ضرور بٹھا لیتے کہ جب کتاب کے ''علماء'' کے کردار وعمل میں ہی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی روشنی اس کتاب کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں۔

آیت ۱۵ ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ﴾ ''تو (اے نبیﷺ!) آپ اسی کی دعوت دیتے رہیے''

یہاں ذٰلِکَ کا اشارہ اوپر آیت ۱۳ میں مذکور اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے حکم کی طرف ہے کہ اے نبیﷺ! آپ ان لوگوں کو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے مسلسل دعوت دیتے رہیے۔

﴿وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ﴾ ''اور جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے''

اے نبیﷺ! آپ کی رسالت کا مقصد اور مشن ہی چونکہ اقامتِ دین ہے' اس لیے آپؐ غلبۂ حق کی جدوجہد کی اس راہ میں پوری استقامت اور تندہی کے ساتھ کھڑے رہیں۔ آپؐ کے مخالفین تو چاہیں گے کہ آپ کچھ نرم پڑنے کو تیار ہوں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ⑨﴾ (القلم)۔ مگر آپ ہماری

ہدایت ومشیت کے مطابق اپنے موقف پر جم کر کھڑے رہیے اور اس سفر میں کسی بھی موڑ پر کسی حال میں' کبھی کوئی سمجھوتہ (compromise) نہ کیجیے: ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکہف: ۲۹) ''اور آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے۔''

یہی بات ان آیات کے نزول کے پانچ چھ سال بعد سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۰ میں بایں الفاظ پھر سے دہرائی گئی: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہودی اور نصرانی آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپؐ ان کے طریقے کی پیروی نہ کریں''۔ ظاہر ہے پرانے نظام کے ساتھ ان لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں' آپؐ کی دعوت کو آگے بڑھتا دیکھ کر انہیں اپنی سیادتیں اور چودھراہٹیں خطرے میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ تو چاہیں گے کہ آپؐ ان کے پیچھے چلیں اور ان کی لیڈر شپ قائم رہے۔ مفادات کو بچانے کی یہ روش اقامت دین کی جدوجہد میں آج بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آج بھی اگر اللہ کا کوئی بندہ اس دعوت کا عَلم بلند کر کے ''مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ'' کا نعرہ لگاتا ہے تو اربابِ جُبّہ ودستار کو اپنی مسندوں' خانقاہوں اور گدیوں کا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان کے ''خاموش ردِعمل'' سے ایسی جدّوجہد کے عَلم برداروں کو یہ پیغام آپ سے آپ ہی موصول ہو جاتا ہے کہ ''ہم تمہارے پیچھے کیوں چلیں' تم ہمارے پیچھے کیوں نہ چلو؟''

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے۔''

اب سلسلۂ دعوت چلے گا تو اس کتاب کے بل پر اور کسی کو استقامت نصیب ہو گی تو بھی اسی کتاب کے ذریعے سے۔ چنانچہ آپؐ اس کی تلاوت کو اپنا معمول بنائیے' اس کے معانی ومفہوم کو اپنے دل میں اتاریئے اور دوسروں تک پہنچایئے۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۵ میں حضور ﷺ کو اس بارے میں یوں تاکید فرمائی گئی ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ ''(اے نبی ﷺ) آپ تلاوت کرتے رہا کریں اس کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف کتاب میں سے۔''

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ ''اور (آپؐ کہہ دیجیے کہ) مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔''

اے نبی (ﷺ) آپ ان پر واضح کر دیجیے کہ میں صرف وعظ کہنے اور میٹھی میٹھی باتیں سنا کر لوگوں کا دل بہلانے کے لیے نہیں آیا' بلکہ میں معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنے اور نظامِ توحید کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس جملے کے حوالے سے ہمیں بہت واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ حضور ﷺ کا اصل مشن کیا تھا

اور آپؐ کے اتباع کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آج ہمارے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

حضورﷺ کے اتباع کے تقاضے میلاد کی محفلیں سجا لینے یا بڑے بڑے جلوس نکال لینے سے پورے نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے سب غلط کاریاں چھوڑ کر خود کو دین کے احکام کا پابند بنانا ہوگا اور پھر اپنے تن مَن دھن کے ساتھ عدلِ اجتماعی (نظامِ توحید) کو معاشرے میں قائم کرنے کے لیے جدّوجہد کرنے والوں کی صف میں شامل ہونا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں دراصل حضورﷺ کے اتباع کے اسی تقاضے ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ کے حوالے سے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے ہر کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہوگا جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلوا دوں' اور تم میں سے ہر قوی شخص میرے نزدیک کمزور ہوگا جب تک کہ میں اس سے حق دار کا حق وصول نہ کرلوں۔''

﴿اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ؕ﴾ ''اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔''

﴿لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ ؕ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ﴾ ''ہمارے درمیان کسی حجت بازی کی ضرورت نہیں' اللہ ہمیں جمع کردے گا۔''

﴿وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔''

اللہ تعالیٰ یا تو ہمیں اسی دنیا میں اکٹھا کر دے گا اور اگر یہاں یہ ممکن نہ ہوا تو آخرت میں تو ہم اکٹھے ہو ہی جائیں گے۔ اس فقرے کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان تنظیموں اور گروہوں کا تصور ذہن میں لایئے جو سب اخلاص اور نیک نیتی سے اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے ہر جماعت کا اپنا منصوبہ اور اپنا طریقہ کار ہے۔ ان سب کی مثال دراصل منیٰ سے میدانِ عرفات جانے والے حجاج کے قافلوں جیسی ہے۔ منیٰ سے لاکھوں لوگ ہزاروں قافلوں میں مختلف راستوں اور مختلف شاہراہوں پر میدانِ عرفات کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ ان کے راستے بے شک مختلف ہوتے ہیں مگر منزل سب کی ایک ہوتی ہے۔ یہ قافلے جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کے مابین فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ میدانِ عرفات میں پہنچ کر وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں جوں جوں اپنی منزل کی طرف بڑھتی جائیں گی ان کے باہمی اختلافات کم ہوتے چلے جائیں گے اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر یہ سب اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور اگر بالفرض وہ دنیا میں اکٹھے نہ ہو سکے تو بھی روزِ محشر تو سب اکٹھے ہو ہی جائیں گے۔

چنانچہ ان سب کو آپس میں تنقید کرنے کے بجائے زیر مطالعہ آیت کے الفاظ میں ایک دوسرے سے یوں کہنا چاہیے کہ دیکھو بھئی ہم سب اللہ تعالیٰ کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ہمارا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا بھی۔ باقی جہاں تک ہمارے باہمی اختلاف کا تعلق ہے اس حوالے سے ہمیں آپس میں کوئی حجت بازی نہیں کرنی چاہیے۔ تم

لوگ اپنی سوچ اور اپنے نظریے کے مطابق جدّوجہد کرتے جاؤ‘ ہم اپنے طریق کار اور لائحہ عمل کے مطابق کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم سب اپنی اپنی کوششوں کے لیے ماجور ہوں گے۔ تم لوگوں کو تمہاری جدّوجہد کا صلہ مل جائے گا اور ہم اپنی محنت کا پھل پالیں گے۔ لیکن چونکہ ہم سب اپنے مشن اور اپنی جدوجہد میں مخلص ہیں اس لیے آج نہیں تو کل ہم سب یقیناً ایک ہو جائیں گے۔ اگر ہمارا طریق کار غلط ہوا تو ایک دن حقیقت ہم پر واضح ہو جائے گی اور ہم رجوع کر لیں گے‘ اور اگر آپ لوگوں کے لائحہ عمل میں کوئی کمی ہوئی تو کبھی نہ کبھی آپ کو بھی وہ نظر آ ہی جائے گی اور آپ بھی ضرور اس کی تلافی کر لیں گے‘ اِن شاء اللہ!

علمبردارانِ حق کے اوصاف

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ)

ان آیات میں وہ اہم اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والے افراد کی سیرت کے لیے ناگزیر ہیں۔ انہی اوصاف کو اپنانے سے دراصل ایک ایسے مردِ مؤمن کے کردار کا نقشہ تیار ہوتا ہے جو اس میدانِ کارزار میں قدم رکھتے ہوئے طے کر لیتا ہے کہ: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانعام) ”میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے“۔ اقامت دین کی جدوجہد کے علمبردار افراد کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان اوصاف کو اپنائے بغیر ان کے کردار و عمل میں وہ مضبوط ”جان“ پیدا نہیں ہوگی جو اس ”معرکۂ روح و بدن“ میں پیش کرنے کے لیے درکار ہے۔ اسی ضرورت اور شرط کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے: ؎

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

آیئے اب ہم ایک ایک کر کے ان اوصاف کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت ملاحظہ ہو:

آیت ۳۶ ﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ”پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز و سامان ہے۔“

﴿وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ’’اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔‘‘

گویا اس منزل کے مسافروں کو سب سے پہلے اپنی ترجیحات بدلنا ہوں گی اور ایسی سوچ اپنانا ہو گی جس کے مطابق دنیا و مافیہا انہیں ہیچ نظر آئے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی زندگی ان کا اصل مقصود و مطلوب بن جائے۔ اگر دنیا کی محبت دل کے کسی گوشے میں چھپی رہ گئی تو وہ اس میدان کے بڑے سے بڑے شہسوار کو بھی کبھی نہ کبھی ضرور اڑنگا لگا کر منہ کے بل گرائے گی۔ چنانچہ اس راستے پر گامزن ہونے سے پہلے انسان یہ طے کرے کہ وہ طالبِ آخرت ہے یا طالبِ دنیا۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد کے علمبرداروں کا پہلا وصف یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا سے بے نیازی اختیار کر کے آخرت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیتے ہیں' جبکہ آیت کے اختتامی الفاظ کے مطابق ان کا دوسرا وصف یہ ہے: ﴿وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ﴾ یعنی وہ ہر حال اور ہر کیفیت میں اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ﴾ ’’اور وہ لوگ کہ جو اجتناب کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے‘‘

ظاہر ہے اس مقدس فریضہ کو نبھانے کا حلف اٹھانے والے رضا کار اگر اپنے دامنِ کردار کو ایسی نجاستوں سے بچا کر نہیں رکھیں گے تو وہ اس میدان میں آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ النساء میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾﴾ ’’اگر تم اجتناب کرتے رہو گے ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی برائیوں کو تم سے دور کر دیں گے اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزت جگہ پر‘‘۔ صغائر اور کبائر کے حوالے سے یہ نکتہ اچھی طرح سے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کو کبائر کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں عمومی روش یہ ہے کہ ہم صغائر کے بارے میں تو بہت زیادہ باریک بین بننے کی کوشش کرتے ہیں' چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں وضاحتیں اور فتوے بھی طلب کرتے رہتے ہیں' مگر کبائر سے متعلق لاپرواہی برتتے ہیں۔ حالانکہ صغائر تو ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (ھود: ۱۱۴) کے اصول کے تحت ساتھ ہی ساتھ معاف ہوتے رہتے ہیں اور سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت میں بھی یہی بشارت دی گئی ہے کہ اگر تم لوگ کبائر سے بچتے رہو گے تو تمہارے صغائر ہم خود معاف کر دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود کبائر سے متعلق لاپرواہی اور صغائر کے بارے میں ’’حساسیت‘‘ کا عمومی رویہ ہمارے معاشرے میں ایک متعدی بیماری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس حوالے سے ہماری مشابہت بنی اسرائیل کی اس کیفیت کے ساتھ ہو چکی ہے جس کے بارے میں حضرت مسیح علیہ السلام نے انہیں فرمایا تھا کہ ’’تم لوگ

مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو''۔ بہر حال اللہ کے راستے میں نکلنے والے مجاہدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقویٰ کی روش پر کار بند رہیں اور کبائر و فواحش سے اپنا دامن بچا کر رکھیں۔

﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ ''اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

غَـفَـرَ کے معنی ڈھانپ دینے کے ہیں۔ اس معنی میں اس آہنی خود (ہیلمٹ) کو مِـغْـفَـر کہا جاتا ہے جس سے دورانِ جنگ تلوار وغیرہ کے وار سے بچنے کے لیے سر کو ڈھانپا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مغفرت سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہے جو بندے کے گناہوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لہٰذا مؤمنینِ صادقین کا یہاں جو وصف بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ غصے کا اظہار کرنے کے بجائے اسے پی جاتے ہیں۔ اشتعال کی حالت میں وہ کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ اپنے فیصلے ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور انتقام لینے کے بجائے معاف کرنے کی حکمت عملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۴ میں بھی متقین کی تعریف میں یہی صفت بیان کی گئی ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ﴾ کہ وہ اپنے غصے کو پی جانے والے اور دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے والے لوگ ہیں۔ چونکہ غصے کی کیفیت میں انسان کا اشتعال شیطانی اثرات کی بنا پر ہوتا ہے اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۶ میں دی گئی یہ ہدایت غصے اور اس کے منفی اثرات سے بچنے کا بہترین نسخہ ہے: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ﴾ ''اور اگر کبھی تمہیں شیطان سے کوئی چوک لگنے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو'' ـــــ اب آگے چلیے اگلے وصف کی طرف:

آیت ۳۸ ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور نماز قائم کی۔''

یہ کون سی پکار ہے؟ اس حوالے سے یہ اہم نکتہ ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت سے قبل اب تک جمع کے صیغے میں فعل امر ایک ہی مرتبہ آیا ہے' یعنی ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ اور جمع کے صیغے میں اب تک ایک ہی مرتبہ فعل نہی آیا ہے' یعنی ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾۔ چنانچہ یہی وہ پکار یا حکم ہے جس کی استجابت کا ذکر یہاں ہوا ہے' یعنی: ﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ (الشوریٰ: ۱۳) ''دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو''۔ اور اسی کے بارے میں حضور ﷺ کو اس سورت کی آیت ۱۵ میں مخاطب کر کے فرمایا گیا تھا: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ کہ آپؐ کی دعوت کا عمود اور مرکزی پیغام اقامتِ دین ہے' اسی کی طرف آپؐ نے لوگوں کو بلانا ہے' اسی کی ضرورت اور اہمیت کو ان کے اذہان میں نقش (hammer) کرنا ہے۔ یہی آپؐ کا مشن ہے اور یہی آپؐ کی دعوت کا اصل ہدف ہے۔ آپؐ اپنے اسی مشن اور اسی موقف پر ڈٹے رہیے اور مخالفین کی مخالفت کی بالکل پروا نہ کیجیے۔

بلاشبہ یہ مشن بہت عظیم ہے اور اسی نسبت سے اس کی جدوجہد کے لیے خصوصی سیرت و کردار کے حامل مردانِ کار درکار ہیں۔ چنانچہ آیاتِ زیرِ مطالعہ میں ان اوصاف کا تذکرہ ہے جو اس مشن کے علمبرداروں کی

شخصیات کے لیے ناگزیر ہیں —— نماز کی پابندی کے بعد اب اگلا وصف ملاحظہ ہو:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ ’’اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔‘‘

ظاہر ہے اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اجتماعیت درکار ہے اور اجتماعیت میں فیصلے کرنے اور مختلف امور نپٹانے کے لیے باہمی مشاورت بہت ضروری ہے۔ کسی اجتماعیت کے اندر اگر مؤثر مشاورتی نظام موجود نہیں ہوگا اور کوئی ایک فرد دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا طرزِ عمل اپنانے کی کوشش کرے گا تو اس سے نہ صرف اجتماعی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا بلکہ خود اس اجتماعیت کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

جماعتی زندگی میں مشاورت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جن صحابہؓ سے درّہ چھوڑنے کی غلطی سرزد ہوئی ان کے بارے میں حضورﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) کہ نہ صرف آپؐ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں بلکہ انہیں مشورے میں بھی شامل رکھیں۔ مشاورت کے عمل سے اجتماعیت کو تقویت ملتی ہے۔ اس سے ساتھیوں کے مابین مشترکہ سوچ اور باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو جماعت کے اندر اپنی موجودگی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی بات سنی جاتی ہے۔

حضورﷺ خود بھی صحابہؓ سے مشورے کو بہت اہمیت دیتے تھے بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ حضورؐ نے اپنی رائے پر صحابہؓ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے فیصلہ صادر فرمایا۔ مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر حضورﷺ نے لشکر کے کیمپ کے لیے ایک جگہ کا انتخاب فرمایا۔ مگر جب کیمپ لگ چکا تو کچھ صحابہؓ نے آپؐ سے اجازت لے کر رائے دی کہ بعض وجوہات کی بنا پر دوسری جگہ کیمپ کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کیمپ اکھاڑ کر صحابہؓ کی مجوزہ جگہ پر لگانے کا حکم دے دیا۔ بہرحال اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف جماعت کے نظم و نسق کا تقاضا ہے کہ اس جماعت میں مشاورت کا خصوصی اہتمام رکھا جائے۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ’’اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔‘‘

دعوت و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں مصروف لوگوں کو جہاں اپنے وقت اور اپنی جانوں کی قربانی دینا پڑے گی، وہاں اس راستے میں انہیں اپنا مال بھی خرچ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی گنوا دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے ’’انفاق‘‘ بھی کرتے ہیں۔

اب اگلی پانچ آیات میں مردانِ حق کے جس وصف کا ذکر خصوصی اہتمام سے کیا جا رہا ہے وہ ’’بدلہ‘‘ لینے کی حکمت عملی ہے۔ یہ حکمت عملی بظاہر سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے اس حکم سے متضاد نظر آتی ہے جس میں لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کرنے اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس ظاہری تضاد یا حکمت عملی کی تبدیلی کے فلسفے کو یوں سمجھیں کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ’’دعوت‘‘ ہے جبکہ سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون ’’اقامتِ دین‘‘ ہے۔ دعوت کے لیے تو ظاہر ہے خوشامد بھی کرنا پڑتی ہے، لوگوں کے دروازوں پر بھی جانا پڑتا ہے اور ان

کی جلی کٹی باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ (آیت ۳۴) میں لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت کرنے اور گالیاں سن کر دعائیں دینے کا سبق دیا گیا ہے۔ لیکن سورۃ الشوریٰ کی زیر مطالعہ آیات میں اقامتِ دین اور عملی جدّوجُہد (active resistance) کے تناظر میں سختی کا جواب سختی سے دینے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں دی گئی ہدایات کی روشنی میں دعوت کا مرحلہ کامیابی سے طے کرنے کے بعد غلبۂ دین کی تحریک جب مسلّح تصادم (armed conflict) کے مرحلے میں داخل ہو جائے تو یہ مرحلہ تیغ بکف' سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترنے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کو للکارنے کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں صورتِ حال کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شمع توحید کے پروانوں کو حکمت عملی بھی بدلنا ہوگی۔ اس لیے اس مرحلے کے لیے انہیں نئی ہدایات دی جا رہی ہیں:

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝﴾ ''اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔''

یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد جب ''قتال'' کے مرحلے میں داخل ہو جائے تو پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حکم ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس حکمتِ عملی کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور قتل کر دو انہیں جہاں کہیں بھی تم انہیں پاؤ اور نکال باہر کرو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا''۔ گویا جب ایک دفعہ آگے بڑھ کر باطل کو چیلنج کر دیا گیا تو پھر فیصلہ کن فتح تک اس جنگ کو سختی سے جاری رکھنے کا حکم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ بدر میں پکڑے گئے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیے جانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے (سورۃ الانفال کی آیات ۶۷' ۶۸ میں) ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا۔ ان قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے' بلکہ آپؓ کو تو اصرار تھا کہ ہر مسلمان اپنے رشتے دار اور عزیز قیدی کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اس حوالے سے آپؓ کی دلیل یہی تھی کہ اگر آج ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا تو کل وہ پھر ہمارے مقابلے میں آ جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خدشے کی اس وقت تصدیق بھی ہوگئی جب فدیہ پر رہائی پانے والے قیدیوں میں سے اکثر و بیشتر اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف پھر سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ عام مفسّرین کے نزدیک سورۃ الانفال کی مذکورہ آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید میں نازل ہوئیں تھیں۔

آیت ۴۰ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾ ''اور کسی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے''

یہاں تقابل کے لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا یہ حکم ایک مرتبہ پھر ملاحظہ ہو: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۳۴) ''اور دیکھو! اچھائی اور برائی برابر نہیں ہوتے' لہٰذا تم مدافعت کرو اُس طریقے سے جو بہترین ہو''۔ اب بظاہر تو ان دونوں احکام میں تضاد (contrast) نظر آتا ہے' لیکن قرآن کے ایسے مقامات کا مطالعہ اگر حضور ﷺ کی تحریک کے مختلف اَدوار کے زمینی حقائق کی روشنی میں کیا

جائے اور اس حوالے سے مکّی اور مدنی اَدوار کے حالات کے فرق کو مدّنظر رکھا جائے تو تمام اشکالات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ مکہ میں رہتے ہوئے اگر ﴿کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ﴾ (النساء:۷۷) کی حکمت عملی اپنانے کی ہدایت تھی تو یہ اس وقت کا تقاضا تھا۔ اور اگر مدینہ میں آ کر ﴿وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ﴾ کا حکم جاری ہوا ہے تو یہ اس مرحلے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب دشمن کے ساتھ تمہارا دوبدو مقابلہ شروع ہو جائے تو جس قدر زیادتی تم پر مخالف فریق کرے اس قدر زیادتی ان پر تم بھی کر سکتے ہو۔ اگر وہ اشہرِ حُرم کی حرمت کو بٹہ لگاتے ہیں تو تم بھی اس ماہ کے تقدس کے احترام میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھے رہو۔

﴿فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ﴾ ''پس جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

یہ معاف کرنا اگر اس اعتبار سے ہو کہ اس میں متعلقہ شخص کی اصلاح کا امکان ہو تو اسی میں بہتری ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

ظالموں کے لیے البتہ کوئی معافی نہیں' ان سے تو بہرحال بدلہ ہی لیا جائے گا۔ اس حکمت عملی کے بارے میں ہم سورۃ البقرۃ میں بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴾ (آیت ۱۷۹) ''اور اے ہوشمندو! قصاص میں ہی تمہارے لیے زندگی ہے۔''

آیت ۴۱ ﴿وَلَمَنِ انۡتَصَرَ بَعۡدَ ظُلۡمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور جو کوئی بدلہ لے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔''

سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں یہی اصول بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ﴿لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الۡجَهۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ ؕ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں کہ کوئی شخص کوئی بری بات بلند آواز سے کہے مگر مظلوم اس سے مستثنیٰ ہے۔ بدلہ لینا بہرحال مظلوم کا حق ہے اور اگر وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ ہی لینا چاہتا ہے تو اسے معاف کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھئے ان آیات کا اسلوب اور انداز سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ آیات کے اسلوب سے کس قدر مختلف ہے۔ اسی ''تضاد'' کی بنیاد پر پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء۔۲۰۰۶ء) نے Muhammad at Mecca اور Muhammad at Medina دو کتابیں لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مکّہ کے اندر جب محمد عربی (ﷺ) کی ایک حکمتِ عملی ناکام ہو گئی تو انہوں نے مدینہ جا کر اپنا لائحہ عمل بالکل ہی تبدیل کر لیا۔ اس بے چارے ''دانشور'' کی نظریں تعصب کی عینک کے باعث حضورﷺ کی تحریک کے دو مراحل کے فرق کو نہیں دیکھ سکیں اور وہ اس سادہ سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکا کہ پہلا مرحلہ تیاری کا مرحلہ تھا جبکہ دوسرا عملی جدوجہد کا۔

مکی دور میں ''ہاتھ بندھے رکھنے'' کا حکم دراصل ایک سوچی سمجھی حکمت عملی (strategy) کا حصہ تھا' جس

کے تحت جاں نثارانِ توحید کو صبر و مصابرت کی بھٹی میں سے گزارنا مقصود تھا تاکہ میدانِ کارزار میں اترنے سے پہلے ان کے جذبِ ضبط و برداشت کی آنچ سہہ سہہ کر پختہ اور ان کے دست و بازو آزمائش و ابتلا کی سختیاں جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے اس حکمت عملی کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

مدنی دور میں جب "بندھے ہوئے ہاتھ" کھول دیے گئے تو حالات یکسر بدل گئے۔ چنانچہ میدانِ بدر میں جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سامنا اپنے سابق آقا اُمیّہ بن خلف سے ہوا تو اس وقت چشمِ فلک کوئی اور ہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اب اُمیّہ کی گردن کا مقدر نشانہ بننا تھا جبکہ "اقدام" کا اختیار تیغِ بلالیؓ کے پاس تھا۔

آیت ۴۲ ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ﴾ "اصل میں الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں"

﴿وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾﴾ "اور زمین کے اندر سرکشی کرتے ہیں بغیر کسی حق کے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

عدل و انصاف کی راہ میں اصل رکاوٹ تو وہ لوگ ہیں جو زمین میں سرکشی دکھاتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بجائے خود حاکم بن بیٹھتے ہیں اور عوام الناس کے حقوق پر شب خون مارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کی اہمیت کا اندازہ اُن تاکیدی احکام سے لگایا جا سکتا ہے جو قرآن حکیم میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کی شان ﴿قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ﴾ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ وہ عدل و انصاف قائم کرنے والا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ﴾ "اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر"۔ اور پھر سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں یہی الفاظ اس ترتیب میں دہرائے گئے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ﴾ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ"۔ اس کے بعد سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۵ میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپؐ انہیں بتا دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ کہ مجھے تمہارے درمیان عدل قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

آیت ۴۳ ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ "اور ہاں جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ واقعتاً بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

بدلہ لینا اگرچہ مظلوم کا حق ہے، لیکن کسی خاص صورت حال میں اگر وہ صبر سے کام لیتے ہوئے اپنا یہ حق معاف کرنا چاہے تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ (الاحقاف)

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ﴾ ''اور ہم نے تاکید کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں حسنِ سلوک کی۔''

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے احکام قرآن حکیم میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے اس حکم میں اس حوالے سے خصوصی تاکید پائی جاتی ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسٰنًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾﴾

''اور فیصلہ کر دیا ہے آپؐ کے رب نے کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اس کے' اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں' تو مت کہو ان کو اُف بھی اور مت جھڑکو ان کو' اور بات کرو ان سے نرمی کے ساتھ۔''

اولاد کے لیے اگرچہ والد اور والدہ دونوں قابلِ احترام ہیں اور دونوں ہی ان کے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں' لیکن بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں کی مشقت اور ذمہ داری چونکہ زیادہ ہے اس لیے اولاد کی طرف سے خدمت اور حسن سلوک کے حوالے سے اس کا حق بھی فائق ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں ماں کے خصوصی حق کا ذکر یوں فرمایا گیا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ (آیت ١٤) ''اور ہم نے وصیت کی انسان کو اس کے والدین کے بارے میں' اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر' پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں۔''

والدہ کے خصوصی حق کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا: یا رسول اللہؐ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے بڑھ کر مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تمہاری والدہ!'' انہوںؓ نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تمہاری والدہ!'' یہ سوال انہوں نے چار مرتبہ دہرایا۔ جواب میں آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: تمہاری والدہ۔ جبکہ چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تمہارا والد!'' (متفق علیہ) البتہ اس حوالے سے یہ نکتہ مدنظر رہنا چاہیے کہ والدہ کے حق کی یہ فوقیت اخلاقی اعتبار سے ہے جبکہ قانونی طور پر والد کا حق ہی فائق ہے۔ مثلاً اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے: ((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ)) (الجامع الصغیر للسیوطی) لیکن اگر میاں بیوی

میں علیحدگی ہو جائے تو اسلامی قانون اولاد پر والد ہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔

﴿حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ﴾ ''اُس کی ماں نے اسے اٹھائے رکھا (پیٹ میں) تکلیف جھیل کر اور اسے جنا تکلیف کے ساتھ۔''

﴿وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ﴾ ''اور اُس کا یہ حمل اور دودھ چھڑانا ہے (لگ بھگ) تیس مہینے میں۔''

ان دو جملوں میں ان تمام اضافی تکالیف اور مشقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جو والد کے مقابلے میں صرف والدہ کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بچے کی پیدائش اور پرورش میں والد بالواسطہ طور پر حصہ لیتا ہے جبکہ والدہ اس پورے عمل میں براہِ راست کردار ادا کرتی ہے۔ دورانِ حمل کی گوناگوں پریشانیوں، وضع حمل کی جان لیوا تکلیفوں اور رضاعت و پرورش کی صبر آزما مشقتوں کو وہ تن تنہا جھیلتی ہے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۙ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے''

بچے کی جسمانی بلوغت تو سولہ سترہ سال کی عمر میں ہو جاتی ہے، لیکن یہاں ذہنی اور نفسیاتی بلوغت اور پختگی کا ذکر ہوا ہے اور اس کی کم از کم حد چالیس سال بتائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام ؊ کو عموماً چالیس برس کی عمر میں منصبِ نبوت پر فائز کیا جاتا رہا ہے، جیسا کہ خود حضور ﷺ کو بھی نبوت چالیس برس کی عمر میں ملی۔ البتہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ استثناء کی مثالیں بھی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ ؑ کو بچپن میں ہی حکمت عطا کر دی گئی تھی، جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَاٰتَيۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِيًّا ۝۱۲﴾ ''اور ہم نے اسے عطا کر دی حکمت و دانائی بچپن میں ہی''۔ اور ایسا ہی معاملہ حضرت عیسیٰ ؑ کا بھی تھا۔ لیکن عام قاعدہ کے تحت ذہنی و نفسیاتی بلوغت (maturity) کی حد چالیس سال ہی ہے۔ اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ میں ایک بچے کی مثال دی گئی ہے کہ جب وہ اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر کے چالیس برس کی عمر میں ذہنی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو:

﴿قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ﴾ ''وہ کہتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر کر سکوں تیرے انعامات کا جو تُو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائے۔''

﴿وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰٮهُ وَاَصۡلِحۡ لِىۡ فِىۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ﴾ ''اور یہ کہ میں ایسے اعمال کروں جنہیں تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں بھی اصلاح فرما دے۔''

اس دعا کا اسلوب خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے۔ دعا صرف یہ نہیں کہ میری اولاد کی اصلاح فرما دے اور انہیں نیک بنا دے، بلکہ ان الفاظ کے مفہوم کی اصل روح یہ ہے کہ میری نسل میں میرے لیے اصلاح فرما دے، ان

میں میرے لیے بہتری پیدا فرما دے۔ اس لیے کہ بچے اگر صالح اور نیک ہوں گے تو اپنے والدین کے لیے مغفرت کی دعا کریں گے۔ اگر والدین نے اولاد کی اچھی تربیت کی ہوگی تو ان کے نیک اعمال میں سے والدین کو بھی صدقہ جاریہ کے طور پر حصہ ملتا رہے گا۔ یوں اولاد کی بہتری اور اصلاح گویا والدین کے لیے بھی فائدہ مند ہوگی۔ بالکل یہی مفہوم اس قرآنی دعا کا بھی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾﴾ (الفرقان) ''اور وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما، اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔''

﴿اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور یقیناً میں (تیرے) فرمانبرداروں میں سے ہوں۔''

فلسفۂ جہاد بالسّیف کا ایک اہم اصول

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ۬ ذٰلِكَ ؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾ (محمد)

﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''تو (اے مسلمانو!) جب تمہاری مڈ بھیڑ ہو کافروں سے''

اب جبکہ تمہاری جدّوجہد مسلح تصادم کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور تم لوگ تلوار کا جواب تلوار سے دینے کے لیے میدان میں اُتر پڑے ہو تو اس مرحلے میں جب ان کافروں سے تمہارے مقابلہ کی نوبت آئے:

﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ﴾ ''تو ان کی گردنیں مارنا ہے!''

اب میدانِ کارزار میں تمہاری پہلی ترجیح یہی ہونی چاہیے کہ جو دشمنِ حق تمہارے سامنے آئے وہ بچ کر نہ جائے۔ لہٰذا ان کی گردنیں اُڑاؤ، انہیں قتل کرو!

﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم انہیں اچھی طرح سے کچل دو تب انہیں مضبوطی کے ساتھ باندھو''

یعنی اس مرحلے پر تم بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنا سکتے ہو۔

﴿فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ۬﴾ ''پھر اس کے بعد (تم انہیں چھوڑ سکتے ہو) احسان کر کے یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔''

اس آیت کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر کے اسلوب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: ''فَضَرْبَ الرِّقَابِ، حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً''۔ گویا اس جملے کے مطابق مقابلے کے مختلف مراحل کی ترتیب یہ ہوگی: پہلے ان کی گردنیں

مارو' جب ان کی طاقت اچھی طرح کچل ڈالی جائے تب انہیں قید میں مضبوط باندھو۔ پھر جب جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے تو اس کے بعد انہیں چھوڑا جا سکتا ہے' چاہے احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

اس آیت کے درست مفہوم تک پہنچنے کے لیے اس اہم فلسفے کو بھی سمجھنا ضروری ہے جو یہاں ''حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا '' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس کے لیے انگریزی کے دو الفاظ war اور battle کو ذہن میں رکھیے۔ war سے مراد دو فریقوں کی باہمی محاذ آرائی اور کشمکش ہے جو ایک فریق کے فتح یاب اور دوسرے کے سرنگوں ہونے تک جاری رہتی ہے' جبکہ battle سے مراد اس محاذ آرائی کے دوران متعلقہ فریقوں کے درمیان ہونے والا کوئی خاص معرکہ ہے۔ گویا ایک جنگ (war) کے دوران میں کئی لڑائیاں (battles) ہو سکتی ہیں۔ اب رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کے حوالے سے اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ مدنی دور میں غلبۂ دین کی جنگ (war) ۲ ہجری میں شروع ہوئی اور چھ سال تک مسلسل جاری رہی —— اس میں صرف صلح حدیبیہ کی وجہ سے کچھ مدت کے لیے ایک مختصر سا وقفہ آیا تھا —— اس جنگ کے دوران غزوۂ بدر (Battle of Badar)' غزوۂ اُحد (Battle of Uhad)' غزوۂ احزاب (Battle of Ahzaab)' غزوۂ بنی مصطلق (Battle of Bani Mustalaq) اور بہت سی دوسری لڑائیاں لڑی گئیں۔ لیکن جنگ (war) نے مکمل طور پر ہتھیار اُس وقت ڈالے جب پورے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کا دین اس حد تک غالب ہو گیا کہ اس کے مقابلے میں باطل کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت باقی نہ رہی۔

چنانچہ زیر مطالعہ آیت میں جو حکمت بیان ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے آخری مرحلے (مسلّح تصادم) میں جب باطل قوتوں کو علی الاعلان للکارا جا چکا ہو اور مردانِ حق اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں اتر پڑے ہوں تو یہ پنجہ آزمائی اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک باطل پوری طرح سرنگوں نہ ہو جائے۔ اس دوران کسی مہم یا کسی لڑائی میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو کسی بھی شرط پر آزاد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ انہیں اگلے معرکے میں دوبارہ اپنے مقابلے میں آنے کا موقع دے رہے ہیں۔ جیسے غزوۂ بدر میں کفار کے ستر (۷۰) جنگجوؤں کے مارے جانے سے ان کی طاقت کو ایک حد تک تو نقصان پہنچا تھا' مگر ان کی جنگی صلاحیت پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے ۷۰ قیدیوں کی آزادی ان کے لیے پھر سے تقویت کا باعث بن گئی اور فدیہ دے کر آزاد ہونے والے قیدیوں میں سے اکثر افراد اگلے سال مسلمانوں کے مقابلے کے لیے پھر سے میدان میں تھے۔

دوسری طرف اس حوالے سے ایک نکتہ یہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے سے متعلق حضور ﷺ کا فیصلہ ایک اجتہاد تھا' جس کا تعلق آپ ؐ کی ذاتی جانچ (judgement) سے تھا۔ یعنی اس معاملے میں حضور ﷺ کا اندازہ تھا کہ کفار کی طاقت کچلی جا چکی ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ بہرحال اجتہاد کی دونوں صورتیں (خطا اور صواب) ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں اور دونوں پر

ہی اجر ملتا ہے' البتہ اجتہاد میں تصویب کی صورت میں دہرے اجر کا وعدہ ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں چونکہ قیدیوں کو فدیے کے عوض رہا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اس لیے حضور ﷺ نے اس اختیار کی رو سے مذکورہ فیصلہ فرمایا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کو بہتر طور پر معلوم تھا کہ کفر کی جنگی صلاحیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اسی لیے سورۃ الانفال (جو اس سورت یعنی سورۂ محمد کے بعد نازل ہوئی) میں حضور ﷺ کے اس فیصلے سے متعلق یہ تبصرہ نازل ہوا تھا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ ''کسی نبی کے لیے یہ روا نہیں کہ اُس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں خوب خونریزی نہ کر دے۔ تم دنیا کا ساز و سامان چاہتے ہو' اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے' اور اللہ عزیز اور حکیم ہے''۔ ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ ''اگر اللہ کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو جو کچھ (فدیہ وغیرہ) تم نے لیا ہے اس کے باعث تم پر بڑا سخت عذاب آتا''۔ یہاں ''کِتٰب'' سے مراد آیت زیر مطالعہ کا یہ حکم ہے جس میں فدیہ کے عوض قیدیوں کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۴ کا حکم پہلے سے نازل نہ ہو چکا ہوتا تو فدیہ لینے کی وجہ سے تم پر سخت گرفت ہوتی۔ ﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''تو اب کھاؤ جو تمہیں ملا ہے غنیمت میں سے (کہ وہ تمہارے لیے) حلال اور طیب (ہے)' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

بہر حال آیت زیر مطالعہ کے حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو تو انہیں خوب قتل کرو' پھر جب کفر کی کمر پوری طرح ٹوٹ جائے تو ان کے بچے کھچے زندہ افراد کو قیدی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پھر جب دشمن کی طرف سے مزاحمت بالکل ختم ہو جائے اور اس کے خلاف تمہاری جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے تو ان جنگی قیدیوں کو آزاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں' چاہے ان کے عوض فدیہ لے لو یا احسان کرتے ہوئے بلا معاوضہ انہیں رہا کر دو۔

﴿ذٰلِكَ ۛؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ﴾ ''یہ ہے (اس بارے میں حکم)' اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا''

﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ﴾ ''لیکن اللہ آزماتا ہے تمہارے بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے سے۔''

اللہ تعالیٰ ان کفار سے خود بھی انتقام لے سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو میدانِ بدر میں کفار کے ایک ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کو آنِ واحد میں بھسم کر کے رکھ دیتا' لیکن اس نے تمہارے تین سو تیرہ افراد کو ایک ہزار کے طاقت ور لشکر کے مقابلے میں لا کر تمہارے صبر و ایمان اور جذبۂ استقامت کا امتحان لینا پسند کیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل

ہو گئے تو اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا انہیں بھرپور صلہ دے گا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (الفتح)

آیت ۱ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ "یقیناً ہم نے آپ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔"

آیت ۲ ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ "تاکہ اللہ بخش دے آپ کی کوئی کوتاہیاں جو پیچھے ہوئیں اور جو بعد میں ہوئیں"

رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے لفظ "ذنب" کی وضاحت کے لیے سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۱۹ کی تشریح ملاحظہ ہو۔ بہرحال میرے نزدیک آیت زیر مطالعہ میں لفظ ذَنْۢبِكَ (آپ کی کوتاہیوں) سے مراد دراصل وہ خامیاں اور کوتاہیاں ہیں جو غلبۂ اسلام کی اس جدوجہد میں رہ گئی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمان کر رہے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگزر کر کے محض اپنے فضل سے ان کی تلافی کر دی ہے اور آپ کے لیے فتح و نصرت کا دروازہ کھول دیا ہے۔

﴿وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲﴾ "اور تاکہ اللہ اپنی نعمت کا اتمام فرما دے آپ پر اور آپ کی راہنمائی کرے سیدھے راستے کی طرف۔"

بظاہر اس فقرے سے بھی لفظ "ذنب" کی طرح اشکال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو پہلے ہی سیدھی راہ پر تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲﴾ (الشوریٰ) کا مصداق تھے اور آپ کے تمام اہلِ ایمان ساتھی بھی پچھلے اٹھارہ برسوں سے سربکف ہو کر اسی راہِ ہدایت پر گامزن تھے تو پھر یہاں ﴿وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝﴾ کے فرمان کا کیا مفہوم ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی بہت سی آراء ہیں، جن کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال میرے نزدیک اس کی توجیہہ وہی ہے جو میں سورۂ محمد کی آیت ۱۹ کے ضمن میں لفظ "ذنب" کی وضاحت کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے جو مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں، اس حوالے سے اگر اہلِ ایمان میں سے کسی فرد سے اب تک کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس فتح مبین کی برکت سے ایسی تمام کوتاہیوں کی تلافی فرما دے گا۔ اس کے بعد اللہ عزوجل کی حکومت قائم کرنے کے لیے آپ لوگوں کی یہ جدوجہد تیر کی طرح سیدھی اپنے ہدف کی طرف تیزی سے بڑھے گی اور "اظہارِ دینِ حق" کا عملی مظاہرہ اب بہت جلد دنیا کی نظروں کے سامنے

آ جائے گا۔ گویا اس مقام پر آپ ﷺ کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب فتح و کامرانی کا راستہ دکھانا ہے۔

جہاں تک آیت زیر مطالعہ میں ''اتمامِ نعمت'' کے وعدے کا تعلق ہے تو اس سے مراد دراصل دین کا اتمام ہی ہے جس کے بارے میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں یہ خوشخبری دی گئی ہے: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے' اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا ہے' اور تمہارے لیے میں نے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا ہے''۔ البتہ اس اہم مضمون کی درست تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ دین کے اتمام کی دونوں ممکنہ صورتیں پیش نظر رہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں تمام احکامِ دین بیان کر دیے گئے اور شریعت مکمل ہو گئی۔ لیکن دین اسلام چونکہ ایک ضابطہ حیات ہے اس لیے عملی طور پر اس کی تکمیل تب ہی ممکن تھی جب اس کے تحت باقاعدہ ایک حکومت قائم ہوتی اور معاشرے کے اندر اس کے تمام قوانین کی تنفیذ کا مظاہرہ اور نمونہ عملی طور پر سامنے آتا۔ اسی کیفیت کا نام دراصل ''اظہارِ دین'' ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں تین مقامات (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸ اور الصف:۹) پر ﴿لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾ کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ''مقصد'' کے طور پر بیان ہوا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں یہاں خصوصی طور پر اسی ''نعمت'' کے اتمام کی طرف اشارہ ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کے ساتھیوں کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کے لیے ہم نے آپ کو یہ ''فتح مبین'' عطا کر دی ہے۔ اب آپ کی جدوجہد تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھے گی اور جزیرہ نمائے عرب میں بہت جلد ''اظہارِ دینِ حق'' کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آ جائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَّ یَنۡصُرَکَ اللّٰہُ نَصۡرًا عَزِیۡزًا ③﴾ ''اور اللہ آپ کی مدد کرے گا' بہت زبردست مدد۔''

اب آپ کی جدوجہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی مدد شامل ہو گی جسے کوئی شکست نہیں دے سکے گا۔

آیت ۴ ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِیۡمَانًا مَّعَ اِیۡمَانِہِمۡ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں میں سکینت نازل کر دی تاکہ وہ اضافہ کر لیں اپنے ایمان میں مزید ایمان کا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت اور طمانیت ہی تھی جس کے باعث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باطل کے ساتھ تصادم کے دوران ہر مرحلے پر اپنی جانیں قربان کر دینے کے لیے پورے سکونِ قلب کے ساتھ جازم رہے۔ پھر اسی سکینت کے سہارے صحابہ کرامؓ اس کڑے امتحان سے بھی سرخرو ہو کر نکلے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر انہیں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے حوالے سے درپیش تھا۔ اس موقع پر اصل صورت حال یہ تھی کہ صحابہؓ میں سے کوئی ایک فرد بھی صلح کے حق میں نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود اس دوران ان کے نظم و ضبط کا یہ عالم رہا کہ بغیر کسی ایک استثناء کے پوری جماعت نے حضور ﷺ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

بادیُ النظر میں یہ کہنا ذرا عجیب لگتا ہے کہ ''صحابہؓ میں سے کوئی بھی صلح کے حق میں نہیں تھا'' لیکن تاریخی

حقائق بہر حال ایسی ہی صورتِ حال کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح نامہ پر دستخط ہو جانے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانو! اب اٹھو احرام کھول دو اور یہیں پر قربانیاں کر دو' تو آپؐ کے کہنے پر کوئی ایک مسلمان بھی نہ اٹھا۔ آپؐ نے اپنا یہ حکم پھر دہرایا تو پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔ حتیٰ کہ آپؐ نے تیسری مرتبہ فرمایا کہ لوگو اٹھو! احرام کھول دو اور قربانی کے جانور ذبح کر دو' تو آپؐ کے تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کوئی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔ بلاشبہ صحابہؓ کا یہ ''توقف'' اضطراری کیفیت کے باعث تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے لیے امتحان کی کوئی صورت ہے' اس کے بعد شاید کوئی نیا حکم آجائے گا اور صورتحال بدل جائے گی۔ دراصل یہ صورتِ حال صحابہؓ کی سمجھ سے باہر تھی کہ جو احرام انہوں نے حضور ﷺ کی اقتدا میں عمرے کے لیے باندھے ہیں وہ عمرہ ادا کیے بغیر میدانِ حدیبیہ میں ہی کھول دیے جائیں۔ بہر حال حضور ﷺ کے تیسری مرتبہ حکم دینے پر بھی جب کوئی احرام کھولنے کے لیے نہ اٹھا تو آپؐ دل گرفتہ ہو کر اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ ؓ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ جب آپؐ نے تمام صورتحال انہیں بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ اپنی زبان مبارک سے کچھ نہ فرمائیں' بس آپؐ اپنا احرام کھول دیں اور قربانی کا جانور ذبح کر دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کے احرام کھولنے اور جانور ذبح کرنے پر سب مسلمانوں نے احرام کھول دیے اور اپنے اپنے جانور ذبح کر دیے۔ صحابہؓ کے مذکورہ ردِعمل سے یہ حقیقت بہر حال عیاں ہوتی ہے کہ اس موقع پر وہ سب کے سب ''صلح'' کو خوش آمدید کہنے کے بجائے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے زیادہ پُر عزم تھے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ④﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر تو اللہ ہی کے ہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

فلسفۂ بیعت اور تنظیم سازی میں بیعت کی اہمیت

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۞ (الفتح)

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔''

﴿يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ﴾ ''ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

اس بیعت میں گویا تین ہاتھ شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ' بیعت کرنے والے شخص کا ہاتھ اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ۔

﴿فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ﴾ ''تو اب جو کوئی اس کو توڑے گا تو اس کے توڑنے کا وبال اپنے اوپر ہی لے گا۔''

﴿وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۰﴾﴾ ''اور جو کوئی پورا کرے گا اس معاہدے کو جو وہ اللہ سے کر رہا ہے تو وہ اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔''

اس آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۃ التوبہ کی اس آیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِیۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ﴾ (آیت ۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمے ہے سچا تورات' انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اُس بیع پر جس کا سودا تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے''۔ اب ان دونوں آیات کے باہمی ربط و تعلق کو اس طرح سمجھیں کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں ایک ''بیع'' (سودے) کی ترغیب دی گئی ہے جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اس بیع کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں بھی ب ی ع مادہ سے باب مفاعلہ (بَايَعۡتُمۡ بِهٖ) آیا ہے اور یہاں آیت زیر مطالعہ میں بھی (اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ)۔ لفظ بیعت دراصل بیع ہی سے مشتق ہے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ دو فریق جب خرید و فروخت (بیع) کا کوئی معاملہ کرتے تو سودا پکا ہو جانے پر آپس میں مصافحہ کرتے تھے۔ یہ مصافحہ دراصل ''بیع'' طے ہو جانے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ایسے مصافحے کو ''بیعت'' کا نام دے دیا گیا۔

سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ اور بندے کے مابین ہونے والی بیع و شراء میں بندے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس سودے کی بیعت براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے یہ ''بیعت'' اللہ تعالیٰ کے کسی نمائندے یعنی کسی انسان کے ہاتھ پر ہی کرنی پڑے گی اور اس طرح عملی طور پر اس سودے یا بیع میں تین فریق شامل ہوں گے' یعنی اللہ تعالیٰ' سودا کرنے والا شخص اور وہ شخص جس کے ہاتھ پر اس سودے کی بیعت ہوگی۔ آج بالفرض اگر میں اپنا مال و جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں تو میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان چونکہ غیب کا پردہ حائل ہے اس لیے مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے کوئی ''انسان'' ہی ڈھونڈنا پڑے گا اور اس سے راہنمائی لینا پڑے گی کہ میں اپنی جان کب اور کیسے قربان کروں؟ اور اپنا مال کس طریقے سے کہاں خرچ کروں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ''انسان'' اللہ کے رسول ﷺ کی شکل میں میسر تھا' انہوں نے اپنے مال و جان کے سودے کی ''بیعت'' حضور ﷺ کے ہاتھ پر کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ انہیں بتاتے تھے کہ اب اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں پہنچ جاؤ اور اب اپنے اموال حاضر کر دو تو صحابہؓ خوشی خوشی آپؐ کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ بلکہ وہ تو منتظر رہتے تھے کہ کب حضورؐ انہیں حکم دیں اور کب انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کو لوٹانے کی سعادت نصیب ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب واذہان کی اس کیفیت کی تصویر سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں دکھائی گئی ہے:
﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۫﴾ (آیت ۲۳) ''اور اہلِ ایمان میں کچھ جواں مرد لوگ وہ ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا وہ وعدہ جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا' ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور ان میں کچھ وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں''۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذکورہ سودے (بیع وشراء) کے بعد وہ جواں مرد اپنی جانیں اور اپنے مال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لیے مسلسل بے تاب و بے قرار رہتے تھے۔ کسی شاعر نے اس خوبصورت مضمون کو تغزل کے رنگ میں یوں ادا کیا ہے: ؎

وبالِ دوشِ ہے سر جسمِ ناتواں پہ مگر   لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

کہ اے محبوب! ہم تو اپنے جسمِ ناتواں پر اپنے سر کے اس ''بوجھ'' کو صرف اس لیے اٹھائے پھر رہے ہیں کہ تو جب چاہے اور جہاں چاہے بس اسی وقت وہیں پر ہم تیری راہ میں اسے قربان کر دیں۔ اب تو ہم زندہ ہی اس ''انتظار'' میں ہیں کہ کب تیرا اشارہ ہو اور کب ہم اپنے سر کو کٹوا کر تیری امانت کے اس بوجھ سے سبکدوش ہوں۔

اب رسول اللہ ﷺ کے بعد قیامت تک کے زمانے کے لیے بھی بیعت کے اس لائحہ عمل کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے بعد اس نوعیت کی بیعت جس کسی کے ہاتھ پر بھی ہوگی وہ حضور ﷺ کا کوئی امتی ہی ہوگا۔ لہٰذا اس کی اطاعت مستقل بالذات اطاعت نہیں ہوگی بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہوگی۔ چنانچہ اب اس نوعیت کی بیعت کسی ایسے داعی کے ہاتھ پر ہی ہونی چاہیے جو صرف اور صرف اللہ کے نام پر کھڑا ہوا ہو' لوگوں کو قرآن اور دین کے نام پر پورے خلوص سے دعوت دے رہا ہو اور اس دعوت پر لبیک کہنے والے افراد کو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے ایک جمعیت کی شکل میں منظم کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہو۔ ظاہر ہے ''جمعیت'' کے بغیر اقامتِ دین کے لیے مؤثر اور منظم جدوجہد ممکن نہیں۔

جہاں تک جماعت سازی کے طریق کار کا تعلق ہے آج اس کے لیے بہت سے طریقے رائج ہیں۔ بعض تنظیمیں فارم کے ذریعے رکنیت سازی کرتی ہیں' بعض دستخطی مہم چلا کر ممبر بناتی ہیں۔ کئی جماعتیں اپنے امیر کا انتخاب استصوابِ رائے کے ذریعے سے کرتی ہیں' پھر کہیں دو سال کے لیے امیر منتخب ہوتا ہے اور کہیں چار سال کے لیے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے جائز اور مباح ہیں' لیکن جماعت سازی کا منصوص' مسنون اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خندق کھودنے میں مصروف تھے تو وہ سب مل کر بلند آواز میں یہ شعر پڑھتے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا   عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

کہ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رکھی ہے' اور اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

جماعت سازی کے لیے بیعت کا طریقہ نصِ قرآنی اور نصِ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں مختلف مواقع پر صحابہؓ سے بیعت لی۔ حضور ﷺ کے بعد خلافتِ راشدہ کا سلسلہ بھی بیعت کی بنیاد پر چلا۔ خلیفہ کے انتخاب کے لیے جب طے شدہ طریقہ کار کے مطابق مشاورت ہو جاتی اور ایک فیصلہ کر لیا جاتا تو اس فیصلے پر باقاعدہ اعتماد کا اظہار لوگ بیعت کے ذریعے سے ہی کرتے تھے۔ پھر آگے چل کر جب خلافت کے بارے میں مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے تب بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی اپنی جمعیتوں کی تشکیل بیعت کی بنیاد پر ہی کی تھی۔ حتیٰ کہ دورِ ملوکیت میں بھی مسلمان بادشاہ عوام سے اعتماد کا ووٹ بیعت کے ذریعے سے ہی لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پچھلی صدی میں مسلمانوں کے اندر جتنی جہادی تحریکیں اٹھیں' ان کی رکنیت سازی بھی بیعت کی بنیاد پر کی گئی۔ مثلاً سید احمد بریلویؒ کی سکھوں کے خلاف' مہدی سوڈانی کی انگریزوں کے خلاف اور سنوسیوں کی اطالویوں کے خلاف جہادی تحریکوں کو بیعت کی بنیاد پر ہی منظم کیا گیا۔ صوفیاء کے ہاں بھی اپنے مریدین کے تزکیہ نفس کے لیے ''بیعتِ ارشاد'' کا سلسلہ رائج ہے۔

بہرحال اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے تنظیم سازی اور جمعیت ناگزیر ہے' کیونکہ اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ البتہ کسی داعی کی دعوت پر لبیک کہنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی شخصیت' اس کے معمولات و معاملات' معیارِ تقویٰ' دین و دنیا کے بارے میں اس کے علم و شعور' اقامتِ دین کے لیے اس کی جدوجہد کے طریق کار وغیرہ کے بارے میں اچھی طرح سے تحقیق کر لی جائے۔ پھر جب کسی شخصیت کے بارے میں دل مطمئن ہو جائے کہ واقعی وہ اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں مخلص ہے اور باقی ضروری شرائط پر بھی پورا اُترتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا ساتھ دینا چاہیے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے اندر رہتے ہوئے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیے۔ اور یاد رکھنا چاہیے کہ ''سمع و اطاعت'' کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی تنظیم اپنے ہدف کے حصول کے لیے مؤثر جدوجہد کر سکتی ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾ (الفتح)

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر''

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد عربی ﷺ کو قرآن حکیم دے کر بھیجا ہے جو نوعِ انسانی کے لیے ہدایتِ کاملہ ہے:۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمیں! (اقبال)

مزید برآں آپؐ کو سچا اور کامل دین بھی عطا فرمایا ہے جو عادلانہ نظامِ زندگی کا جامع خاکہ پیش کرتا ہے۔

﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط﴾ ''تاکہ وہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر۔''

گویا قبل ازیں اس سورت کی آیت ۲ اور آیت ۲۰ میں جس سیدھے راستے (صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا) کا ذکر ہے وہ راستہ ''اظہارِ دینِ حق'' کی منزل کی طرف جاتا ہے اور اسی ہدف کو حاصل کرنے کا حکم سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں ''اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ'' کے الفاظ میں ہوا کہ تم دین کو قائم کرو! پھر سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۱ میں جھوٹے معبودوں کے ابطال کی جو دلیل دی گئی ہے اور ان کے مقابلے میں معبودِ حقیقی کی جو شان بیان ہوئی ہے وہ بھی ''الدِّيْن'' (نظامِ زندگی) کے حوالے سے ہے۔ ملاحظہ ہوں متعلقہ آیت کے یہ الفاظ: ﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ط﴾ ''کیا ان کے لیے ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین میں کچھ ایسا طے کر دیا ہو جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟'' یعنی اللہ کی شان تو یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو دینِ حق دیا ہے۔ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور عادلانہ نظامِ زندگی عطا کیا ہے تو کیا اس کا کوئی شریک بھی ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے بھی اپنے ماننے والوں کو کوئی نظامِ زندگی دیا ہے؟ بہرحال اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی ''اظہارِ دینِ حق'' بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے الہدیٰ اور دینِ حق دے کر اپنے رسولؐ کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس ''الدِّین'' کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸﴾ ''اور کافی ہے اللہ مددگار کے طور پر۔''

عام طور پر لفظ شَہِید کا ترجمہ ''گواہ'' کیا جاتا ہے لیکن یہاں پر خصوصی طور پر شہید کا ترجمہ ''مددگار'' ہوگا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جہاں قرآن جیسی ایک سورت بنانے کا چیلنج دینے کے بعد فرمایا گیا: ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کہ بلا لو اس کام کے لیے اپنے تمام مددگاروں کو اللہ کے سوا۔ ''شَهِدَ يَشْهَدُ'' کے معنی کسی موقع یا وقوعہ پر حاضر ہونے کے ہیں۔ ''گواہی'' کے معنی اس لفظ میں اسی حاضری کے مفہوم کی وجہ سے آئے ہیں کیونکہ کسی واقعے کی صحیح گواہی کا اہل تو وہی شخص ہو سکتا ہے جو وہاں اس وقت موقع پر حاضر ہو۔ جبکہ اسی ''حاضری'' کی وجہ سے اس لفظ شہید میں ''مددگار'' کے معنی بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کی مدد وہی شخص کر سکے گا جو آپ کے ساتھ موجود ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جو آپ کا بہت اچھا دوست ہو آپ کے ساتھ مخلص بھی ہو مگر جب آپ کو مدد کی ضرورت ہو اس وقت آپ کے پاس موجود ہی نہ ہو تو وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ سیاق و سباق کے اعتبار سے یہاں لفظ شہید کے معنی مددگار کے ہیں۔

اصحابِ رسولؐ کے اوصاف

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا

سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ (الفتح)

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں' وہ کافروں پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں''

آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر پہلا فقرہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر مکمل کر دیا جائے اور وَالَّذِيْنَ سے دوسرا فقرہ شروع کیا جائے تو آیت کا مفہوم وہی ہو گا جو اوپر ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور جو ان کے ساتھی ہیں وہ کفار پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں۔ لیکن اگر پہلے فقرے کو وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ تک پڑھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور آپؐ کے ساتھی ایک وحدت اور ایک جماعت ہیں۔ اس طرح دوسرے فقرے میں بیان کی گئی دو خصوصیات اس جماعت کی خصوصیات قرار پائیں گی۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے ساتھی کفار پر بہت بھاری اور آپس میں بہت شفیق و مہربان ہیں۔

اہلِ ایمان کی اس شان کا ذکر زیر مطالعہ آیت کے علاوہ سورۃ المائدۃ' آیت ۵۴ میں بھی ہوا ہے۔ وہاں مؤمنین صادقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے' کافروں پر بہت بھاری ہوں گے''۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

یہاں پر یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ یہ آیت بیعت کے تذکرے کے بعد آئی ہے۔ اس ترتیب سے گویا یہ یاد دہانی کرانا مقصود ہے کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ﴾ کے الفاظ میں جس جماعت کا ذکر ہوا ہے وہ بیعت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کی سیرت سے جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص آپؐ پر ایمان لاتا' آپؐ اس سے بیعت لیتے تھے' یہ ایمان کی بیعت تھی۔ لیکن سیرت کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اہلِ مکہ میں سے آپؐ نے کسی سے ایمان کی بیعت کبھی نہیں لی' بلکہ اہل مکہ میں سے جو کوئی ایمان لانا چاہتا وہ کلمۂ شہادت پڑھتا اور حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ اس کے لیے کسی علامتی اقدام کی کبھی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں اگر کوئی شخص باہر سے آتا تو اس سے آپؐ ایمان کی بیعت لیتے تھے۔

اس کے علاوہ مکی دور میں آپ ﷺ نے دو بیعتوں کا خصوصی طور پر اہتمام فرمایا تھا۔ یعنی بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ۔ ان میں بیعتِ عقبہ ثانیہ وہ بیعت ہے جس کی بنیاد پر مسلمان باقاعدہ ایک ''جماعت'' بنے تھے۔

اس بات کی گواہی اس بیعت کے الفاظ بھی دیتے ہیں۔ یہ الفاظ ایک متفق علیہ روایت کے مطابق حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل ہوئے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحابِ اختیار سے جھگڑیں گے نہیں' لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے خوف رہیں گے۔''

غور کیجیے! اس بیعت کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ کس قدر اہم اور سبق آموز ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے۔ خواہ مشکل ہو' خواہ آسانی ہو' خواہ اس کے لیے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں' خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے اور خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے ——— یعنی ہم کبھی شکایت نہیں کریں گے کہ ہم آپؐ کے پرانے ساتھی ہیں' آپؐ ہمیں نظر انداز کر کے ہمارے اوپر ایک نو وارد کو امیر کیوں مقرر کر رہے ہیں؟ بس یہ آپؐ کا اختیار ہوگا کہ آپؐ جس کو چاہیں امیر مقرر کریں' آپؐ جو چاہیں فیصلہ کریں ——— اور یہ کہ ہم آپؐ کے مقرر کردہ امیر سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے ——— اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی بہت واضح ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ)) (متفق علیہ)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

اطاعتِ امیر کے حوالے سے یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ جماعتی زندگی میں ''امیر'' صرف ایک نہیں ہوتا' بلکہ مختلف سطحوں پر اوپر نیچے بہت سے ''اُمراء'' ہوتے ہیں۔ جیسے فوج کا ایک سپہ سالار ہوتا ہے' اس کے نیچے مختلف رجمنٹس' بٹالینز' کمپنیز اور پلاٹونز کے اپنے اپنے کمانڈرز ہوتے ہیں' اسی طرح ایک تنظیم کا ایک مرکزی امیر ہوگا' پھر صوبائی اُمراء' ڈویژنل اُمراء' ضلعی اُمراء ہوں گے اور ان سب اُمراء کا سلسلہ وار سمع و طاعت کا ایک مربوط نظام ہوگا۔

حضور ﷺ کی مذکورہ بیعت کی عبارت کی آخری شق بھی بہت اہم ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے۔ یعنی

مشورہ مانگا جائے گا تو بے لاگ مشورہ دیں گے' اپنی رائے کو چھپا کر نہیں رکھیں گے —— اس حوالے سے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک مامور کی ذمہ داری صرف مشورہ دینے کی حد تک ہے۔ اس کے بعد امیر جو فیصلہ بھی کرے اسے دل و جان سے تسلیم کرنا اس پر لازم ہے' جیسا کہ سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۲۱ کے الفاظ ﴿فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ جب فیصلہ ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہے۔

بہرحال جب منہجِ انقلابِ نبویؐ میں اقدام کا مرحلہ آنے کو تھا' Passive Resistance کی پالیسی Active Resistance کی حکمت عملی میں تبدیل ہونے جا رہی تھی' تو اس وقت مسلمانوں میں ایک باقاعدہ جماعت کا نظم وجود میں آیا اور اس نظم کی بنیاد بیعتِ عقبہ ثانیہ بنی۔ آیت زیر مطالعہ کے الفاظ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ میں اسی جماعت اور اسی نظم کی طرف اشارہ ہے۔

﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ﴾ ''تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے' وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں''

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ﴾ ''ان کی پہچان ان کے چہروں پر (ظاہر) ہے سجدوں کے اثرات کی وجہ سے۔''

سجدوں کے نشان سے عام طور پر پیشانی کا وہ گٹہ مراد لے لیا جاتا ہے جو بعض نمازیوں کے چہروں پر کثرتِ سجود کی وجہ سے پڑ جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس سے اصل مراد ایک نمازی اور متقی مؤمن کے چہرے کی وہ نورانیت اور خاص کیفیت ہے جو اس کے عمل اور کردار کی غمازی کرتی محسوس ہوتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ﴾ ''یہ ہے ان کی مثال تورات میں۔''

یعنی محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ تمثیل تورات میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ نے تورات اور انجیل میں قطع و برید کر کے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے بارے میں پیشین گوئیوں کو بالکل مسخ کر دیا ہے' تاہم آج بھی تورات اور انجیل دونوں میں ایسے جملے موجود ہیں جن کا مصداق نبی آخر الزماں ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کتاب استثناء' باب ۳۳' آیت ۲ ملاحظہ ہو: ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔''

﴿وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۾ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ﴾ ''اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی کونپل' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ سخت ہوئی' پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔''

﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ ''یہ کاشتکار کو بڑی بھلی لگتی ہے''

یہ ایک کھیتی کی مثال ہے۔ بیج کو جب زمین میں دبایا جاتا ہے تو اس سے ایک چھوٹی سی نرم و نازک کونپل

پھوٹتی ہے‘ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے‘ پھر اس کا تنا بنتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک مضبوط پودے کی صورت میں بغیر کسی سہارے کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس طرح جب ایک کھیتی کے تمام پودے اپنے جوبن پر ہوں اور فصل خوب لہلہا رہی ہو تو اسے دیکھ کر کاشتکار کا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ’’تاکہ ان سے کافروں کے دل جلائے۔‘‘

اس آخری جملے میں گویا واضح کر دیا گیا کہ اس مثال یا تشبیہہ کے پردے میں جس کھیتی کی بات ہو رہی ہے وہ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے اور اس کھیتی کا کاشتکار خود اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ چشمِ تصور سے اس جماعت کے چند سال پہلے کے ماضی میں جھانکیں تو ہمیں وہ نقشہ نظر آئے گا جب سرزمینِ مکہ میں دعوت کے بیج سے ایک ایک کر کے اس کھیتی کی نرم و نازک کونپلیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس وقت ان کونپلوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنے بل پر کھڑی ہو سکتیں۔ جناب ابو طالب کے انتقال کے وقت مکہ میں بمشکل ڈیڑھ سو مسلمان تھے۔ خود حضور ﷺ کے قبیلے نے آپؐ سے تعلق توڑ لیا تھا اور قبیلے کی حمایت کے بغیر مکہ میں رہنا بھی بظاہر آپؐ کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر آپؐ اپنی دعوت اور تحریک کے متبادل مرکز کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے تھے‘ لیکن وہاں سے بہت تکلیف دہ حالت میں خالی ہاتھ واپس آنا پڑا تھا۔ طائف سے واپسی تک صورتحال اس حد تک گھمبیر ہو چکی تھی کہ آپ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کے لیے ایک مشرک مطعم بن عدی کی امان لینا پڑی تھی۔ تو ایک صورتِ حال وہ تھی جو کل سرزمینِ مکہ میں اہلِ ایمان کو برداشت کرنا پڑی تھی اور ایک منظر یہ تھا جس کا نظارہ آج حدیبیہ کا میدان کر رہا تھا‘ جہاں چودہ سو یا اٹھارہ سو مجاہدین کی سربکف جمعیت سر کٹانے کے لیے بے تاب و بے قرار تھی۔ ان کا نظم و ضبط‘ ان کا جذبہ ٔ ایثار‘ بیعت علی الموت کے لیے ان کا جوش و خروش‘ پھر جنگ کے ٹل جانے اور جانوں کے بچ جانے پر ان کا ملال اور بظاہر دب کر صلح کرنے پر ان کا رنج۔ غرض ان کی ہر ادا نرالی اور ان کا ہر انداز انوکھا تھا۔ یہ تھی وہ کھیتی جو آج حدیبیہ کے میدان میں لہلہاتی ہوئی دشمنوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس کھیتی کے جوبن کی اس نرالی شان کو آج ملائکہ مقربین بھی رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوں گے اور اس کے ’’نگہبان‘‘ کے اندازِ نگہبانی کی تحسین کے لیے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کے ترانے الاپتے ہوں گے۔

’’لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ‘‘ کے الفاظ میں ایک اہم نکتہ یہ بھی لائق توجہ ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی اس کھیتی پر جس کا دل جلتا ہو قرآن حکیم اس کے ایمان کی نفی کر رہا ہے۔ یعنی یہ کہ صحابہؓ سے بغض ہو اور دعویٰ ایمان کا ہو تو واقعتاً اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾ ’’اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے‘ مغفرت اور اجرِ عظیم کا۔‘‘

تفسیرِ عثمانی میں اس جملے کے حوالے سے یہ وضاحت بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ حضورﷺ کے تمام صحابہؓ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر چکے تھے' پھر بھی یہاں مِنۡهُمۡ کی قید لگا کر ان پر واضح کر دیا گیا کہ اس کیفیت پر موت تک قائم رہنا بھی ضروری ہے' مبادا کہ بعد میں کسی کے اندر کسی قسم کا کوئی تزلزل پیدا ہو جائے۔ انسان چونکہ طبعاً کمزور واقع ہوا ہے' اس لیے اگر اس کو کامیابی کا یقین دلا دیا جائے تو اطمینان کی وجہ سے اس میں تساہل پیدا ہو جاتا ہے' جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند مقام حاصل کر لینے کے باوجود بھی انسان آخری دم تک ''بین الخوف والرجاء'' کی کیفیت میں رہے۔

اسلامی ریاست کے آئین کی بنیاد

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝۱ (الحجرات)

''اے اہلِ ایمان مت آگے بڑھو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہ آیت گویا اسلامی ریاست کے آئین کی بنیاد ہے۔ اسلامی ریاست کے آئین کی پہلی شق یہ ہے کہ حاکمیت اللہ کی ہے اور اقتدارِ مطلق کا مالک صرف اکیلا وہ ہے۔ اس نظری و اعتقادی حقیقت کی تعمیل و تنفیذ کا طریقہ اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسولﷺ نے جو حدود قائم کر دی ہیں ان حدود سے کسی بھی معاملے میں تجاوز نہیں ہوگا۔ اس آیت کے مفہوم کو پاکستان کے ہر دستور میں ان الفاظ کے ساتھ شامل رکھا گیا ہے:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

یہ شق گویا اسلامی ریاست کے آئین کے لیے اصل الاصول کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ آئین پاکستان میں اس شق کے شامل ہونے سے اصولی طور پر تو پاکستان ایک اسلامی ریاست بن گیا' لیکن عملی طور پر اس ''ذمہ داری'' سے جان چھڑانے کے لیے کمال یہ دکھایا گیا کہ ان الفاظ کے ساتھ ایک ہاتھ سے آئین کے اندر اسلام داخل کر کے دوسرے ہاتھ سے نکال لیا گیا۔ آئین پاکستان کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل (Islamic Ideological Council) تشکیل دی گئی اور اسے بظاہر یہ اہم اور مقدس فریضہ سونپا گیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ''قانون سازی'' پر گہری نظر رکھے گی اور اس ضمن میں کسی کوتاہی یا غلطی کی صورت میں حکومت کو رپورٹ پیش کرے گی۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا' لیکن اس میں منافقت یہ برتی گئی کہ آئین کی رو سے حکومت کو نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل کرنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ مذکورہ کونسل نے اقتصادیات اور غیر سودی بینکاری کے حوالے سے بہت مفید سفارشات مرتب کیں۔ بہت سے دوسرے معاملات میں بھی تحقیقاتی رپوٹیں حکومتوں کو بھجوائیں۔ یہاں تک کہ کونسل کی سفارشات جمع ہوتے ہوتے الماریاں بھر گئیں' لیکن کسی حکومت نے ان میں سے کسی ایک سفارش کو بھی تنفیذ کے حوالے سے لائقِ اعتناء نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کونسل

کی تمام تحقیقات اور سفارشات کُلّی طور پر ایک لاحاصل مشق (exercise in futility) بن کر رہ گئیں۔

بہر حال زیر مطالعہ آیت کی رو سے جب کسی ریاست کے آئین میں مذکورہ شق شامل کر لی جائے گی تو اصولی طور پر وہ ریاست اسلامی ریاست بن جائے گی۔ اس کے بعد اس ریاست کے قانون ساز ادارے کو چاہے پارلیمنٹ کہیں، مجلس ملی کہیں یا کانگرس کا نام دیں، اس کی قانون سازی کا دائرۂ اختیار (legislative authority) قرآن وسنت کی بالادستی کے باعث محدود ہو جائے گا۔ یعنی اس ''قدغن'' کے بعد وہ مقننہ اپنے ملک کے لیے صرف قرآن وسنت کے دائرے کے اندر رہ کر ہی قانون سازی کر سکے گی۔ اس دائرے کے اندر جو قانون سازی کی جائے گی وہ جائز اور مباح ہوگی اور اس دائرے کی حدود سے متجاوز ہوتا ہوا کوئی بھی قانون ناجائز اور ممنوع قرار پائے گا، چاہے اس قانون کو مقننہ کے تمام ارکان ہی کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو۔ اس نکتے کو رسول اللہ ﷺ نے ایک مثال کے ذریعے نہایت عمدگی سے واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِیْ آخِیَّتِہٖ ، یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی آخِیَّتِہٖ ......)) (صحیح ابن حبان) ''مؤمن کی مثال اور ایمان کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ گھومنے پھرنے کے بعد پھر اپنے کھونٹے پر واپس لوٹ آتا ہے......'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مؤمن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے کھونٹے سے بندھ چکا ہے، اب وہ اس کھونٹے کے گرد اگرد ایک دائرے میں اپنی مرضی سے چر چگ سکتا ہے، لیکن اس دائرے کی حدود کا تعین اس کھونٹے کی رسّی (حدود اللہ) کے اندر موجود گنجائش کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ اس کے برعکس ایک وہ شخص ہے جو مادر پدر آزاد ہے۔ وہ نہ اللہ کو مانتا ہے، نہ رسول کو جانتا ہے اور نہ ہی ان کے احکام کو پہچانتا ہے، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، جو چاہے کرے اور جس چیز کو چاہے اپنے لیے ''جائز'' قرار دے لے۔ چنانچہ ایسے افراد اگر کسی ملک یا ریاست کے قانون ساز ادارے میں بیٹھے ہوں گے تو وہ کثرتِ رائے سے اپنی ریاست اور قوم کے لیے جو قانون چاہیں منظور کر لیں۔ وہ چاہیں تو ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے دیں اور چاہیں تو مرد کی مرد سے شادی کو قانونی حیثیت دے دیں۔

انسانی مساوات کا قرآنی فلسفہ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿﴾ (الحجرات)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔''

ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر اگر تمام انسان ایک رنگ اور ایک جیسی شکل وصورت کے حامل ہوتے تو ان کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور پھر انہیں رنگ، نسل، زبان وغیرہ کی بنیاد پر مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ کروڑوں، اربوں انسانوں کی پہچان اور تعارف میں کسی سطح پر کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

یہاں دراصل اس اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ انسانوں کے درمیان رنگ ونسل کا فرق اور اقوام وقبائل میں ان کی تقسیم، اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز وتفریق کے لیے نہیں بلکہ ان کی باہمی جان پہچان اور تعارف کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں اس مضمون کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی:

((یَا اَیُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ، اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰی عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی))

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ، یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

عیسائی اسکالر ایچ جی ویلز (۱۸۶۶ء۔۱۹۴۶ء) اپنی کتاب "A Concise History of the World" میں حضور ﷺ کے خطبہ مبارک کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد گویا گھٹنے ٹیک کر آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا یہ حقیقت پسندانہ تبصرہ:

''اگرچہ انسانی اخوت، مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

H.G.Wells کے اس تبصرے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ حضور ﷺ کا بہت بڑا مداح تھا، بلکہ اس نے اپنی اسی کتاب میں حضور ﷺ کی شخصیت پر بہت رکیک حملے بھی کیے ہیں۔ اس حوالے سے اس کا انداز سلمان رشدی ملعون سے ملتا جلتا ہے، لیکن اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسے حضور ﷺ کے حوالے سے تاریخ کی یہ عظیم حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔ مقامِ افسوس ہے کہ بعد کے ایڈیٹرز نے مصنف کے اس اعترافی بیان کو مذکورہ کتاب سے خارج کر دیا ہے۔ اس لیے مذکورہ اقتباس کی تصدیق کے خواہش مند حضرات کو کسی لائبریری سے اس کتاب کا کوئی پرانا ایڈیشن تلاش کرنا پڑے گا۔

ایمان اور اسلام کا فرق

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ

قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات)

آیت ۱۴ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ﴾ ’’یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔‘‘

﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ’’(اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں‘‘

’’لَمْ تُؤْمِنُوْا‘‘ میں نفی جحد بِلَمْ کا نہایت مؤکد اسلوب ہے یعنی یہاں مضارع سے پہلے لَمْ تاکیدی نفی کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ ’’لَمْ تُؤْمِنُوْا‘‘ میں جو خاص تاکید پائی جاتی ہے وہ ’’مَا آمَنْتُمْ‘‘ جیسے الفاظ میں نہیں۔

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ’’اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔‘‘

اس آیت میں جو نکتہ بیان ہوا ہے وہ اسلامی معاشرے کی رکنیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ایمان دراصل ایک نظریے کا نام ہے جو دل کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی طریقے یا ذریعے سے کسی شخص کے ایمان کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلامی معاشرے کے افراد یا اسلامی ریاست کے شہریوں کی قانونی حیثیت کا تعین ’’اسلام‘‘ کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ ’’ایمان‘‘ کی بنیاد پر۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص کے معاملات کا فیصلہ ایمان کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں مردم شماری کے فارم پر مذہب کے خانے میں کسی کے لیے ’’مسلم‘‘ کا لفظ لکھ دینے سے متعلقہ شخص کو قانونی طور پر تو مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا لیکن دنیا میں قانونی طور پر مسلمان بن جانے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں چھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے دل میں ایمان کی کیفیت کو دیکھے اور پرکھے گا۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) (صحیح مسلم) ’’اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا‘ بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے‘‘۔ چنانچہ دُنیوی قانون کے تقاضوں اور نجاتِ اُخروی کے حوالے سے ایمان اور اسلام کے اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ’’لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کوئی کمی نہیں کرے گا۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ’’یقیناً اللہ بہت بخشنے والا‘ بہت مہربان ہے۔‘‘

اگرچہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے یعنی جب تک کسی کے دل میں ایمان نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے‘ اس نے اپنی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل تم لوگوں کو خصوصی رعایت عطا کی ہے‘ چنانچہ اگرچہ تم نے ایمان کا ابھی صرف زبانی اقرار ہی کیا ہے

اور یہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں راسخ نہیں ہوا' پھر بھی اس اقرار کے بعد اگر تم لوگ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو شرفِ قبولیت بخشتا رہے گا۔ اس حوالے سے یہ اہم قانونی اور اصولی نکتہ ضرور مدِ نظر رہنا چاہیے کہ یہاں جس اطاعت کا ذکر ہے اس سے مراد کُلّی اطاعت ہے۔ کیونکہ ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ (البقرۃ:۲۰۸) کے واضح حکم کے بعد اسلام میں جزوی داخلہ اور اللہ تعالیٰ کی جزوی اطاعت قابل قبول ہی نہیں۔

آیت زیر مطالعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایمان کو اسلام سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ کو واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ تا حال ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوا کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے' حالانکہ اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ منافقین کا تو کوئی عمل بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں' جبکہ یہاں متعلقہ لوگوں کو یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس حکم کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے ان حالات کے بارے میں جاننا ضروری ہے جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جزیرۃ العرب میں غلبہ عطا فرما دیا تو کفار و مشرکین کے تمام قبائل پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اب وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں ان کے لیے یہ الٹی میٹم بھی نازل ہو چکا تھا: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (آیت ۵) ''اور جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو قتل کرو ان مشرکین کو جہاں پاؤ' اور پکڑو ان کو' اور گھیراؤ کرو ان کا' اور ان کے لیے ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو''۔ ۹ ہجری کے حج کے موقع پر یہ الٹی میٹم ہر خاص و عام تک پہنچا بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد متعلقہ لوگوں کے پاس صرف چار ماہ کا وقت تھا۔ ان حالات میں مشرک قبائل کے پاس اطاعت قبول کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی راستہ اپنایا اور حضور ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں اپنے اپنے وفد بھیجنے شروع کر دیے۔ اس طرح اس سال مدینہ میں وفود کا تانتا بندھ گیا۔ گویا ہر قبیلہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے اور اسلام میں داخل ہونے کے لیے دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اس صورت حال کا نقشہ سورۃ النصر میں یوں دکھایا گیا ہے: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ②﴾ ''جب آ جائے مدد اللہ کی اور فتح نصیب ہو۔ اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔''

اطاعت قبول کرنے والے ان لوگوں میں تین طرح کے افراد تھے۔ کچھ تو ظاہر ہے خلوصِ نیت سے ایمان لانے والے تھے اور کچھ منافق اور دھوکہ باز جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور تھے۔

لیکن ان دو اقسام کے درمیان تیسری قسم کے کچھ وہ لوگ بھی تھے' جن کے دلوں میں نہ تو دھوکے کی نیت تھی اور نہ ہی ایمان لانے کا سچا جذبہ تھا۔ یعنی وہ مثبت اور منفی دو انتہاؤں کے درمیان ''زیرو پوائنٹ'' پر کھڑے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل ان ہی لوگوں کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کو نہ صرف اطمینان دلایا گیا کہ اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی' بلکہ آگے آیت ۱۷ میں انہیں خوشخبری بھی سنا دی گئی کہ اگر تم خلوصِ دل سے اطاعت کے اس راستے پر چلتے رہو گے تو تمہارے دلوں میں سچا اور حقیقی ایمان بھی پیدا ہو جائے گا۔

دراصل ایمانِ حقیقی اور عمل صالح باہم لازم وملزوم ہیں۔ ایک طرف دل میں ایمانِ حقیقی کی موجودگی اگر اعمالِ صالحہ کے صدور کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف اعمالِ صالحہ کی مداومت بھی ایمان کی تقویت کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اس حوالے سے ٹھوس نتائج کے لیے دل میں مضبوط ارادے اور نیت کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ یعنی دل میں پختہ نیت ہو کہ مجھے ایک سچا اور پکا مؤمن بننا ہے' مؤمن بن کر جینا ہے اور مؤمن کی حیثیت سے اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آج کل کے ماحول میں اول تو ایسی نیت یا آرزو کا دل میں پیدا ہونا ہی مشکل ہے' اور اگر کسی دل میں یہ آرزو پیدا ہو بھی جائے تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ آج کا معاشرہ اور خارج کا موجودہ ماحول ایسی مثبت سوچ کو غذا فراہم نہیں کرتا اور ظاہر ہے جس ماحول میں آکسیجن نہیں ہو گی وہاں کوئی متنفس کیسے زندہ رہ سکے گا۔ اقبالؔ نے اس صورت حال کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

بلکہ ہمارا موجودہ معاشرہ تو اس حوالے سے منفی کردار کے لیے غیر معمولی طور پر حساس اور فعال ہے۔ ایسی کوئی آرزو کسی دل میں ابھی پوری طرح آنکھیں بھی نہیں کھولنے پاتی کہ ماحول کی تمام منفی قوتیں اپنے اپنے ہتھیار سجا کر اس جانِ ناتواں کے محاصرے کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس میں سب سے مؤثر کردار ''اپنوں'' کی ایسی نصیحتوں کا ہوتا ہے کہ دیکھو اپنے گھر بار کی بھی کچھ فکر کرو! کیوں تم اپنا بنا بنایا کیریئر تباہ کرنے پر تُل گئے ہو؟ کیا تمہیں اپنے مستقبل اور اپنے بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دباؤ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ ''نوزائیدہ آرزو'' لحہ بہ لحہ کمزور ہونے لگتی ہے اور بالآخر سسک سسک کر دم توڑ جاتی ہے' اِلّا یہ کہ کسی کے ارادے میں غیر معمولی خلوص واستقامت ہو اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق ونصرت بھی اس کے شاملِ حال ہو۔

بہر حال آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہ بحث تو اسلام اور ایمان کے فرق سے متعلق تھی۔ لیکن اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ حقیقی مؤمن کسے کہتے ہیں تو وہ ''مؤمن'' کی اس تعریف (definition) کو اپنے پیش نظر رکھے جو اگلی آیت (آیت ۱۵) میں بیان کی گئی ہے۔ (اس مضمون کی وضاحت سورۃ الانفال کی آیات ۲'۳ اور ۴'۷ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔)

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے''

یعنی ایسے لوگوں کا ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو کر یقین کی ایسی صورت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے دلوں کے اندر شک کی کوئی گنجائش رہی ہی نہیں۔ جیسے اسی سورت (سورۃ الحجرات) کی آیت ۷ میں صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر رچا بسا دیا ہے۔''

تو جب تک ایمان کسی کے دل میں راسخ نہیں ہوا اور ابھی صرف زبان پر ہے (اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ......) تو یہ اسلام ہے۔ اسی لیے اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر بتائی گئی ہے: (بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ ...... الحدیث) ان پانچ شرائط میں یقین قلبی شامل نہیں ہے' بلکہ نظریاتی طور پر صرف توحید و رسالت کی گواہی دے کر اور اس کے بعد نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کا التزام کر کے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے' لیکن ایمان اس سے اوپر کی منزل ہے۔ گویا مذکورہ پانچ شرائط (پہلی شرط کا تعلق نظریے سے جبکہ باقی چار کا تعلق عمل سے ہے) پوری کر کے جو شخص ''مسلمان'' ہو گیا اسے ''مؤمن'' بننے کے لیے کچھ اضافی شرائط بھی پوری کرنا ہوں گی اور آیت زیر مطالعہ کی رو سے یہ اضافی دو شرائط ہیں' یعنی ''شہادت'' کے ساتھ یقینِ قلبی (لَمْ يَرْتَابُوْا) کی کیفیت کا اضافہ ہوگا اور اعمال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا:

﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ ''یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

گویا کسی شخص کو ''حقیقی مؤمن'' بننے کے لیے مذکورہ ساتوں شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ پہلی پانچ شرائط ''اسلام'' میں داخل ہونے کے لیے جبکہ آخری دو شرائط ''ایمان'' کی منزل حاصل کرنے کے لیے۔ اسلام اور ایمان کے اس فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک مؤمن لامحالہ ''مسلم'' تو ہوگا ہی لیکن ہر ''مسلم'' مؤمن نہیں ہو سکتا۔

اسلام اور ایمان کی اس بحث میں لائق توجہ نکتہ یہ ہے کہ زبان سے: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ......'' کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے مگر دل میں حقیقی ایمان پیدا کرنا اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورے کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنی ''ایمانی کیفیت'' کا جائزہ لیتا رہے۔ خصوصی طور پر اس حوالے سے یہ حقیقت تو ہمیں کسی لمحے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم باطل نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اگر ہم اس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر کے اس کی چاکری کرنا شروع کر دیں گے' یعنی اس نظام کے تحت اپنی معیشت کی ترقی اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی فکر میں لگ جائیں گے تو ایسی

صورت میں ہمیں اپنے ایمان کی خبر لینے کی ضرورت ہوگی۔

دراصل کسی ملک یا معاشرے میں غلبۂ باطل کی صورت میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے لازم ہے کہ وہ اس نظام کے تحت حالتِ احتجاج میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ اور ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ)) (صحیح مسلم) کے مصداق باطل نظام کے تحت وہ ایسے رہے جیسے ایک قیدی جیل کے اندر رہتا ہے۔ یعنی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرنے میں وہ اپنی کم سے کم توانائی صرف کرے اور ان ضروریات کو بھی کم سے کم معیار (subsistance level) پر رکھے' جبکہ اپنا باقی وقت اور اپنی بہترین صلاحیتیں نظامِ باطل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں کھپا دے۔ ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' اگر باطل نظام کے تحت رہتے ہوئے ایک مردِ مسلمان کی زندگی کے شب و روز کا نقشہ ایسا نہیں تو بے شک قانونی طور پر وہ اپنے ملک کا ایک مسلمان شہری ہے' اپنے مسلمان باپ کی وراثت کا حقدار ہے' مسلمان عورت سے شادی کرسکتا ہے اور اس طرح کے دوسرے تمام قانونی حقوق سے بھی مستفید ہوسکتا ہے' لیکن ایسا ''مسلمان'' اللہ کے ہاں ''مؤمن'' شمار نہیں ہوسکتا۔

اس آیت کے بارے میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اس کا آغاز ''اِنَّمَا'' سے ہو رہا ہے اور آخر پر ''اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی آیت کا آغاز بھی اسلوبِ حصر سے ہو رہا ہے اور اختتام پر بھی اسلوبِ حصر آیا ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ مؤمن تو ہیں ہی صرف وہ لوگ جن کے دلوں میں ایمان نے ''یقین'' کی شکل اختیار کرلی اور پھر انہوں نے اپنے جان و مال کو اللہ کی راہ میں کھپا دیا۔ اور صرف یہی لوگ ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ آمین' ثم آمین!

آیت کے آخر میں ان مؤمنین کو جو سرٹیفکیٹ (اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ) عطا ہوا ہے اس کی اہمیت کو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت میں اہل ایمان کو صادقین کے ساتھ شامل ہونے (کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ) کا حکم دیا گیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''صادقین'' کون ہیں۔ اس نکتے کو اس طرح سمجھیں کہ آیت زیر مطالعہ میں مؤمنین صادقین کی دو نشانیاں (ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) ہماری راہنمائی کے لیے بتائی گئی ہیں کہ مسلمانو! اٹھو اس ''چراغ'' کی روشنی میں ''مؤمنینِ صادقین'' کو تلاش کرو اور پھر ان کے مشن کی جدوجہد میں ان کے دست و بازو بن جاؤ!

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ، لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ، حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ عَلٰی ذٰلِکَ)) (صحیح البخاری) ''میری اُمت میں سے ایک گروہ اللہ کے حکم کو قائم کرنے والا ہمیشہ موجود رہے گا۔ ان کا ساتھ چھوڑ دینے والے اور ان

کی مخالفت کرنے والے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا' اور وہ اسی پر قائم ہوں گے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''مؤمنین صادقین'' آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں تلاش کریں اور ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تا کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِينَ مَعَهٗ﴾ (الفتح:۲۹) کی طرز پر ایک مضبوط ''حزب اللہ'' تشکیل پا سکے۔ ظاہر ہے افراد کے اتحاد کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت وجود میں آ سکتی ہے' نہ اقامتِ دین کی جدوجہد آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی ''اظہارِ دینِ حق'' کی شانِ تکمیلی کا ظہور ممکن ہو سکتا ہے۔

نفسِ انسانی کی وسوسہ اندازی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶ (ق)

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔''

یہ اُس قوتِ شر کا ذکر ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ نفسِ انسانی کے شر کا ذکر سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۳﴾ ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

فطری طور پر انسان کے اندر داعیہ خیر بھی پایا جاتا ہے اور داعیہ شر بھی۔ انسان کی اندرونی قوتِ شر کو سورۂ یوسف کی مذکورہ آیت میں ''نفسِ امارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ فرائیڈ اسے id یا libido کہتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر خیر کی قوت اس کی روح ہے جس کا مسکن قلبِ انسانی ہے۔ انسان کی روح اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس داعیہ یا قوت کو فرائیڈ super ego کا نام دیتا ہے' یعنی ego (انسانی انا) کا اعلیٰ درجہ۔ فرائیڈ کے دیے ہوئے یہ عنوانات تو کسی حد تک ہمارے لیے قابل قبول ہیں' لیکن ان عنوانات کی تشریح جو اُس نے کی ہے اسے ہم درست نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی سائنسدان اور فلاسفر سب کے سب ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ صرف ''عالمِ خلق'' یعنی اسباب وعلل کی دنیا سے واقف ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مادی دنیا کے اَسرار و رموز کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس میدان میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کے ایسے معیار قائم کیے ہیں کہ انسانی عقل واقعی دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ''عالمِ امر'' کے بارے میں وہ بالکل اندھے اور کورے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں روح' وحی اور فرشتوں وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''انسان'' کے بارے میں ان کے فلسفیانہ تجزیے اکثر درست نہیں ہوتے۔ بہر حال آیت زیر مطالعہ میں انسان کے اندر موجود قوتِ شر (نفسِ امارہ) کا ذکر ہے کہ انسان کا نفس اسے جو پٹیاں پڑھاتا ہے اس کی تفصیلات اس کے خالق سے

پوشیدہ نہیں ہیں۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ⑯﴾ ''اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قرب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے' بقول شاعر یہ قرب ''بے تکیف و بے قیاس'' ہے: ؎

اتّصالے بے تکیف بے قیاس ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس قرب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہم اس ''معیت'' کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر بھی ہے۔ اس کا چہرہ کیسا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ وہ کیسے نزول فرماتا ہے؟ ہم اس نزول کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے معاملات میں خواہ مخواہ کا تجسس ہمیں فتنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں آخری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ''عالمِ امر'' اور اس کی کیفیات ہماری سمجھ سے وراء الوراء ہیں۔ ہم اپنے حواسِ خمسہ اور عقل وشعور کے ذریعے جو علم حاصل کر سکتے ہیں اس کا تعلق ''عالمِ خلق'' سے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی ''دائرے'' میں رہتے ہوئے سوچیں' سمجھیں' تحقیق کریں' نتائج اخذ کریں اور ان نتائج کو بروئے کار لائیں۔ دوسری طرف ''عالمِ امر'' سے متعلق جو معلومات وحی کے ذریعے ہم تک پہنچیں انہیں مِن وعَن تسلیم کر لیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے الفاظ ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ میں اسی طرزِ عمل کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں مذکور لفظ ''اَقْرَبُ'' کے حوالے سے ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جان سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس قرب کی منطق اور کیفیت کے بارے میں ہمیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید!

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿٤٧﴾ (الذاریات)

''اور آسمان کو ہم نے بنایا اپنے ہاتھوں سے اور ہم (اس کو) توسیع دینے والے ہیں۔''

اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ عام طور پر ''ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں'' یا ''ہم بڑی قدرت والے ہیں'' کیا جاتا رہا ہے' لیکن لغوی اعتبار سے اس کا یہ ترجمہ زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ہے جو اوپر متن میں اختیار کیا گیا ہے۔ اَوْسَعَ یُوْسِعُ باب افعال ہے' جس کا مطلب ہے کشادہ کرنا' وسعت دینا۔ وَسِعَ ثلاثی مجرد ہے' جس سے اسم الفاعل وَاسِعٌ آتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ کا مطلب ہے: اللہ بڑی وسعت والا ہے' اس کے

خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ مُوْسِع باب افعال سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معنی ہوں گے: وسعت دینے والا۔ اس لحاظ سے یہاں ﴿اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کائنات کو مسلسل وسعت بخش رہے ہیں' اسے وسیع سے وسیع تر کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہی بات ہے جو آج ہمیں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تک انسان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا' مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر گھڑی نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں' ہر آن نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں اور یہ کائنات مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے۔

''Expanding Universe'' کے اس تصور کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنْ فَیَکُوْن کا ظہور مسلسل جاری ہے۔ اس مفہوم کو سورۂ فاطر کی پہلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ﴾ ''وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے۔''

انسان کا مقصدِ تخلیق

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾ (الذاریات)

''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

زندگی آمد برائے بندگی — زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تخلیقِ انسانی کی غایت بیان کی گئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس تخلیق کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر زمانے کے فلاسفر اور حکماء نے اپنی اپنی آراء دی ہیں۔ یہ ان تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ بہرحال ایک عام شخص کے لیے تخلیقِ کائنات کے سبب کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں۔ البتہ اپنی تخلیق کی غرض و غایت کے بارے میں جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان کو اپنی غایتِ تخلیق ہی کا علم نہیں ہوگا تو گویا اس کی ساری زندگی رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں بنی نوع انسان کو ان کی غایتِ تخلیق واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ''بندگی'' کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس مضمون کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ بندگی یا عبادت کے تین حصے ہیں: اوّلاً ہمہ تن اطاعت' ثانیاً اطاعت کی روح یعنی اللہ تعالیٰ کی غایت درجے کی محبت۔ عبادت اصلاً ان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے (اَلْعِبَادَۃُ تَجْمَعُ اَصْلَیْنِ: غَایَۃَ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ)۔ جبکہ تیسری چیز مراسمِ عبودیت ہے' جس کی حیثیت عبادت کے ظاہر یا جسم کی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی حالت (قنوت) میں کھڑے ہونا (قیام)' رکوع' سجدہ' حمدیہ کلمات ادا کرنا' نماز وغیرہ مراسمِ عبودیت ہیں اور ان کی اپنی

اہمیت ہے۔ اگر ہم عبادت کی اس تعریف (اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت) کی روشنی میں آج اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت واضح ہو گی کہ ہم میں سے جو لوگ اپنے زعم میں شب و روز پابندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر کمربستہ ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس کا واضح تر مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کا غالب حصہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت سے نکلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس پر کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اس نظام کے تحت رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا عبادت کے تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے خواہش مند حضرات اس موضوع پر میری کتب اور تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں پر مختصراً یہ سمجھ لیں کہ مادی و علمی لحاظ سے انسان جس قدر چاہے ترقی کر لے لیکن اگر وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا بندگی کے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہا تو انسانی سطح پر اس کی ساری زندگی بیکار اور رائیگاں ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں انسان کی اسی ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿﴾ (القمر)

''اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!''

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے اور اس میں ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیش نظر پوری سورت میں اس آیت کو چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد ایک بندے پر گویا اتمامِ حجت ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے استطاعت بھر کوشش شروع کر دے۔ خصوصی طور پر پڑھے لکھے خواتین و حضرات پر تو گویا فرض ہے کہ وہ عربی سیکھیں اور قرآن حکیم کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ باقی علوم سیکھ سکتے ہیں تو قرآن حکیم کا علم باقاعدہ حاصل نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس قدر اہم اور بنیادی فرض کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے کی ترغیب تو دی جاتی ہے، مختلف اَذکار و وظائف کے ثواب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اپنی اپنی استطاعت کے

مطابق قرآن حکیم کے مطالب ومفاہیم کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عربی زبان سیکھنے کے حوالے سے ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ ایک زندہ زبان ہے' دنیا کے ایک بہت بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ آج کوئی بین الاقوامی فورم ایسا نہیں جہاں پر عربی ترجمہ پیش کرنے کا انتظام نہ ہو۔ ہم مسلمانوں کو اپنی الہامی کتاب کی زبان کو سیکھنے کے لیے یہودیوں اور ہندوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ قومیں اپنی مُردہ زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو زندہ کر سکتی ہیں تو ہم اپنی زندہ زبان کو کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ بہرحال آج نوجوان نسل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کے معانی ومفہوم کی تعلیم حاصل کرنا حسب استطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت باز پرس ہوگی۔

عظمتِ قرآن کے بیان کا خصوصی انداز

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (الرحمٰن)

آیت ۱ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾﴾ ''رحمٰن نے''

رحمٰن' اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے' اس کا مادہ ''ر ح م'' ہے اور یہ فَعلان کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ان کے مفہوم میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ (الاعراف: ۱۵۰ اور طٰہٰ: ۸۶) غَضْبان کا لفظ آیا ہے' اس کے معنی ہیں: غصے سے بہت زیادہ بھرا ہوا۔ اسی طرح اَنَا عَطْشَان کا مطلب ہے کہ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں اور اَنَا جَوْعَان کے معنی ہیں کہ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ لغوی اعتبار سے لفظ ''رحمٰن'' کے مفہوم میں ایک طوفانی شان پائی جاتی ہے (لفظ ''طوفان'' بھی اسی وزن پر ہے' اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے)۔ اس مفہوم کو ہم اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ کسی مخلوق کا کوئی فرد بھی اس کی رحمت سے مستغنی نہیں۔ خاص طور پر بنی نوعِ انسانی تو دنیا میں بھی اُس کی رحمت کی محتاج ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت میں نہیں جا سکے گا جب تک کہ رحمتِ خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا آپؐ بھی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ((وَلَا اَنَا، اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِمَغْفِرَةٍ وَرَحْمَةٍ)) (متفق علیہ) ''ہاں میں بھی نہیں' اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں رحمٰن چوٹی کا نام ہے۔

آیت ۲ ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾﴾ ''قرآن سکھایا۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام رحمٰن ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو علم سکھایا ہے

اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے۔ اکتسابی علم (acquired knowledge) میں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو الہامی علم (revealed knowledge) عطا ہوا ہے اس میں چوٹی کا علم قرآن ہے‘ جو ہر قسم کے تمام علوم کی معراج ہے۔

آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾﴾ ’’اُسی نے انسان کو بنایا۔‘‘

ان آیات میں مذکور تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی معراج (climax) انسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ النحل‘ آیت ۴۰ کی تشریح) دونوں کو جمع فرما دیا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص: ۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔

آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾﴾ ’’اس کو بیان سکھایا۔‘‘

یعنی بولنا سکھایا‘ اسے گویائی کی صلاحیت بخشی۔ آیات زیر مطالعہ کے حوالے سے یہ چوتھا اہم نکتہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں میں سے چوٹی کی صلاحیت قوتِ بیان (گویائی) ہے۔ آج میڈیکل سائنس کی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی قوتِ گویائی کا تعلق اس کے دماغ کی خصوصی بناوٹ سے ہے۔ سائنس کی زبان میں تو انسان بھی گویا ایک حیوان ہی ہے‘ لیکن اس کے بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہا گیا ہے۔ دماغ تو ظاہر ہے انسان سمیت تمام جانوروں کو دیا گیا ہے‘ لیکن ہر جانور کے دماغ کی بناوٹ اور صلاحیت مختلف ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا دماغ تمام حیوانات کے دماغوں میں سب سے اعلیٰ ہے اور اس میں بہت سی ایسی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جو کسی اور جانور کے دماغ میں نہیں ہیں۔ بہرحال استعداد کے حوالے سے حیوانی دماغ کی بناوٹ نچلی سطح سے ترقی کر کے گوریلوں اور چیمپنزیز (champenzies) کے دماغ کی سطح تک پہنچتی ہے‘ اور پھر اس ترقی کی معراج انسان کا دماغ ہے۔ انسانی دماغ کے مختلف حصے ہیں‘ مثلاً سماعت سے متعلقہ حصہ‘ بصارت سے متعلقہ حصہ وغیرہ۔ حواس (آنکھ‘ کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والی معلومات پہلے دماغ کے متعلقہ حصے میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے gray matter کے پچھلے حصے میں پہنچتی ہیں۔ لیکن انسانی دماغ کا سب سے اہم اور بڑا حصہ speech centre ہے‘ اور پھر اس میں بھی کلام کے فہم اور ابلاغ سے متعلق دو الگ الگ حصے ہیں‘ یعنی ایک حصے میں دوسروں کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ دوسرا حصہ دوسروں تک بات پہنچانے سے متعلق ہے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے‘ لیکن قوتِ گویائی کے علاوہ انسان کی باقی تقریباً تمام صلاحیتیں کسی نہ کسی سطح پر کسی نہ کسی درجے میں دوسرے حیوانات کو بھی ملی ہیں‘ بلکہ بعض حیوانات کی بعض صلاحیتیں تو انسان کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ بعض جانوروں کی بصارت ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ تیز ہے‘ کئی جانور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دیکھنے کے لیے روشنی کے محتاج ہیں۔ گھوڑے کی

قوتِ سماعت انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح کتوں کے دماغ میں سونگھنے کا حصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سونگھنے کی حس انسان کے مقابلے میں سوگنا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے مختلف جانوروں کو ایک سے ایک بڑھ کر صلاحیتوں سے نوازا ہے' لیکن بیان اور گویائی ایک ایسی صلاحیت ہے جو صرف اور صرف انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس تمہید کے بعد آیئے اب ان آیات کو دوبارہ پڑھئے۔ ان چار آیات سے تین جملے بنتے ہیں۔ پہلی آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝١﴾ جملہ نہیں ہے' یہ مبتدأ ہے اور ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢﴾ اس کی خبر ہے۔ چنانچہ پہلی اور دوسری آیت کے ملنے سے مکمل جملہ بنتا ہے۔ یعنی ''رحمٰن نے قرآن سکھایا''۔ اس کے بعد آیت ۳ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝٣﴾ ''اُس نے انسان کو پیدا کیا'' بھی مکمل جملہ ہے اور آیت ۴ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝٤﴾ ''اسے بیان کی صلاحیت عطا کی'' بھی مکمل جملہ ہے ـــــ اب ان آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے اعلیٰ نام کے حوالے سے سب سے اعلیٰ علم (قرآن) کا ذکر کیا۔ پھر اپنی چوٹی کی مخلوق (انسان) اور اس مخلوق کی چوٹی کی صلاحیت (بیان) کا ذکر کیا۔ اس زاویے سے غور کیا جائے تو یہ تین جملے ریاضی کے کسی سوال کی طرح ''جواب'' کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح ریاضی کے ''نسبت وتناسب'' کے سوالات میں تین رقموں (values) کی مدد سے چوتھی رقم معلوم کی جاتی ہے' اسی طرح ان تین جملوں پر غور کرنے سے اس عبارت کے اصل مدّعا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ''رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت عطا فرمائی''۔ کس لیے؟ ـــــ جواب بالکل واضح ہے: ''قرآن کے بیان کے لیے!'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ ترین مخلوق کو ''بیان'' کی انمول صلاحیت سے اس لیے تو نہیں نوازا کہ وہ اسے لہو ولعب میں ضائع کرتا پھرے' یا دلائل کے انبار لگانے والا وکیل یا شعلہ بیان مقرر بن کر اسے حصولِ دولت وشہرت کا ذریعہ بنا لے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ توپ اس لیے تو نہیں بنائی جاتی کہ اس سے مکھیاں ماری جائیں۔ چنانچہ انسان کی اس بہترین صلاحیت کا بہترین مصرف یہ ہوگا کہ وہ اسے بہترین علم کے سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بنائے۔ یعنی اپنی قوتِ بیان کو قرآن کی تعلیم اور نشرواشاعت کے لیے وقف کر دے۔

ان آیات کے اس مفہوم کو حضور ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) (صحیح البخاری) یہاں خَيْرُكُمْ کا صیغہ تفضیلِ کُل (superlative degree) کے مفہوم میں آیا ہے کہ تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث کے حوالے سے ضمنی طور پر یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس کے راوی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام اور حدیث کے لفظ ''قرآن'' کے قافیے بھی زیرمطالعہ آیات کے قافیوں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یعنی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس حدیث کی ان آیات کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سورۃ القمر کی ترجیعی آیت ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ ......﴾ کے

مفہوم اور اس کے پُرشکوہ اسلوب کو بھی مدِنظر رکھا جائے اور ان آیات کی ترتیب پر بھی غور کیا جائے کہ سورۃ القمر کی مذکورہ آیت کو بار بار دہرانے کے فوراً بعد سورۃ الرحمٰن کی یہ آیات آئی ہیں تو ان آیات کا مذکورہ مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان آیات کے بین السطور یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی قرآن حکیم جیسی عظیم نعمت کا حق ادا کرنا لازم ہے۔

قرآن مجید کے حقوق میں کوتاہی کے حوالے سے ایک سخت وعید

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ (الواقعہ)

آیت ۷۵ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾﴾ ''پس نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔''

بعض مفسرین نے مَوٰقِعِ النُّجُوْم کی وضاحت شہابِ ثاقب کے حوالے سے کی ہے' حالانکہ شہابِ ثاقب بالکل مختلف چیز ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسے شیاطین کو عالمِ بالا سے مار بھگانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ بہرحال موجودہ دور میں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس آیت کو نسبتاً بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے' اگرچہ ابھی بھی اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ حلال و حرام' جائز و ناجائز' اور دین کے عملی پہلو سے متعلق قرآنی احکام کی تفہیم و تعمیل کے حوالے سے ہمیں راہنمائی کے لیے ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!'' کے مصداق پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظری و عملی اطاعت کا کمال یہ ہوگا کہ ہم اپنے اسلاف کا دامن تھامے رکھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کو لازم جانیں۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے خود کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچا دیں' بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

البتہ دوسری طرف کائنات کی تخلیق' کائنات میں زندگی کی ابتدا' تاریخی حوالہ جات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کے لیے ہمیں ہر دور کے اجتماعی انسانی شعور اور دستیاب حقائق و معلومات کو مدنظر رکھنا چاہیے' پھر جہاں مناسب معلوم ہو ان معلومات سے استفادہ بھی کرنا چاہیے اور جب ممکن نظر آئے تکلف سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں قرآنی الفاظ و معانی کا زمینی حقائق کے ساتھ تطابق ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ایسی آیات کا جو مفہوم آج سے ہزار سال پہلے سمجھا گیا تھا آج ہم اس مفہوم کو ماننے اور درست جاننے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسی آیات کا تعلق حکمت

سے ہے' احکام سے نہیں ہے۔ چنانچہ حکمت اور سائنس کے میدان میں تو نئے نئے اُفق تلاش کرنے کے لیے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے' لیکن احکام اور دین کے عملی پہلو کو سمجھنے' سمجھانے کے لیے ماضی سے تعلق جوڑنے اور حضور ﷺ کے فرمان ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' کو مشعلِ راہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

اب آیئے آیت زیر مطالعہ کو ہم موجودہ دور کی سائنسی معلومات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس دانوں نے کائنات کے اندر ایسے بے شمار بڑے بڑے اندھے غاروں کا کھوج لگایا ہے جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو نگل جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ان ''غاروں'' کو Black Holes کا نام دیا ہے۔ ایسے کسی ایک بلیک ہول کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ستارے پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں' بلکہ ایسے کروڑوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی ایسے بلیک ہولز کے اندر گم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ کائنات کے اندر مسلسل نئے نئے ستارے جنم لے رہے ہیں اور نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں' جبکہ ساتھ ہی ساتھ بے شمار کہکشائیں اپنے اَن گنت ستاروں کے ساتھ مسلسل بلیک ہولز کی نذر ہو کر معدوم ہو رہی ہیں۔ اگرچہ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق آج بھی انسان کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن پھر بھی بلیک ہولز کے متعلق اب تک حاصل ہونے والی یہ معلومات بہت ہوش رُبا ہیں۔

اب اگر ہم اپنی زمین کی جسامت اور وسعت کا نقشہ ذہن میں رکھیں' پھر اس کے مقابلے میں سورج کی جسامت کا اندازہ کریں' پھر یہ تصور کریں کہ کائنات میں ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اربوں کھربوں ستارے بھی موجود ہیں اور ان ستاروں کے درمیان اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں' پھر یہ تصور کریں کہ ایسے اَن گنت ستاروں پر مشتمل ان گنت کہکشائیں ہیں' اور ان کہکشاؤں کے درمیانی فاصلے بھی اسی تناسب سے ہیں۔ کہکشاؤں اور ستاروں سے متعلق یہ تمام معلومات ذہن میں رکھ کر اگر ہم کائنات کے طول و عرض میں موجود لاتعداد بلیک ہولز کا تصور کریں اور پھر یہ نقشہ ذہن میں لائیں کہ ان میں سے ایک ایک بلیک ہول اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے پاس سے گزرنے والی کسی بڑی سے بڑی کہکشاں کو آنِ واحد میں ایسے نگل جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اور پھر ان بلیک ہولز کا اطلاق مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ پر کریں تو شاید ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس آیت میں جس قسم کا ذکر ہوا ہے وہ کتنی بڑی قسم ہے۔

آیت ۷۶ ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!''

یعنی ابھی تم مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں ان کی حقیقت سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی' پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے یہ کس قدر عظیم قسم پیش کی ہے۔

آیت ۷۷ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾﴾ ''یقیناً یہ بہت عزت والا قرآن ہے۔''

یہاں پر ہم میں سے ہر شخص کو پوری دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اپنی حد تک قرآن

مجید کی کیا قدر کی ہے اور کس حد تک اس کے حقوق پورے کیے ہیں؟ بہر حال جہاں تک قرآن حکیم کے حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی انسان کو ہزاروں زندگیاں بھی مل جائیں اور وہ انہیں ''قرآن حکیم'' کے لیے وقف کر دے' تب بھی اس سے قرآن حکیم کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

آیت ۷۸ ﴿فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿۷۸﴾﴾ ''ایک چھپی ہوئی کتاب میں۔''

یہ قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اس کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ کو اُمّ الْکِتَاب کا نام دیا گیا ہے: ﴿وَ اِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا' بہت حکمت والی!'' جبکہ سورۃ البروج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۲۱﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''بلکہ یہ قرآن عظیم الشان (کتاب) ہے۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

آیت ۷۹ ﴿لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''اسے چھو نہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔''

یعنی اسے فرشتے ہی چھو سکتے ہیں جو بالکل پاک مخلوق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں سورۂ عبس میں فرمایا گیا ہے: ﴿کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿۱۲﴾ فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ﴿۱۳﴾ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو باعزت ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں جو معزز اور نیک ہیں۔''

آیت زیر مطالعہ میں الۡمُطَہَّرُوۡنَ سے مراد فرشتے ہیں اور یَمَسُّہٗ میں ہٗ کی ضمیر کا تعلق ''کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ'' سے ہے۔ لہٰذا ''مَوٰقِعِ النُّجُوم'' کی قسم کا مقسم علیہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت باعزت اور باعظمت کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے' جس تک اُس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ یعنی اس کو صرف ملائکہ مقرّبین چھو سکتے ہیں' جِنّات اور شیاطین وہاں پھٹک بھی نہیں سکتے۔

فقہاء نے اس آیت سے یہ حکم بھی استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید کو ناپاکی کی حالت میں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو چھونے اور چھو کر پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے' جبکہ زبانی تلاوت بغیر وضو بھی کی جا سکتی ہے' البتہ جنابت کی حالت میں قرآن مجید کے الفاظ کو زبانی پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کے اصل لُبِ لُباب تک پہنچنے اور اس کی ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے باطنی صفائی ضروری ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کے ظاہر اور باطن کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں پڑھتے ہیں: ﴿ہُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''کہ وہ اول بھی ہے' آخر بھی ہے' ظاہر بھی ہے اور باطن بھی

ہے''۔اسی طرح قرآن حکیم کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔قرآن حکیم کا ظاہر اس کی عبارت اور اس کے الفاظ ہیں۔جہاں تک قرآن حکیم کے اس ظاہر کا تعلق ہے ہر عربی دان شخص اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی صرف ونحو پر بحث کر سکتا ہے۔اس اعتبار سے کئی ایسے غیر مسلموں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے عربی میں مہارت حاصل کر کے قرآن حکیم کے تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں' لیکن ایسے لوگ قرآن حکیم کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔علامہ اقبال نے اسی مفہوم میں ایسی ہی بات اس شعر میں بندۂ مؤمن کے بارے میں کہی ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

اقبال نے اس شعر میں بندۂ مؤمن کے وجود کے مرکز کا ذکر کیا ہے۔بالکل اسی مفہوم میں قرآن مجید کا بھی ''مرکز'' ہے۔قرآن حکیم کے مرکز سے مراد اس کی روح باطنی' اس کی ہدایت' اس کا اصل علم اور اس کا لُبِّ لُباب ہے۔اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن مجید کے مرکز (nucleus) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تزکیہ باطنی ضروری ہے۔اس تزکیہ باطنی کا ذکر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل ﷉ کی اس دعا میں بھی ہے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ﴾ (البقرۃ: ۱۲۹) ''پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔''

یہاں پر ایک نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں تعلیمِ کتاب وحکمت کا ذکر پہلے کیا اور تزکیہ کو آخر پر رکھا' لیکن جب حضور ﷺ کے حوالے سے ان ہی چار امور کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ترتیب بدل دی۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین مقامات (البقرۃ:۱۵۱' آل عمران:۱۶۴' الجمعہ:۲) پر حضور ﷺ کی ان ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے اور تینوں مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی روحِ باطنی تک رسائی کا طالب ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تکبر' حسد' حُبِّ دُنیا سمیت تمام خباثتوں سے پاک کرے' ورنہ قرآن مجید کا نور اس کے باطن میں کبھی سرایت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اصل فہم اس پر کبھی منکشف ہوگا' اگرچہ بظاہر وہ قرآن حکیم کا بہت بڑا مفسر ہی کیوں نہ بن جائے۔تزکیۂ باطن کے حوالے سے یہاں سورۂ یونس کی آیت ۵۷ کا پیغام بھی ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم کو انسانی دل کی تمام باطنی امراض کے لیے شفا قرار دیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾ ''اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔''

آیت ۸۰ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰﴾ ''اس کا اتارا جانا ہے ربّ العالمین کی جانب سے۔''

قرآن حکیم کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد اب یہ چبھتا ہوا سوال (piercing question) پوچھا جا رہا ہے:

آیت ۸۱ ﴿اَفَبِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡهِنُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مداہنت کر رہے ہو؟''

اس آیت کا مفہوم ہمیں تب سمجھ آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک خود کو اس کا مخاطب سمجھے کہ یہ آیت براہِ راست اس سے پوچھ رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! کیا تم اپنے دُنیوی معاملات و مفادات کو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے مقابلے میں ترجیح دے رہے ہو؟ کیا تم اس عظیم کتاب کو سیکھنے سکھانے اور سمجھنے سمجھانے میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟ ذرا سوچو تو! تم نے کیسے کیسے مشکل علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے تم نے کیسی کیسی محنت کی ہے اور کتنا وقت کھپایا ہے! اس کے مقابلے میں قرآنی زبان سیکھنے کے لیے تم نے کتنی کوشش کی ہے؟ تو کیا تم نے اپنی دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس قدر عظیم نعمت کو پسِ پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

آیت ۸۲ ﴿وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلا رہے ہو!''

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ قرآن حکیم کا جھٹلانا ایک تو زبانی ہے اور دوسرا عملی۔ زبانی اور نظریاتی طور پر تو قرآن مجید کو مشرکینِ عرب جھٹلاتے تھے یا ہر زمانے کے بہت سے غیر مسلم جھٹلاتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے، جبکہ عملی طور پر اسے ہم مسلمان جھٹلاتے ہیں۔ ہم نظریاتی طور پر تو اسے اللہ تعالیٰ کا کلام مانتے ہیں اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اس کے احکام ماننے سے کھلم کھلا اعراض کرتے ہیں۔ ہماری اس کیفیت کی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الجمعۃ:۵) کہ جو لوگ حاملِ تورات بنائے گئے اور پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو، اور یہ بہت بُری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی —— اگر آپ ایک گدھے پر مکالماتِ افلاطون اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں لاد دیں تو ظاہر ہے ان کتابوں کو اٹھا لینے سے وہ ان کا عالم تو نہیں بن جائے گا۔ سورۃ الجمعہ کی اس آیت کی روشنی میں یہودیوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو انہوں نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی، بلکہ وہ ابھی تک اسے اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کی جس تکذیب کا ذکر کیا ہے وہ عملی تکذیب ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی آج قرآن مجید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کر کے مذکورہ بالا مثال کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق تو ہمارے اس طرزِ عمل سے قرآن مجید پر ہمارے زبانی ایمان کی بھی تکذیب ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ)) (سنن الترمذی) ''جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔''

قرآن مجید کی اس عملی تکذیب کے علاوہ آج ہم مسلمان اس کی ''تکذیبِ حالی'' کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ تکذیب حالی یہ ہے کہ کسی شخص کا حال اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہو کہ اس کے نزدیک فلاں چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے اپنی تکذیبِ حالی کو آپ اپنے ہاں کے ایک عام ڈاکٹر کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں جس نے رات دن ایک کر کے پچیس سال کی عمر میں ایم بی بی ایس کیا۔ پھر FRCS کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ گیا' وہاں جا کر امتحان دیا۔ وہاں کے بورڈز سے یہ ڈپلومہ' وہ ڈپلومہ......! اس پڑھائی میں اس نے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال کھپا دیے۔ اس کے بعد وہیں ملازمت اختیار کر لی یا واپس آ کر اپنی ملازمت اور پریکٹس میں کولہو کے بیل کی طرح جُت گیا۔ مشن کیا ہے؟ معاش اچھی ہو جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو جائے! یہ مشن تو اس نے حاصل کر لیا' لیکن اپنی زندگی کے ماہ وسال میں سے کیا اُس نے قرآن مجید سیکھنے کے لیے کوئی وقت نکالا اور کیا اس کے لیے کوئی محنت کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو اس کا حال گویا چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں قرآن مجید کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں یقین نہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات میں قرآن حکیم کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب مثبت انداز میں دلائی گئی تھی' جبکہ سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں اسی ترغیب کے لیے منفی انداز اپنایا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الرحمٰن کی چار ابتدائی آیات کے بین السطور میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر رحمٰن نے اپنا کلام ''قرآن'' تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہیں ''بیان'' کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے تو تمہاری اس طلاقتِ لسانی کا بہترین اور لازمی مصرف یہی ہے کہ تم اس صلاحیت کو قرآن کے لیے وقف کر دو۔ جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں یہ تنبیہہ مضمر ہے کہ جو لوگ قرآن کے حقوق کماحقہ ادا نہیں کرتے آخرت میں انہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور کوتاہی ثابت ہونے پر ان کی سخت گرفت ہو گی۔

وحی و رسالت کا بنیادی مقصد: نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ (الحدید)

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ''

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری''

یہاں تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: (۱) بیّنات' (۲) کتاب' اور (۳) میزان —— ان میں سب سے پہلی چیز ''بیّنات'' ہے۔ ''بیّن'' اُس شے کو کہتے ہیں جو از خود ظاہر اور نمایاں ہو اور اس کے تعارف کے لیے کسی دلیل اور وضاحت کی حاجت نہ ہو۔ ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یہ لفظ قرآن حکیم میں عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔

''کتاب'' کا لفظ عام فہم اور بالکل واضح ہے' جبکہ ''میزان'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ وہ نظام ہے جس میں حقوق و فرائض کا بہترین توازن پایا جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں اگر انسانوں کے حقوق و فرائض کے مابین توازن ہوگا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا' اور اگر کسی معاشرے میں اس حوالے سے عدمِ توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم' عدوان' زیادتی اور ناانصافی ہے۔

﴿لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ﴾ ''تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

یہ ہے دراصل اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب بہتر ہوگا کہ ہم اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا بھی جائزہ لے لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن حکیم کو کس حد تک ''بے دخل'' کر چکے ہیں۔ کیا یہ کتاب اس لیے نازل ہوئی تھی کہ قرآن خوانی کی مجالس سجا لی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کر لیا جائے' یا اس کی آیات کی خطاطی کی نمائشیں لگائی جائیں' یا چالیس من وزنی قرآن سونے کی تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے —— اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کرنے کو ترجیح دی جائے؟ اس حوالے سے مولانا ماہر القادری کی زبان سے قرآن حکیم کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے:

یہ میری عقیدت کے دعوے' قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں' ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!

ظاہر ہے قرآن حکیم تو ایک ضابطہ زندگی اور ایک نظامِ حکومت لے کر آیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے نظام کو عملی طور پر اپنے ملک اور معاشرے میں قائم کریں' اس کی لائی ہوئی میزان کو نصب کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں ؏ ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!''

اس آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں درج ذیل آیات کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) کہ میں عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہوں۔ سورۃ النساء میں اہلِ ایمان کو باقاعدہ حکم دیا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''۔ سورۃ المائدۃ میں الفاظ کی ترتیب بدل کر یہی حکم پھر سے دہرایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ﴾ (آیت ۸) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ پھر سورۃ الشوریٰ میں حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا: ﴿وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔ پھر سورۃ الشوریٰ ہی میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ الۡـكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ وَالۡمِيۡزَانَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ''اللہ وہ ہستی ہے جس نے نازل فرمائی کتابِ حق کے ساتھ اور میزان بھی''۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب اور میزان نازل کرنے کا

ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔

اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ﴾ (آیت ۶۸) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے تورات کو اور انجیل کو اور اُس کو جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے''۔ ہمیں چاہیے کہ آج ہم سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں ''تورات وانجیل'' کی جگہ لفظ ''قرآن'' رکھ کر اسے اس طرح پڑھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کریں: ''قُلْ يٰٓاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کہ اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے قرآن کو اور اس کو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے! — تم قرآن کی تلاوت کر کے سمجھ لیتے ہو کہ تم نے قرآن کا حق ادا کر دیا' یا تراویح میں قرآن ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مار لیا' چاہے تم نے اس کا ایک حرف بھی نہ سمجھا ہو۔ یاد رکھو! جب تک تم قرآن حکیم کے احکام کو عملی طور پر خود پر نافذ نہیں کرتے ہو اور اس کے نظامِ عدل کو اپنے ملک و معاشرہ میں قائم نہیں کرتے ہو' تب تک قرآن حکیم پر ایمان کے تمہارے زبانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن حکیم کے نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے یہ حقیقت بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کے لیے یہ نظام کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے جونہی کہیں اس کے قیام کے لیے ٹھوس کوششوں کا آغاز ہوگا یہ طبقات ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے آ موجود ہوں گے۔ ظاہر ہے جن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات (vested interests) پرانے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں' وہ کب چاہیں گے کہ معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے بھی تاریخ میں استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اپنے معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' اس کے باوجود ان دونوں حضرات ؓ نے اپنے مفادات' کاروبار اور سٹیٹس کی پروا کیے بغیر حق کی آواز پر بلاتاخیر لبیک کہا۔ لیکن عمومی طور پر اشرافیہ اور دولت مند طبقہ ہمیشہ نظامِ عدل کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقات کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہ آئے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ایسے عناصر کی سرکوبی کا نسخہ بتایا جا رہا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں''

نوٹ کیجیے! یہاں نہ تو کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جو بات کہنا مقصود تھی وہ دوٹوک انداز میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہ تاریخِ انسانی کی

''عریاں ترین'' انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور جب ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سر بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے' اس کے بغیر انقلاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل کے لیے انقلاب کی بات ہو رہی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خود انسان عدلِ انسانی کے اپنے تصور کی ترویج و تنفیذ کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں' مخالف ممالک کا گھیراؤ کرتے ہیں' ان پر بے رحمانہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ''امن کے لیے جنگ'' (War for Peace) کا نعرہ لگا کر کمزوروں پر چڑھائی کرتے ہیں اور پھر ملکوں کے ملک برباد کر کے رکھ دیتے ہیں' اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل و غارت اور بربریت کو وہ لوگ وقت کی اہم ضرورت اور عین انصاف سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق اور مالک ہے اور زمین پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کا ہے۔ اُسی نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنایا ہے اور اُسی نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسی اختیار کی وجہ سے انسان اکثر مَن مانی کرتے ہوئے اُس کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین میں عدل و انصاف کی ترویج اور اپنے قانون کی حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کی مشیت یہی ہے کہ اُس کے حقِ حکمرانی کو چیلنج کرنے والے باغیوں کو حق کی طاقت کے ذریعے سے کچل دیا جائے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' تو جبھی وہ نابود ہو جاتا ہے''۔ بہر حال اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا یہ کام اُس کے نام لیوا کریں۔ اُس کے نام لیوا حق کے علمبردار بن کر اس کے باغیوں کا مقابلہ کریں' باطل نظام کو بزورِ بازو اُکھاڑ پھینکیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی کو یقینی بنائیں۔

آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر دراصل اسی حوالے سے آیا ہے کہ ہر دور کے علمبردارانِ حق اپنے حالات اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیار کریں' رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال اَفرادی قوت کی فراہمی کا ہے' اور اس عمل کی ابتدا دعوت و تبلیغ سے ہوگی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بارہ سال تک مسلسل دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ حق کو قبول کرنے والے افراد کی تربیت کی' انہیں منظم کیا' اور جب مطلوبہ افرادی قوت فراہم ہوگئی تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق طاقت کے اس ''کوڑے'' کو باطل کے سر پر یوں دے مارا کہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیا۔ چنانچہ آج بھی یہ کام اگر ہوگا تو اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا۔ آج بھی اہلِ حق کو اسی طرح جانیں قربان کرنا ہوں گی' تکلیفیں جھیلنا پڑیں گی' گھر بار چھوڑنے پڑیں گے اور جان و مال کے نقصانات

برداشت کرنا پڑیں گے۔ گویا یہ انتہائی مشکل کام ہے اور اہلِ حق کی بے دریغ قربانیوں کے بغیر اس کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ ''اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے۔''

''تاکہ اللہ جان لے'' کا مفہوم یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دکھا دے' ظاہر کر دے' ممیز کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ گویا حق و باطل کی جنگ کے دوران جو مردانِ حق لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئیں گے وہی اللہ اور اس کے رسولؐ کے مددگار ہوں گے۔ دراصل اللہ کے دین کو غالب کرنا بنیادی طور پر حضورﷺ کا فرضِ منصبی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف: ۹) ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ' تاکہ وہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین پر''۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حضورﷺ کے اس مشن میں تمام اہلِ ایمان آپؐ کے دست و بازو بنیں' بلکہ سورۃ الصف میں تو اس کے لیے اہل ایمان کو براہِ راست حکم دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔''

آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اس آیت میں غلبہ دین کی تکمیل اور نظامِ عدل و قسط کی تنفیذ کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بینات' کتاب اور میزان: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ یعنی حضورﷺ سے پہلے رسولوں کو اس مشن کے لیے بیّنات (معجزات)' کتاب اور میزان کے ساتھ بھیجا جاتا رہا' جبکہ حضورﷺ کو اس مشن کے لیے صرف دو چیزیں (الہدیٰ اور دین الحق) عطا کی گئیں: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸ اور الصف: ۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورﷺ کے لیے بیّنات (معجزات) اور الکتاب ایک ہو گئے۔ یعنی الہدیٰ (قرآن) آپؐ کی کتاب بھی ہے' اسی میں قانون ہے اور یہی آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ بھی ہے' جبکہ آپؐ کی رسالت میں میزان (شریعت) مکمل ہو کر ''دین الحق'' کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کی سزا

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (الحشر)

''اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔''

ہمارے لیے اس آیت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا فلسفہ خودی اسی آیت سے اخذ کیا تھا۔ علامہ کے اس بیان کے راوی سید نذیر نیازی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے۔ (یہ واقعہ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کانفرنس میں اپنے ایک لیکچر میں بھی بیان کیا تھا)' وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ اقبال سے عرض کیا کہ آپ کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے یہ فلسفہ نطشے سے لیا ہے' اور کوئی اس حوالے سے کسی دوسرے مغربی فلاسفر کا نام لیتا ہے۔ بہتر ہوگا اگر آپ خود واضح فرما دیں کہ آپ کے اس فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ یہ سن کر علامہ اقبال نے انہیں فرمایا کہ آپ کل فلاں وقت میرے پاس آئیں' میں آپ کو اس کے ماخذ کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ شاعر مشرق اور حکیم الامت انہیں یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ انہیں اس موضوع پر تفصیلی ڈکٹیشن دیں گے۔ لیکن اگلے دن جب وہ کاپی پنسل ہاتھ میں لیے مقررہ وقت پر حاضر خدمت ہوئے تو علامہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ ذرا وہ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ اس کے بعد علامہ نے انہیں سورۃ الحشر کی یہ آیت (آیت ۱۹) تلاوت کرنے کو کہا اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ ہے میرے فلسفہ خودی کا ماخذ!

اب آیئے ہم اس آیت کے الفاظ ﴿فَاَنۡسٰـہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ﴾ کے مفہوم پر غور کریں۔ یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح بھول سکتا ہے کہ وہ خود اپنی شخصیت سے ہی واقف نہ رہے؟ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اپنے پیٹ کا خیال نہ رہے؟ یا جسے اپنی کوئی بیماری یاد نہ رہے؟ ظاہر ہے کوئی انسان اپنے جسم اور اس کے تقاضوں سے غافل نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ حیوانی جسم کے علاوہ انسان کی کوئی اور حیثیت بھی ہے جسے وہ بھول جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ''روح''۔ جہاں تک انسان کے اللہ تعالیٰ کو بھلانے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے: ﴿اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے' پس انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔ بہرحال جو لوگ اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتے ہیں' آیت زیر مطالعہ میں ایسے لوگوں کی اس سزا کا ذکر ہے جو انہیں دنیوی زندگی میں ہی مل جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی اصل حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ انسان ہیں' اشرف المخلوقات ہیں یا اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بس یہی یاد رہ جاتا ہے کہ بہت سے حیوانات کی طرح وہ بھی بس حیوان ہیں۔

آج ہماری جدید تہذیب بھی مختلف انداز سے ہمیں یہی سبق پڑھانے کی کوشش میں ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے۔ اس فلسفے کو متعارف کرانے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) نے ادا کیا ہے۔ اس تھیوری کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حیوان اور انسان میں بنیادی فرق صرف ارتقاء کے مراحل اور مدارج کا ہے۔ جیسے گدھے اور گھوڑے میں صرف یہ فرق ہے کہ گدھا نچلے

درجے کا (rough & coarse) جانور ہے' جبکہ گھوڑا ارتقاء کا ایک مزید مرحلہ طے کر کے نسبتاً بہتر درجے میں چلا گیا ہے اور گدھے کے مقابلے میں ایک refined اور تمکنت والا جانور بن گیا ہے' اسی طرح کا فرق ایک گوریلے (chimpanzee) اور انسان میں ہے۔ یعنی گوریلے کے مقابلے میں انسان نسبتاً بہتر قسم کا جانور ہے' باقی ان دونوں کے فطری و جبلی تقاضوں (instincts) اور محرکات (motives) میں کوئی فرق نہیں ہے — جدید سائیکالوجی بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے۔ چنانچہ آج کے سائیکالوجسٹ کو بھی محرکاتِ عمل کے حوالے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جب یہ فرق مٹ گیا اور انسان اپنی اصلیت کو بھلا کر حیوان بن گیا تو گویا وہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ انیسویں صدی کے فرنچ لٹریچر میں بنیادی طور پر اسی نکتے کو فوکس کیا گیا ہے کہ حیوانات کی زندگی فطرت کے عین مطابق ہے' اس لیے ہم انسانوں کو ان سے سبق لیتے ہوئے اپنی زندگی کو خواہ مخواہ کے تکلفات سے آزاد کر لینا چاہیے۔ مثلاً تمام حیوانات لباس سے بے نیاز ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس فطرت کا تقاضا نہیں ہے' انسان کی اپنی ایجاد ہے۔ اسی طرح بیوی' بیٹی اور ماں کی تمیز بھی حیوانات میں نہیں پائی جاتی' یہ پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر خود ہی عائد کی ہے —— یہ ہے آج کے انسان کا المیہ!

بہرحال یہ آیت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اُس کی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ انسان کی روح خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پھونکی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ''انسان'' کے مرتبے پر فائز ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اپنی روح اور اس کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے اپنشد کا یہ جملہ بہت اہم ہے:

Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.

اسی real self کا دوسرا نام ''انا'' ہے' لیکن اس سے اصل مراد انسان کی ''روح'' ہی ہے' جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ انداز میں ''خودی'' کا نام دیا ہے:

؎ نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی ست — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

؎ ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں — غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حیوانی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ بقول شیخ سعدی:

آدمی زادہ طرفہ معجون است — از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی آدمی ایک ایسی معجونِ مرکب ہے جس میں فرشتہ اور حیوان دونوں گندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے سے مراد یہاں وہ نورانی روح ہے جو عالم امر کی چیز ہے: ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿٨٥﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا سا''۔ چنانچہ انسان کی

روح نورانی چیز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کو بھلا دے گا تو اپنی روح یعنی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو کر محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر میں اچھے برے اور حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔ انسانی معاشرے کے ایسے ہی افراد آیت زیر مطالعہ کے حکم ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' کے مصداق ہیں۔

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تکمیلی منہاج

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (الصف)

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے نظامِ زندگی پر''

حضور اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے قرآن مجید میں بشیر' نذیر' مذکّر' شاہد' معلّم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں' لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔ اَلْھُدٰی سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپ ﷺ پر کامل ہو گیا' جبکہ آپؐ سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضور ﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر ''دِیْنُ الْحَقِّ'' یعنی سچے اور عادلانہ نظامِ زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل وقسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے۔ یہ تھا حضور ﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپؐ ہمارے سپرد فرما گئے ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں نے تو آپؐ کے اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔ ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال وحرام طریقے سے جیسے بھی ہو' دولت اکٹھی کرو' پھر اسی دولت سے صدقہ وقربانی دو' حج کرو اور رمضان میں ہر سال عمرے کرتے چلے جاؤ۔ عبادات میں بھی ہمارا سارا زور مراسم (rituals) پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے' ہماری بلا سے! تصور کریں' اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ مگر افسوس' صد افسوس! ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ''اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو' نظامِ توحید کا نفاذ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔ واضح رہے کہ یہاں پر مُشْرِكُوْنَ سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی

دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے' بلکہ سب سے بڑے مشرک تو وہ لوگ ہیں جو دنیا میں خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں' جو نمرود اور فرعون کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: ﴿اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَ ہٰذِہِ الۡاَنۡہٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ﴾ (الزخرف: ۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا نہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ تو فرعون کے اس دعوے اور ''عوام کی حاکمیت'' کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی نا کہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو ''اپنی حاکمیت'' کے یہ دعوے دار خم ٹھونک کر آپ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے موقف پر قائم رہیں گے تو ان سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور ایسی صورت حال میں آپ کو مال و جان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔

انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی منہاج

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳﴾ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴﴾ (الجمعه)

آیت ۲ ﴿هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭﴾ ''وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمّیین میں ایک رسول ان ہی میں سے' جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔''

﴿وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲﴾﴾ ''اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس سورت کی یہ آیت انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے حوالے سے اسی طرح اہم ہے جس طرح سورۃ الصف کی آیت ۹ تکمیلی منہاج کے اعتبار سے اہم ہے۔ سورۃ الصف کی مذکورہ آیت میں حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے تو آیت زیر مطالعہ میں آپؐ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے۔ سورۃ الصف کی وہ آیت اپنی اہمیت کی وجہ سے قرآن مجید میں تین مرتبہ (سورۃ الصف کے علاوہ سورۃ التوبہ' آیت ۳۳ اور سورۃ الفتح' آیت ۲۸ کے طور پر) آئی ہے' جبکہ اس آیت میں مذکور ''انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی منہاج'' قرآن حکیم میں چار مرتبہ (سورۃ الجمعہ کی اس آیت کے علاوہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۲۹' ۱۵۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں) بیان کیا گیا ہے۔ چاروں آیات میں انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہج کے یہ عناصرِ اربعہ بیان کیے گئے ہیں: (۱) تلاوتِ آیات

(۲) تزکیہ (۳) تعلیمِ کتاب (۴) تعلیمِ حکمت۔

اس آیت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مطلوبہ انقلاب کی تیاری اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی کا مکمل طریقہ اور نصاب بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تعلیم' تربیت' تذکیر' ان کا تزکیہ' ان کا انذار سب کچھ قرآن کریم کے ذریعے سے ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو جب قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سلیم الفطرت لوگ کلام اللہ کی مقناطیسی تاثیر کی وجہ سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ کسی نے فوراً ہی لبیک کہہ دیا' کوئی قدرے تأمل کے بعد راغب ہوا اور کسی نے نسبتاً زیادہ دیر بعد فیصلہ کیا۔ چنانچہ جس طرح دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے بالکل اسی طرح مکہ کی آبادی کو بارہ سال کے عرصے میں آیاتِ قرآن کی تلاوت کے ذریعے سے بار بار جھنجھوڑ کر تمام سلیم الفطرت (زندہ ارواح کے حامل) افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا۔ پھر ان منتخب افراد کا تزکیہ بھی قرآن مجید کی تلاوت سے ہی ہوا۔ قرآن مجید بلاشبہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) ہے۔ جیسے جیسے یہ کلام ان لوگوں کے سینوں میں اترتا گیا ان کے دلوں کی بیماریاں دور ہوتی چلی گئیں۔ واضح رہے کہ دل کی بیماریاں تو بے شمار ہیں' لیکن ان تمام بیماریوں کو اگر کوئی ایک نام یا کوئی ایک عنوان دیا جائے تو وہ ''حُبِّ دُنیا'' ہے۔ حُبِّ دُنیا کی گندگی جب کسی دل کے اندر ڈیرہ جما لیتی ہے تو اس کے تعفن سے نت نئی بیماریاں جنم لیتی چلی جاتی ہیں' جبکہ خود حُبِّ دنیا کے جراثیم کو غذا انسان کی سوچ اور اس کے نظریات سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی کا انداز اور اس کی دوڑ دھوپ کا رخ اس کا نظریہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعے جب ان لوگوں کے نظریات درست ہو گئے تو حُبِّ دنیا سمیت تمام باطنی بیماریوں کی گویا جڑ کٹ گئی اور برے اعمال و خصائل ان کی شخصیات سے ایسے غائب ہو گئے جیسے موسمِ خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے جن فرائضِ منصبی کا ذکر ہوا ہے ان میں ''تعلیمِ حکمت'' کا تعلق عام لوگوں سے نہیں ہے' بلکہ یہ حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا شعبہ تخصص (area of specialization) ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں بن سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا'' ـــــ بہرحال یہ آیت ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ حضور ﷺ کے منہجِ انقلاب میں آلۂ دعوت اور آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت بھی قرآن کے ذریعے دی۔ ان کی تذکیر و تبشیر کے لیے بھی قرآن پر ہی انحصار کیا۔ پھر اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کا تزکیہ بھی قرآن سے ہی ہوا اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی قرآن ہی بنا۔ آپ ﷺ نے قرآن حکیم کی بنیاد پر ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کر کے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کر دیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دین کو غالب کرنے کا مشن امت کے سپرد کر کے

آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ مشن منتقل کرتے ہوئے بھی حضور ﷺ نے اُمت کو جو وصیت کی تھی وہ بھی قرآن حکیم کے بارے میں تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ، كِتَابَ اللّٰهِ)) (صحیح مسلم) ''میں تمہارے درمیان وہ شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جسے تم مضبوطی سے تھام لو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!''

چنانچہ آج ہمارے لیے بلکہ تا قیامِ قیامت ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید گویا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہے۔ اس حیثیت میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے کئی گنا بڑا معجزہ ہے۔ عصائے موسیٰ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں معجزہ تھا' آپؑ کے بعد تو وہ معجزہ نہیں رہا۔ اگر آج بھی وہ کہیں موجود ہے' جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس محفوظ ہے' تو اس کی حیثیت بس ایک لاٹھی کی سی ہے۔ اس کے برعکس حضور ﷺ کا معجزۂ رسالت یعنی قرآن مجید قیامت تک کے لیے معجزہ ہے اور ہر اس شخص کے لیے معجزہ ہے جو اس کا حق پہچانے اور ادا کرے۔ اس حوالے سے میرا ایمان تو حق الیقین کی حد تک ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص و اخلاص کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی ''محنت'' کرے کہ قرآن مجید اس کو possess کر لے تو پھر اسے یقیناً دنیا کی ہر چیز بے وقعت نظر آئے گی اور قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم دنیا بھر کے علوم سیکھتے ہیں مگر اس قدر عربی نہیں سیکھ سکتے جس سے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جا سکے۔ اس لیے کہ یہ نہ تو ہماری ترجیح ہے اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو نظر انداز کرنے کا ہمارا یہ انداز حیرت انگیز حد تک جسارت آمیز ہے۔ اس حوالے سے ذرا قرآن کی یہ وعید بھی سنیے: ﴿أَفَبِهٰذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿٨٢﴾﴾ (الواقعہ) کہ اے اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو! کیا تم اس عظیم الشان کلام کے بارے میں مداہنت کرتے ہو؟ اور کیا اس کی تکذیب کو تم نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے؟

قرآن مجید تو ظاہر ہے ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔ سورۃ الواقعہ کی یہ آیات اپنے نزول کے وقت تو مشرکینِ مکہ سے مخاطب تھیں' جبکہ آج ان کے مخاطب ہم ہیں۔ وہ لوگ تو نظریاتی طور پر قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تھے اور اپنی زبانوں سے اس کی تکذیب کرتے تھے' جبکہ آج ہم اپنی زبانوں سے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مقامِ عبرت ہے! قرآن مجید کی طرف تو پلٹ کر دیکھنے کے لیے بھی ہمارے پاس وقت نہیں' جبکہ دنیا کے حقیر مفادات کے لیے ہم دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں اسی لیے پیدا کیا گیا تھا؟ یہی سوال تھا جس نے ابراہیم بن ادھمؒ کی زندگی بدل دی تھی۔ ابراہیم بن ادھمؒ بادشاہ کی حیثیت سے غفلت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن شکار کھیلنے میں مصروف تھے کہ انہوں نے ایک آواز سنی: يَا إِبْرَاهِيمُ أَلِهٰذَا خُلِقْتَ أَمْ لِهٰذَا أُمِرْتَ؟ کہ اے ابراہیم ذرا سوچو! کیا تمہیں اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا تمہیں اسی کام کا حکم ہوا تھا؟ اللہ جانے یہ کسی فرشتے کی آواز تھی

یا ان کے اپنے دل کی صدا۔ بہرحال جو بھی صورت حال تھی‘ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔

آیت ۳ ﴿وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ ؕ﴾ ’’اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔‘‘

﴿وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳﴾﴾ ’’اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ کا عطف پچھلی آیت کے لفظ اُمِّیّٖنَ پر ہے۔ یعنی دوسرے کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت تو قیامت تک لیے ہے۔ ظاہر ہے آپؐ کی اُمت میں ہر نسل‘ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوں گے۔ متفق علیہ احادیث کے مطابق حضور ﷺ سے جب اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ ’’یہ اور اس کی قوم کے لوگ‘‘۔ مزید فرمایا کہ دین اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کے بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں‘ جو ایرانی النسل ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ایرانی قوم بحیثیت مجموعی بہت ذہین ہے۔ اس قوم نے ایک سے بڑھ کر ایک فلاسفر پیدا کیے ہیں‘ بلکہ ہمارے علمائے کلام تو سب کے سب ایرانی ہیں۔ اس حوالے سے ایرانی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے فلسفہ اور منطق ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ ماضی میں یونان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایران بھی فلسفہ و منطق کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں جرمن قوم نے بھی اس میدان میں نام پیدا کیا۔ یہ سب اقوام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چُن لیا تھا‘ جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔

میں نے آیت زیر مطالعہ کو ایٹم (atom) اور اس کے مرکزہ (nucleus) کے گرد مختلف دائروں میں گھومنے والے الیکٹرانز کی مثال سے سمجھا ہے۔ اس مثال کے مطابق اُمتِ مسلمہ کا مرکزہ (nucleus) ’’اُمِّیّین‘‘ پر مشتمل ہے۔ یعنی بنو اسماعیل اور حضور ﷺ کے زمانے کے تمام اہلِ عرب جو اُس وقت آپؐ کے براہِ راست مخاطب تھے‘ ان کی حیثیت امتِ مسلمہ کے مرکزہ کی ہے۔ اس کے بعد نیوکلیس کے گرد پہلا دائرہ ایرانیوں کے الیکٹرانز سے بنا۔ پھر رومی‘ قبطی‘ سندھی‘ ہندی وغیرہ اقوام کے الیکٹرانز کے دائرے بنے اور پھیلتے گئے۔ یہ دائرے ظاہر ہے قیامت تک مزید بھی پھیلیں گے‘ لیکن اُمِّیّین (نیوکلیس) کے علاوہ باقی تمام اقوام کا شمار ’’آخرین‘‘ میں ہوگا۔ حضور ﷺ کی دعوت کے حوالے سے ’’اُمِّیّین‘‘ اور ’’آخرین‘‘ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اُمیین پر اللہ تعالیٰ کا وہی قانون لاگو ہوا جو سابقہ رسولوں کی اقوام پر ہوا تھا۔ یعنی اِتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائیں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی طرف سے اِتمامِ حجت ہو جانے کے بعد

''اُمّیّین'' کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ ۹ ہجری میں ان کو ایک اعلانِ عام (سورۃ التوبہ رکوع اول) کے ذریعے متنبہ کر دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اندر تم لوگ ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے برعکس ''آخرین'' پر مذکورہ قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی اسلام کی دعوت کو مانتے یا نہ مانے ایمان لائے یا نہ لائے اسے اختیار ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے مکمل غلبے کی صورت میں بھی کسی سے اس کے مذہب کے بارے میں تعرض نہیں ہوگا۔ البتہ ملک کا نظام اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق چلایا جائے گا اور اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔''
﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے فضل کے بہت سے درجات ہیں اور ان میں سب سے اونچا اور اعلیٰ درجہ پوری کائنات میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے: ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ⑧⑦﴾ (بنی اسرائیل) ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے''۔ حضور ﷺ کے بعد ہر اُس شخص پر بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے جو حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اس نے اپنا یہ فضل پیدائشی طور پر عطا فرما دیا اور ہمیں ایسے گھروں میں پیدا کیا جہاں پیدا ہوتے ہی ہم نے اپنے کانوں میں اذان اور اقامت کی آوازیں سنیں۔ سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (آیت ۱۷) کہ تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویے سے اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور احسان کی ناقدری کریں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے راستے پر چل کر راندۂ درگاہ ہو جائیں تو ہم سے بڑا بدنصیب کون ہوگا!

اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا تعلق دنیوی آسائش و آرام اور مال و دولت سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں خود حضور ﷺ کی مثال ہی لے لیجیے۔ دُنیوی لحاظ سے تو آپؐ کو بہت سی محرومیوں کا سامنا تھا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا کیا۔ آپؐ کی پیدائش کے وقت گھر کی مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی دایہ آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہؓ نے بھی آپؐ کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انہیں کوئی اور بچہ ملا نہیں تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے لڑکپن اور جوانی کا دور بھی سخت مشقت اور مزدوری میں گزرا۔ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ میں چند ٹکوں کے عوض قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ متعلقہ حدیث میں درہم یا دینار کا ذکر نہیں بلکہ 'قراریط'' کا لفظ آیا ہے جو ریزگاری کے لیے استعمال ہوتا تھا' یعنی چند ٹکے یا پیسے۔ آپؐ کی اس دور کی زندگی کی جھلک سورۃ الضحیٰ کی ان آیات میں بھی نظر آتی ہے: ﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ⑥ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ⑦ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ⑧﴾ ''کیا اُس نے آپؐ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا! اور آپؐ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راہ دکھلائی! اور آپؐ کو نادار پایا تو مال دار کر دیا!''

اس کے بعد دورِ نبوت میں بھی آپ ﷺ کی زندگی مسلسل فقر و فاقہ اور مصائب و مشکلات میں گزری' آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے' آپؐ کو شاعر اور مجنون کہا گیا' اوباش اور آوارہ لڑکوں نے پتھراؤ کر کے آپ ﷺ کو

لہولہان کر دیا۔ غرض آپؐ کی دنیوی زندگی مجموعی طور پر سخت مشکلات اور مشقت میں گزری۔ جبکہ دوسری طرف آپؐ کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل آپؐ پر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے اپنے انداز اور اپنے پیمانے ہیں۔ دنیوی ناز و نعم، عیش و عشرت، عزت و شہرت وغیرہ کو اس کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔

الغرض، سورۃ الجمعہ کی ان چار آیات میں حضورﷺ کی بعثت کے حوالے سے آپؐ کے فرائض منصبی کا ذکر بھی ہے اور اس امت کی ''آفاقی'' حیثیت کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یعنی سابقہ اُمتِ مسلمہ (بنی اسرائیل) یک نسلی (uni racial) اُمت تھی، جبکہ موجودہ امت مسلمہ ملٹی نیشنل اُمت ہے، جس میں عربی، فارسی، ہندی، چینی وغیرہ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں، بلکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی قوم یا نسل موجود ہو جس کے افراد اس امت میں شامل نہ ہوں۔ ان آیات میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ حضورﷺ کا آلۂ دعوت اور آلۂ تربیت صرف اور صرف قرآن حکیم تھا۔ اسی سے آپؐ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسی سے انہیں انقلابی جدّوجُہد اور جہاد و قتال کے لیے تیار کیا۔

ایمانِ حقیقی کے ثمرات

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (التغابن)

آیت ۱۱ ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے۔''

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۱﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ اُس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

ایمانِ حقیقی کی بدولت انسان کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر اس پر کوئی مصیبت بھی آ جاتی ہے، تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی آئی ہے اور یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے، جیسے کہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں فرمایا گیا:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔ چنانچہ اپنے اس ایمان اور یقین کی وجہ سے ایک بندۂ مؤمن بڑی سے بڑی تکلیف اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہ تو دل میں شکوہ کرتا ہے اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے' بلکہ وہ ہر حال میں پیکرِ تسلیم و رضا بنا رہتا ہے کہ اے اللہ! میری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے: بِیَدِكَ الْخَیْرُ! تیری طرف سے میرے لیے خوشی آئے یا غم' مجھے قبول ہے' تیری جو بھی رضا ہو اس کے سامنے میرا سرِ تسلیم خم ہے! بقول غالب:

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی!

ظاہر ہے اس مقامِ خاص تک صرف سچے اور مخلص اہل ایمان ہی پہنچ پاتے ہیں۔ ایمانِ حقیقی سے محروم دلوں کے نصیب میں تسلیم و رضا کی حلاوت کہاں: ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی!

علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں مقامِ تسلیم و رضا کی برکات کا ذکر بڑے پرشکوہ انداز میں کیا ہے: ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

(اس مقامِ رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے ہیں اور مجھے دنیا کی کیسی کیسی پریشانیوں سے نجات دلا دی ہے۔)

خوئے تسلیم و رضا کی وجہ سے انسان اپنا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے' اور جو انسان اس یقین سے محروم ہے وہ دن رات اسی پیچ و تاب میں پڑا رہتا ہے کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ آخر یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ اگر میں اس وقت ایسا کر لیتا تو اس نقصان سے بچ جاتا! اگر میرا فلاں دوست عین وقت پر ایسا نہ کرتا تو ایسا نہ ہوتا! کاش میں یوں کر لیتا! کاش' اے کاش!...... گویا انسان اگر مقامِ تسلیم و رضا سے ناآشنا ہو تو چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس کے دل کا روگ بن جاتے ہیں اور اس کے پچھتاوے کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔

اس حوالے سے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے اور ہر سختی یا تکلیف کو اس کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے کا تعلق انسان کے ایمان اور دل سے ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کسی جرم کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کریں یا اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا بدلہ نہ لیں۔ بہرحال ایمان کے ثمرات میں سے پہلا ثمرہ یہ ہے کہ حقیقی ایمان انسان کو مقامِ تسلیم و رضا سے آشنا کرتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق چونکہ انسان کے احساسات سے ہے اس لیے یوں کہہ لیجیے کہ یہ وہ پھول ہے جو ایک بندۂ مؤمن کے دل کے اندر کھلتا ہے' باہر سے نظر نہیں آتا۔ باہر سے نظر آنے والے بڑے پھول کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔
﴿فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۲﴾﴾ ''پھر اگر تم نے پیٹھ موڑ لی تو جان لو کہ

ہمارے رسول (ﷺ) کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ ان احکام کے بارے میں اب ہر کوئی خود جواب دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کے مقابلے میں اب کسی انسان کی دلیل بازی نہیں چلے گی۔ جیسے سود کی حرمت کا حکم سن کر بعض لوگوں نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہ کاروبار کا منافع بھی تو ربا (سود) ہی کی مانند ہے! ایسے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵) کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ اب بھلا تم کون ہو اللہ کے واضح حکم کے بعد اپنی منطق بگھارنے والے؟ اگر تم اللہ کو مانتے ہو اس کے رسول کو مانتے ہو اس کے قرآن کو مانتے ہو تو پھر اللہ اس کے رسول ﷺ اور قرآن کے احکامات کے مقابلے میں تمہاری کوئی دلیل نہیں چلے گی۔ تمہیں اللہ کے سب احکام بے چون و چرا تسلیم کرنے ہوں گے۔ بقولِ اکبر الہ آبادی:

رضائے حق پر راضی رہ، یہ حرفِ آرزو کیسا!　　خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم، تو کیسا؟

اور اگر نہیں مانتے ہو تو سیدھی طرح اقرار کرو کہ ہم نہیں مانتے۔ بس تمہارے پاس یہی دو راستے ہیں، یا تو اطاعت و فرمانبرداری کی روش اپناؤ، یا پھر اُس کے در سے اُٹھ کر چلے جاؤ! (either obey or go away)۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ چنانچہ ایمان کا دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ مؤمنینِ صادقین کے کردار و عمل سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ "اللہ وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پس اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔"

اے اہلِ ایمان! اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک ذرّہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی سے ہوگا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ محنت کرو اور اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کوئی کام کرنے کی استطاعت بھی رکھتے ہو، تمہارے پاس تمام وسائل بھی موجود ہیں اور تم حالات کو بھی کُلّی طور پر سازگار دیکھتے ہو تو بھی کبھی مت کہنا کہ میں یہ کام ضرور کر لوں گا۔ اگر تم ایسا دعویٰ کر بیٹھو گے تو ایمان سے دور ہو جاؤ گے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؗ﴾ (الکہف) "اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کل ضرور کروں گا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے!" کثرتِ وسائل کے زعم میں فتح کی امید رکھو گے تو وہی حال ہوگا جو لشکرِ اسلام کا وادیٔ حُنین میں ہوا تھا۔ وادیٔ حُنین میں دشمن کی تیراندازی کی وجہ سے اہلِ ایمان کی صفوں میں ایسی بھگدڑ مچی تھی کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق تین چار سو اور ان کے استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے مطابق صرف تیس چالیس لوگ حضور ﷺ کے ساتھ کھڑے رہ گئے تھے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۵ میں اس کا سبب بھی بتا دیا گیا: ﴿اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ﴾ کہ

اس دن اہلِ ایمان میں سے بعض لوگوں کے دلوں میں اپنی کثرتِ تعداد کا زعم پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال مؤمنین کو ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے اور صادق الایمان مؤمنین ہر حالت میں بلاشبہ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرتے ہیں۔ یہ توکل علی اللہ بھی شجرِ ایمان کا وہ پھول ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں اور ذہنوں کے اندر کھلتا ہے۔ گویا یہ ایمانِ حقیقی کا تیسرا ثمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تہذیب وتمدن کی گاڑی کو چلانے کے لیے ''علائقِ دنیوی'' کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت سے متعلق اگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی' لہٰذا اس ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے:

آیت ۱۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ ''اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' سو اُن سے بچ کر رہو۔''

یہ بہت مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ سورۃ المنافقون میں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی عداوت سے بھی انہی الفاظ میں خبردار کیا گیا ہے: ﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۭ﴾ (المنافقون: ٤) کہ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہیے! چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اہل ایمان کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ جس طرح منافقین کی دشمنی تمہارے لیے نقصان دہ ہے' اسی طرح تمہارے بیوی بچوں کی محبت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نقصان بے شک کسی کی دشمنی کی وجہ سے ہو یا محبت کی وجہ سے' نقصان ہی ہے اور جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو وہ ظاہر ہے آپ کا دشمن ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں اور بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات اگر حلال کی کمائی سے پوری نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا؟ ظاہر ہے حرام میں منہ مارے گا۔ اور اگر کوئی یہ نہیں کرے گا تو ڈالر کمانے کے چکر میں ملک سے باہر چلا جائے گا۔ پیچھے سے بیوی بچے کیا کرتے ہیں؟ بوڑھے والدین کس حال میں ہیں؟ انہیں بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس کون لے کر جائے گا؟ اس کی بلا جانے! اس کی اپنی مجبوری ہے' مکان بنانا ہے' بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے' ان کی شادیاں کرنی ہیں اور اس سب کچھ کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اور ظاہر ہے سرمایہ گھر بیٹھے تو نہیں ملتا' نہ ہی حلال کی کمائی سے ملتا ہے۔

دوسری طرف اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ اور آخرت کی فکر عطا کی ہے اور وہ حرام سے بچتے ہوئے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرنا چاہتا ہے تو اسے صبح وشام بیوی کے طعنے چین نہیں لینے دیتے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' تمہیں بچوں کے مستقبل کی فکر بھی نہیں۔ ذرا ہمسائے سے ہی سبق حاصل کر لیتے' کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ وہ تم سے زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں' ان کی داڑھی بھی تم سے لمبی ہے' مگر وہ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی نبھا رہے ہیں۔ ذرا دیکھو ان کے بیوی بچے کیسے عیش کر رہے ہیں' اور کون نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ اوپر کی کمائی سے ہو رہا ہے۔ اب تم کیا ان سے بھی بڑے دین دار ہو کہ جو سب کچھ ان کے لیے حلال ہے تم اسے اپنے

اوپر خواہ مخواہ حرام کر کے بیٹھ گئے ہو؟ وغیرہ وغیرہ —— آج ہمارے ہاں کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی بچوں کی دشمنی والی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی' لیکن اگر کوئی بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہے تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جائے گی کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بنتی ہے۔

یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے اس لیے اس سخت حکم کے بعد اگلے جملے میں اس ضمن میں نرمی اختیار کرنے کی ہدایت بھی کی جا رہی ہے۔ قوانین اور احکام کا یہ توازن کلامِ الٰہی کا خاص معجزہ ہے اور اس اعتبار سے یہ آیت اعجازِ قرآن کی بہت بڑی مثال ہے۔ ایک طرف متنبہ بھی کر دیا کہ تمہیں اپنے اہل وعیال کے معاملے میں سانپ کی طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیوی اور اولاد کی محبت تمہیں کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ لیکن اگلے جملے میں عفو و درگزر کا حکم بھی دے دیا کہ تم اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل وعیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نبٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر صبح وشام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے:

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭﴾ ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی عفو و درگزر کا معاملہ فرمائے تو تم بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرو۔ بالکل یہی اسلوب سورۃ النور کی اس آیت میں بھی نظر آتا ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ㉒﴾ ''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے''۔ واضح رہے کہ سورۃ النور کی یہ آیت واقعہ افک کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ آپؓ نے اپنے ایک نادار رشتہ دار (حضرت مسطحؓ) کی کفالت کا ذمہ لے رکھا تھا' لیکن جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کیچڑ اچھالنے میں اس کا بھی حصہ تھا تو آپؓ نے اس کی مدد سے ہاتھ روک لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تم خود اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہو تو تم اسے معاف کر دو۔ بہرحال ان دونوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ خود بہت معاف اور درگزر کرنے والا ہے بلکہ اپنے بندوں سے بھی وہ ایسے ہی رویے کو پسند کرتا ہے۔

زیر مطالعہ آیات میں اب تک ایمان کے چار ثمرات کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے پہلے تین کا تعلق تو ایک فرد کی انفرادی زندگی سے ہے' جبکہ چوتھا ثمرہ فرد کے گرد بننے والی اجتماعیت کے پہلے حلقے یعنی اس کے افرادِ خانہ سے متعلق ہے۔ انفرادی سطح کے مذکورہ تین ثمرات کو قبل ازیں میں نے بندۂ مؤمن کی شخصیت کے چمن میں کھلنے والے خوبصورت پھولوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان میں سے دو پھول تو وہ ہیں جو اس کے دل کے اندر کھلتے ہیں اور باہر سے ہر کسی کو نظر نہیں آتے' یعنی خوئے تسلیم و رضا اور توکل علی اللہ۔ جبکہ تیسرا پھول اللہ اور اس کے رسول کی

اطاعت کا پھول ہے‘ جو شخصیت کے خارج میں کھلتا ہے۔ ظاہر ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کے حکم میں تو پورے کے پورے دین کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں رہتے ہوئے یہ پھول بجا طور پر بندۂ مؤمن کی شخصیت کا طرۂ امتیاز بنتا ہے۔

ایمان کے چوتھے ثمرے کا تعلق بندۂ مؤمن کی عائلی زندگی سے ہے۔ اس حوالے سے آیت زیر مطالعہ ہمیں انتہائی متوازن اور معتدل رویے کا شعور عطا کرتی ہے۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اپنے اہل و عیال کی طبعی محبتوں کے منفی اثرات سے ہوشیار بھی رہنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عفوو درگزر کی حکمت عملی اپناتے ہوئے گھر کی فضا کو محاذ آرائی اور نفرت کے تکدر سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہنا ہے ـــــ اب اسی حوالے سے دوسری اصولی اور انتہائی اہم بات:

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ﴾ ”تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں۔“

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مال و دولت دنیا‘ یہ رشتہ و پیوند تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ﴾ (آل عمران: ۱٤) ”مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی“۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں یہ محبتیں پیدا ہی ان کو آزمانے کے لیے کی ہیں۔ اس کا تو اعلان ہے کہ میرے جس بندے کے دل میں مجھ تک پہنچنے کی تڑپ ہے‘ اسے ان تمام رکاوٹوں اور آزمائشوں کو عبور کر کے آنا ہوگا: ؎

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ ۔۔۔ مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے!

حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ)) (صحیح الجامع للالبانی) ”جہنم کو نفس کی مرغوب چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔“

ان ناپسندیدہ چیزوں میں مال و اولاد کی محبتوں کی قربانی سرفہرست ہے۔ آج اگر کسی شخص کے بارے میں آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کے دل میں کتنا ایمان ہے تو یہ دیکھ لیجیے کہ وہ اپنی اولاد کو کیا بنانا چاہتا ہے۔ بظاہر ایک شخص اگر بہت بڑا عالم دین‘ صوفی‘ مسند نشین اور پیر طریقت ہے‘ لیکن اپنی اولاد کو وہ ایمان و آخرت کے راستے پر ڈالنے کے بجائے پیسے بنانے والی مشین بنانے کی کوشش میں ہے تو جان لیجیے کہ اس کے باطن میں دین اور دینی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے ـــــ اب اس سلسلے کی تیسری بات سنیے:

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۵﴾ ”اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔“

تمہارے اعمال کا اصل اجر اور بدلہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملے گا‘ لہٰذا کسی اور سے کسی اجر کی توقع نہ رکھنا۔ اولاد کے بارے میں بھی مت امید رکھنا کہ وہ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ ہوسکتا ہے یہی اولاد جس کے

لیے آج تم اپنا ایمان تک داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہو' بڑھاپے میں تمہیں ٹھوکریں مارے اور بعض اوقات اولاد کی زبان کی ٹھوکریں والدین کے لیے ان کی پاؤں کی ٹھوکروں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس تکلیف کی کیفیت اس باپ سے پوچھیں جس کا بیٹا اس کے سامنے سینہ تان کر کہتا ہے: ابا جان آپ ہمیشہ بے موقع بات کرتے ہیں' اس معاملے میں آپ خاموش رہیں' آپ کو کیا معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے!

آیت ۱۶ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو''

گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں' بلکہ اس کی استطاعت کی آخری امکانی حد تک —— جتنا اس کے حدِ استطاعت میں ہے —— البتہ کسی انسان میں کتنی استطاعت واستعداد اور وسعت وطاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلف اور جواب دہ ہے' اس کا صحیح شعور وادراک بسا اوقات اسے خود بھی نہیں ہوتا' لہٰذا وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے' حالانکہ انسان کا خالق خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت' استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق ہر انسان کا محاسبہ اور مؤاخذہ فرمائے گا۔

واضح رہے کہ سمع وطاعت کا تعلق اصلاً ایمان باللہ سے ہے' لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے' اس لیے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے' مگر اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل ''مطاع'' بن کر رسول آتا ہے تو اللہ کے رسول کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (آیت ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

یہاں پر وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا کے حکم کے حوالے سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ قبل ازیں آیت ۱۲ میں جب وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا واضح حکم آ چکا ہے تو اب یہاں کون سی اطاعت کے لیے بلایا جا رہا ہے؟ اس مسئلے کو یوں سمجھے کہ حضور ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں مختلف مواقع پر مختلف امور کے لیے امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے مقرر کردہ امیر کی اطاعت بھی متعلقہ اہل ایمان پر اسی طرح لازم تھی جیسے کہ خود حضور ﷺ کی اطاعت۔ اس بارے میں حضور ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (متفق علیه)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اُس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اُس نے گویا میری

نافرمانی کی۔‘‘

یادر ہے کہ غزوۂ احد میں تیراندازوں کی جس نافرمانی پر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں وعید بھی آئی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اجتماعی سزا بھی بھگتنا پڑی وہ دراصل حضور ﷺ کی براہِ راست نافرمانی نہیں تھی بلکہ آپؐ کے مقرر کردہ کمانڈر کے حکم کی نافرمانی تھی۔ اسی حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ امیر کی اطاعت صرف حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لازم نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے لازم ہے اور آیت زیرِ مطالعہ میں دراصل اسی اطاعت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ کہ دعوت واقامتِ دین کی جدوجہد کے مشن کو تو قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور توفیق سے اللہ تعالیٰ کے بندے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اُٹھتے رہیں گے اور اہلِ ایمان کو دعوت دیتے رہیں گے۔ چنانچہ ہر دور کے اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ جب بھی اللہ کا کوئی بندہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کا علمبردار بن کر اُٹھے اور مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کی صدا بلند کرے تو وہ اس کی بات سنیں۔ پھر اگر ان کا دل گواہی دے کہ اس کی دعوت خلوص واخلاص پر مبنی ہے تو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان وانصار بنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ جیسے ماضی قریب میں سید احمد بریلویؒ، حسن البناء شہیدؒ، مولانا الیاسؒ اور مولانا مودودیؒ اپنے اپنے زمانے میں پورے خلوص کے ساتھ دعوت واقامتِ دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوئے اور بہت سے اہلِ ایمان نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کی آواز پر لبیک بھی کہا۔

یہ آیت آج ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم ایسے ’’داعی الی اللہ‘‘ کی تلاش میں رہیں۔ پھر اگر ہمارا دل گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کا فلاں بندہ واقعی خلوصِ نیت سے رسول اللہ ﷺ کے مشن کو لے کر کھڑا ہوا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی پکار پر لبیک کہیں، تا کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے سمع وطاعت کی بنیاد پر ایک مربوط ومضبوط اور منظم جماعت وجود میں آسکے۔ ظاہر ہے اگر مسلمان خود کو ایک امیر کے تحت ایسی جماعت کی شکل میں منظم نہیں کریں گے تو ان کی حیثیت ایک ہجوم کی سی رہے گی۔ ذرا تصور کریں! ہر سال حج کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا جو ’’ہجوم‘‘ اکٹھا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ کسی ایک امیر کے تحت ایک جماعت کی شکل میں منظم ہو جائیں تو یقیناً ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیں۔ اس موضوع پر علامہ اقبال کا یہ شعر بہت بصیرت افروز ہے: ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ ’’اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔‘‘

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۶﴾ ’’اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔‘‘

یعنی جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھا ہے وہ اس کے راستے میں نچھاور کر دو۔ جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷﴾ ’’ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور خرچ کرو اس میں سے جس پر اس نے تمہیں خلافت

عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو بھی) خرچ کیا' ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔"

تم اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کو سونپ کر تو دیکھو!

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ (الطلاق)

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾﴾ "اور جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا' اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔"

اللہ کے تقویٰ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کا یہ بہت حسین اور دلکش انداز ہے اور اس اعتبار سے یہ قرآن مجید کا منفرد مقام ہے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ حقیقی تقویٰ دل کا تقویٰ ہے' جس کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے دست مبارک سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا، اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا)) (صحیح مسلم) کہ اصل تقویٰ یہاں (دل کے اندر) ہوتا ہے۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا براہِ راست تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ اگر دل میں تقویٰ نہیں تو جُبّہ و دستار کا اہتمام اور متقیانہ وضع قطع کی حیثیت بہروپ سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں اہلِ تقویٰ کو بہت بڑی بشارت سنائی جا رہی ہے کہ اگر کسی بندۂ مؤمن کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول و منظور ہوا تو اس کے لیے مشکل سے مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دیا جائے گا' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو فرعون نے انہیں ساحلِ سمندر پر جا لیا۔ اب آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ بظاہر بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا۔

اسی طرح جب حضور ﷺ غارِ ثور میں تشریف فرما تھے تو مشرکینِ مکّہ میں سے کچھ لوگ آپؐ کے کھوج میں غار کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اگر ان لوگوں نے نیچے اپنے قدموں کی طرف بھی دیکھ لیا تو ہم انہیں نظر آ جائیں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰) کہ آپ فکر مت کریں' اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتِ حال پیدا فرما دی کہ مشرکین آپؐ کو نہ دیکھ سکے۔ حضور ﷺ کے سفرِ طائف کی مثال لیں تو بظاہر وہاں سے آپؐ خالی ہاتھ واپس آئے تھے' لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مدینہ سے کھڑکی کھول دی اور ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے ہی وہاں انقلاب آ گیا۔ یہ مثالیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے متقی بندوں کے لیے ضرور "مخرج"

پیدا فرماتا ہے۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف اہلِ ایمان کے لیے آیت زیر مطالعہ کے ان الفاظ میں یہ خوشخبری ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اپنی کوششیں پورے خلوص سے جاری رکھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کو ان کوششوں کی کامیابی منظور ہوگی تو حیرت انگیز طریقے سے منزل خود چل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ﴾ ''اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔''

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رزق یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا ہے۔ اس لیے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرمانِ الٰہی: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ١٦٢﴾ (الانعام) کو اپنا نصب العین بنانا چاہتا ہے تو اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ اندیشہ بنتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کیسے پوری ہوں گی؟ چنانچہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے میرے بندو! تمہارا رازق تو میں ہوں اور تمہیں رزق دینے کے لیے میں وسائل و اسباب کا محتاج نہیں ہوں۔ تم لوگ ایمان و یقین کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو' میں تمہیں وہاں سے رزق دوں گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہے۔''

جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی بات کو کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے: ؎

کار سازِ ما بہ فکرِ کارِ ما　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

کہ ہمارا کارساز تو اللہ تعالیٰ ہے' اور وہ ہمارے کاموں کی فکر میں مصروف ہے' اس لیے ہم اپنے کاموں کی فکر کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں! ظاہر ہے اگر ہم خود اپنے کاموں کی فکر کریں گے تو غلطیاں بھی کریں گے' نقصان بھی اٹھائیں گے اور ٹھوکریں بھی کھائیں گے' تو کیوں نہ ہم اپنے کام اسے سونپ کر خود کو اس کے کام (اقامتِ دین کی جدوجہد) میں لگا دیں۔ اللہ تعالیٰ تو ایسا قدر دان ہے کہ اگر اس کا کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے تو وہ بدلے میں اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) (متفق علیہ) کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی کوئی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے تو اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اپنی ذاتی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر خود کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے کام میں لگا دے گا تو کیا اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! ایسا تو دنیا میں ہم انسانوں کے ہاں بھی نہیں ہوتا' بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت اور مروّت ہوتی ہے وہ دوسرے انسان کی وفاداری کا بدلہ ضرور چکاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک انسان بھی دوسرے انسان کی وفاشعاری کا صلہ دینا ضروری سمجھتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

اپنے ایک وفا شعار اور متوکّل بندے کی کس کس انداز سے دست گیری فرمائے گا۔ یاد رکھیں! توکّل کا تعلق بندے کے ایمان سے ہے۔ جس قدر گہرا اور پختہ کسی کا ایمان ہوگا' اسی قدر مضبوط اس کا توکّل ہوگا۔ آج ہمارے لیے اللہ تعالیٰ پر بھرپور توکّل کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارا ایمان کمزور ہے۔ تو آیئے! ہم اپنا ایمان مضبوط کر کے اللہ پر توکّل کریں۔ اپنے معاملات کی منصوبہ بندیوں کا دردِ سر مول لینے کے بجائے **تفویض الامر الی اللّٰہ** کی حکمت عملی اپنائیں' اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیں اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اپنا تن من دھن اس کام میں لگانے پر کمربستہ ہو جائیں!

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ﴾ ''اللہ تو یقیناً اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے تو اپنے دین کو غالب کرنا ہی ہے' لیکن اس عظیم الشان کام کے لیے جدوجہد کی سعادت وہ اپنے بندوں کے نام کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے لیے ہر انسان کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس منافع بخش ''کاروبار'' میں شریک ہونا چاہتا ہے یا اپنی محرومی پر قناعت کر کے بیٹھے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ جیسے ابوبکر' عمر' عثمان' علی' عبد الرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) اس جدوجہد میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے سرخرو ہو گئے' جبکہ ابوجہل' ابولہب اور ان کے ہم نواؤں نے اس سے بے اعتنائی دکھائی اور ابدی محرومیاں اپنے نام کرالیں۔ آج ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے پہلے اس کُرۂ ارضی پر دینِ اسلام کو غالب تو ہونا ہی ہے اور یقیناً ہم جیسے انسانوں کی کوششوں اور قربانیوں سے ہی ہونا ہے' تو کیا ہم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو تیار ہیں یا محرومین کی صفوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا تن من دھن غرض سب کچھ اس جدوجہد میں کھپ جائے اور ہماری ہڈیاں چورا بن کر بھی اسلام کی تعمیرِ نو میں کام آ جائیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہوگی۔

﴿قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ③﴾ ''اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

یہ بہت خوبصورت اور سبق آموز جملہ ہے۔ غلبہ دین کی جدوجہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح تر ہو جاتا ہے' کہ اے راہِ حق کے مسافرو! تمہاری محنت اور جدوجہد کس گھاٹی سے ہوتی ہوئی کب' کہاں پہنچے گی اور اللہ کی مدد کب تمہارے شامل حال ہوگی' اللہ کے ہاں یہ سب کچھ طے ہے۔ یقیناً اس راستے میں کامیابی کا دارومدار اللہ کی مدد پر ہے' لیکن اللہ کی مدد تو تبھی آئے گی جب تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں منہجِ نبویؐ کو اپناتے ہوئے ہر اُس راستے سے گزرنا ہوگا جس راستے سے حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گزرے' اور ہر وہ سختی برداشت کرنا ہوگی جو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برداشت کی۔ جب ان تمام امتحانات سے سرخرو ہو کر آگے بڑھو گے تو خود کو ایک ایسے میدان میں کھڑا پاؤ گے جس کے نشیب و فراز سرزمینِ بدر کے نشیب و فراز سے ملتے جلتے ہوں گے۔ اس میدان کی مخالف سمت سے اسلحہ کی جھنکار اور لَا غَالِبَ لَكُمُ الۡيَوۡمَ کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوگی' جبکہ اس کی فضا ملکوتی

تقدس کے احساس سے معمور ہوگی۔ جب تم یہ سب کچھ دیکھو اور محسوس کرو تو جان لینا کہ تمہاری جدوجہد کا فیصلہ کن موڑ آ پہنچا ہے۔ بس اس موقع پر تم سجدے میں گر جانا اور رو رو کر دعا کرنا کہ اے اللہ! ہم نے تیرے داعی کی دعوت پر لبیک کہا! ہم تیرے پیغام کو لے کر قریہ قریہ گھومے! گلی گلی پھرے! ایک عرصہ تک ہم نے اپنی صبحیں اور اپنی شامیں اسی فکر میں بتا دیں! ہم نے اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پھلانگنے اور ہر مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش کی! اے اللہ! ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا' اور تیری ہی توفیق اور مشیت سے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں معلوم ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم کوشش' محنت' ایثار اور قربانی کا حق ادا نہیں کر سکے! لیکن ہم سے جو ہو سکا وہ ہم نے پوری دیانت داری اور اخلاص سے کیا۔ پروردگار! ہم نے اپنی سالہا سال کی محنت کو آج اس میدان میں تیرے حضور پیش کر دیا ہے! اے گناہوں کو معاف کرنے والے! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری اس حقیری کمائی کو قبول فرما لے......!

یاد رکھیے! اگر تو یہ دعائیں مذکورہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مانگی جائیں گی تو ضرور قبول ہوں گی' تب اللہ کی مدد بھی آئے گی' فرشتے بھی اتریں گے اور دینوی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔ لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کا کاروبار بھی چلتا رہے' معیارِ زندگی بھی برقرار رہے' معمولاتِ زندگی میں بھی خلل نہ پڑے' مال و جان بھی محفوظ رہے' بچوں کے کیریئرز بھی بن جائیں اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اقامتِ دین کا ''کارنامہ'' بھی انجام پا جائے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ ایسے لوگ کسی جماعت کے اراکین کی فہرست میں نام لکھوا کر سمجھتے ہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی' دین غالب ہو جائے گا اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس نے کیا قربانی دی ہے' کس نے کتنا وقت لگایا ہے' کس نے کس مرحلے پر کس مہم میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ نہیں! یہ کوئی اندھیر نگری نہیں! اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز اور ہر انسان کے ہر عمل کا حساب موجود ہے! قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا بے شک اس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

جہنّم کی آگ سے خود کو بھی بچاؤ اور اپنے اہل و عیال کو بھی!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے''

سورۃ التغابن میں اہلِ ایمان کو ان کے اہل و عیال کے بارے میں بایں الفاظ متنبہ کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان کے

دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو''۔ گویا سورۃ التغابن کے اس حکم کے تحت اہل ایمان کو ان کے اہل وعیال سے متعلق متنبہ کرنے کے لیے منفی انداز اختیار کیا گیا ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں انہیں اس بارے میں مثبت طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالے سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے' بلکہ ایک مؤمن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالے سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب واَذہان میں دین کی سمجھ بوجھ' اللہ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی جہنم کی اُس آگ سے بچ جائیں:

﴿وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ ''جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر''

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ ''اس پر بڑے تُند خُو' بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں''

وہ فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے' اور نہ ہی وہ ان کے نالہ وشیون سے متاثر ہوں گے۔ تو اے اہلِ ایمان! کیا تم نازونعم میں پالے ہوئے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہو؟ بہرحال ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویے سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل وعیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟ اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں دین سے بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ''اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے''

اللہ تعالیٰ جس کو جیسا عذاب دینے کا حکم دے گا جہنم پر مامور فرشتے اسے ویسا ہی عذاب دیں گے۔ کسی کے رونے دھونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

﴿وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦﴾ ''اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔''

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (الملک)

آیت ۳ ﴿اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ﴾ ''(وہ اللہ کہ) جس نے بنائے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر۔''

یہ آیت آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ ابھی تک انسان سات آسمانوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

﴿مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ﴾ ''تم نہیں دیکھ پاؤ گے رحمٰن کی تخلیق میں کہیں کوئی فرق۔''

اس کائنات کا نظام اور اس میں موجود ایک ایک چیز کی تخلیق اس قدر خوبصورت' محکم' مربوط اور کامل ہے کہ اس میں کسی خلل' نقص' رخنے' بدنظمی یا عدمِ تناسب کا کہیں کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت کی گواہی نسلِ انسانی نے اپنے اجتماعی علم کی بنیاد پر ہر زمانے میں دی ہے۔ ہر زمانے کے سائنس دانوں نے فلکیات' ارضیات' طبعیات' حیوانیات' نباتات غرض سائنس کے تمام شعبوں میں حیران کن تحقیقات کی ہیں' لیکن آج تک کوئی ایک محقق یا سائنسدان یہ نہیں کہہ سکا کہ قدرت کی بنائی ہوئی فلاں چیز میں فلاں نقص ہے یا یہ کہ فلاں چیز اگر ایسے کی بجائے ویسے ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتی۔

﴿فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو' کیا تمہیں کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟''

آیت ۴ ﴿ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾﴾ ''پھر لوٹاؤ نگاہ کو بار بار (کوئی رخنہ ڈھونڈنے کے لیے) پلٹ آئے گی نگاہ تمہاری طرف ناکام تھک ہار کر۔''

اندازہ کیجیے کہ کس قدر پُرزور اسلوب ہے اور کتنا بڑا چیلنج ہے! بار بار دیکھو' ہر پہلو اور ہر زاویے سے دیکھو! اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تمہیں کہیں کوئی خلل' نقص یا رخنہ نظر نہیں آئے گا! ظاہر ہے یہ چیلنج پوری انسانیت کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ بہرحال آج تک کوئی سائنس دان اور کوئی دانشور اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔ گویا اب تک پوری نوعِ انسانی اس نکتے پر متفق ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ایک ایک تخلیق مثالی اور کامل ہے۔ دراصل دنیا بھر کے داناؤں اور دانشوروں کی توجہ اس مثالی تخلیق کی طرف دلا کر انہیں پیغام تو یہ دینا مقصود ہے کہ اے عقل کے اندھو! کائنات کی خوبصورتی اور کاملیت کو دیکھ کر اس پر حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کے خالق کو پہچانو اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سر نیاز خم کرو۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کے اسرار و عجائب کا کھوج لگانے والے بڑے بڑے سائنسدان اور ماہرینِ فلکیات بھی اس معاملے میں اپنے ناک تلے کے پتھر سے ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے دوران بہت کچھ دریافت بھی کیا اور بہت کچھ دیکھا بھی' لیکن اس ساری چھان بین میں انہیں اگر نہیں نظر آیا تو اس کائنات کا خالق کہیں نظر نہیں آیا۔ بقول علامہ اقبال: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا   اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق

اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾

(الملک)

''تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل گھسٹ رہا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھا ہو کر چل رہا ہے ایک سیدھے راستے پر؟''

اس آیت میں دو قسم کے انسانوں کے ''طرزِ زندگی'' کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ایک قسم کے انسان وہ ہیں جو انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جیسے ان کی حیوانی جبلت انہیں چلا رہی ہے بس اسی طرح وہ چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر تو وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندیاں بھی کرتے ہیں' معاشی دوڑ دھوپ میں بھی سرگرمِ عمل رہتے ہیں' کھاتے پیتے بھی ہیں اور دوسری ضروریات بھی پوری کرتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے جبلی داعیات کے تحت کرتے ہیں۔ جبلی داعیات کی تعمیل و تکمیل کے علاوہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں۔ ان لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص فاصلہ طے کرنے کے لیے چوپایوں کی طرح اوندھا ہو کر منہ کے بل خود کو گھسیٹ رہا ہو۔ ظاہر ہے ایسا شخص نہ تو راستہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنی منزل کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ دوسری مثال اُس شخص کی ہے جو سیدھے راستے پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑے ہو کر چل رہا ہے۔ اس مثال کے مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی منزل طے کر رکھی ہے۔ وہ طے شدہ منزل پر پہنچانے والے درست راستے کا تعین بھی کر چکے ہیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس راستے پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ظاہر ہے دنیا میں ان لوگوں کی منزل اقامتِ دین ہے جبکہ آخرت کے حوالے سے وہ رضائے الٰہی کے حصول کے متمنی ہیں۔

یہ مضمون قبل ازیں سورۃ الحج کی آیت ۷۳ میں بھی آ چکا ہے۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو حیوانات سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ اس کا نظریہ اور اس کی سوچ ہے۔ گویا انسان حقیقت میں وہی ہے جو اپنا کوئی نظریہ' کوئی آئیڈیل اور کوئی نصب العین رکھتا ہو۔ جو انسان کسی نظریے اور نصب العین کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹) کے مصداق ہیں' یعنی وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے جانوروں کو تو شعور کی اس سطح پر پیدا ہی نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کر سکیں۔ ان کی تخلیق کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی طور پر انہیں اپنے کام میں لائیں اور بس۔ سورۃ الحج کی مذکورہ آیت (آیت ۷۳) میں بتوں اور ان کے پجاریوں کی تمثیل کے پردے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس انسان کا نظریہ یا آئیڈیل بلند ہوگا اس کی شخصیت بھی بلند ہوگی' جبکہ گھٹیا آئیڈیل کے پیچھے بھاگنے والے انسان کی سوچ اور شخصیت بھی گھٹیا ہو کر رہ جائے گی۔

انبیاء ورسل علیہم السلام کے علمِ غیب کا معاملہ

عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّہٗ یَسۡلُکُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ (الجن)

آیت ۲۶ ﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ﴾ ''وہی ہے غیب کا جاننے والا''

﴿فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ ''پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔''

آیت ۲۷ ﴿اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ﴾ ''سوائے اُس کے جس کو اُس نے پسند فرما لیا ہو اپنے رسولوں میں سے''

اس آیت میں علمِ غیب کے بارے میں بہت اہم اصول بتا دیا گیا ہے۔ یعنی غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ اپنے رسولوںؑ میں سے جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے اس بارے میں مطلع فرماتا ہے۔ اس اصول کے تحت دیکھا جائے تو حضور ﷺ کی ذات سے متعلق علم غیب کا مسئلہ خواہ مخواہ متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ اگر تو کوئی شخص علم غیب سے مراد ایسا علم لیتا ہے جو بغیر کسی کے بتائے ہوئے حاصل ہو تو ایسا کوئی علم اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہر کسی کو جو بھی علم ملا ہے کسی نہ کسی کے سکھانے سے ہی ملا ہے۔ حضور ﷺ کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی علم اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔ ہم جیسے عام انسان بھی اپنے والدین' اساتذہ اور بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔

چنانچہ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے علم غیب کی درست تعریف (definition) طے کرنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ ''غیب'' کا تعلق مخلوق سے ہے' اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز ''غیب'' ہے ہی نہیں' ہر شے ہر آن اُس کے سامنے موجود ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں یا خبریں ہم انسانوں سے پوشیدہ رکھی ہیں وہ ہمارے لیے ''عالمِ غیب'' ہے۔ مثلاً جنت' دوزخ' فرشتے وغیرہ۔ اس بارے میں بھی کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء ورسل علیہم السلام کو غیب کی خبریں بھی دی جاتی ہیں اور کسی حد تک انہیں عالمِ غیب کا مشاہدہ بھی کرایا جاتا ہے: ﴿وَ کَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۷۵﴾﴾ (الانعام) ''اور اسی طرح ہم دکھاتے رہے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے''۔ حضور ﷺ کو بھی معراج کے موقع پر جنت' دوزخ اور بہت سی دوسری کیفیات کا مشاہدہ کرایا گیا' بلکہ غیب سے متعلق ایسے مشاہدات آپ کو عام معمول کی زندگی میں بھی کرائے جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نمازِ کسوف (سورج گرہن کے وقت) پڑھا رہے تھے تو نماز کے دوران آپ اچانک ایک دفعہ آگے بڑھے اور پھر اسی انداز میں پیچھے ہٹے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے اچانک جنت لے آئی گئی تو میں نے چاہا کہ اس کا پھل توڑ لوں۔ چنانچہ میرا ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بعد میرے سامنے دوزخ لے آئی گئی تو اس کی تپش کی وجہ سے میں

بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ بہر حال علم کے اعتبار سے ایک عام انسان اور ایک نبی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے کہ نبی کو عالمِ غیب کا علم بھی دیا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں تک امورِ دنیا کے علم کا تعلق ہے اس بارے میں حضورﷺ کا واضح فرمان موجود ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) (صحیح مسلم) کہ دنیاداری کے اپنے معاملات کے بارے میں تم لوگ بہتر جانتے ہو۔ چنانچہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل علیہم السلام کو جب چاہے جس قدر چاہے عالم غیب کا مشاہدہ کرادے یا غیب کے علم میں سے جتنا علم چاہے عطا فرمادے۔

حضورﷺ کے علمِ غیب کے بارے میں بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ذاتی طور پر متعدد بریلوی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ میں جتنے علماء سے ملا ان سب کو میں نے مندرجہ ذیل تین نکات پر متفق پایا:

(۱) حضورﷺ کا علم ذاتی نہیں، عطائی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

(۲) آپﷺ کا علم قدیم نہیں، حادث ہے۔ یعنی پہلے نہیں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تو آپؐ کو علم ہوگیا۔

(۳) آپﷺ کا علم لامحدود نہیں، محدود ہے۔

دراصل ان تین نکات کے بارے میں مسلمانوں کے کسی مکتبہ فکر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے بحث طلب ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کو علم غیب عطا فرمایا، جب چاہا اور جتنا چاہا عطا فرمایا۔ اب کیا میں اور آپ اس بارے میں بحث کریں گے کہ حضورﷺ کو کس چیز کا علم تھا اور کس چیز کا علم نہیں تھا؟ میری اور آپ کی حیثیت ہی کیا ہے کہ ہم حضورﷺ کے علم کے بارے میں ناپ تول کریں۔ معاذ اللہ!

﴿فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝۲۷﴾ ”تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔“

یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے غیب کے حقائق کا علم اپنے کسی رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی حفاظت کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے۔

قیام اللیل کی اہمیت وفضیلت

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ (المزمل)

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ

مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ ۙ وَ اٰخَرُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۫ۖ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ ۙ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّ اَعۡظَمَ اَجۡرًا ؕ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۰﴾ (المزمل)

آیت ۱ ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!''

آیت ۲ ﴿قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾﴾ ''آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔''

آیت ۳ ﴿نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ﴿۳﴾﴾ ''(یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔''

یعنی آپ اللہ تعالیٰ کے حضور آدھی رات یا ایک تہائی رات کا قیام کریں۔

آیت ۴ ﴿اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ﴾ ''یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں''

یا پھر رات کا دو تہائی حصہ قیام میں گزاریں۔ یعنی آپ ﷺ کے قیام اللیل کا دورانیہ یا نصاب ایک تہائی رات سے لے کر دو تہائی رات تک ہونا چاہیے۔ اس نصاب میں ہمارے لیے رمضان کے قیام اللیل کے حوالے سے بھی راہنمائی موجود ہے۔ رمضان کی راتوں کے قیام کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ ، وَمَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ)) (متفق علیہ)

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ' اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ' اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے' اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ' اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!''

اب ظاہر ہے ''قیام اللیل'' کی اصطلاح کا اطلاق رات کے ایک بڑے حصے کے قیام پر ہی ہو سکتا ہے۔ گھنٹے بھر میں جیسے تیسے بیس رکعات پڑھ کر سو جانے کو تو قیام اللیل نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ بیس رکعات کا نصاب تو اصل میں ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے سارا دن محنت و مشقت میں گزارنا ہے۔ ایسے لوگوں کی مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے قیام اللیل کا ایک کم سے کم معیار مقرر فرما دیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کے حالات موافق ہوں' انہیں رمضان المبارک میں بہر صورت زیر مطالعہ آیات کے مفہوم و مدعا کے مطابق قیام اللیل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ حضرات جو اپنی ملازمت وغیرہ سے ایک ماہ کی رخصت لے سکتے ہوں انہیں بھی چاہیے کہ وہ اپنی سالانہ چھٹیاں سیر سپاٹوں پر ضائع کرنے کے بجائے رمضان کے لیے

بچا کر رکھا کریں' تا کہ قیام اللّیل کی برکتوں سے کماحقہٗ مستفید ہو سکیں۔

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ ''اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔''

تَــرْتِیْــل کے معنی قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کے ہیں۔ گویا قیام اللّیل کا اصل لازمہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کو یہ حکم نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں دیا گیا تھا۔ بعد میں جب باقاعدہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو قیام اللّیل کو مختصر کر کے تہجد کی شکل دے دی گئی' لیکن اس میں بھی قرآن کی تلاوت پر زور دیا گیا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۷۹) یعنی تہجد بھی قرآن کے ساتھ (بِـهٖ) ادا کریں۔ لہٰذا تہجد کا حق یوں ادا نہیں ہوتا کہ چند مختصر سورتوں کے ساتھ آٹھ رکعتیں ادا کیں اور پھر بیٹھ کر دوسرے اذکار میں مشغول ہو گئے۔ بہرحال جسے اللہ تعالیٰ نے تہجد کی توفیق دی ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اتنا قرآن ضرور یاد کرے جس سے تہجد کا کچھ نہ کچھ حق ادا ہو سکے۔

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب' کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات''

﴿وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ﴾ ''اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان میں سے بھی ایک جماعت آپ کے ساتھ (کھڑی) ہوتی ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے۔''

رات دن کے اوقات بھی اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں اور انسانوں کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے' اس لیے وہ اپنے بندوں کی استعداد سے خوب واقف ہے۔

﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ ''اللہ جانتا ہے کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے''

یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس انداز سے یہ مشقت زیادہ عرصے تک نہیں جھیلی جا سکتی۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اُس نے تم پر مہربانی فرمائی ہے''

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ﴾ ''تو اب قرآن سے جتنا بآسانی پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔''

اس حکم کے ذریعے دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللّیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔

﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں کچھ لوگ مریض ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''اور بعض دوسرے زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش کرتے ہوں گے''

﴿وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۫﴾ ''اور کچھ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہوں گے''

اب ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے رات کو طویل قیام کرنا ممکن نہیں۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ﴾ ''چنانچہ جس قدر تمہارے لیے آسان ہو اُس میں سے پڑھ لیا کرو''

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

اس حکم میں پانچ نمازوں کو قیام اللّیل کا بدل قرار دے دیا گیا' البتہ رمضان میں قیام اللیل کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رہا۔ رمضان چونکہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا'' چنانچہ قرآن سے تعلق کی تجدید کے لیے اس مہینے میں قیام اللّیل کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رمضان کی آمد پر حضور ﷺ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے' جس میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان) ''اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نمازِ تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)''۔ یعنی رمضان کے روزے تو اہل ایمان پر فرض کر دیے گئے کہ اہل ثروت' نادار' مزدور' کسان وغیرہ سبھی روزہ رکھیں اور بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرنے کے عادی بن کر خود کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھیں۔ جبکہ رمضان کی راتوں کے قیام کے لیے اختیار دے دیا گیا کہ جو کوئی اس کا اہتمام کر سکتا ہو وہ ضرور اس کی برکتوں سے مستفیض ہو۔ بعد میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسے اجتماعی شکل دے دی گی۔ چنانچہ اجتماعی قیام الیل کا وہ سلسلہ جس کا اہتمام ہمارے ہاں باجماعت تراویح کی صورت میں ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے امت تک پہنچا ہے۔ یہ دراصل قیام اللّیل کا ''عوامی'' پروگرام ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قیام اللیل کی برکتوں سے کوئی شخص بھی محروم نہ رہنے پائے۔ قرونِ اولیٰ کے مخصوص ماحول اور حالات میں اس باجماعت قیام اللیل کی افادیت بہت زیادہ تھی۔ قرآن مجید کی زبان چونکہ ان لوگوں کی اپنی زبان تھی اس لیے امام کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق تمام سامعین کے دلوں میں اترتا چلا جاتا تھا' لیکن آج ہمارے ہاں کی تراویح کے اکثر و بیشتر مقتدی تو ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' کی تصویر بنے سارا وقت رکعتوں کے حساب میں مشغول رہتے ہیں (اِلّا ماشاء اللہ)۔ چنانچہ اس عظیم الشان فورم پر بھی اب قرآن حکیم کا سننا بس سننے کی حد تک ہی ہے اور تفہیم و تذکیر کے حوالے سے اس استماع کی افادیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔

﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ﴾ ''اور اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔''

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لیے' اسے موجود پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر اور اجر میں بڑھ کر۔''

جو نیک اعمال تم نے آگے بھیجے ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ کے پاس تم بہت ہی بہتر حالت میں پاؤ گے۔ اللہ

تعالیٰ تمہارے ان اعمال کو نہ صرف سات سو گنا تک بڑھا کر تمہیں لوٹائے گا بلکہ اپنے فضلِ خاص سے اس کے بدلے خصوصی اجر بھی تمہیں عطا فرمائے گا۔

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ﴾ ''اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا' رحمت فرمانے والا ہے۔''

''تکبیرِ رب'' کے حکم کا اصل مفہوم و مدعا

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ (المدثر)

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!''

آیت ۲ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿٢﴾﴾ ''آپ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے۔''

یہ دراصل وہ کٹھن ذمہ داری ہے جس کے بارے میں سورۃ المزمل کی آیت ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾﴾ میں حضور ﷺ کو بہت پہلے اشارہ دے دیا گیا تھا' یعنی انذارِ آخرت کی ذمہ داری۔ آپ کی اس ذمہ داری کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ﴾ کہ اے نبی (ﷺ!) آپ ان لوگوں کو بتائیں کہ قرآن مجھ پر نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو خبردار کر دوں۔ تم اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہو' تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم امانت ہے جس کی ذمہ داری کے بوجھ سے زمین' پہاڑ اور آسمان تک ڈر گئے تھے۔ اسی امانت کے حوالے سے تمہارا احتساب ہونا ہے۔ اس احتساب کے لیے مرنے کے بعد تمہیں پھر سے زندہ کیا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) (فقه السيرة للالبانی)

''اللہ کی قسم' تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا' اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور برائی کا برائی' اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی!''

بہرحال آیت زیر مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی دعوت کا نقطۂ آغاز ''انذارِ آخرت'' ہے۔ اب اگلی آیت میں اس دعوت کے ہدف کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کی دعوت کا ہدف نہ تو خانقاہی نظام کی تشکیل ہے اور نہ ہی صرف تعلیم و تعلّم کے نظام کا قیام ہے' بلکہ اس کا ہدف یہ ہے:

آیت ۳ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾﴾ ''اور اپنے رب کو بڑا کرو!''

غور کیجیے! رب کو بڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو اپنی ذات میں خود ہی سب سے بڑا ہے۔ ہم انسان اس کو بھلا کیا بڑا کریں گے؟ تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی عملاً تسلیم نہیں کی

جا رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو محدود اختیار عطا فرمایا تھا اس کے بل پر اُس نے اسی کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم اور فساد کا بازار گرم ہو گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ۴۱) ''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے لوگوں کے اعمال کے سبب''۔ چنانچہ اب جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ اور اپنا رب مانتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پارٹی (حزب اللہ) کا ممبر اور اس کی فوج کا سپاہی بن کر لوگوں سے اُس کی بڑائی کو منوانے اور اس کی کبریائی کو عملی طور پر دنیا میں نافذ کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن مَن اور دھن کھپا دے' تاکہ اللہ تعالیٰ کی بات سب سے اونچی ہو: ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹) ''اور دین کُل کا کُل اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے''۔ یہ ہے ''تکبیرِ رب'' یا ''رب کو بڑا کرنے'' کے مفہوم کا خلاصہ۔ گویا ان دو لفظوں میں حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد اور آپؐ کے مشن کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ''تکبیرِ رب'' کی اصطلاح کی حیثیت ایک ایسی گٹھلی کی ہے جس میں سے اقامتِ دین' غلبۂ دین' اظہارِ دین حق' حکومتِ الٰہیہ وغیرہ اصطلاحات کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں بھی آیا ہے۔ اس آیت میں بھی حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے: ﴿وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾﴾ ''اُس کی تکبیر کرو جیسے کہ تکبیر کرنے کا حق ہے''۔ یہ ترجمہ (تکبیر کرو) بہت اہم اور توجہ طلب ہے۔ صرف زبان سے ''اللہ اکبر'' کہہ دینے سے اللہ کی تکبیر نہیں ہو جاتی' اس کے لیے عملی طور پر بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ زبان سے اللہ اکبر کہنا تو تکبیر کا پہلا درجہ ہے کہ کسی نے زبان سے اقرار کر لیا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد اہم اور کٹھن مرحلہ اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اللہ تعالیٰ کو عملی طور پر بڑا کرنے کا ہے۔ یہ مرحلہ تب طے ہوگا جب ہمارے گھر میں بھی اللہ تعالیٰ کو بڑا تسلیم کیا جائے گا اور گھر کے تمام معاملات میں اسی کی بات مانی جائے گی' جب ہماری پارلیمنٹ میں بھی اس کی بڑائی کو تسلیم کیا جائے گا اور کوئی قانون اس کی شریعت کے خلاف نہیں بن سکے گا' جب ہماری عدالتوں میں بھی اس کی بڑائی کا ڈنکا بجے گا اور تمام فیصلے اسی کے احکامات کی روشنی میں کیے جائیں گے۔ غرض جب تک ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اور ہر کہیں اس کا حکم آخری حکم کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ کی تکبیر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو عملی طور پر نافذ نہ کرنے والوں کے لیے' سورۃ المائدۃ کے احکام بہت واضح ہیں: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾۔ آج ہم نے اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) اپنے تئیں مسجدوں میں بند کر دیا ہے کہ اے اللہ! آپ یہیں رہیں' ہم یہیں پر آ کر آپ کی تکبیر کے ترانے گائیں گے' آپ کی تسبیح و تحمید کریں گے —— لیکن مسجد سے باہر ہماری مجبوریاں ہیں۔ کیا کریں مارکیٹ میں مالی مفادات کے ہاتھوں مجبور ہیں' گھر میں بیوی بڑی ہے' کسی اور جگہ کوئی اور بڑا ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے ہاں اللہ کی تکبیر کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے اور اب تکبیر فقط دو الفاظ (اللہ اکبر) پر مشتمل ایک کلمہ بن کر رہ گئی ہے' جسے زبان سے ادا کر دیں تو گویا اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

سورۃ المدثر کی ان ابتدائی تین آیات میں ہمیں حضور ﷺ کی زندگی کے اس دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے

جب آپ پر تفکر و تدبر بلکہ تشویش اور فکر مندی کا غلبہ تھا۔ غارِ حرا کے اندر پہلی وحی کا نزول آپ کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا جس پر آپ بجا طور پر فکر مند تھے۔ پھر ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کے آئندہ حالات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے آپ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی تھے۔ پہلی وحی کے واقعہ کے بعد حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ان کے پاس لے کر گئیں۔ وہ صاحبِ بصیرت عیسائی راہب تھے۔ انہوں نے آپ سے غارِ حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد کہا کہ آپ کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور ﷺ نے ورقہ بن نوفل کی اس بات پر پریشانی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ آپ ﷺ کا مطلب تھا کہ وہ سب لوگ تو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں، مجھے صادق اور امین مانتے ہیں، اور میرے قدموں میں اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں، بھلا وہ مجھے کیوں شہر بدر کریں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی یہ ذمہ داری جس کسی کو بھی ملی اس کی قوم اس کی دشمن بن گئی، ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضور ﷺ سے اس ملاقات کے بعد جلد ہی ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا۔ یعنی اس وقت تک صرف آپ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا، رسالت کی ذمہ داری ابھی آپ کو نہیں ملی تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت بھی نہیں دی اور اسی لیے ورقہ بن نوفل کا شمار صحابہ میں بھی نہیں ہوتا۔

وقوعِ قیامت کا ایک اہم گواہ ـــ انسان کا نفسِ لوامہ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (القیامہ)

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی۔''

نفسِ لوامہ کے لغوی معنی ہیں: ملامت کرنے والا نفس۔ اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جسے ہم عرفِ عام میں ضمیر (conscience) کہتے ہیں۔ اس آیت میں نفسِ لوامہ یا انسانی ضمیر کو قیامِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی نفسِ لوامہ یا ضمیر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مسلمان، کافر یا دہریہ انکار نہیں کر سکتا۔ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' یا ''my conscience is biting me'' جیسے جملے دنیا بھر کے انسانوں کے ہاں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آپ کوئی غلط یا برا کام کریں تو اندر سے کوئی چیز کیوں بار بار آپ کے دل و دماغ میں چبھن پیدا کرتی ہے؟ اور بعض اوقات اس چبھن کے تسلسل و

تکرار کی وجہ سے آپ کی نیند تک کیوں اُڑ جاتی ہے؟ اگر کوئی نیکی نیکی نہیں اور کوئی برائی برائی نہیں تو برے کام پر انسان کے اندر کی یہ چبھن یا خلش آخر آپ کو کیوں تنگ کرتی ہے؟ چنانچہ نیکی اور بدی کے الگ الگ وجود کا سب سے بڑا اور آفاقی سطح پر مسلّمہ ثبوت انسانی نفس کی ملامت یا ضمیر کی خلش ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے نیک اور برے اعمال کا حتمی اور قطعی نتیجہ نکلنا بھی ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اس حوالے سے زمینی حقائق سب کے سامنے ہیں۔ یعنی دنیا میں ایسا کوئی حتمی اور قطعی نتیجہ نہ تو نکلتا ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر انسان کو اُس کے اچھے بُرے اعمال کی پوری پوری جزا یا سزا دینے کے لیے ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کا وجود میں لایا جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قیامت' آخرت یا بعث بعد الموت کی سب سے بڑی دلیل خود انسان کے اندر موجود ہے' اور وہ ہے انسان کا نفسِ لوّامہ یا اس کا ضمیر۔

''انسان'' کا اصل المیہ

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾
فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ
وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾

(الانشقاق)

آیت ۶ ﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾﴾ ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف' پھر تو اس سے ملنے والا ہے۔''

یہ دنیا انسان کے لیے دارالمِحن یعنی مشقتوں کا گھر ہے۔ انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سورۃ البلد میں یوں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾﴾ کہ انسان تو پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ گویا مشقتیں برداشت کرنا' دکھ اٹھانا اور سختیاں جھیلنا انسان کا مقدر ہے۔ اس سے کسی انسان کو رستگاری نہیں۔ مزدور ہے تو وہ صبح سے شام تک جسمانی سختیاں سہہ رہا ہے۔ کارخانہ دار ہے تو انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں جگر خون کر رہا ہے۔ اگر کوئی کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو ذہنی مشقت کی چکی میں پس رہا ہے۔ پھر اپنی اور اہل وعیال کی بیماریاں' معاشی مشکلات' معاشرتی الجھنیں' مال و جان کی حفاظت کی فکر وغیرہ کی صورت میں ذہنی ونفسیاتی پریشانیاں الگ ہیں جو ہر انسان کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کا غم اس کے علاوہ ہے جو ہر انسان نے اپنے دل و دماغ میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور پال رکھا ہے۔ پیدل چلنے والا سائیکل سوار کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے' سائیکل سوار کار والے کے حسد میں مبتلا ہے۔ چھوٹی کار والا بڑی کار والے سے جلن کا شکار ہے۔ غرض مشقت' تکلیف یا غم کی نوعیت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی دکھ' پریشانی یا مشقت میں مبتلا نہ ہو۔ ان مشقتوں' تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا انسان کو روزِ اوّل سے ہے اور رہتی

دنیا تک رہے گا۔ جیتے جی کوئی انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ مرزا غالبؔ نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ‘ لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر اور پریشان کن ہے۔ اور بقول ابراہیم ذوقؔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

ذرا انسان کے اخروی احتساب کا تصور ذہن میں لائیے اور پھر موازنہ کیجیے کہ باقی جانداروں کے مقابلے میں ’’انسان‘‘ کس قدر مشکل میں ہے۔ ایک بار بردار جانور کی زندگی کا معمول چاہے جتنا بھی مشکل ہو‘ لیکن اس کی مشقت اور تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایک بیل جب ہل یا رہٹ چلاتے چلاتے مر جاتا ہے تو اس مشقت سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک انسان ہے جو کوفت پر کوفت برداشت کرتا اور تکلیف پر تکلیف جھیلتا جب اس دنیا سے جائے گا تو اسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دنیوی زندگی کے ایک ایک پل کا حساب دینا ہوگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ، وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) (سنن الترمذی)

’’ابنِ آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں‘ صلاحیتوں اور اُمنگوں) کے دور کے بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللّوں تللّوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟‘‘

یعنی دنیا میں بار برداری بھی کرو‘ جسمانی‘ ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں بھی برداشت کرو۔ مال و جان اور اولاد سے متعلق رنگارنگ صدمے جھیلتے جھیلتے زندگی بھر کانٹوں پر بھی لوٹتے رہو اور پھر مرنے کے بعد ایک ایسی ہستی کے سامنے کھڑے ہو کر پل پل کا حساب بھی دو جس سے تمہارے قلوب و اذہان کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذبات و خیالات بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ ہے ’’انسان‘‘ کی اصل ٹریجڈی! یہ مرحلہ ایک انسان کے لیے ایسا مشکل ہے کہ اسے یاد کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا!

اگر غور کیا جائے تو حضور ﷺ کے درج بالا فرمان میں مذکور سوالات میں سے آخری سوال سب سے مشکل ہے۔ جس کسی نے دین اور قرآن کا علم جس قدر زیادہ سیکھا اس کے لیے اس کا حساب دینا اسی قدر مشکل ہوگا۔

اگر کسی انسان تک قرآن حکیم کی دعوت پہنچ ہی نہیں پائی تو ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ (ایسی صورت میں اس کوتاہی کا کچھ نہ کچھ بوجھ ان لوگوں پر بھی ضرور پڑے گا جنہوں نے اسے دعوت پہنچانے میں تساہل برتا) لیکن جن لوگوں تک قرآن حکیم کی دعوت پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق قرآن حکیم کے پیغام کو سمجھ بھی لیا تو ظاہر ہے ان کے لیے اس آخری سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

آیت ۷ ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۟ۙ﴾ ''تو جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں۔''

آیت ۸ ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۟ۙ﴾ ''تو اس سے لیا جائے گا بہت ہی آسان حساب۔''

اس حساب کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی وضاحت حضرت عائشہ ؓ کی روایت کردہ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں آئی ہے۔ حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ حُوْسِبَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عُذِّبَ)) ''قیامت کے روز جس کا حساب لیا جائے گا اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا''۔ اس پر میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۟ۙ﴾ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَیْسَ ذَاكِ الْحِسَابُ، اِنَّمَا ذَاكِ الْعَرْضُ، مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عُذِّبَ)) (متفق علیه) ''یہ حساب نہیں ہوگا' یہ تو محض (اعمال نامہ) پیش کیا جانا ہوگا' روزِ قیامت جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔''

تو جس خوش قسمت انسان کا اعمالنامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا' اس سے نہ تو کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی اس کے مواخذے اور مناقشے کی نوبت آئے گی۔ بس اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص سے نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۟ؕ﴾ ''اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں۔''

عدالت کے کٹہرے سے وہ شخص جب اپنے ان اہل وعیال' رشتہ دار اور ساتھیوں کی طرف لوٹے گا جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے تو بہت خوش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میری بھی خلاصی ہوگئی۔

آیت ۱۰ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۟ۙ﴾ ''اور جس کو دیا جائے گا اس کا اعمالنامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے۔''

قرآن کریم کی اکثر آیات میں ایسے لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمالنامے دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سیاق وسباق میں یہاں وَرَآءَ ظَهْرِهٖ کے الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ فرشتہ ایک مجرم شخص کو جب اس کا اعمالنامہ پکڑانے لگے گا تو وہ اس سے بچنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے چھپا لے گا۔ چنانچہ اسی حالت میں اعمالنامہ پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۟ۙ﴾ ''تو اب وہ موت کی طلب کرے گا۔''

اس وقت اس کی ایک ہی خواہش ہوگی کہ مجھے موت آجائے اور میں مر کر ختم ہو جاؤں۔

آیت ۱۲ ﴿وَّیَصۡلٰی سَعِیۡرًا ﴿۱۲﴾﴾ ’’لیکن وہ داخل ہوگا جہنم میں۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿اِنَّہٗ کَانَ فِیۡۤ اَہۡلِہٖ مَسۡرُوۡرًا ﴿۱۳﴾﴾ ’’یقیناً (دنیا میں) وہ اپنے اہل وعیال میں بہت خوش وخرم تھا۔‘‘

دنیا میں وہ حرام کی کمائی سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ عیش کرتا رہا اور آخرت کے محاسبے کا کبھی تصور بھی ذہن میں نہ لایا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھنے کا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی روزی تو سو فیصد حلال ذرائع سے کما رہا ہے لیکن وہ اللہ کے دین کا حق ادا نہیں کر رہا تو ایسے شخص کی حلال ذرائع سے کمائی ہوئی وہ روزی بھی حلال نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اپنی روزی کمانے کی اس تگ ودو میں جو وقت‘ صلاحیتیں اور وسائل صرف کیے ہیں ان میں دین کے حقوق کا حصہ بھی شامل تھا۔ گویا اپنے وقت‘ وسائل اور اپنی صلاحیتوں کا وہ حصہ جو اسے اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا چاہیے تھا‘ اس حصے کو غصب کر کے وہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آیا۔ تو دین کے حقوق کو غصب کر کے کمائی ہوئی ایسی روزی حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ دراصل حلال وحرام کے معاملے کو بہت دقتِ نظری سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے کو عام طور پر بہت سطحی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام مسلمان سور کا گوشت کھانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اس بکری کا گوشت بہت مزے اور رغبت سے کھا لیتا ہے جو اس نے کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر خریدی ہوتی ہے۔ اب ایسی بکری کے بارے میں کون کہے گا کہ وہ حلال ہے اور حرام نہیں ہے!

اس موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باطل کے غلبے کے تحت اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کر رہا تو وہ بزعم خویش بے شک ناپ تول کر حلال ہی کیوں نہ کھا رہا ہو‘ اس کا کھانا پینا حتیٰ کہ اس ماحول میں سانس لینا سب حرام ہے۔ ایسے شخص کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کس نظام کی چاکری کر رہا ہے؟ کس کے اقتدار کو کندھا دے رہا ہے؟ تنخواہ کہاں سے لے رہا ہے؟ اور اپنا کاروبار کس کی مدد سے آگے بڑھا رہا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ سب کچھ باطل نظام کے لیے کر رہا ہے اور طاغوت کی فراہم کردہ چھتری کے سائے میں کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کا کسی باطل نظام کے تحت ہنسی خوشی زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ اِلّا یہ کہ ایسی صورت حال میں وہ کراہت اور بے چینی میں زندگی بسر کرے‘ اپنی ضروریات کو کم سے کم سطح پر رکھے اور باطل نظام کو بدلنے کے لیے اپنا تن مَن دھن کھپا دینے پر ہمہ وقت کمربستہ رہے۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی یہ سوچ اور جدوجہد باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

آیاتِ زیر مطالعہ میں دو انسانی کرداروں کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں ایک کردار تو اللہ کے اُس بندے کا ہے جو دُنیوی زندگی کے دوران آخرت کی جواب طلبی کے احساس سے ہر وقت لرزاں وترساں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب پر آخرت کے احتساب کا خوف اس حد تک مسلّط ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کیفیت کو جنت میں

پہنچ کر بھی یاد کریں گے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ (الطور) ’’وہ کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے اہل وعیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے‘‘۔ ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں یہاں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت سے اپنی کامیابی کی نوید سننے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں لوٹے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کردار وہ ہے جو آخرت اور آخرت کے محاسبے سے بے خبر اپنے اہل وعیال کے ساتھ عیش وعشرت میں مست رہا۔ ایسے شخص نے دنیا میں بلاشبہ ایک خوشحال اور خوشیوں بھری زندگی گزاری، لیکن آخرت میں اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے بارے میں ایک اہم بشارت

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۶ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝۱۷ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝۱۸ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹

(الانشقاق)

آیت ۱۶ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۶﴾ ’’تو نہیں، مجھے قسم ہے شام کی سرخی کی۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝۱۷﴾ ’’اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝۱۸﴾ ’’اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔‘‘

میری خالص ذاتی رائے کے مطابق (واللہ اعلم!) سورۃ المدثر کی آیات ۳۲، ۳۳ اور ۳۴ میں بعثتِ محمدیؐ کی خبر دی گئی ہے، جبکہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ المدثر کی مذکورہ آیات میں رات ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝۳۳﴾ سے مراد چھ سو سال (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور تک) کا وہ طویل عرصہ ہے جس کے دوران وحی ونبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور دُنیا پر مجموعی طور پر کفر وشرک اور ضلالت وجہالت کے اندھیرے چھائے رہے۔ چاند کی قسم ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝۳۲﴾ میں علم وہدایت کی اس مدھم روشنی کا استعارہ ہے جو جن وانس کے نیک افراد کی صورت میں اس دوران کہیں کہیں موجود رہی، جبکہ صبح کی قسم ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝۳۴﴾ کے پردے میں نبوتِ محمدی ﷺ کے خورشید کے طلوع ہونے کی خبر دی گئی ہے، اور اس کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے: ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝۳۵﴾ کہ یہ بلاشبہ ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔ ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا کوئی اور واقعہ کیا ہوگا!

بہرحال نبوت ورسالتِ محمدیؐ کے خورشیدِ جہاں تاب کی تابانیوں سے دنیا پر چھ سو سال سے چھائی ہوئی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ حضور ﷺ کی وساطت سے اَبنائے آدم کو ’’اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ‘‘ کی خصوصی سند بھی عطا ہوئی، جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب بھی رونما ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب کی فتوحات وبرکات تین براعظموں تک پھیل گئیں۔ لیکن چند ہی دہائیوں کے بعد مشیتِ خداوندی سے نہ صرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ پسپائی پر مجبور ہوگئے۔ پسپائی کا یہ عمل جب شروع ہوا تو صرف جنگی محاذوں سے پیچھے ہٹنے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم زندگی کے ہر شعبے اور ہر

میدان سے دست بردار ہو کر نکبت واد بار کی پستیوں میں لڑھکتے چلے گئے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ابھی اس کے رکنے کے بظاہر کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گھمبیر صورت حال اپنی جگہ پر ایک زمینی حقیقت ہے، لیکن دوسری طرف ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے اسلام پوری دنیا پر غالب آئے گا۔ اس بارے میں حضورﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں (اس مضمون کی احادیث ''نویدِ خلافت'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تفصیل جاننے کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر نگرانی چھپنے والے اس کتابچے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے)۔ میں سمجھتا ہوں کہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کے اسی غلبے کی بشارت دی گئی ہے جس کی تفصیل حضورﷺ کے فرمودات میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک یہاں پہلی قسم ﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾﴾ میں اسلام کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے کی صورت حال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی سورج غروب ہو چکا ہے اور اب اُفق پر صرف شفق کی سرخی نظر آ رہی ہے۔ دوسری قسم ﴿وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾﴾ میں حالات کے مزید گھمبیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ دین پر عمل کے اعتبار سے دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا جائے گی، صرف مدھم سی روشنی باقی رہے گی جو وقت آنے پر آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔ درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے چاند کی قسم ﴿وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾﴾ اسی مدھم اور تدریجاً بڑھتی ہوئی روشنی کا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کی چاندنی ایک حد تک رات کو روشن کر دیتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

آیت ۱۹ ﴿لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾﴾ ''(اسی طرح) تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔''

یعنی جس طرح چاند درجہ بدرجہ بڑا ہو کر مرحلہ وار رات کو روشن کرتا ہے بالکل اسی طرح تم لوگ مرحلہ وار کوششوں سے غلبۂ دین کی منزل تک پہنچو گے۔ واضح رہے کہ لَتَرۡکَبُنَّ کے صیغے میں زور اور تاکید بھی ہے کہ تم لوگ اس منزل تک ضرور پہنچو گے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ خبر حضرت محمدٌ رسول اللہﷺ نے دی ہے وَهُوَ الصَّادِقُ وَالۡمَصۡدُوۡق! آپؐ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا دنیا پر اسلام کا مکمل غلبہ ہو کر رہے گا۔ البتہ اسلام کے پہلے غلبے کی شان اور تھی اور دوسرے غلبے کا انداز اور ہوگا۔ یہ فرق سورۃ المدثر کی آیت ۳۴ اور زیر مطالعہ سورت کی آیت ۱۸ پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صبح کے اُجالے کی طرح ہوا تھا: ﴿وَالصُّبۡحِ اِذَآ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾﴾ (المدثر)۔ اس اُجالے کی شان یہ تھی کہ ادھر آفتابِ نبوتؐ طلوع ہوا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہو گیا۔ یعنی حضورﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پوری طرح غالب آگیا۔ ظاہر ہے سورج کے طلوع ہونے کے بعد روشنی پھیلنے میں زیادہ دیر تو نہیں لگتی۔

البتہ اسلام کے دوسرے غلبہ کی روشنی چاند کی چاندنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔ یعنی اب اقامت دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی کوششوں اور کسی ایک نسل کے

زمانے میں نہیں بلکہ نسل در نسل جدوجہد سے قائم ہوگا۔ جیسے برعظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''، یعنی مسلمان اس ضابطہ حیات کو ایک ''وحدت'' کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حزب اللہ'' اور مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے پلیٹ فارم سے اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کی۔ اسی طرح آئندہ ادوار میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کے بندے اس جدوجہد کا عَلَم سنبھالے رہیں گے۔ مختلف تحریکیں اس مشن کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف انداز میں کردار ادا کرتی رہیں گی اور بالآخر ان اجتماعی اور مرحلہ وار کوششوں کے نتیجے میں جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اسلام بطور دین پوری دنیا میں غالب ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے چار مظاہر

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣ (الاعلیٰ)

آیت ۱ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١﴾ ''پاکی بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت بلند و بالا ہے۔''

یہ حکم یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ''اپنے رب کی پاکی بیان کرو'' لیکن یہاں خصوصی طور پر اسم (نام) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی تعلق صرف اور صرف اس کے ناموں کے حوالے سے ہے۔ اسی لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے''۔ چنانچہ ہم انسان اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیں یا اس کی تسبیح و تحمید کرنا چاہیں تو ظاہر ہے اس کے اسماء کے حوالے سے ہی کر سکتے ہیں۔

آیت ۲، ۳ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣﴾ ''جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا، پھر تناسب قائم کیا۔ اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا، پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔''

ان چار الفاظ (خَلَقَ، فَسَوّٰى، قَدَّرَ، فَهَدٰى) میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان بھی ہے اور تخلیقی عمل کے مختلف مراحل کا ذکر بھی۔ قبل ازیں سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کے حوالے سے تین اسمائے حسنیٰ (اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِئُ، اَلْمُصَوِّرُ) کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ سورۃ الحشر کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفات ایک خاص منطقی ترتیب سے بیان ہوئی ہیں۔ یہ ترتیب دراصل تخلیقی عمل کے مرحلہ وار ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے کسی چیز کا نقشہ یا نمونہ بناتا ہے، اس لحاظ سے وہ اَلْخَالِقُ ہے۔ پھر وہ مطلوبہ چیز کو طے شدہ نمونے کے مطابق عدم سے عالمِ وجود میں ظاہر فرماتا ہے، اس اعتبار سے وہ اَلْبَارِئُ ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ اس تخلیق کو ظاہری صورت یا شکل عطا فرماتا ہے، اس مفہوم میں وہ اَلْمُصَوِّرُ ہے۔

سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت میں تخلیقی عمل کے جن تین مراحل کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق چیزوں کے ظاہری یا مادی وجود سے ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیات میں مادی وجود کی تخلیق کے ساتھ ساتھ چیزوں کے باطنی خصائص کی تخلیق کا ذکر بھی ہے۔ (خَلَقَ فَسَوّٰی کے الفاظ میں چیزوں کے مادی وجود کی تخلیق کے مراحل کا بیان ہے' جبکہ قَدَّرَ فَهَدٰی کے الفاظ کسی تخلیق کے باطنی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔)

اب ہم ان الفاظ کے معانی و مفہوم کو انسانی ماحول کی مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مراحل (تخلیق اور تسویہ) کو ایک عمارت کی مثال کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کر دینا اس کی ''تخلیق'' ہے' جبکہ اس کو سجانا' سنوارنا (finishing) وغیرہ اس کا ''تسویہ'' ہے۔ تخلیق کا تیسرا مرحلہ جس کا یہاں ذکر ہوا ہے وہ ''قدر'' ہے۔ قدر کے لغوی معنی اندازہ مقرر کرنے کے ہیں' جسے عرفِ عام میں ہمارے ہاں تقدیر کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں کسی تخلیق کے معیار' اس کی صلاحیت' استعداد اور حدود (limitations) سمیت جملہ خصوصیات کو اس کی قدر یا تقدیر کہا جائے گا۔ مثلاً انسان اشرف المخلوقات تو ہے لیکن وہ ہوا میں اڑنے سے معذور ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی چڑیا آسانی سے ہوا میں اڑتی پھرتی ہے۔ گویا ہوا میں اڑنے کی یہ صلاحیت رکھنا چڑیا کی تقدیر کا خاصہ ہے اور اس اعتبار سے معذور ہونا انسان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے اگلے مرحلے کے طور پر یہاں ''ہدایت'' کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد وہ فطری اور جبلی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدائشی طور پر عطا کر رکھی ہے۔ اسی ''ہدایت'' کی روشنی میں بکری کو معلوم ہوا ہے کہ اسے گھاس کھانا ہے اور شیر جانتا ہے کہ اس کی غذا گوشت ہے۔ غرض ہر جاندار اپنی زندگی اسی طریقے اور اسی لائحہ عمل کے مطابق گزار رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

تخلیق کے ان چار مراحل کے حوالے سے اگر ہم انسانی زندگی کا جائزہ لیں تو پہلے دو مراحل یعنی تخلیق اور تسویہ کے اعتبار سے تو انسان میں اور اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں' لیکن اگلے دو مراحل (تقدیر اور ہدایت) کے حوالے سے انسان کا معاملہ دوسری مخلوقات سے الگ ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان کی قدر' صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ کے ہاں دو طرح سے طے پاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یا ایک حصہ تو وہ ہے جو اسے پیدائشی طور پر جینز (genes) کی صورت میں عطا ہوا (given) ہے اور دوسرا پہلو یا دوسرا حصہ اس کے ماحول کا ہے جس میں وہ آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے اچھے برے اور مثبت و منفی عوامل کے ملنے سے ہر انسان کی شخصیت کا ایک سانچہ تیار ہوتا ہے جسے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں ''شاکلہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کے تحت اس اصطلاح کی وضاحت کی جا چکی ہے۔) اسی سانچہ یا شاکلہ سے ہر انسان کی استعداد کی حدود متعین ہوتی ہیں اور کوئی انسان' انگریزی محاورہ "one cannot out grow ones skin" (کوئی انسان اپنی کھال سے باہر نہیں نکل سکتا) کے مصداق' ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ہر انسان نیکی کرے گا تو اپنی اسی استعداد کے مطابق کرے گا اور اگر برائی کمائے گا تو انہی حدود کے اندر رہ کر ایسا کرے گا۔ غرض ہر انسان

کی عملی زندگی کی ساری محنت‘ کوشش اور بھاگ دوڑ اپنے شاکلہ کے مطابق ہی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جانچ (evaluation) بھی اسی حوالے سے کی جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی صلاحیت پچاس درجے تک پہنچنے کی تھی‘ اگر وہ چالیس درجے تک پہنچ گیا تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ کامیاب قرار پائے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص جو سو درجے تک جانے کی استعداد رکھتا تھا‘ وہ ممکن ہے پچاس درجے تک پہنچنے کے بعد بھی ناکام رہے۔ بہرحال اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ایک اصول طے فرمادیا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ﴾ (البقرۃ:٢٨٦) ”اللہ تعالیٰ نہیں ذِمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اس کی وسعت کے مطابق۔“

اسی طرح انسان کی ”ہدایت“ کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ تو جبلی ہدایت کا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو جبلی ہدایت سے نواز رکھا ہے اسی طرح اس نے ہر انسان کو بھی فطری اور جبلی طور پر ہدایت کا ایک حصہ (نیکی و بدی میں تمیز کرنے کا شعور) عطا فرمایا ہے۔ جبکہ انسان کی ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے وحی کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔ یعنی انسان کی فطرت میں پہلے سے ودیعت شدہ بنیادی ہدایت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔

تزکیۂ باطن کی اہمیت وضرورت

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ﴿ۙ۱۴﴾ (الاعلیٰ)

”یقیناً وہ کامیاب ہوگیا جس نے خود کو پاک کرلیا۔“

تَـزَکّٰـی سے مراد یہاں روح کی پاکیزگی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی روح بہت بلند اور اعلیٰ چیز ہے۔ سورۃ التین کی اس آیت میں دراصل انسان کی روح کی تخلیق ہی کا ذکر ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾﴾ کہ ہم نے انسان کو بہت عمدہ تخلیق پر بنایا ہے۔ لیکن جب اس روح کو جسد حیوانی میں قید کرکے دنیا میں بھیجا گیا تو وقتی طور پر یہ اپنے اعلیٰ مقام سے گرکر پستی میں چلی گئی‘ جس کا ذکر سورۃ التین کی اگلی آیت میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾﴾ کہ پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ چنانچہ انسان کی دُنیوی زندگی کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود کو پستی سے نکال کر دوبارہ بلندی کی طرف لے جائے۔ اگر تو اس نے یہ ہدف حاصل کرلیا تو وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ اس کامیابی کے لیے اسے ایک طرف جسدِ حیوانی کے داعیات یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو دبانا ہوگا اور دوسری طرف اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا فراہم کرنے کا سامان کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے حیوانی داعیات کمزور ہوں گے تو تبھی روح کو تقویت ملے گی۔ ماہِ رمضان کے چوبیس گھنٹوں کے معمولات کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو دراصل اسی ”دوطرفہ“ پروگرام کی مشق کرائی جاتی ہے کہ دن کو روزہ رکھ کر حیوانی جسم اور اس کے داعیات کو کمزور کرو اور رات کو قیام اللّیل کے دوران انوارِ قرآن کی بارش سے اپنی روح کو سیراب کرو تاکہ تمہاری روح کو ترفع اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے۔

یہ ہے تزکّی کا اصل مفہوم اور اس کا بنیادی فلسفہ۔

رزق کی بست وکشاد — انسان کی آزمائش کی دو صورتیں

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ؕ﴿۱۵﴾ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ۚ﴿۱۶﴾ (الفجر)

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ﴿۱۵﴾﴾ ''انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا ربّ اسے آزماتا ہے پھر اسے عزت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی!''

آیت ۱۶ ﴿وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ﴾ ''اور جب وہ اسے آزماتا ہے پھر اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے''

﴿فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!''

یہ مقام اپنے مضمون کے اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے۔ مذکورہ دونوں کیفیات کے حوالے سے انسان کے جن مکالمات کا یہاں ذکر ہوا ہے بظاہر ان میں کوئی خرابی یا شرک کی آلودگی نظر نہیں آتی۔ دونوں کلمات توحید کے عین مطابق ہیں۔ رزق کی فراخی اور تنگی کے حوالے سے عزت اور ذلت کو کسی دیوی یا دیوتا سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ہے اور یہ کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ بظاہر تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ﴾ (آلِ عمران:۲۶) ہی کا اقرار ہے' کہ اے اللہ! تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تو پھر یہاں ان جملوں کو آخر قابلِ مذمت کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اس نکتہ لطیف کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ توحید تو ہدایت کی جڑ اور بنیاد ہے' جبکہ اس بنیاد سے اوپر بھی ہدایت کی بہت سی منازل ہیں۔ اس لیے ایک بندۂ مؤمن کو زندگی میں راہنمائی کے لیے اپنی نگاہیں صرف مینارۂ توحید پر ہی مرکوز نہیں رکھنی چاہئیں بلکہ اسے شاہراہِ ہدایت کے ہر سنگ میل اور ہر موڑ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا رخ متعین کرنا چاہیے۔

چنانچہ ان جملوں میں جس خرابی کی نشاندہی کی گئی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہاں انسانی سوچ نے رزق کی فراخی اور تنگی کو عزت اور ذلت کا معیار سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کے رزق کی بست و کشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی زیادہ رزق دے کر آزماتا ہے تو کبھی اس کو معاشی تنگی سے دوچار کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔ گویا انسان کے لیے عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی امتحان ہے اور رنج و عسرت اور تنگدستی و ناداری کے حالات بھی امتحان ہی کے مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو جس انسان نے مال و دولت کی کمی یا زیادتی کو ذلت اور عزت کا معیار سمجھ لیا وہ دھوکا کھا گیا — ایک بندۂ مؤمن کو تو دنیوی عزت و ذلت کی ویسے بھی پروا نہیں ہونی چاہیے۔

ظاہر ہے اصل اور حقیقی عزت یا ذلت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہو گا۔ چنانچہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی سے آزما رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اپنے دائیں بائیں محروم و نادار لوگوں کو ان کا وہ حق ادا کرے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی غرض سے اس کے مال میں رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کا امتحان رزق کی تنگی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنی عزتِ نفس کو بچا کر رکھے۔

اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر رزق کی کمی بیشی اور عزت و ذلت کے حوالے سے مذکورہ فلسفہ واقعتاً ہماری سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ہمارا نفس ہمیں یہ پٹی ضرور پڑھاتا ہے کہ رزق کی فراخی والی آزمائش آسان ہے اور اس کے مقابلے میں غربت و تنگدستی کی آزمائش بہت مشکل ہے' جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے اصل حقیقت یہ ہے کہ غربت و تنگدستی کی آزمائش سے سرخرو ہونا انسان کے لیے نسبتاً آسان ہے اور اس کے مقابلے میں مال و دولت کی فراوانی کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آسائش و آرام میں انسان کے غافل ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا زیادہ امکان ہے' جبکہ مشکل اور پریشانی کی کیفیت میں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى)) (مسند احمد) ''جو (مال) مقدار میں کم ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو مگر غافل کر دے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب خلیفۂ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے تو جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں آپؒ کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا ویسا تشدد اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ لیکن آپؒ نے وہ اذیت ناک آزمائش کمال صبر و استقامت سے برداشت کی اور اس دوران آنکھوں میں کبھی آنسو تک نہ آنے دیے۔ لیکن دوسرے خلیفہ کے دور میں جب آپؒ کو رہائی ملی اور آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے توڑے بطور نذرانہ پیش کیے گئے تو آپؒ یہ ''نذرانہ'' دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ اے اللہ! تیری یہ آزمائش بہت سخت ہے' میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ''توحید'' ہدایت کا پہلا اور بنیادی درجہ ہے۔ اگر انسان اپنے اچھے برے ہر طرح کے حالات کو من جانب اللہ سمجھے تو اس کا یہ طرزِ عمل توحید کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھی ہدایت کے بہت سے درجات ہیں۔ ان درجات میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلاء کے اصول و ضوابط کو سمجھے اور یقین رکھے کہ دنیا کے عیش و آرام اور تنگدستی و عسرت کی کیفیات اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ کہ تنگدستی و عسرت کی آزمائش کے مقابلے میں دولت کی فراوانی کی آزمائش کہیں زیادہ سخت اور خطرناک ہے۔

نفسِ انسانی کی خصوصیت اور اہمیت

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا ۝ وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰىهَا ۝

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا
وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ (الشمس)

آیت ۱ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝۱﴾ ''قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔''

آیت ۲ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲﴾ ''اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کر دیتا ہے۔''

آیت ۴ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴﴾ ''اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لیتی ہے۔''

آیت ۵ ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵﴾ ''اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اسے بنایا۔''

آیت ۶ ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶﴾ ''اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کہ اسے بچھا دیا۔''

آیت ۷ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ ''اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔''

آیت ۸ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ ''پس اس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا۔''

اب اگلی دو آیات میں ان قسموں کا جواب مذکور ہے:

آیت ۹ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹﴾ ''یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ ''اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا۔''

یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ ان دو آیات میں انتہائی اختصار کے ساتھ انسان کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا معیار بیان کر دیا گیا ہے۔ دَسَّ یَدُسُّ کے معنی کسی چیز کو مٹی میں دفن کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۵۹) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اَیُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ﴾ اس آیت میں قبل از اسلام زمانے کے عربوں کی ایک خاص ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جس شخص کے گھر بیٹی پیدا ہوتی ہے وہ یا تو اسے ذلت آمیز طریقے سے زندہ رکھتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں ''دَسّٰی'' دراصل دَسَّسَ (بابِ تفعیل) ہے' اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تو جس انسان نے اپنے نفس کو مٹی میں دفن کر دیا (اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس نے اپنی روح کو اپنے خاکی وجود کے اندر دبا دیا' یعنی جس کی حیوانی خواہشات و شہوات اس کی روح پر غالب آ گئیں) تو وہ ناکام رہا۔ واضح رہے کہ یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۝۱۴﴾ میں قدرے اختصار سے بیان ہوا ہے لیکن اب یہاں آیات زیر مطالعہ میں اس کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس مضمون پر قسموں کی صورت میں یہاں مزید گواہیاں بھی لائی گئی ہیں اور زیر مطالعہ آیت کے الفاظ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے۔

دراصل انسان کا نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس امانت کو پاک وصاف رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔ نفس کو پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو' یعنی اپنی شخصیت کو تمام رذائل اور باطنی

بیماریوں سے پاک کر کے بہترین انسانی خوبیوں کا مرقع بنائے۔اس کے لیے ہمارے ہاں عام طور پر تزکیۂ نفس‘ تعمیرِ سیرت‘ تعمیرِ خودی وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے نفس کو پاک کرنے اور پاک رکھنے میں کامیاب ہو گیا‘ خواہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ حقیر‘ فقیر اور بے نام ہی کیوں نہ ہو۔اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو رذائل وخبائث سے آلودہ کر لیا‘ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ناکام ہے‘ دنیا میں خواہ وہ غیر معمولی عزت‘ شہرت اور دولت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔اس لیے کہ اصل اور حقیقی کامیابی اور ناکامی کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ اس کی ''ذات'' سے ہے۔

انسان کی ''ذات'' سے کیا مراد ہے؟ فرائڈ نے اسے انسان کی self (اَنا) کا نام دیا ہے۔اس کے نزدیک انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی self کو id اور libido کے تسلط سے آزاد کرا کے اسے مثبت انداز میں ترقی دے۔علامہ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے اور انسان کی ''کامیابی'' کو اس کی خودی کی تعمیر و ترقی سے مشروط کیا ہے۔ بہرحال اس حوالے سے سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک جسم یا ہاتھ پاؤں‘ سر‘ دھڑ وغیرہ کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔انسان کہتا ہے میرا ہاتھ‘ میرا پاؤں‘ میرا سر وغیرہ۔ یہ تمام اعضاء بے شک اس کے ہیں‘ لیکن وہ انسان جو ان اعضاء کو اپنا بتا رہا ہے وہ خود کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے اصل انسان اس جسم یا وجود کے اندر ہے۔اس کو ایسے سمجھیں کہ جس طرح آم کی گٹھلی کے اندر آم کا پورا درخت موجود ہے‘ اسی طرح انسانی جسم کے اندر اصل انسان ایک لطیف شخصیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لطیف شخصیت عبارت ہے اس روح سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حیوانی یا خاکی وجود کے اندر پھونکی ہے: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:٢٩)۔ روح یا انسان کی انا کا ذکر اپنشد کے اس فقرے میں بھی ملتا ہے:

Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.

گویا انسان کی self یا انا یا خودی یا روح اس کے حیوانی وجود کی مٹی کے اندر دفن ایک خزانہ ہے۔اب جو انسان اس خزانے کو مٹی سے نکال کر کام میں لے آئے گا‘ یعنی اپنی روح کو صیقل کر لے گا‘ اس کا نفس پاک ہو جائے گا (روح کی پاکیزگی نفس کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے‘ اس لیے کہ دونوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے) اور وہ کامیابی یا فلاح کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ (فلاح کا لفظ قرآن مجید میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اس اصطلاح کے مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت کی تشریح۔)

زیر مطالعہ آیات کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر پیش نظر رہنا چاہیے کہ انسان کی روح اور اس کا نفس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان آیات میں انسانی روح کا نہیں بلکہ انسانی نفس کا ذکر ہوا ہے۔ روحِ انسانی دراصل عالمِ امر کی چیز ہے اور یہ معرفتِ خداوندی اور محبتِ خداوندی کی امین ہے‘ جبکہ نفسِ انسانی کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔ اسی لیے اس کے ذکر سے پہلے جن چیزوں کی یہاں قسمیں کھائی گئی ہیں ان سب (سورج‘ چاند‘ دن‘ رات‘ آسمان‘ زمین) کا تعلق بھی عالمِ خلق سے ہے۔ روح تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو عطا ہوئی ہے‘

جبکہ نفس گدھے، گھوڑے اور چمپینزی وغیرہ سب جانوروں میں ہوتا ہے۔ البتہ انسان کی خصوصیت اس حوالے سے یہ ہے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں نفسِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ارتقائی درجات سے نوازا ہے اور اس کے اندر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی وہ تمیز الہام کر دی ہے جو دوسرے جانوروں کے نفس میں نہیں پائی جاتی۔ اسی حس اور تمیز کی وجہ سے انسانی فطرت آفاقی سطح پر نیکی کو اچھا اور بدی کو برا سمجھتی ہے۔ دنیا میں کسی معاشرے، کسی مذہب اور کسی نسل کا انسان ہو وہ سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں معروف اور منکر کی اصطلاحات کثرت سے آئی ہیں۔ معروف وہ چیزیں یا افعال یا اعمال ہیں جو نفس انسانی کے لیے مانوس ہیں۔ انہیں دیکھ کر یا اپنا کر نفس انسانی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں منکرات وہ چیزیں یا اعمال یا افعال ہیں جنہیں نفس انسانی برا سمجھتا ہے اور جن کی صحبت و معیت میں وہ اجنبیت اور کوفت محسوس کرتا ہے، بلکہ وہ انسان کو ایسے اعمال و افعال سے ٹوکتا ہے۔ اسی لیے انسان غلطی کرنے کے بعد اکثر یہ کہتا پایا جاتا ہے کہ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' (my conscience is pinching me)۔ نفس انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سورۃ القیامہ کی آیت ۲ میں اسے نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے آیات زیر مطالعہ کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی تمیز کا بنیادی بیج ڈال دیا گیا ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس بیج کی حفاظت کرے، اسے سازگار ماحول فراہم کرے اور عمل صالح کے پانی سے اس کی آبیاری کرے۔ سورۂ فاطر (آیت ۱۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ﴾ کہ کسی بھی اچھی بات یا اچھے کلام میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن عمل صالح اس کی اس صلاحیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان جب تزکیہ نفس اور اعمالِ صالحہ کے حوالے سے محنت کرے گا تو اسے ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی، وہ ایمان کے ان ثمرات سے بھی بہرہ مند ہوگا جن کا ذکر سورۃ التغابن میں آیا ہے اور اسے کامیابی کی ضمانت بھی ملے گی۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو حیوانی وجود کے تابع کیے رکھا اور وہ اس کی آواز کو دبا کر زندگی بھر جسمانی تقاضے پورے کرنے میں لگا رہا وہ گویا خائب و خاسر ہو کر رہ گیا۔

سورۃ الّیل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰىۙ ۝۱ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰىۙ ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓىۙ ۝۳ اِنَّ سَعۡيَكُمۡ
لَشَتّٰىؕ ۝۴ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَاتَّقٰىۙ ۝۵ وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰىۙ ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰىؕ ۝۷ وَاَمَّا
مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰىۙ ۝۸ وَكَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰىۙ ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰىؕ ۝۱۰ وَمَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُ
مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰىؕ ۝۱۱ اِنَّ عَلَيۡنَا لَلۡهُدٰىۖ ۝۱۲ وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰى ۝۱۳ فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا

تَلَظّٰی ۚ﴿۱۴﴾ لَا یَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِیۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ؕ﴿۱۶﴾ وَ سَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ۙ﴿۱۷﴾ الَّذِیۡ
یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴿ۚ۱۸﴾ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤی ﴿ۙ۱۹﴾ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰی ﴿ۚ۲۰﴾
وَ لَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾ (الّیل)

آیت ۱ ﴿وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔''

یعنی تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔''

رات اور دن اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے ہیں' جبکہ اگلی قسم کا تعلق انسان کی ذات (اللہ تعالیٰ کی انفسی نشانیوں) سے ہے۔

آیت ۳ ﴿وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾﴾ ''اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔''

ان قسموں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے اندر نظر آنے والے تضادات دراصل نظامِ کائنات کا حصہ ہیں' بلکہ کائنات کا نظام انہی تضادات کی وجہ سے چل رہا ہے اور ایک جنس سے تعلق رکھنے والی دو متضاد چیزیں باہم مل کر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ دنیا کا سارا نظام دن اور رات کے ادلنے بدلنے کی وجہ سے قائم ہے۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کا وجود اسی گردشِ لیل و نہار کا مرہون منت ہے۔ خود نسل انسانی کا تسلسل بھی مرد اور عورت کے جنسی اختلاف و تضاد کی وجہ سے چل رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کی مختلف تخلیقات میں بظاہر نظر آنے والے ان تضادات کے اندر بھی ایک طرح کا توافق اور تطابق پایا جاتا ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾﴾ ''بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔''

یعنی جس طرح کائنات کی باقی چیزوں میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اسی طرح تمہارے مختلف افراد کی کوششوں اور محنتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔

ظاہر ہے زندگی کے شب و روز میں محنت' مشقت اور بھاگ دوڑ کرنا تو انسان کا مقدر ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾﴾ (البلد) ''بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے''۔ ہر انسان اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لیے بھی مشقت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کسی نظریے کا پیروکار ہے تو اس نظریے کی اشاعت اور سربلندی کے لیے بھی تگ و دو کرتا ہے اور اس نظریے کے تحت ایک نظام کے قیام کے لیے بھی جدوجہد کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق محنت اور مشقت تو سب انسان ہی کرتے ہیں لیکن ان کی مشقتوں کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی محنت کے نتیجے میں جنت خرید لیتا ہے اور دوسرا اپنی محنت و مشقت کی پاداش میں خود کو دوزخ کا مستحق بنا لیتا ہے۔ انسانی محنت میں اس فرق کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث میں ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((کُلُّ النَّاسِ یَغۡدُوۡ فَبَائِعٌ نَفۡسَهٗ فَمُعۡتِقُهَا اَوۡ مُوۡبِقُهَا)) (صحیح مسلم) ''ہر شخص روزانہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے' پھر یا تو وہ اسے

آزاد کرالیتا ہے یا اسے تباہ کر بیٹھتا ہے''۔ کوئی اپنی جسمانی قوت کا سودا کرتا ہے' کوئی اپنی ذہنی صلاحیت بیچتا ہے' کوئی اپنی مہارت نیلام کرتا ہے' کوئی اپنا وقت فروخت کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے طریقے اور اپنے اپنے انداز میں ہر شخص دن بھر خود کو بیچتا ہے۔ اب ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے خود کو بیچتے ہوئے حلال کو مدنظر رکھا' اس نے جھوٹ نہیں بولا' کسی کو دھوکہ نہیں دیا' کم معاوضہ قبول کر لیا' لیکن حرام سے اجتناب کیا۔ ایسا شخص شام کو گھر لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص نے بھی دن بھر مشقت کی' مگر حلال وحرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر۔ معاوضہ اس نے بھی لیا مگر غلط بیانی کر کے اور دوسروں کو فریب دے کر' ناپ تول میں کمی کر کے اور گھٹیا چیز کو بڑھیا چیز کے دام پر بیچ کر۔ اب یہ شخص جب شام کو گھر آئے گا تو جہنم کے انگاروں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے آئے گا۔

اب آئندہ آیات میں انسانی زندگی کے دو واضح راستوں میں سے ہر راستے کے تین اوصاف یا تین سنگ ہائے میل کی نشاندہی کر دی گئی ہے' تا کہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے' اس راستے پر اب وہ کس مقام پر ہے اور اگر وہ اس راستے پر مزید آگے بڑھے گا تو آگے کون سی منزل اس کی منتظر ہوگی۔ اس مضمون کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اب ملاحظہ ہوں ان میں سے پہلے راستے کے تین اوصاف:

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵﴾ ''تو جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔''

ظاہر ہے یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کا پہلا وصف یا پہلا سنگ میل ''اِعطاء'' یا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ البلد میں اس عمل کو انسان کے لیے ایک بہت مشکل گھاٹی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی:

﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝۱۴ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......﴾ ''کسی گردن کا چھڑا دینا۔ یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن' اُس یتیم کو کہ جو قرابت دار بھی ہے' یا اس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔ پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے......''

یعنی جو انسان اس ''مشکل گھاٹی'' کو عبور کرنے کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں شامل ہو گا وہ ان شاء اللہ حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا پیرو کار بنے گا۔ لیکن جس نے یہ امتحان پاس کیے بغیر ہی کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ توحید و رسالت کی گواہی دینے کے بعد بھی اس کے ایمان کی بو باس عبداللہ بن اُبی کے ایمان کی سی ہوگی۔ ظاہر ہے جو کلمہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے پڑھا تھا وہی کلمہ عبداللہ بن اُبی نے بھی پڑھا تھا۔ یعنی ایمان کا بیج تو دونوں طرف ایک سا تھا' مگر یہ زمین اور تھی' وہ زمین اور تھی۔ اس زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چل چکا تھا اور اُس زمین میں حُبِ دنیا اور شکوک و تردّد کے جھاڑ جھنکاڑ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی کے دل کی زمین میں ایمان کے بیج کا جماؤ ممکن ہی نہ ہوا۔ اس حوالے سے اگر سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ کے اس جملے کو مدِ نظر رکھا جائے تو اِنفاق و

اِعطاء کے اس فلسفے کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ یعنی جب تک تم لوگ اپنی عزیز ترین چیز کو اللہ کی راہ میں نہ دے ڈالو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے تو مال کی قربانی دو اور قربانی بھی بہترین چیز کی۔ یہ نہیں کہ چھانٹ کر بے کار چیزیں کسی کو دے کر سمجھو کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار دی ہے۔

اس راستے کا دوسرا وصف یا سنگ میل تقویٰ (وَاتَّقٰى) ہے' یعنی انسان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا۔ ہر لحہ برائی کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں رہنا اور مسلسل کوشش کرتے رہنا کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں اور کسی کا حق نہ ماروں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ وہ اخلاقی حس زندہ و بیدار ہو جس کا ذکر سورۃ الشمس میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ لیکن اگر اس کی اخلاقی حس کی شمع ہوا و ہوس کے طوفان کی نذر ہو چکی ہو تو پھر ظاہر ہے کہاں کا تقویٰ اور کس کا ڈر!

آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶﴾ ''اور اُس نے تصدیق کی اچھی بات کی۔''

یہ خیر کے راستے کی تیسری شرط یا اس کا تیسرا وصف ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھلائی اور حق کی کوئی بات انسان کے سامنے آئے اور اس کا دل گواہی دے دے کہ ہاں یہ بات حق ہے تو وہ بلا تردد اس کی تصدیق کر دے۔ یعنی وہ بھلائی' سچائی اور حق کی تصدیق کرنے کے لیے عواقب و نتائج کی پروا نہ کرے۔ حق کو حق جان کر اس کی تصدیق و توثیق کے لیے سود و زیاں کا ترازو نصب کر کے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس حوالے سے اپنی انا کو آڑے آنے دے۔ جیسے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی بحث کے دوران ایک آدمی پر واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی بات درست ہے مگر وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس کے موقف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ ''تو اس کو ہم رفتہ رفتہ آسان منزل (جنت) تک پہنچا دیں گے۔''

اس حوالے سے سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت بھی پیش نظر رہنی چاہیے: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸﴾ ''اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسان منزل تک''۔ لیکن سورۃ الاعلیٰ کی نسبت یہاں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔

اب اگلی آیات میں دوسرے راستے اور اس کے تین سنگ ہائے میل کا ذکر آ رہا ہے:

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ﴾ ''اور جس نے بخل کیا''

پہلی تین خصوصیات کی ترتیب ذہن میں رکھیے اور نوٹ کیجیے کہ ''اِعطاء'' کے مقابلے میں یہاں ''بخل'' آ گیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْنٰى ۝۸﴾ ''اور بے پروائی اختیار کی۔''

بھلائی اور خیر کے راستے کی تین خصوصیات میں اِعطاء کے بعد تقویٰ یعنی پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور ذمہ داری کے احساس کا بیان تھا۔ اس کے مقابلے یہاں لااُبالی پن' لاپرواہی اور بے نیازی (استغناء) کا تذکرہ

ہے۔ گویا ایک شخص حلال وحرام کی تمیز سے ناآشنا اور نیکی و بدی کے تصور سے بیگانہ اپنی دھن میں مست چلا جارہا ہے۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اس کی بلا سے' کسی کی عزت پر حرف آتا ہے تو آتا رہے' کسی کے جان و مال کی حرمت پامال ہوتی ہے تو بھی پروا نہیں! غرض اپنی سوچ ہے' اپنی مرضی ہے اور اپنے کام سے کام ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۹ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹﴾ ''اور جھٹلا دیا اچھی بات کو۔''

یعنی اس کے دل نے گواہی دے دی کہ یہ سچ اور حق بات ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تعصب یا تکبر یا ہٹ دھرمی یا مفاد یا کسی خوف کی وجہ سے اسے جھٹلا دیا۔ واضح رہے اس آیت کا تقابل آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶﴾ کے ساتھ ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰﴾ ''تو اس کو ہم رفتہ رفتہ مشکل منزل (جہنم) تک پہنچا دیں گے۔''

یہ ہیں انسانی کوشش اور مشقت کے دو رخ۔ گویا پہلی تین شرائط کو اپنانے کا راستہ صِدِّیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ اگر کسی نے کوشش کی لیکن وہ مذکورہ تینوں شرائط کو کماحقہ پورا نہ کر سکا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوشش اور اخلاص کے مطابق ہوگا۔ لیکن جس بدقسمت شخص کی کوشش اور محنت میں ان تینوں اوصاف کا فقدان ہوا اور وہ ان کے مقابلے میں عمر بھر دوسرے راستے (بخل' استغناء اور تکذیب) پر گامزن رہا' ظاہر ہے اس کا شمار ان بدترین لوگوں کے گروہ میں ہوگا جس کے سرغنہ ابولہب اور ابوجہل ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ابوجہل کے مقابلے میں ابولہب کا کردار کہیں زیادہ گھٹیا اور مذموم تھا' بلکہ قرآن مجید نے جس انداز میں اس شخص کی مذمت کی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کا بدترین فرد تھا۔ بزدلی' بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس کے بخل اور مال کو سینت سینت کر رکھنے کا ذکر سورۃ اللہب میں بھی آیا ہے۔ اس کی بزدلی اور خودغرضی کا پول اس وقت کھلا جب اس کے سامنے اپنے ''دین'' کے لیے جنگ کرنے کا مرحلہ آیا' اس وقت اس نے اپنی جگہ کرائے کے دو سپاہیوں کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے مقابلے میں ابوجہل صاف گو' بہادر اور اپنے نظریے پر مر مٹنے والا شخص تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے باطل دین کی خاطر بڑے فخر سے گردن کٹوائی۔ انگریزی کی مثل ہے: "give the devil his due" یعنی شیطان کے کردار میں بھی اگر کوئی مثبت خصوصیت ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت میں آخر کوئی تو خوبی تھی جس کی بنا پر حضور ﷺ نے اپنی خصوصی دعا میں اسے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ہی پلڑے میں رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے تو ان دونوں شخصیات کے لیے برابر کی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے! حضور ﷺ کی اس دعا کی روشنی میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ابوجہل ایمان لے آتا تو وہ حضرت عمرؓ کے پائے کا مسلمان ہوتا' نہ کہ عبداللہ بن اُبی کے کردار والا مسلمان۔

بہرحال ان آیات میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کے معیار اور اوصاف کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو انسان اپنی سیرت و شخصیت کی بنیاد پہلے تین اوصاف (بحوالہ آیت ۵ اور ۶) پر رکھے گا وہ ان شاء اللہ کامیابی سے ہمکنار ہو گا اور جو آخری تین اوصاف (بحوالہ آیت ۸ اور ۹) کا انتخاب کرے گا وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪﴾ ''اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا جب وہ (جہنم کے) گڑھے میں گرے گا۔''

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ⑫﴾ ''(دیکھو انسانو!) یقیناً ہمارے ذمے ہے ہدایت پہنچا دینا۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانا اور ''ہدایت'' تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی ہدایت بھی عطا کی ہے' اس کے نفس کے اندر اخلاقی حس بھی الہام کر دی ہے۔ اس کے اندر اپنی روح بھی پھونکی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی امین ہے اور پھر اس ہدایت و معرفت کی تکمیل کے لیے اس نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع سے انسان کو راہِ ہدایت دکھانے کا اہتمام فرما دیا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ⑬﴾ ''اور ہمارے ہی لیے ہے اختیار آخرت کا بھی اور دنیا کا بھی۔''

ظاہر ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کون انسان کامیاب ہوا ہے اور کون ناکام رہا ہے۔ اور دنیا میں بھی وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی قوم اب اس کی زمین پر بوجھ بنتے جا رہی ہے اور اس طرح کے کس بوجھ سے کس وقت اس نے زمین کو آزاد کرنا ہے۔ سورۃ الشمس میں قومِ ثمود کے بارے میں اللہ کے ایسے ہی ایک فیصلے کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ⑭﴾ ''تو الٹ دیا ان پر عذاب ان کے رب نے ان کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا''۔ یعنی جب اس قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا رسولؑ واضح نشانیوں کے ساتھ آ گیا' پھر اللہ کے رسولؑ نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور اپنے کردار و عمل کا نمونہ پیش کر کے اس قوم پر اتمامِ حجت کر دیا' اس کے بعد بھی جب وہ قوم کفر اور سرکشی پر اَڑی رہی تو انہیں ایسے ملیامیٹ کر دیا گیا جیسے کسی باغ کی صفائی کے لیے اس کا سارا کوڑا کرکٹ جمع کر کے اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ⑭﴾ ''دیکھو! میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔''

جہنم تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کی تاک میں ہے: ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ⑯ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ⑰﴾ (المعارج) ''وہ کلیجوں کو کھینچ لے گی۔ وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔''

آیت ۱۵ ﴿لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ⑮﴾ ''نہیں پڑے گا اس میں مگر وہ جو انتہائی بدبخت ہے۔''

ظاہر ہے جس انسان کو آخری رسولؐ کے آ جانے کے بعد بھی حقیقت نظر نہ آئی اس سے بڑا بدبخت اور کون ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ جہنم کے گڑھے میں گرنے کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شخص اندھیرے میں یا کم روشنی میں ٹھوکر کھا جائے تو اس کی ٹھوکر کا تو پھر بھی کچھ نہ کچھ جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دن کی روشنی

میں اس وقت راستہ پہچاننے سے انکار کردے جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہوتو ظاہر ہے اس کے لیے وہ خود ہی قصوروار ہوگا۔

آیت ۱۶ ﴿ الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ⑯ ﴾ ''جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔''

آیت ۱۷ ﴿ وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ⑰ ﴾ ''اور بچالیا جائے گا اس سے جو انتہائی متقی ہے۔''

اس آیت کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کا مصداق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں' کیونکہ قبل ازیں آیت ۵ اور ۶ میں جن تین اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ اس اُمت کی جس شخصیت میں بتمام و کمال نظر آتے ہیں وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔

''تصدیق بالحسنیٰ'' کے حوالے سے آپؓ کے بارے میں خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میں نے جس کسی کو بھی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے۔ انؓ کے سامنے جونہی میں نے اپنی نبوت کا ذکر کیا وہ فوراً مجھ پر ایمان لے آئے۔ آپؓ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپؓ توحید پر کاربند اور بُت پرستی سے دور رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی آپؓ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپؓ نے کئی نادار خاندانوں کی کفالت مستقل طور پر اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ مکہ کے بہت سے غلاموں اور لونڈیوں کو آپؓ نے منہ مانگی قیمت میں خرید کر آزاد کرایا تھا' اور غزوہ تبوک کے موقع پر تو آپؓ نے اپنے گھر کا پورا اثاثہ لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ غرض مذکورہ تینوں اوصاف بدرجہ اَتم اُمت کے مَردوں میں آپؓ کی شخصیت میں' جبکہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ⑱ ﴾ ''جو اپنا مال دیتا ہے اپنے (نفس) کو پاک کرنے کے لیے۔''

یعنی مال خرچ کرتے ہوئے دنیاداری کا کوئی مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرانے کے لیے اُمیہ بن خلف کو جب منہ مانگی قیمت ادا کی تو اس پر اُمیہ خود بھی حیران رہ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ (آپؓ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے) نے بھی آپؓ سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم تم نے کسی طاقتور غلام پر کیوں نہ خرچ کی جو تمہارے کام بھی آتا! (اس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کراتا تھا تو وہ غلام زندگی بھر اسی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اخلاقی لحاظ سے بھی وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ عرب رواج کے مطابق ایسے آزاد کردہ غلام کو متعلقہ شخصیت کا مولیٰ کہا جاتا تھا' جیسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے مولیٰ تھے۔) بہرحال مال خرچ کرنے کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے جن کی نظر ہر وقت دنیا کے مفادات پر رہتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی ⑲ ﴾ ''اور اس کے ذمے کسی کا احسان نہیں جس کا وہ بدلہ چکا رہا ہو۔''

آیت ۲۰ ﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ⑳ ﴾ ''بلکہ (وہ تو خرچ کر رہا ہے) صرف اپنے بلند و برتر

پروردگار کی رضاجوئی کے لیے۔''

آیت ۲۱ ﴿وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾﴾ ''اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔''

یہاں پر یَرۡضٰی کی ضمیر کا اشارہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور اس شخصیت کی طرف بھی جس کی صفات کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ گویا یہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ جیسی بشارت ہے کہ اگر اللہ کا یہ بندہ اپنا مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے لٹا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔

سورۃ الم نشرح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ﴿۲﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ ﴿۳﴾ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾ (الم نشرح)

آیت ۱ ﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ﴿۱﴾﴾ ''کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا؟''

یعنی ہم نے آپ کا اضطراب کم کر کے آپ کے دل کو ایک ٹھہراؤ اور سکون عطا فرما دیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''اس میں علوم و معارف کے سمندر اُتار دیے اور لوازمِ نبوت اور فرائضِ رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔''

آیت ۲ ﴿وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ﴿۲﴾﴾ ''اور ہم نے اُتار نہیں دیا آپ سے آپ کا وہ بوجھ؟''

آیت ۳ ﴿الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ ﴿۳﴾﴾ ''جو آپ کی کمر کو توڑے دے رہا تھا!''

آیت ۴ ﴿وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ﴿۴﴾﴾ ''اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔''

آیت ۵ ﴿فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۵﴾﴾ ''تو یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

آیت ۶ ﴿اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۶﴾﴾ ''یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔''

یہ سورت دراصل مشکلات القرآن میں سے ہے۔ آیت ۲ میں جس بوجھ کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی مشقتوں اور لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ رائے صرف جزوی طور پر درست ہے' اس لیے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کی مشکلات کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور بعد کے زمانے میں آپ کو نسبتاً بہت زیادہ مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ مثلاً شعبِ ابی طالب میں تین

سال کی قید کا واقعہ اس سورت کے نزول کے بعد پیش آیا اور اس کے بعد ہی آپؐ کو یومِ طائف اور یومِ اُحد جیسے گھمبیر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت و تبلیغ اور آپؐ کے فریضۂ رسالت سے متعلقہ مشکلات بھی اس سورت کے نزول کے بعد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئیں‘ بلکہ بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں جس بوجھ کے اتار دینے کا ذکر ہوا ہے وہ اصل میں کوئی اور بوجھ تھا۔

چنانچہ اس بوجھ کی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پہلے اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو اپنے قربِ خاص کی نعمت سے نوازتا ہے۔ چنانچہ قربِ خاص کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد انبیاء ورسل علیہم السلام کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کیفیت میں گزاریں۔ لیکن وہاں سے حکم ملتا ہے کہ جاؤ خلقِ خدا تک میرا پیغام پہنچاؤ اور انہیں ہدایت کا راستہ دکھاؤ! مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اپنے قربِ خاص سے نوازا اور آپؑ سے کلام فرمایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش تو یہی ہوگی کہ وہ سدا اسی کیفیت میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مکالمے اور مخاطبے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہیں‘ لیکن اس کے فوراً بعد آپؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) ”اب جاؤ فرعون کی طرف‘ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے!“ ظاہر ہے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس بارے میں اصل حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی اور طنز و تمسخر کے تیر برسائے جاتے تھے‘ حتیٰ کہ جسمانی اذیت پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ الغرض اس راستے میں تو ہر قدم پر مخالفت اور ہر موڑ پر تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں پیغمبروں کو دوہری مشکل کا سامنا رہا ہے‘ یعنی ایک طرف قرب و حضوری کی خصوصی کیفیت سے باہر آنے کا ملال اور دوسری طرف لوگوں کے رویے کے باعث دل پر تکدر کا بوجھ۔ کہاں وہ قربِ خاص کا کیف و سرور اور کہاں یہ مشقت بھری مصروفیات۔ روح اور طبیعت کا میلان تو ظاہر ہے اسی طرف ہوگا کہ وہی خلوت ہو‘ وہی حضوری ہو اور وہی کیف و سرور ہو۔ غالبؔ نے اپنی زبان اور اپنے انداز میں محبوب کی قربت کے حوالے سے انسان کی اس کیفیت اور خواہش کی ترجمانی یوں کی ہے:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت‘ کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے!

اس صورتِ حال یا کیفیت کو علامہ اقبال کے بیان کردہ اس واقعہ کے حوالہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات (چوتھے لیکچر) میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں انہیں اقامت کی آواز سنائی دی۔ آپؒ فوراً نماز کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جھنجلا کر کہا: ”حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا!“ اب ظاہر ہے حضوری کی کیفیت میں تو اور ہی لذت تھی جبکہ نماز میں جماعت کا نظم ملحوظ رکھنے کی پابندی ہے اور ہر صورت میں امام کی اقتدا ضروری ہے۔ فرض کریں مقتدی کو تلاوت سننے میں لذت محسوس ہو رہی ہے اور وہ مزید سننا چاہتا ہے لیکن یہاں وہ ایسا

نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے جب امام قراءت ختم کر کے رکوع میں جائے گا تو اسے اس کی اقتدا کرنا ہوگی۔ اگر وہ دیر تک سجدہ میں ہی پڑے رہنا چاہتا ہے تو بھی اسے اپنا سجدہ مختصر کر کے امام کی اقتدا میں سر اٹھانا ہوگا۔

اس تمہیدی وضاحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اب آپ حضورﷺ کی اس کیفیت کا تصور کیجیے جب حضورﷺ رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اُس وقت آپؐ کی روح کیسی کیسی قربتوں اور رفعتوں سے آشنا ہوتی ہوگی اور آپؐ کے قلب مبارک پر کیسے کیسے انوار وتجلیات کی بارش ہوتی ہوگی۔ پھر صبح کو جب آپؐ اہلِ مکّہ کے درمیان جا کر ان سے شاعر' مجنون' کذاب (نعوذ باللہ) جیسے القابات سنتے ہوں گے اور ان کے تمسخر بھرے جملوں کا سامنا کرتے ہوں گے تو آپؐ اپنی طبیعت میں کیسا تکدر اور کیسی کوفت محسوس کرتے ہوں گے۔ چنانچہ حضورﷺ کے لیے اصل معاملہ یہ تھا کہ ''عروج'' (قُربِ خاص) کی لذت کے بعد ''نزول'' کا مرحلہ آپؐ پر بہت شاق گزرتا تھا۔ اور یہی وہ ''بوجھ'' تھا جو آپؐ کی کمر کو دوہرا کیے دے رہا تھا۔ البتہ رفتہ رفتہ آپؐ کا مزاج جب اس معمول کا خوگر ہو گیا تو اس بوجھ کے احساس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ پھر جب روز بروز اہلِ ایمان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی تو دعوت وتحریک کی مصروفیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے تسکین کا سامان پیدا فرما دیا۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ فریضۂ رسالت کی انجام دہی کے لیے عروج اور نزول (ان کیفیات کے لیے صوفیاء کے ہاں ''سیر الی اللہ'' اور ''سیر عن اللہ'' کی اصطلاحات بھی معروف ہیں) کی دونوں کیفیات کا بیک وقت باہم متوازی چلنا ضروری ہے۔ اس نکتہ لطیف کو مولانا رومؒ نے بارش کی مثال سے بہت مؤثر انداز میں سمجھایا ہے۔ مولانا کی بیان کردہ اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات کی شکل میں بالکل صاف اور پاکیزہ پانی فضا میں پہنچتا ہے۔ بارش برستی ہے تو یہ صاف پانی فضا کی کدورتوں کو بھی صاف کرتا ہے' زمین کی گندگیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر سمندر میں ڈال دیتا ہے اور اس کے بعد سمندر سے پھر بخارات بن کر صاف اور پاکیزہ حالت میں بارش کے لیے فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس مثال کو حضورﷺ کی ذات پر منطبق کرتے ہوئے یوں سمجھیں کہ حضورﷺ کو ''سیر الی اللہ'' (قیام اللّیل اور خلوت کی مناجات وغیرہ) کے ذریعے روحانی ترفع حاصل ہوتا۔ پھر جب آپؐ ''سیر عن اللہ'' کی صورت میں معاشرے کی طرف رجوع فرماتے تو آپؐ کی رحمت اور روحانیت لوگوں پر بارش کی طرح برستی اور راستے میں آنے والی تمام ظاہری و باطنی آلائشوں اور کدورتوں کو دھو ڈالتی۔ اسی دوران لوگوں کی مخالفت اور گھٹیا حرکات کے باعث آپؐ کی ''روحانیت'' میں کچھ تکدر بھی پیدا ہوتا' جسے ''سیر الی اللہ'' کے اگلے مرحلے میں صاف کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ نتائج کے اعتبار سے تو دعوت وتبلیغ کی مصروفیات بھی ''سیر الی اللہ'' ہی کے زمرے میں آتی ہیں' لیکن عملی طور پر اس کی کیفیت بظاہر ''سیر عن اللہ'' جیسی ہے۔ جیسے نماز کی حالت میں انسان کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے' لیکن ایک داعی جب نماز سے فارغ ہو کر تبلیغ کے لیے نکلتا ہے تو بظاہر اس

کی پشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور رُخ لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔

آیت ۷، ۸ ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝﴾ ''پھر جب آپؐ (فرائضِ نبوت سے) فارغ ہو جائیں تو اسی کام میں لگ جایئے۔ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جایئے۔''

تو اے نبی ﷺ! جب آپ اپنے فرضِ منصبی سے فارغ ہو جائیں اور اللہ کا دین غالب ہو جائے تو پھر آپ یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نوٹ کیجیے! سورۃ النصر میں بھی حضور ﷺ کے لیے بالکل یہی پیغام ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا ۝﴾ یعنی جب غلبۂ دین کے حوالے سے آپ ﷺ کا مشن مکمل ہو جائے تو پھر ہمہ تن ہمہ وقت آپؐ اللہ کی طرف متوجہ ہو جایئے گا اور تقرب الی اللہ کے لیے محنت شروع کر دیجیے گا۔ چنانچہ جونہی آپؐ کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا تو آپؐ نے فوراً محبوب کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا (اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی) کہ اے اللہ! اب میں اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو گیا ہوں، اب مجھ میں مزید انتظار کا یارا نہیں! واضح رہے کہ انبیاء ورسل ؊ کو اللہ تعالیٰ دنیا میں مزید رہنے یا کوچ کرنے سے متعلق اختیار عطا فرماتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ آخری ایام میں ایک دن جب حضور ﷺ کے مرض میں افاقہ ہوا تو آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے۔ منبر پر فروکش ہوئے اور خطبہ دیا۔ اس کے بعد منبر سے نیچے تشریف لائے۔ ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور چند اہم نصیحتیں فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: ''ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا کہ وہ یا تو دنیا کی چمک دمک اور زیب وزینت میں سے جو کچھ چاہے اللہ اسے دے دے یا اللہ کے پاس جو کچھ ہے اسے اختیار کر لے تو اس بندے نے اللہ کے پاس والی چیز کو اختیار کر لیا''۔ یہ بات سن کر ابوبکر ؓ رونے لگے اور فرمایا: ''ہم اپنے ماں باپ سمیت آپؐ پر قربان!'' اس پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضور ﷺ کیا ارشاد فرما رہے ہیں اور اس پر ابوبکرؓ کیا کہہ رہے ہیں! لیکن چند دن بعد واضح ہوا کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا تھا وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے اور ابوبکر صدیقؓ صحابہ کرام ؓ میں سب سے زیادہ صاحبِ علم وبصیرت تھے۔

یہاں حضور ﷺ کے اس فرمان کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل کی بات زبان پر آ گئی ہے —— وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے مجھے حضور ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیا تو میں حضور ﷺ سے شکوہ کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ حضور! آپؐ نے بہت جلدی کی ...... حضورؐ! مانا کہ ہجر وفراق کا ایک ایک لمحہ آپؐ کے لیے مشکل تھا...... مگر حضورؐ! جو لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے تھے وہ بھی تو آپؐ کے فیضانِ نظر کے محتاج تھے...... حضورؐ! اگر تھوڑا سا وقت ان کو بھی مل جاتا تو...... مہاجرینؓ وانصارؓ کی طرز پر ان کی تربیت بھی ہو جاتی......!!!

سُورۃ العصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾ (العصر)

آیت ۱ ﴿وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''زمانے کی قسم ہے۔''

یعنی اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے یا پوری تاریخ انسانی شاہد ہے کہ:

آیت ۲ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ﴿۲﴾﴾ ''یقیناً انسان خسارے میں ہے۔''

اگلی آیت میں اس نقصان اور خسارے سے بچاؤ کے لیے چار شرائط بتائی گئی ہیں' لیکن ان میں سے کوئی ایک یا دو یا تین شرائط پوری کر دینے سے مذکورہ خسارے سے بچنے کی امید نہیں کی جا سکتی' بلکہ کامیابی کے لیے بہر حال چاروں شرائط پر عمل درآمد ضروری ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

ان شرائط میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان لائے۔ اس میں ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سمیت تمام ایمانیات شامل ہیں۔ یعنی انسان اس کائنات کے مخفی اور غیبی حقائق کو سمجھے' ان کا شعور حاصل کرے اور ان کی تصدیق کرے۔ ایمان لانے کے بعد دوسری شرط اس ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ یعنی اگر انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے عمل اور کردار سے ثابت ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس عمل کو اپنے شب و روز کے معمول کا حصہ بنانے پر کمربستہ ہو جائے جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ہر اس فعل سے اجتناب کرنے کی فکر میں رہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔

تیسری شرط ''تواصی بالحق'' کی ہے۔ یعنی جس حق کو انسان نے خود قبول کیا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالا ہے' اس حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علمبردار بن جائے۔ اس کے بعد چوتھی اور آخری شرط ''تواصی بالصبر'' کی ہے اور یہ ''تواصی بالحق'' کا لازمی اور منطقی نتیجہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ ''تواصی بالحق'' کا علم اٹھائے گا اسے شیطانی قوتوں کی مخالفت مول لے کر آزمائش و ابتلا کی مشکل گھاٹیوں سے بھی گزرنا ہوگا اور اس راستے پر چلتے ہوئے نہ صرف اسے خود صبر و استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین و نصیحت

کرنا ہوگی۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصیحت کی تو ساتھ ہی صبر کی تلقین بھی کی تھی: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾ (لقمان:۱۷) ''اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو!''

بہر حال راہِ حق کے مسافروں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستہ آزمائش وابتلا کے خارزاروں سے ہو کر گزرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ (البقرۃ) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔''

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

سُورۃ قُریش

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ (قریش)

آیت ۱ ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾﴾ ''قریش کے مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

آیت ۲ ﴿اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾﴾ ''(یعنی) سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے ان کو مانوس رکھنے کی وجہ سے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی الفت ومحبت پیدا کر دی۔

اِیْلاف: اَلِفَ یَاْلَفُ اَلْفًا سے باب افعال کا مصدر ہے' یعنی مانوس کرنا اور خوگر بنانا۔ اردو الفاظ اُلفت' مالوف وغیرہ بھی اسی مادہ سے ماخوذ ہیں۔

سورۂ قریش کی ان پہلی دو آیات میں قریش کی اس اجارہ داری کی طرف اشارہ ہے جو حضور ﷺ کی پیدائش سے قبل زمانے میں انہیں مشرق اور مغرب کی تجارت پر حاصل تھی۔ اس زمانے میں مشرقِ بعید کے ممالک (ہندوستان' جاوا' ملایا' سماٹرا' چین وغیرہ) سے بحر ہند کے راستے جو سامانِ تجارت آتا تھا وہ یمن کے ساحل پر اترتا تھا۔ دوسری طرف یورپ سے آنے والے جہاز شام اور فلسطین کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اس کے بعد یمن سے سامانِ تجارت کو شام پہنچانے اور ادھر کا سامان یمن پہنچانے کے لیے خشکی کا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اس راستے کی حیثیت اس زمانے میں گویا بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کی سی

تھی۔ظاہر ہے یورپ کو انڈیا سے ملانے والا سمندری راستہ (around the cape of good hope) تو واسکوڈے گاما نے صدیوں بعد ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا تھا' جبکہ بحیرۂ احمر کو بحر روم سے ملانے والی نہر سویز ۱۸۶۹ء میں بنی تھی۔

حضورﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک اس تجارتی شاہراہ پر قومِ سبا کی اجارہ داری تھی' لیکن جب ''سد مآرب'' ٹوٹنے کی وجہ سے اس علاقے میں سیلاب آیا اور اس سیلاب کی وجہ سے اس قوم کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ شاہراہ کلی طور پر قریش مکہ کے قبضے میں چلی گئی۔قریشِ مکہ چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے پورے عرب میں انہیں عزت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس زمانے میں جہاں کوئی بھی تجارتی قافلہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا وہاں قریش کے قافلوں کو پورے عرب میں کوئی میلی نظر سے بھی نہیں دیکھتا تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب کے تمام قبائل نے اپنے اپنے بت خانہ کعبہ میں نصب کر رکھے تھے۔ گویا ہر قبیلے کا ''خدا'' قریش کی مہربانی سے ہی خانہ کعبہ میں قیام پذیر تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریش کے پاس یرغمال تھا۔اس لیے عرب کا کوئی قبیلہ بھی ان کے قافلوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلے سارا سال بلاخوف وخطر یمن سے شام اور شام سے یمن کے راستے پر رواں دواں رہتے تھے۔گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ شام وفلسطین کے سرد علاقوں جبکہ سردیوں میں یمن کے گرم علاقے کا سفر اختیار کرتے تھے۔

آیت زیر مطالعہ میں ان کے اسی تجارتی سفر کا ذکر ہے۔ظاہر ہے بین الاقوامی تجارتی شاہراہ پر مکمل اجارہ داری' تجارتی قافلوں کے ہمہ وقت تحفظ کی یقینی ضمانت اور موسموں کی موافقت اور مطابقت سے سرد وگرم علاقوں کے سفر کی سہولت' یہ ان لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تھیں جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔اس لیے ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

آیت ۳ ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳﴾ ''پس انہیں بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے رب کی۔''

ظاہر ہے ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا یہ گھر (ع ''دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا'') توحید کے مرکز کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں بساتے وقت توحید کے اعتبار سے ان کی ذمہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (ابراھیم:۳۷) تاکہ وہ اللہ کی بندگی کے طور پر نماز قائم کریں۔ چنانچہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انہیں خوشحالی اور عزت ملی تھی وہ اس گھر کے مالک کو پہچانتے اور اس کا حق ادا کرتے' لیکن اس کے برعکس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس گھر میں ۳۶۰ بت نصب کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے بت کدے میں تبدیل کر دیا اور اس کے اصل مالک کو بالکل ہی فراموش کر دیا۔

آیت ۴ ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۝۵﴾ ''جس نے انہیں بھوک میں کھانے کو دیا''

انہیں رزق عطا فرما کر فاقہ کشی سے محفوظ رکھا۔جب عرب کے عام لوگ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھے

اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے قریشِ مکہ کو کامیاب تجارت اور کعبہ کی تولیت کی وجہ سے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

﴿وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴﴾ ''اور انہیں خوف سے امن عطا کیا۔''

ان کے قافلے سارا سال یمن اور فلسطین کے درمیان بلاخوف وخطر محوِ سفر رہتے تھے۔ خداداد تحفظ کی یہ ضمانت انہیں اس سرزمین میں میسر تھی جہاں ہر طرف جنگل کے قانون کا راج تھا۔

سورۃ الفلق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ (الفلق)

آیت ۱ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱﴾ ''کہو کہ میں پناہ میں آتا ہوں صبح کے رب کی۔''

فَلَقَ یَفْلِقُ کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے کے ہیں۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے سپیدۂ سحر نمودار کرتا ہے۔ اور اسی سورت کی آیت ۹۵ میں یہ لفظ دانوں اور گٹھلیوں وغیرہ کے پھاڑنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کے اندر دانوں یا گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے تو پودوں یا درختوں کی پتیاں اور جڑیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ فلق سے مراد یہاں صرف صبح ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عدم کا پردہ چاک کر کے وجود بخشا ہے۔ جیسے کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا گیا:

آیت ۲ ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲﴾ ''(میں پناہ میں آتا ہوں) اس کی تمام مخلوقات کے شر سے۔''

یعنی ''شر'' مستقل طور پر علیحدہ وجود رکھنے والی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مختلف مخلوقات کے اندر ہی کا ایک عنصر ہے۔ اس نکتے کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص یا عیب سے پاک ہے' لیکن اس کی مخلوق اپنے خالق کی طرح کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہر مخلوق کے اندر کمی یا تقصیر و تنقیص کا کوئی نہ کوئی پہلو یا عنصر بالقوّہ (potentially) موجود ہے۔ جیسے خود انسان کی متعدد کمزوریوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸﴾ کہ انسان بنیادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱﴾ کے الفاظ میں انسان کی جلد بازی کا ذکر ہوا۔ سورۃ المعارج میں اس کی تین کمزوریوں کا ذکر بایں الفاظ ہوا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝۱۹ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝۲۱﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑ دلا۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔''

گویا انسان روحانی طور پر اگرچہ احسن تقویم کے درجے میں پیدا کیا گیا ہے' لیکن اس کے حیوانی اور

مادی وجود میں مذکورہ خامیوں سمیت بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہر مخلوق میں مختلف کمزوریوں کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے 'شر' جنم لیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ اے پروردگار! تیری جس جس مخلوق میں شر کے جو جو پہلو پائے جاتے ہیں میں ان میں سے ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

آیت ۳ ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳﴾ ''اور (خاص طور پر) اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے۔''

ظاہر ہے رات کے اندھیرے میں انسانوں' جنّوں اور ضرر رساں جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کی صورت میں شر پھیلانے والے عناصر زیادہ فعال اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ گویا رات کا اندھیرا بذاتِ خود ایک بہت بڑا شر ہے جس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔

آیت ۴ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴﴾ ''اور اُن عورتوں کے شر سے جو گرہیں باندھ کر پھونکیں مارتی ہیں۔''

یعنی وہ تمام ٹونے ٹوٹکے' تعویذ گنڈے اور سفلی عملیات جن کے ذریعے سے کسی انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ کسی چیز کا بالفعل موجود ہونا اور بات ہے اور اس چیز کا حلال' حرام یا جائز' ناجائز ہونا الگ بات ہے۔ مثلاً جادو ایک حقیقت ہے لیکن کفر ہے۔ شراب اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتی ہے لیکن حرام ہے۔ اسی طرح علم نجوم' پامسٹری (ہاتھ کی لکیروں کا علم) اور سفلی عملیات کی حقیقت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا (ظاہر ہے جب ہم اچھے وظائف و کلمات کی اچھی تاثیر کو مانتے ہیں تو ہمیں سفلی و شیطانی کلمات وغیرہ کی منفی تاثیر کا بھی اقرار کرنا پڑے گا) لیکن شریعت نے ہمیں ایسے علوم سے استفادہ کرنے اور ایسے علوم کی بنیاد پر کیے گئے دعووں پر یقین کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہ تو مؤثر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس لیے ان کے شر سے بچنے کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دے۔

آیت ۵ ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵﴾ ''اور حسد کرنے والے کے شر سے بھی (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔''

ظاہر ہے جب ایک انسان کسی دوسرے انسان سے حسد کرتا ہے تو عین ممکن ہے وہ اپنے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر عملی طور پر بھی اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلْعَيْنُ حَقٌّ)) (متفق علیہ) یعنی نظر لگ جانا برحق ہے۔ چنانچہ حاسدانہ نگاہ بذاتِ خود بھی منفی اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے حاسدوں کے شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کی ضرورت ہے۔

بہرحال جادو' ٹونے' تعویذ گنڈے' نظر بد وغیرہ کے اثرات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲

میں شیاطینِ جن کا ذکر آیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے‘ بلکہ یہ گھناؤنا کاروبار کسی نہ کسی انداز سے ہر زمانے میں چلتا رہا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسی چیزیں سیکھنے سکھانے اور پھر مختلف دعووں کے ساتھ اپنا کاروبار چمکانے میں مصروف ہیں۔ البتہ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے‘ ہماری شریعت میں ایسی چیزیں سیکھنا اور پھر کسی بھی انداز میں ان سے استفادہ کرنا حرام ہے۔ اس حوالے سے ایک بندۂ مؤمن کو اپنے دل میں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی‘ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے: ﴿وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۰۲)۔ پھر ایک بندۂ مؤمن کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ جو تکلیف بھی آئے گی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی آئے گی (یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ خود کسی انسان کو کسی تکلیف یا مشکل سے دوچار کرنا چاہے) اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی دور ہوگی۔ جہاں تک ایسی چیزوں سے حفاظتی تدابیر اپنانے یا ایسے کسی شیطانی حملے کے توڑ کرنے کا تعلق ہے تو ان دو سورتوں (مُعَوِّذتَین) کے ہوتے ہوئے ایک بندۂ مسلمان کو کسی اور عمل‘ تعویذ یا تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو سکھائی تھیں اور اس لحاظ سے یہ حضور ﷺ کی وساطت سے اُمت کے لیے ایک بیش بہا تحفے کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر شب آرام کرنے سے پہلے آخری تینوں سورتیں (سورۃ الاخلاص اور معوذتین) پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے اور پھر اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ مزید برآں شیطانی اثرات اور نظر بد وغیرہ سے حفاظت کے لیے احادیث میں متعدد ادعیہ ماثورہ بھی وارد ہوئی ہیں‘ جن کو ہمیں اپنا معمول بنانا چاہیے۔

سُورۃ النّاس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ﴿۶﴾ (الناس)

آیت ۱ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ ”کہیے کہ میں پناہ میں آتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔“

یہاں سب سے پہلے ”رَبّ النّاس“ (لوگوں کا پروردگار) کے کلمات سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا ہے کہ تمہیں ایسی ذات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو تمہاری جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔

آیت ۲ ﴿مَلِكِ النَّاسِ ②﴾ ”تمام انسانوں کے بادشاہ کی۔“

وہ تمام انسانوں کا صرف پروردگار ہی نہیں‘ ان کا بادشاہ اور فرماں روا بھی ہے۔ اس کا حکم ہر وقت‘ ہر جگہ اور ہر چیز پر نافذ ہے۔

آیت ۳ ﴿اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳﴾ ''تمام انسانوں کے معبود کی۔''

انسانوں کا رب اور بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ان کا معبود بھی ہے' چنانچہ وہ ان پر کامل اقتدار اور اختیار رکھتا ہے اور ان کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت ۴ ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴﴾ ''اس بار بار وسوسہ ڈالنے والے' پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے۔''

شیطان کی وسوسہ اندازی کا طریق کار یہ ہے کہ وہ لگاتار اپنی کوشش جاری رکھتا ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کی کوششوں سے تھکتا نہیں۔ کبھی حملہ کرتا ہے' کبھی دفاعی پسپائی اختیار کرتا ہے اور پھر پلٹ کر حملہ آور ہوتا ہے۔

آیت ۵ ﴿الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵﴾ ''جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔''

آیت ۶ ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶﴾ ''خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔''

انسان کے دل ودماغ پر شیطانی وساوس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کی وضاحت حضورﷺ کے اس فرمان سے ملتی ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (متفق علیہ) ''شیطان انسان کے وجود میں خون کی مانند گردش کرتا ہے''۔ گویا شیطان نفس انسانی کے اندر موجود حیوانی شہوات اور سفلی داعیات (فرائیڈ اسے id یا libido کا نام دیتا ہے) کو بھڑکاتا ہے۔ حضورﷺ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ شیطان اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اس طرح اس کے جذبات وشہوات میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے اور اس کے جذبات کو انگیخت دینے کی حد تک اختیار دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان سے زبردستی کوئی عمل کرانے کا اختیار اسے نہیں دیا گیا۔ بہرحال نفسِ انسانی بعض اوقات شیطان کے بہکاوے میں آ کر متعلقہ انسان کے لیے شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے اور پھر بالکل شیطان ہی کی طرح اس کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قٓ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ (آیت ۱۶) ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے''۔ ایسے نفس انسانی کو سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں ''نفس امارہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اہم اور بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ شیطان اُسی دل پر اپنی تھوتھنی رکھ کر پھونکیں مارتا ہے اور اسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے جو دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول اور اس کے ذکر سے معمور ہوتا ہے شیطان اس سے دور رہتا ہے۔ بہرحال شیطان کے تمام وسوسے اور حربے انسان کے اپنے نفس کے ذریعے سے ہی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ سورت خصوصی طور پر شیطانی وساوس کے توڑ کے لیے نازل ہوئی ہے۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم ۝

دعائے ختمِ قرآن

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ، وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً، اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَا نَسِیْتُ، وَعَلِّمْنِیْ مِنْہُ مَا جَھِلْتُ، وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَہٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ، وَاجْعَلْہُ لِیْ حُجَّۃً یَّارَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

قرآن حکیم کے حوالے سے یہ بہت پیاری دعا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کے الفاظ اور معانی کو اچھی طرح سے یاد کرلیں' کیونکہ دعا مانگنے کا مزہ تو تبھی ہے جب انسان اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا مفہوم بھی سمجھتا ہو۔ تو آیئے اس خوبصورت دعا کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ

''اے اللہ! میری قبر کے اندر مجھے جو وحشت ہوگی اسے میرے لیے مانوس کردے!''

اس وحشت کو دُور کرنے کے لیے مجھے قرآن مجید کا اُنس عطا کردے! ـــــ یاد رکھیں! قبر کی وحشت قرآن حکیم کے ساتھ تعلق کی بنا پر مانوس ہوگی۔ اپنی جوانی کے ایام میں (جب آتش جوان تھا!) میں اس دعا کو پڑھا کرتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرآن سے متعلق اصل دعا تو اگلے فقرے سے شروع ہوتی ہے اور یہ پہلا جملہ اضافی سا ہے۔ مگر اب جبکہ بڑھاپے میں قبر ہر وقت سامنے نظر آتی ہے تو اب معلوم ہوا ہے کہ اس دعا کا اہم ترین حصہ تو یہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ

''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما قرآنِ عظیم کی بدولت''

وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً

''اور اس کو میرے لیے امام' نور' ہدایت اور رحمت بنادے!''

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کو اپنا امام بنانے کا ارادہ بھی کرے' کہ اب مجھے قرآن مجید کو اپنا راہبر و راہنما مان کر اس کی پیروی کرنی ہے۔ لیکن اگر دل میں ایسا کوئی شعوری ارادہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو ظاہر ہے ایسی کیفیت میں یہ دعا یہ کلمہ بھی ''ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاھِکُمْ'' کے مصداق محض منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بن کر رہ جائے گا اور عملی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَا نَسِیْتُ

''اے اللہ! مجھے یاد کرا دے جو کچھ میں اس میں سے بھول جاؤں''

وَعَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ

اور مجھے سکھا دے اس میں سے جو میں نہیں جانتا''

ظاہر ہے یہ دعا بھی تبھی کارگر ہوگی جب عملی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے کی نیت اور کوشش انسان کے شامل حال ہوگی۔ یاد رکھیں! قرآن مجید کا علم بہت قیمتی چیز ہے۔ یہ عظیم دولت اللہ تعالیٰ کسی کی جھولی میں زبردستی نہیں ڈالتا۔ چنانچہ جس طرح انسان دنیا کے دوسرے علوم وفنون کو سیکھنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے اسی طرح قرآن مجید کو سیکھنے کے لیے بھی محنت درکار ہے۔ اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار بہت بصیرت افروز ہیں:

یَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِیْ   وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهِرَ اللَّیَالِیْ

''جو شخص بھی موتیوں کا طلب گار ہوتا ہے اسے سمندر میں غوطہ زنی کرنا پڑتی ہے۔ اور جو شخص کسی بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے (اور محنت ومشقت کرتا ہے)۔''

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی مِنْ غَیْرِ کَدٍّ   اَضَاعَ الْعُمْرَ فِیْ طَلَبِ الْمُحَالِیْ

''اور جو کوئی بلندی کا طلب گار بن جائے بغیر کوشش کے وہ اپنی عمر ضائع کر بیٹھتا ہے ایک محال چیز کی طلب میں۔''

اس حوالے سے پڑھے لکھے خواتین وحضرات کو خصوصی طور پر بہت سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اگر انہوں نے بہت سے دُنیوی علوم وفنون سیکھ رکھے ہیں تو آخر وہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ اور یہ کہ قیامت کے دن وہ اپنی اس کوتاہی کے جواز میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آخر کیا عذر پیش کریں گے؟

وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ

''اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اسے پڑھتا رہوں''

آنَآءَ الَّیْلِ وَآنَآءَ النَّهَارِ

''رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی۔''

وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

''اور اے تمام جہانوں کے پروردگار! اس قرآن کو میرے حق میں دلیل اور گواہ بنا دے۔''

اس جملے کا مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیں حضور ﷺ کا یہ فرمان مدنظر رکھنا چاہیے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَیْكَ)) ''قرآن حجت (دلیل یا گواہ) ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف!'' یعنی قرآن مجید قیامت کے دن ہر انسان کے حساب کے وقت گواہ بن کر کھڑا ہوگا۔ جس کسی نے حسبِ استطاعت اس کے حقوق (یعنی اس پر ایمان لانے' اس کو پڑھنے' سمجھنے' اس پر عمل کرنے اور اس کی ترویج وتبلیغ کے حوالے سے حقوق) ادا کیے ہوں

گے تو قرآن مجید اس کے حق میں گواہی دے گا اور اس کے شافع کی حیثیت سے اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لیکن جس شخص نے قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے سے بے اعتنائی برتی ہوگی قیامت کے دن وہ اس کے خلاف گواہی دے گا' بلکہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ اے اللہ! یہ بدبخت مجھے تیرا کلام تو مانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے مجھے پڑھنے یا سمجھنے یا میرے احکام پر عمل کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔

یہ تو وہ دعا ہے جو قرآن مجید کے نسخوں کے اختتام پر عام طور پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ سے ایک اور دعا بھی منقول ہے' جسے میں نے تین مختلف روایتوں سے جمع کر کے لوگوں کی سہولت کے لیے ترجمے کے ساتھ شائع کروایا ہے۔ اس دعا میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ، وَابْنُ عَبْدِکَ، وَابْنُ اَمَتِکَ ، فِیْ قَبْضَتِکَ، نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ ، مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ ، اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ، سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ، اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ، اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ، اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْکَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ، وَنُوْرَ صَدْرِیْ، وَجِلَاءَ حُزْنِیْ، وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَ غَمِّیْ۔ آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

اس دعا کو پڑھتے ہوئے مجھے امام ابن تیمیہ ؒ کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو انہوں نے عبادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں عبادت ''غَایَۃُ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ'' کا نام ہے۔ یعنی عبادت یہ ہے کہ انسان خود کو حد درجے کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے بچھا دے۔ اس دعا کے ایک ایک جملے اور ایک ایک لفظ میں اللہ تعالیٰ کے لیے غایت درجے کی محبت' انکساری' عاجزی اور تذلل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اس دعا کو زبانی یاد کر لے اور حرزِ جاں بنا لے۔

آیئے اب اس دعا کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیجیے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ ''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں''

وَابْنُ عَبْدِکَ، وَابْنُ اَمَتِکَ ''تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔''

میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا اور میری والدہ بھی تیری ادنیٰ کنیز تھی۔

فِیْ قَبْضَتِکَ ''میں تیرے قبضۂ قدرت میں ہوں۔''

نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ ''میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔''

مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ ''میرے پورے وجود میں تیرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔''

عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ ''میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ عدل ہی پر مبنی ہے۔''

اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ، سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ ''میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہر اُس پاک نام

کے واسطے سے‘ جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا۔“

اس جملے میں گویا سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۸۰ کے اس حکم کی جھلک نظر آ رہی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰) کہ سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں‘ پس تم اس سے ان ناموں کے حوالے سے دعا کیا کرو۔

اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ ”یا جسے تو نے اپنی کسی کتاب میں نازل کیا“

~~اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ~~ ”یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا“

اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ ”یا اسے ابھی تو نے اپنے پاس‘ اپنے غیب کے خزانے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔“

اب دیکھیں حضور ﷺ نے اپنی عاجزی وانکساری اور اللہ تعالیٰ کے سارے ناموں کا حوالہ دے کر مانگا کیا ہے:

اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْكَرِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ ”(اے اللہ!) اس قرآن کریم کو میرے دل کی بہار بنا دے“

وَنُوْرَ صَدْرِیْ ”اور اسے میرے سینے کا نور بنا دے“

وَجِلَاءَ حُزْنِیْ ”اور میرے رنج وحزن کا مداوا بنا دے“

وَذَهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ ”اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب بنا دے۔“

آمِیْنَ! ثُمَّ آمِیْنَ!!

نوٹ کیجیے! حضور ﷺ نے عبدیت‘ تواضع اور تذلّل کی انتہا پر جا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے تو قرآن کریم کی محبت کا‘ قرآن مجید کی معیت کا اور قرآن حکیم کے سہارے کا۔ ظاہر ہے یہی تو کائنات کی سب سے قیمتی چیز اور سب سے بڑی دولت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (یونس)

”اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے امراض) کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے‘ تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

بارك اللّٰه لی ولكم فی القرآن العظیم ونفعنی وایّاكم بالآیات وَالذِّكر الحكیم○○

(اختتامی نشست دورۂ ترجمہ قرآن‘ جامع مسجد قرآن اکیڈمی‘ ڈیفنس‘ کراچی‘

۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ / ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ء)